

مقالات سیرت طیبہ

سیرت کانفرنس ۱۴۱۲ھ

جامعہ سلفیہ بنارس، ہندوستان

پروفیسر عبدالجبار شاکر یادگار سیرت کتاب نمبر 2

مقالات سیرت طیبہ

سیرت کانفرنس ۱۴۱۲ھ

جامعہ سلفیہ بنارس، ہندوستان

www.KitaboSunnat.com

کتاب سرائے
بیت الحکمت لاہور کا اشاعتی ادارہ
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

بیاد

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

۱۹۲۷ - ۲۰۰۹

۱۴۳۳ھ......۲۰۱۲ء

نام کتاب : مقالات سیرت طیبہ

منعقدہ : ۱۴۱۲ھ جامعہ سلفیہ بنارس

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

کمپوزنگ : الشیخ یعقوب 0300-4067636

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، پاکستان

فون: 042-37320318 فیکس: 042-37239884

ای میل: kitbsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی

فون: 32629724 - 32212991

ترتیب

کانفرنس سے متعلق منظومات

❁......❁......❁

عرضِ ناشر

سیرت النبی ﷺ کائنات کے سدا بہار موضوعات میں سے ایک نمایاں ترین موضوع ہے۔ اس موضوع پر جو لکھا جا چکا ہے، جو لکھا جا رہا ہے اور مستقبل میں امکانی طور پر جو لکھا جائے گا، اس کا مکمل احاطہ کرنا ناممکن ہے اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔

زیر نظر کتاب ''مقالات سیرت طیبہ'' ۱۴۱۲ھ میں جامعہ سلفیہ بنارس میں ہونے والی سیرت کانفرنس کے مجموعہ مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ سب سے پہلے ہندوستان میں جامعہ سلفیہ کے اشاعتی ادارے ''ادارہ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ بنارس'' نے ۱۴۱۵ھ میں شائع کی۔

ہمارے ادارے نے والد محترم پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ کی سیرت سے محبت اور تعلق کے حوالے سے ایک سلسلہ ''پروفیسر عبدالجبار شاکر یادگار سیرت کتاب'' کا شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اُس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''کلکی اوتار اور حضرت محمد ﷺ'' شائع ہو چکی ہے۔

''مقالات سیرت طیبہ'' میں ۳۷ مقالات اور چار منظومات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے عربی مقالے اس اشاعت میں شامل نہیں ہیں ان مقالات میں سیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں سیرت کی اہم کتابیں اور ان کے مصنفین، غزوات، عہد مکی، اطاعت واتباع اور حب رسول کا مفہوم، اخلاق نبوی، سیرت کی عالمگیریت، حقوق انسانی اور خطبہ الوداع، معجزات نبویؐ، عقیدہ

ختم نبوت، علم کا تصور حدیث کی روشنی میں، حقوق نسواں، اولاد کی تربیت، سیرت نبوی اور غیر اسلامی افکار، طبقاتی کشمکش کا حل اور دیگر موضوعات شامل ہیں۔

ان مقالات میں علمی آہنگ بھی ہے اور دعوتی اسلوب بھی ہے۔ ان سے اہل علم بھی اپنے ذوق کی تسکین اور عوام الناس اپنے عقائد کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ایک طالب علم کے لیے سیرت کے موضوعات پر یہ کتاب ایک گنجینہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ایک کتاب کے اندر ہی سیرت کے بہت سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور معلومات کا ایک جہان آباد ہے۔

مقالات سیرت طیبہ کی ترتیب میں مولانا مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا ذوق سلیم بھی شامل ہے کہ انھوں نے بڑے سلیقے سے مقالات کو ترتیب دیا ہے۔ بعض مقالات پر تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

بیت الحکمت، لاہور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے اشاعتی سفر کے آغاز سے ہی سیرت النبی ﷺ کے جواہر پاروں کو منظر عام پر لا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ نے سیرت کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق اور محبت کے حوالے سے ایک رخ متعین کیا جس کے باعث سیرت کے موضوع پر ایک قابل ذکر تعداد شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے اور یہ سفر ابھی جاری وساری ہے۔ بیت الحکمت لاہور کی سیرت کے حوالے سے لائبریری بھی اپنے جواہر پاروں کے ساتھ مزید ترقی کر رہی ہے۔ پروفیسر صاحب کی وفات کے بعد سے اب تک سیرت النبی ﷺ پر اس میں تقریباً ۵۰۰ کتب کا اضافہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ کی زندگی سیرت کے ساتھ وابستگی پر مبنی ایک سفر کا نام تھا۔ اس سلسلے میں ہم نے ان کے روایت کو جاری رکھتے ہوئے سیرت کے موضوع پر نایاب، قدیم اور علمی کتابوں کے منظر عام پر لانے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مقالہ نگاروں، مرتبین کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ کو سیرت سے محبت اور ہمیں اس سفر کو جاری رکھنے پر اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور آخرت میں اپنے حبیب نبی کریم کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

محمد جمال الدین افغانی

بیت الحکمت، لاہور

۱۹ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ

حکیمانہ تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفوس: سیرت طیبہ کی رہنمائی میں

مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگر، نیپال رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

قرآن شریف میں رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(الجمعة:٦٢/٢)

''اسی نے قریش کے ناخواندہ لوگوں میں سے رسولؐ بھیجا ہے، جو اس کے احکام کو پڑھ کر انھیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور علم وحکمت سکھاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی تعریف کی گئی ہے کہ آپؐ ان پڑھ لوگوں میں رسول ہو کر مبعوث ہوئے، آپؐ ان پر آیات قرآنیہ کی تلاوت کرتے اور ان کے قلوب کا تزکیہ کرتے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تھے۔

آیات قرآنیہ کی تلاوت، لوگوں کے قلوب ونفس کا تزکیہ، اور کتاب اللہ کی تعلیم اور حکمت ودانائی کی باتیں سکھانا رسول پاک ﷺ کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ ان تمام صفات سے متصف اور اوصاف حسنہ کے حامل تھے۔

آپ ﷺ کی حکیمانہ تربیت وتزکیۂ نفوس کے سلسلے میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ایک بہترین واقعہ اپنی کتاب «الخصائص الکبری» میں نقل فرمایا ہے کہ ایک نوجوان شخص رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں اسلام کے جملہ احکام پر عمل کروں گا مگر ایک چیز کی مجھے بڑی خواہش ہے۔ اس سے مجھ کو مستثنیٰ رکھا جائے اور چھوٹ دے دی جائے، یعنی میں صرف زنا کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں عورتوں کا بڑا عاشق ہوں، اس بات پر دوسرے صحابہ اسے ڈانٹنے لگے کہ تم اس ناجائز اور حرام فعل کی کیسے اجازت چاہتے ہو، بھلا پیارے رسول ﷺ تم کو اس کی اجازت دیں گے؟

لیکن آپ ﷺ نے اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا اور پوچھا کہ کیا تو اپنی ماں سے زنا کر سکتا ہے؟ اس نے کہا یارسول اللہ ﷺ! ماں سے زنا کا کون خیال کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کوئی شریف آدمی اپنی ماں سے زنا نہیں کرے گا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اپنی خالہ سے زنا کرے گا؟ تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ بھلا خالہ سے کون زنا کرے گا؟ تو اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ ہاں کوئی شریف آدمی اپنی خالہ سے زنا نہیں کرے گا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ تو اپنی پھوپھی سے زنا کرے گا؟ تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! پھوپھی سے کون زنا کرے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کوئی شریف آدمی اپنی پھوپھی سے زنا کا خیال نہیں کرے گا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تو اپنی بہن سے زنا کرے گا؟ تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ تو غیر ممکن ہے، اپنی بہن سے کون زنا کرے گا، تو اللہ کے رسول ﷺ نے کہا ہاں واقعی کوئی شریف آدمی اپنی بہن سے زنا کرنے کا خیال نہیں کرے گا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تو اپنی لڑکی سے زنا کرے گا؟ تو اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ تو ناممکن ہے، کوئی اپنی بیٹی سے کیسے زنا کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں کوئی شریف آدمی اپنی بیٹی سے زنا کا خیال نہیں کرے گا۔

اس حکیمانہ تعلیم کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تو اپنی ماں، خالہ، اپنی پھوپھی اور اپنی بہن اور اپنی لڑکی سے زنا نہیں کرسکتا اور نہ کوئی شریف آدمی ہی کرے گا تو جس کسی دوسری عورت سے تم زنا کا ارادہ کرو گے، آخر وہ بھی تو کسی کی ماں ہوگی، یا کسی کی خالہ یا پھوپھی ہوگی، یا کسی کی بہن یا بیٹی ہوگی، تو جس طرح تم اپنی رشتہ والیوں سے زنا نہیں کر سکتے اسی طرح دوسروں کی رشتہ والیوں سے بھی زنا نہیں کر سکتے۔ یہ انتہائی شرم وعار کی بات ہوگی۔ جس طرح تم کو برا لگتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی اپنی ماں، خالہ، بہن، بیٹی وغیرہ کے بارے میں برا لگے گا۔

آپ ﷺ کی یہ حکیمانہ باتیں اس نوجوان کی سمجھ میں آ گئیں۔ اس نے اسی مجلس میں خالص توبہ کی اور اپنے ارادۂ بد سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا اور اسلام کے جملہ احکام پر کاربند رہا۔

تزکیۂ نفوس کا دوسرا واقعہ

آپ ﷺ ایک غزوہ میں صحابہ کے ہمراہ تشریف لے جارہے تھے، اس غزوہ میں حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ رات کے آخری حصے میں آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مجاہدین کو تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے اور سونے کا حکم دیا تھا کہ صبح سویرے بیدار ہو جائیں اور تازہ دم ہو کر پھر چلیں، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں کے پاس ایک اونٹ اور ایک ہی غلام تھا جو کھانا وغیرہ تیار کرتا تھا اور اونٹ کے لیے چارہ لاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام سے اس وقت فرمایا کہ ہم دونوں سونے جا رہے ہیں۔ تم ہمارے لیے سالن بنالو۔ جب حضرت ابوبکر و عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں حضرات سوگئے، تو تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈی ہوا چلنے کی وجہ سے غلام بھی سوگیا۔ جب صبح کے وقت دونوں حضرات بیدار ہوئے، تو دیکھا کہ غلام سو رہا ہے اور سالن وغیرہ نہیں بنایا۔ غلام کو جگانے سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «إنه لنؤوم» ''یعنی یہ تو بہت سونے والا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: «إنه لغافل» یہ بہت کاہل اور بدھو کر ہے۔ آپس میں اس کے متعلق یہ خیالات ظاہر کر رہے تھے۔ پھر غلام کو جگایا اور پوچھا کہ کیا تم نے سالن بنایا؟ اس نے کہا حضور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے میری بھی آنکھ لگ گئی، سوگیا اور سالن نہ بنا سکا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اب یہی تدبیر بہتر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دسترخوان وسیع ہے، کئی غلام اور کاتبان وحی آپ کے ساتھ ہیں، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی ہیں، وہاں کھانے میں وسعت ہوتی ہے۔ ہم سب کے لیے تھوڑا سا سالن مانگ لاؤ اور ہم دونوں کا پیارے رسول ﷺ سے سلام عرض کرو، غلام جب حاضر ہوا اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا سلام عرض کیا اور تھوڑا سا سالن دونوں کے لیے طلب کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ «إنهما إئتدما» کہ وہ دونوں تو سالن کھا چکے ہیں، انھیں سالن کی کیا ضرورت ہے۔ جب غلام نے آکر حضور ﷺ کا مقولہ نقل کیا تو دونوں دوڑے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: «كيف إئتدمنا يارسول الله!» اے اللہ کے رسول! ہم دونوں نے سالن کیسے کھایا؟ تو آپ نے بتلایا: «بلحم أخيكما حين غبتما» ''یعنی تم دونوں نے اپنے بھائی کے گوشت کا سالن کھایا، جب تم دونوں نے اس کی غیبت کی۔ غیبت کو قرآن مجید نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرف حضور ﷺ کا اشارہ تھا کہ جب تم دونوں نے اپنے سوئے ہوئے بھائی کے متعلق نکتہ چینی کی اور اس کی غیبت کو بیان کیا تو آیت کریمہ کی روشنی میں گویا تم نے اس کا گوشت کھایا ہے۔ پھر سالن کی کیا ضرورت؟ تو دونوں حضرات اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول!

ہمارے لیے مغفرت کی دعا کر دیجیے۔ اس وقت مربی اعظم ، رسول برحق ﷺ نے ان کو کیسی اچھی تعلیم دی، فرمایا کہ تم دونوں نے میرے حق میں غلطی نہیں کی ہے کہ میں تمھارے لیے خدا سے دعاء مغفرت طلب کروں بلکہ تم لوگوں نے اپنے غلام کے حق میں غلطی کی ہے، اس سے جا کر درخواست کرو کہ وہ تمھارے لیے دعاء مغفرت چاہے۔ چنانچہ دونوں حضرات لوٹ آئے اور غلام سے مغفرت کی درخواست کی۔

دونوں بڑے امیر اور دولت مند صحابی تھے۔ ایک غلام کے سامنے درخواست کرنے پر مجبور ہوئے، حالی نے ایک شعر میں اس جذبۂ اطاعت اور اتباع کی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:

سعادت بڑی اس زمانہ کی یہ تھی   کہ جھک جاتی گردن نصیحت پہ سب کی

دیکھا آپ نے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے جلیل الشان صحابہ کی ہدایت واصلاح کے لیے نیز ان کے تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلب کے لیے کتنا اچھا ڈھنگ اور اسلوب اختیار کیا اور عیب جوئی اور نکتہ چینی جیسی مذموم حرکت سے ان کے ضمیر کو پاک وصاف کرنے کے لیے کتنا انوکھا اور نرالا طرز استعمال کیا کہ بڑے سے بڑے کو ادنیٰ غلام کے سامنے جھکا دیا۔

تزکیۂ نفوس کا تیسرا واقعہ

رسول اللہ ﷺ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک نوجوان نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں چار گناہوں میں مبتلا ہوں، چوری کرتا ہوں، زنا کرتا ہوں، شراب پیتا ہوں اور جھوٹ بولتا ہوں۔ ان سب کاموں کو یکبارگی نہیں چھوڑ سکتا، پہلے کس کام کو چھوڑ دوں، حضور ﷺ تزکیۂ نفس کے ماہر تھے، آپؐ نے فرمایا کہ تو جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ اس نے اقرار کیا کہ میں اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب رات میں چوری کا ارادہ کیا، تو خیال آیا کہ صبح حضور ﷺ پوچھیں گے کہ کون سا جرم کیا تو میں اقرار کر چکا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اگر مجھے جھوٹ بولنا ہے تو چوری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شراب کے متعلق سوچا کہ تھوڑی سی پی لوں تو کیا حرج ہے؟ پھر خیال آیا کہ صبح حضور ﷺ پوچھیں گے تو نے شراب پی کہ نہیں؟ تو میں جھوٹ نہ بولنے کا اقرار کر چکا ہوں، تو اگر مجھے جھوٹ نہیں بولنا ہے تو مجھ کو شراب بھی نہیں پینا ہے، پھر خیال آیا کہ فلاں معشوقہ کے یہاں جا کر زنا کروں، لیکن اس خیال پر اس بات نے بندش لگا دی کہ رسول اللہ ﷺ اگر صبح پوچھیں گے کہ تم نے کوئی برا کام تو نہیں کیا؟ تو اگر مجھے جھوٹ نہیں بولنا ہے تو پھر زنا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ تینوں گناہوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنے اس ایک وعدہ جھوٹ نہ بولنے میں ایسا سچا ثابت ہوا کہ تمام غلیظ وشدید قسم کے گناہوں سے

باز رہنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ روایت سنن اربعہ میں موجود ہے۔ اس واقعہ کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کے لیے ایسا حکیمانہ نسخہ تجویز کیا جو اس کے تمام گناہوں کے راستے میں سد باب بن گیا۔

تزکیۂ نفوس کا چوتھا واقعہ

نبی ﷺ کی خاص صفت حکیمانہ تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفوس تھی، جیسا کہ قرآن کریم میں جا بجا اس وصف کا تذکرہ کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(البقرة:۲/۱۲۹)

''یعنی اے ہمارے رب! تو ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب آسمانی اور علم و حکمت ان کو سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تیری ذات غالب حکمت والی ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾(البقرة:۲/۱۵۱)

''یعنی جیسا کہ ہم نے تمہارے پاس رسول تمہاری جنس کا بھیجا ہے۔ جو ہماری آیتیں تم پر پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور تہذیب سکھاتا ہے اور وہ باتیں تم کو بتاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے۔''

تیسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

(آل عمران:۳/۱٦٤)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا ہے، جبکہ انھی میں سے ایک ایسا رسول بھیجا جو اس کی آیتیں ان کو پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو کتاب الٰہی اور تہذیب روحانی سکھاتا ہے ورنہ پہلے تو سخت غلطی میں تھے۔''

اس آیت کریمہ میں رسولؐ کے تزکیہ نفس کرنے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کو احسان سے تعبیر کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس طرح تعلیم وتربیت فرمائی کہ ان لوگوں کو زُہد وقناعت کی زندگی اور تھوڑے بہت سامان پر قناعت کرنے کی تعلیم دی، چاہے وہ بادشاہ زمانہ، خلیفۂ وقت ہوں یا ملوک صف شکن ہوں، سب کو پیارے نبی ﷺ کی سادگی کی تعلیم نے صابر اور قانع بنادیا۔

چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے اور ان کا راشن مشورے سے مقرر ہوا تو ان کے راشن میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ کوئی میٹھی چیز بن سکے، مہینوں کے بعد خلیفۂ اول کی بیوی نے کہا کہ کچھ حلوہ پکانے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ راشن بڑھالو تو میں انتظام کرلوں گی۔ آپ نے فرمایا: کہ ہمارے لیے اس سے زیادہ راشن ملنا مشکل ہے، تم اسی راشن پر قناعت کرو۔ اس جواب کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے مقررہ راشن میں سے چٹکی چٹکی بچانا شروع کیا۔ جب مختصر انتظام ہوگیا تو آپ کی بیوی نے آپ سے کہا کہ ہم نے کچھ آٹا وغیرہ بچالیا ہے۔ آپ بازار سے کچھ شکر منگا لیجیے تو حلوہ بن جائے۔ سیدنا ابوبکرؓ نے بیوی سے پوچھا کہ کتنا سامان بچایا ہے تو انھوں نے بچا ہوا سامان پیش کردیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ سامان بیت المال میں لے جاکر جمع کردیا اور نگران بیت المال سے کہا کہ: «هٰذا يفضل عن قوتنا» ”یہ میرے راشن میں زیادہ جاتا تھا۔“

میری بیوی نے ایک ایک چٹکی کم کرکے اسے بچایا ہے، اب اس کے بغیر بھی ہمارا کام چل جائے گا۔ اتنا ہمارے راشن میں سے کم کردیا جائے (البداية والنهاية لابن كثير)

تزکیۂ نفس وتطہیر باطن کا پانچواں واقعہ

رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس طرح تعلیم وتربیت فرمائی تھی اور ان کے باطن کو پاکیزہ اور دل کا تزکیہ کیا تھا کہ تکبر اور انانیت جیسی مذموم خصلتیں ان کے دلوں سے دور ہوگئیں تھیں۔

علامہ ابوعبید قاسم بن سلام نے لکھا ہے کہ رسول ﷺ نے ہمیں فلاں پہاڑ کے پاس ایک زمین دی تھی، اس دستاویز پر آپ ﷺ کی مہر انگوٹھی ثبت ہے اور چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دستخط بھی ہیں، اب اس پہاڑی سے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا ہے جس سے ہم اپنے کھیت اور زمین کو سیراب کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس چشمے سے فائدہ اٹھانے کا حق ہمیں دیا جائے کیونکہ وہ چشمہ ہماری زمین کے بالکل قریب ہے، پہلے ہمارا کھیت پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر اراکین شوریٰ نے اس کاغذ کو دیکھ کر باہم مشورہ کیا، تو یہ رائے طے پائی کہ اس چشمے کو اس آدمی کے لیے مخصوص کردیا جائے اور صرف اسی

کو اس چشمے سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ چنانچہ سب نے منظوری دے دی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرما دی کہ اس مجلس شوریٰ کے ایک اہم رکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دستخط باقی ہے، ان سے بھی دستخط کرالو۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ وہ کہاں ملیں گے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا تو گوشت کی منڈی میں ہوں گے یا مچھلیوں اور پھلوں کے بازار میں ہوں گے۔ وہاں سے ردی مالوں، پھلوں اور کمزور مریل بکریوں اور گلی سڑی مچھلیوں کو بازار سے باہر کر رہے ہوں گے، یہ لوگ اس منڈی میں گئے، ملاقات ہوئی، اپنا مقدمہ ان سے بھی بیان کیا اور کاغذ دکھلایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کاغذ پڑھ کر پھینک دیا۔ دستخط نہیں کیا اور غصے ہو کر فرمایا: «أهنأ لك كله دون الناس» ''یعنی دوسروں کو محروم کر کے اس چشمے کا سارا پانی صرف تمھیں کو دے دیا جائے۔ یہ غیر مناسب ہے، یہ فیصلہ غلط ہے، میں اس پر دستخط نہیں کر سکتا، اس کاغذ کو لے چلو۔ چنانچہ دونوں امیر المومنین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور بگڑ کر کہنے لگے: «أأنت أمير المؤمنين أم عمر؟» ''آپ امیر المومنین ہیں یا عمر؟'' اس سوال پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف نہ طیش آیا نہ آپ کی انانیت بھڑکی بلکہ خوش ہوئے اور سنجیدگی سے جواب دیا: «وسيكون عمر إن شاء الله» کہ ان شاء اللہ عمر بھی خلیفہ ہوں گے، یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں آگئے اور فرمایا کہ وہ پہاڑی چشمہ ہے جو ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔ یہ پانی عام رعایا کے لیے فائدہ اٹھانے کی چیز ہے، صرف تنہا ایک آدمی کے لیے اسے منحصر کرنا ٹھیک نہیں ہے، ہاں ان دونوں کی زمین سے وہ چشمہ متصل ہے اس لیے ان کو اولاً استعمال کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے، باقی پانی سے عام پبلک مستفیض ہوتی رہے، پھر اس فیصلے کو بحال کر دیا گیا۔ (کتاب الاموال لابن عبید قاسم بن سلام)

سبحان اللہ وہ پاک نفوس جو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے، کس قدر باہمی مشورہ سے اپنے اختلاف رائے کو دور کر لیتے تھے اور جذبات کی رَو میں نہیں آتے تھے، حالی مرحوم نے ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی منقبت میں کیا خوب لکھا ہے:

جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا خلاف آشتی سے خوش آئند تر تھا
لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

اس واقعہ کی روشنی میں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل کی کتنی بہترین تربیت وتطہیر فرمائی تھی کہ ان کا سینہ کدورت، انانیت اور نفسانیت سے پاک ہوگیا تھا اور امارت وخلافت کے ایام میں بھی انھوں نے اپنے نفس کو نظم وضبط کا پابند رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین تربیت اور عمدہ تزکیہ کے سبب ہمیشہ ان کے قدم حق اور انصاف کی راہ پر ثابت رہے اور فرمان

خداوندی ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ﴾ کے سچے مصداق تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے تزکیۂ نفس کا چھٹا شاندار واقعہ

آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قلب کو بھی سادگی پسند، قناعت گزار اور سادہ مزاج بنا دیا تھا، آپ ہر چند خلیفۂ ثانی تھے، مگر عیش وعشرت اور تنعم کا ان کے پاس گزر نہیں تھا، خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے بھی اسلام کی ترقی وسربلندی کے سوا ان کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔

بیت المقدس کے سفر کا واقعہ ہے کہ جب بیت المقدس کے پادری نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلانے کی خواہش ظاہر کی، تو آپ کو صحابہ کرام کے مشورے سے بیت المقدس کا سفر کرنا پڑا اور ایک ہی اونٹ پر ایک طرف آپ سوار ہوئے، اور دوسرے طرف ستو، کھجور، آٹا اور زیتون وغیرہ سامان سفر رکھا، سفر میں آپ کے ساتھ آپ کا غلام بھی تھا، کچھ متعین منزل تک آپ سوار ہوتے، غلام نکیل پکڑ کر چلتا، پھر کچھ دور آپ نکیل پکڑ کر چلتے اور غلام سوار ہو کر چلتا، یہ ایک بڑی منزل کے لیے شاہی سفر تھا، لیکن آپ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ دوسری اونٹنی غلام کی سواری کے لیے نہیں لی گئی، جب بیت المقدس کے قریب ہوئے تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کچھ سپاہیوں کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور افسروں سے مشورہ کر کے آپ کو ایک نیا قیمتی جوڑا پہننے کے لیے اور ایک بہترین گھوڑا سواری کے لیے پیش کیا، لوگوں کے مشورے کے مطابق آپ نے کپڑا پہن لیا اور ایک دو منٹ کے لیے گھوڑے کی سواری کر لی، پھر اس کے بعد فرمایا: یہ گھوڑا بہت شوخیاں کر رہا ہے اور اس کپڑے سے مجھے تکبر کی بو آتی ہے، لہٰذا میں اپنے ہی کپڑے پہن کر چلوں گا، چنانچہ آپ، سواری سے اتر آئے اور اپنا وہ پرانا کپڑا پہنا جس میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ۱۴/۱۴ پیوند لگے تھے اور ہر پیوند کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف تھا، کسی ٹکڑے کا رنگ سیاہ، کسی کا سرخ اور کسی کا سبز تھا، اس حالت میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے، جب پوپ کے قریب پہنچے تو سواری کی باری اتفاق غلام کی آئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے غلام نے بہت ضد اور اصرار کیا کہ اب آپ بیت المقدس میں داخل ہو رہے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر لگی ہیں، آپ سوار ہو جائیں، نکیل میں پکڑ کر چلوں گا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ راضی نہیں ہوئے، فرمایا: باری تمھاری ہے تم سوار رہو، میں نکیل پکڑوں گا، اس عالم میں جب پادری کے پاس پہنچے تو وہ پہچان نہ سکا، اسلامی فوجوں نے بڑے زور سے غلغلہ بلند کیا اور پکارا کر «قد جاء أمیر المؤمنین» امیر المومنین آ پہنچے، پادری نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ امیر المومنین کون ہے؟ جو سوار ہے وہ، یا جو نکیل پکڑے ہے، لوگوں نے بتایا کہ

جو نکیل پکڑے ہیں وہی امیر المومنین ہیں اور جو سوار ہے وہ غلام ہے، یہ سنتے ہی اس پادری کے ہوش جاتے رہے اور بیہوش ہوگیا، لوگوں نے اس کو پانی کے چھینٹے وغیرہ ڈال کر ہوش میں کیا، تو اس نے کہا کہ ہماری کتابوں میں جو حلیہ لکھا ہے اس کے عین مطابق یہ واقعہ ہے، لہٰذا ہم اس شخص کو بیت المقدس کی کنجی دے رہے ہیں، یہی فاتح بیت المقدس ہے۔(ازالة الخفاء لشاه ولی الله)

دیکھیے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں کس قدر قناعت وسادگی پسندی ہے کہ انھوں نے اپنے اس اہم سفر میں نہ جاہ وحشم کا خیال کیا نہ فوج وسپاہ کا کوئی دستہ لیا نہ غلاموں اور ملازموں کی کوئی قطار رکھی نہ قیمتی کپڑوں کا استعمال کیا، نہ کوئی عمدہ سواری تلاش کی، کوئی کرّ وفر نہیں، کوئی شاہی ٹھاٹ باٹ نہیں، دل ودماغ کو زہد وقناعت سے آسودہ رکھا اور کسی طرح کی حرص وطمع کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی، یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کا کمال تھا۔

حسن تربیت کا ساتواں واقعہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اور بھی نادر واقعہ سنانے کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی اپنے غلام اسلم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ میں رات کو گشت کیا کرتے تھے تاکہ اہل مدینہ کے حالات اور رعایا کے خیالات سے براہ راست واقف ہوسکیں، آپ کو ایک مکان سے بچوں کے رونے کی آواز سنائی دی، ٹھہر گئے اور بچوں کی ماں سے ان کے رونے کا سبب دریافت کیا کہ وہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ گھر کی بوڑھی ماں نے جواب دیا تجھ کو اس سے کیا مطلب، تم اپنی راہ لو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر آگے بڑھ گئے، پھر جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ بچے ابھی تک رو رہے ہیں۔ آپ سے رہا نہ گیا، سوال کیا کہ یہ بچے ابھی تک رو رہے ہیں اور روتے چلے جارہے ہیں آخر سبب کیا ہے؟ تو عورت نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ قبل از وقت میں ان بچوں کا دودھ چھڑا رہی ہوں کیونکہ دودھ چھوڑنے کے بعد ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بچوں کو وظیفہ دیتے ہیں، ایام رضاعت میں نہیں دیتے، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اسلم رضی اللہ عنہ واپس آئے اور سیدھے بیت المال میں گئے، وہاں سے کچھ آٹا، کھجور اور زیتون کا تیل وغیرہ لے کر سب کو ایک گٹھڑی میں باندھا اور اپنے غلام اسلم رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کو میری گردن پر رکھ دو، غلام نے کہا نہیں حضور میں حاضر ہوں، آپ کیوں اپنی گردن پر رکھ کر لے چلیں گے، میری گردن پر رکھ دیجیے'' میں خود لے کر چلوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غلطی میں نے کی ہے اور میری وجہ سے بچے رو رہے ہیں اور قبل از وقت ان کا دودھ چھڑایا جارہا ہے، اس لیے گناہوں کا یہ بوجھ میں لے جاؤں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اس مکان تک پہنچے تو سامان اندر رکھا اور آگ جلانے کی کوشش کی

تا کہ کوئی چیز پکا کر بچوں کو کھلا دیں، آپ نے جب آگ جلانا شروع کیا تو اس کا دھواں آپ کی داڑھی کے بیچ سے نکل رہا تھا، ان کا غلام اسلم رضی اللہ عنہ جو اس واقعہ کا شاہد ہے، خود اس کی روایت ہے «رأیت الدخان یخرج من خلال لحیته» ''یعنی میں نے خود ان کی داڑھی سے دھوئیں کو نکلتے ہوئے دیکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے صحابۂ کرام اپنے چہروں پر مشروع و مسنون داڑھیاں رکھتے تھے، آج کل کی طرح فرنچ کٹ داڑھی کا وجود نہیں تھا، آپ نے آٹا، زیتون اور کھجور گھونٹ گھانٹ کر حلوہ بنا کر ان بچوں کو کھلایا، جب بچے کھا پی کر آسودہ ہو گئے تو کھیلنے اور ہنسنے لگے، پھر آپ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اس عورت نے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا کہ امیر المومنین تم کو ہونا چاہیے تھا، ہر ایک کی خبر گیری اور دادرسی کر سکتے ہو، نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کو۔

یہ واقعہ سیرۃ الخلفاء میں علامہ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل بڑا پاکیزہ اور صاف تھا اور وہ اپنی رعایا کے بڑے ہی خیر خواہ تھے، آپ بہت ہی متواضع تھے، آپ کے دل میں کبر ونخوت اور غرور کا ذرا بھی شائبہ نہیں تھا کہ بیت المال سے غلے کی گٹھڑی خود گردن پر لاد کر لے گئے اور اپنے غلام اسلم کے کندھے پر گٹھڑی لدوانا منظور نہ کیا۔

یہ ان خاکسارانِ جہاں کا شیوہ و وطیرہ تھا، جو حرمین شریفین، مصر و شام اور ارض حجاز کے مالک ووالی تھے، آج کے امراء و والیانِ ریاست کے طنطنے و شوکت جو عام ہیں ان کا اس زمانے کے مسند آرائے خلافت سے کوئی موازنہ و مقابلہ نہیں:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اور ایک دوسرا شعر بھی عرض ہے:

چہ نسبت است برندی صلاح وتقویٰ را سماع و وعظ کجا، نغمۂ رباب کجا؟

حکیمانہ تربیت کا آٹھواں واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں شب گشتی کر رہے تھے کہ رعایا کے حالات و معاملات کا علم حاصل کر سکیں، یکایک آپ نے ایک شخص کو دیکھا جو مستانہ وار نشہ میں مخمور لڑکھڑاتا گرتا پڑتا چلا آ رہا ہے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ شراب پی کر آ رہا ہے، آپ درہ لے کر اس کی طرف بڑھے تو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینی شروع کر دیں، لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑھتے قدم

رک گئے اور آپ نے اس کو درہ سے مارنے کی سزا دینے کا خیال ترک کر دیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے شرابی کو درہ کیوں نہیں مارا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں یہ درہ رضائے الٰہی کے تحت اسلام کے حق میں مارنا چاہتا تھا، لیکن جب اس نے گالیاں دینی شروع کیں تو میرے نفس کا غصہ بھی اس میں شریک ہوگیا، اب اگر ایسی صورت میں میں اس کو سزا دیتا تو اپنے نفس کے لیے دیتا جو رضائے الٰہی کے لیے نہ ہوتی، اس بنا پر میں نے اس کی سزا کا خیال ترک کر دیا۔ (منتخب کنز العمال)

اس واقعے کی روشنی میں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام کی کیسی حکیمانہ تعلیم و تربیت فرمائی تھی کہ کبھی ان کے نفس کو دھوکا نہیں ہوا اور کبھی غلط راستے پر ان کا قدم نہیں پڑا، برابر نفس پر کنٹرول رہا، تزکیۂ نفس کا یہ کتنا شاندار واقعہ ہے، وہ صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست فیض یافتہ و تربیت یافتہ تھے وہ کبھی نفس کے غصہ کے دباؤ میں نہیں آئے۔ «والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس»۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ ضمیری کا ایک واقعہ

حافظ ابن کثیر نے آپ کی پاکیزہ ضمیری کا واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ صحابہ کرام میں سب سے بڑے جاہ و عزت والے تھے، آپ کے پاس بڑی جائیدادیں، کوٹھیاں، باغات اور خدام و ملازمین تھے۔

ایک دفعہ کسی غلام کے متعلق کچھ لوگوں نے شکایت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غلام سے ماجرا پوچھا اور اس کی باتوں پر اعتماد نہ کر کے اس کو سزا دی یعنی اس کی گوشمالی کر دی اور کہا کہ تو نے ایسا کام کیوں کیا ہے؟ وہ بار بار کہتا رہا کہ حضور میں اس معاملے میں بے قصور ہوں، آپ پھر سے معاملے کی تحقیق کر لیں تو آپ مجھ کو بے قصور پائیں گے، جب غلام چلا گیا تو آپ نے اس کے معاملات پر از سر نو غور کیا تو واقعی غلام کو بے قصور پایا، آپ نے اپنے غلام کو آواز دی اور پکار کر کہا کہ تم جلدی آ جاؤ واقعی تم بے قصور ہو، جب غلام آ گیا تو فرمایا کہ میں نے معاملے پر از سر نو غور کیا تو تم کو بے قصور پایا اور جو سزا دی ہے وہ بھی غلط ہے بلکہ میں قصوروار ہوں، تم مجھ سے بدلہ لے لو، یہ میرا کان حاضر ہے، تم بھی اسے اچھی طرح مروڑو تاکہ بدلہ پورا ہو جائے اور آخرت میں میری گرفت نہ ہو، غلام نے کہا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں، بھلا میں کس طرح ایسی جرأت کر سکتا ہوں، تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم یہاں بدلہ نہیں لو گے تو مجھ کو آخرت میں بدلہ دینا پڑے گا، یہ کہہ کر آپ نے غلام کو پکڑا اور اپنے کان کے قریب اس کا ہاتھ لے جا کر فرمایا کہ اسے اینٹھ دو اور اچھی طرح مروڑ دو، جب غلام نے تعمیل حکم میں مروڑنا شروع کر دیا تو فرمایا «حبذا قصاصا فی الدنیا لا قصاص فی الآخرة»

''اے عثمانؓ تجھے مبارک ہو! تم نے دنیا ہی میں بدلہ دے دیا، آخرت میں بدلہ نہیں دینا پڑے گا، نیز آپ نے غلام سے مزید فرمایا«أشدد علی کما شددتك» ''یعنی جس سختی سے میں نے تمہارے کان کو اینٹھا ہے اسی سختی سے تم بھی میرے کان کو اینٹھو، میں قیامت کے دن سے ڈرتا ہوں۔''

اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی حکیمانہ تعلیم وتربیت کا اور آپ کے شاندار تزکیۂ نفس وتطہیر قلب کا پتہ چلتا ہے، اس کا کتنا اچھا اثر اور پائیدار نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے دولت مند صحابہ کرام اپنی پاک ضمیری سے معمولی غلطی سے کانپ جایا کرتے تھے اور ان قدسی صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں آخرت کا احساس اور خدا کا خوف ہر وقت مستحضر رہتا تھا، جس سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تزکیۂ نفس وتطہیر قلب کا ایک شاندار واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے قریب تر رہ کر آپؐ کی حکیمانہ تعلیم وتربیت سے اپنے قلب اور ضمیر کو خوب روشن کیا، حالانکہ اہل عرب اپنے ابتدائی زمانے میں وحشت وجہالت اور بربریت کی زندگی گزار رہے تھے، ہر طرح کی بدی میں مبتلا تھے، حالی مرحوم نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے جھگڑ بیٹھتے تھے

رسول کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت سے جن پاک نفوس کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور جن کے دل آپ ﷺ کے روحانی تزکیہ سے مزکی ومجلی ہوئے، ان میں اعلیٰ صفات کے مالک ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

آپ کے دل میں رضائے الٰہی کی تڑپ تھی اور اس کے لیے پورا اخلاص وجذبہ تھا، چنانچہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جنگ میں ایک دشمن کو زیر کیا، اس کو زمین پر گرا کر اس کا سر کاٹنا چاہتے تھے کہ اس کافر نے بدلے کی کوئی تدبیر نہ پا کر اپنا غصہ اور نفرت ظاہر کرنے کے لیے اپنے تمام بلغم اور تھوک کو منہ میں جمع کیا اور آپ کے منہ پر تھوک دیا، ایسے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چاہیے تھا کہ اس کی سزا میں سختی کرتے اور اس کو بری طرح قتل کرتے لیکن آپ نے ایسا نہ کیا، بلکہ اس کے سینے پر سے اتر گئے اور اس مشرک کو آزاد کر دیا، مشرک بہت متعجب ہوا اور پوچھا کہ میں آپ کے قبضے میں تھا، آپ مجھ کو قتل کرنا چاہتے تھے، آپ کے اوپر تھوک کر غصہ بھی دلایا تھا تو ایسا موقع پا کر مجھ کو آپ نے کیوں چھوڑ دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ پہلے میں تجھ کو اللہ کو رضا کے لیے قتل کرنا

چاہتا تھا، لیکن جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اس میں میرے نفس کا غصہ بھی شریک ہوگیا، ایسی صورت میں اگر میں تجھ کو قتل کرتا تو یہ اللہ کی رضا کے لیے نہ ہوتا، بلکہ اپنے نفس کے لیے ہوتا۔

اس مشرک نے آپ کے پاکیزہ جذبات اور نیک نیتی کی قدر کی اور بڑا اچھا اثر لیا اور کہا کہ جس دین میں تمام کام رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے اور جس میں اپنے نفس کی شرکت ذرا بھی نہیں ہوتی ہے وہ بہت ہی پاکیزہ مذہب ہے، دلوں پر اس کی حکمرانی ہے، نفسانیت وانانیت سے پاک صاف ایسا مذہب قابل تسلیم ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ مشرک نے اس حقیقت کو سمجھ کر اسلام قبول کرلیا۔ (کتب تواریخ وسیرۃ الصحابہ)

اب دیکھیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوگئی کہ ان کی پاکیزہ باطنی اور نیک نیتی نے کبھی یہ گوارہ نہ کیا کہ اس مشرک کو جس نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تھا انتقاماً قتل کر ڈالتے، آپ نے اس کو آزاد کر دیا اور خدا کے لیے معاف کر دیا، آپ کے اس اعلیٰ اخلاق کا اس کے دل پر بہت اچھا اثر ہوا اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا، یہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس ہی کا کرشمہ تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کا ایک بہترین واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرام کو توحید ورسالت کی دعوت دی تو کچھ پاک باطن اور پاکیزہ نفوس ایسے تھے جنھوں نے آپ کی دعوت توحید ورسالت کو قبول کیا اور آپ کے ساتھ جان ومال سے اپنی فدائیت کا ثبوت دیا، پھر آپ کی تربیت وتزکیہ کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ حوادث زمانہ وگردش ایام سے کبھی مضمحل اور کمزور نہ پڑے، اگرچہ کافروں اور مشرکین مکہ نے ایسے مسلمان ضعفاء پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، انھیں ہر طرح سے ابتلاء وآزمائش میں ڈالا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا جو پختہ رنگ ان پر چڑھ چکا تھا وہ ہمیشہ قائم رہا اور کبھی پھیکا نہ پڑا، ظلم وزیادتی کے ماحول میں بھی ان کی استقامت میں کوئی کمزوری وخستگی نہیں آئی بلکہ ہر وہ طرح سے ثابت قدم رہے۔

چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ان کے ایمان لانے اور حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سبب ان کے آقا امیہ بن خلف نے ان کو طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا، ان کو اوباشوں کے سپرد کرتا جو ان کو گھسیٹ کر ریگزاروں میں لے جاتے اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگی پیٹھ کے بل تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے اور اوپر سے ان کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ جنبش نہ کرسکیں اور ان کا آقا امیہ بن خلف آکر کہتا: «لا تزال هكذا حتى تكفر بمحمد وتؤمن باللات والعزى» "یعنی تم اس طرح کے عذاب میں مبتلا کیئے جاؤ گے جب تک کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا انکار نہ کرو گے اور ہمارے بتوں لات وعزیٰ پر ایمان نہیں لاؤ گے، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت اور آپ کی سچی

عقیدت ومحبت کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اس سخت مصیبت کے عالم میں بھی اپنی زبان سے یہ صدا بلند کرتے تھے «الله أحد، الله أحد» ”یعنی اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت کا دم بھرتے تھے، اور بزبان شاعر یہ اعلان کرتے رہے:

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے ان کی اس استقامت کا حال اپنے دو شعروں میں اس طرح پیش کیا ہے:

وہ آستاں نہ چھوٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

اس روشن وتابناک واقعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کی خالص دعوت توحید میں کتنا گہرا رنگ اور آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت کا کتنا زور دار اثر تھا کہ صحابہ کرام ہر مشکل ہر پریشانی کو آسانی سے جھیل لیتے تھے، اس میں لذت وسرور محسوس کرتے تھے اور کسی حالت میں بھی پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتے تھے، مشرکین مکہ کی یہ سزائیں ایک طرف رہتی تھیں اور رسول پاک ﷺ کی سچی تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کا گہرا اثر دوسری طرف رہتا تھا، آپ ﷺ کی دعوت توحید وتزکیۂ نفس کا پلہ تمام جور وستم اور حرص وہوس پر غالب رہا، متنبّی نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

عذل العواذل حول قلبی التائه
وهو الاحبة منه فی سوادئه

”اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پاک نفوس کے نقشِ قدم پر چلائے اور ہمارے قلب کو بھی اسلام کی سچی تعلیم اور رسول اکرم ﷺ کی محبت وعقیدت سے ہمیشہ سرشار رکھے۔“

پیارے نبی ﷺ کی تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس اور کتاب وحکمت کی اعلیٰ صفات سے ہمارے دلوں کو بھی مزین فرمائے، جن سے ہم آخرت کا احساس اور خوف خدا کے تحت اپنے ہر کام کو انجام دیں، برائی، کبر ونخوت اور ریا ونمود، غیبت وچغلی جیسی مذموم خصائل سے دور رہیں:

نیکیوں کی مجھے توفیق دے ہر دم یارب
دل کے زخموں کے لیے بخش دے مرہم یا رب

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین!

❁......❁......❁

سیرت رسول اللہ ﷺ میں......تدبیر و تنظیم کے عناصر

جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

رسول اکرم ﷺ صاحب خلق عظیم تھے، اسی لیے اس زمانے میں تشریف لائے جب تاریخ کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، دوسرے انبیاء کرام کی آمد ان زمانوں میں ہوئی جو قبل تاریخ کے کہرے میں لپٹے ہوئے تھے، جو صحیفہ ہمارے آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا وہ آخری دستور ہدایت تھا اور اس کی حفاظت کی ضمانت خود صاحب صحیفہ نے لے رکھی تھی، یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ پیغامبرؐ کی ذات والا صفات اور اقوال و افعال اور سیرت و شخصیت اور کردار بھی ابد تک کے لیے محفوظ کر دیے جائیں تاکہ قرآن کریم کی تفسیر، تعبیر اور تشریح سنت مطہرہ کے مطابق ہو سکے۔

پیغمبرؐ کی ذات ہدایت خداوندی کی ترجمان بن گئی، انسانی فطرت ہے کہ نظریات جو کہ غیر محسوس ہوتے ہیں آسانی سے گرفت میں نہیں آتے اور گرفت میں آ بھی جائیں تو دل نشیں نہیں ہونے پاتے، شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ فکر کی سطح پر جو بات کہی جائے وہ تحریک کی شکل اختیار کر لے یا انسانوں کو کمر کسنے اور عمل پیکر ہونے پر آمادہ کر دے، وہ باتیں جو ماورائے حواس ہوں عمومی اثر اندازی سے اکثر محروم رہ جاتی ہیں، البتہ وہ باتیں جو حواس کی پکڑ میں آ جاتی ہیں خواہ براہ راست یا کسی واسطہ سے (یعنی تصور کے ذریعے) اگر وہ اخلاص کے تحت کہی گئی ہوں، دل میں یا کم از کم ذہن میں گھر کر لیتی ہیں اور نظام فکر کا جزء اور افتاد طبع کا عنصر بن جانے کا امکان رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیؐ پر یہ بڑا کرم کیا کہ اپنے پیغام ہدایت کے ابلاغ، وضاحت اور ترجمانی

کے لیے رسولؐ کی سیرت اور اقوال کو اس قدر جامع اور واضح بنا دیا اور پیروی کے لیے اتنا حوصلہ افزا کہ یہ شکایت کسی کو نہیں ہو سکتی کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر یا کسی مسئلے میں بے روشنی کے رہ گیا، ہمارے آقاؐ کی حیات کسی اعتبار سے طویل نہ تھی، بعثت کے بعد کی زندگی تو بہت ہی مختصر تھی، بہ مشکل ۲۳ سال، ان میں سے بھی پہلے تیرہ سال مظالم اور شدائد سے عہدہ برآ ہونے میں اور رکاوٹیں دور کرنے میں لگ گئے، باقی بچے دس سال، اسلام کی محیر العقول تسخیرات اور توسیعات بیشتر اسی قلیل لیکن بار آور عرصے میں ہوئیں، تاریخ عالم کوئی دوسری مثال اتنی مختصر مدت میں اتنے بڑے انقلاب کو بروئے کار لانے کی پیش نہیں کر سکتی۔

اسلام کے طلوع پر جو شخص بھی غور کرے گا پہلا سوال اس کے ذہن میں یہی پیدا ہوگا، اور شاید زبان پر بھی آجائے گا کہ آخر اتنی زبردست تبدیلی جس نے سارے عالم انسانیت کا احاطہ کر لیا چند سالوں میں کیوں کر رونما ہوگئی، یہ کہہ کر یکسو ہو جانا کہ یہ امر رب تھا شاید مناسب نہ ہو، یوں تو جو کچھ ہوتا ہے پروردگار کے حکم سے ہی ہوتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی شکل پذیر ہونے کے لیے اسباب و وسائل درکار ہوتے ہیں، یہ بات بھی مقر اور منکر سب کو تسلیم ہے کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو خالق کائنات نے اس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے چنا، ایک قدم اور آگے بڑھیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ آنحضرتؐ کی شخصیت کی کشش اور آپؐ کے مکارم اخلاق نے بہت سے منکرین اور مشرکین کے دلوں کو پگھلا دیا، اس پیغام کی صداقت اور پیغامبر کی امانت کا اثر دلوں پر ہونا تھا سو ہو کر رہا، آنحضرت ﷺ کے اخلاق حسنہ کا تذکرہ ہماری بساط سے باہر ہے۔

یہ سب مانتے ہیں کہ آپؐ صادق، امین اور خوش خلق تھے (باری تعالیٰ نے اس وصف کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آپؐ تلخ گو ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس نہ پھٹکتے) آپؐ غریبوں، محتاجوں، کمزوروں اور درماندوں کی مدد اور ان کے دکھ درد کا مداوا و صلہ رحمی، بیماروں کی عیادت اور مصیبت زدوں کی غمگساری فرماتے، انصاف آپ کا شیوہ اور رحم آپ کی خو تھی، اس کے باوجود آپ کو مخالفتوں، سازشوں، عداوتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، جب کبھی نظام عدل کا اعلان ہوتا ہے تو وہ لوگ جن کے ناجائز تصرفات اور دیرینہ مفاد کو اس اعلان سے ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، وہ اعلان کرنے والے کے درپے آزار ہوتے ہیں، آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو انھیں روشنی سے تکلیف پہنچتی ہے۔

آنحضرتؐ کے مخالفوں اور بدخواہوں میں سب سے زیادہ آزار رساں مشرکین مکہ تھے، انھوں نے آپؐ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ایذا پہنچانے کے سارے ذرائع صرف کر ڈالے، آپؐ مکہ

سے باہر تشریف لے گئے، شعب ابی طالب میں تین سال محصور رہے، بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اہل طائف اہل مکہ سے زیادہ آمادۂ عناد نظر آئے، ۱۳ سال سنگدلوں اور گمراہوں کے آگے سینہ سپر رہے اور پھر ہدایت ربانی کے تحت آپؐ نے مکہ سے جانب شمال یثرب کے لیے ہجرت فرمائی، جس کا نام شرف اجلال ہی کی بدولت مدینۃ النبیؐ اور مختصراً ''مدینہ'' ہو گیا۔

مدینہ میں مشرکین مکہ کے عناد کے علاوہ یہود کے مکر و عداوت کا بار بار سامنا کرنا پڑا، اس سے بھی زیادہ دشوار منافقین سے عہدہ برآ ہونا تھا، جگر گداز حوادث سے نبرد آزمائی کرنی پڑی، یہی نہیں قبائلیوں اور اعرابیوں کو جنھیں اپنی سرکشی اور جنگ آزمائی پر ناز تھا، حلقۂ اطاعت میں لانا تھا، ان سے سر تسلیم خم کروانا تھا، ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے بدرجۂ مجبوری اطاعت قبول کی تھی اور جو پہلے موقع کے حریصانہ منتظر تھے، دشمنوں کی فہرست، عداوتوں اور معرکوں کی داستان یہاں ختم نہیں ہوتی، جزیرۂ عرب کے یمین و یسار پر ایران و روما کی جلیل القدر سلطنتیں تھیں، جنھیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ اونٹنی کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے ریگ پروردہ بدو پھلیں پھولیں اور ترقی کریں اور سلاطین اور شہنشاہوں کے ساتھ برابر کا دم بھریں۔ اس کے علاوہ مذہب زرتشت اور دین مسیح کو بے میل، تازہ دم، سادہ اور پرکشش اسلام سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان بوڑھے تھکے ہوئے، آمیزش گرفتہ اور اب پر پیچ مذاہب کو بے دخل نہ کر دے۔

ایسے حالات کو زیر کرنا آسان نہیں تھا، بلاؤں اور عنادوں کے سیلاب کی ہر موج قدم ڈگمگا دینے، پکڑ ڈھیلی کر دینے، ضبط کی کمر توڑنے اور بہا لے جانے کے لیے کافی تھی۔

ختم رسلؐ کے سامنے دو راہیں تھیں:

① دشمنوں سے جو مختلف سمتوں سے اٹھ رہے تھے، جا کر ٹکرا جانا اور انجام کو اس انداز میں چھوڑ دینا جس کو ہم لوگ توکل کہتے ہیں۔

② گرد و پیش، ارض و سما، دوست دشمن اور ترتیب حوادث پر ہر آن نظر رکھنا، ان کا جائزہ لینا، ان کو پرکھنا، ان کے ارادوں، ان کی نقل و حرکت کی آہٹ لینا اور باخبری، تیاری اور تنظیم کے ذریعے ان کے ارادوں کو باطل کرنا اور ان کی شکست کا سرو سامان کرنا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہی میرے معروضہ کا ماحصل ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نبی اکرم ﷺ کو کیوں پیش آئی؟ ان کا ہر قدم گوناگوں تیاریوں کے بعد کیوں اٹھا؟ انھوں نے ہجوم اعداء میں مقابلے کے لیے بتدریج ایک ایک کو منتخب کیوں کیا؟ بظاہر تو آپؐ کو ہجرت کی تکمیل کے بعد ایک طرف قریش اور دوسری طرف سرکش قبائل کی آتش خصومت کو بجھا دینے کے لیے ان پر حملہ

کر دینا چاہیے تھا، مگر آنحضرتؐ نے ایسا نہیں کیا، آپؐ نے مخالفوں اور دشمنوں کو نہ تو باہم اسلام کے خلاف متحد ہو جانے کا موقع دیا اور نہ سب سے بیک وقت تعارض کیا اور نہ ان کے حملوں کا انتظار کیا کہ جب وہ حملہ کریں گے تو دیکھا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو خصوصاً قابل غور اور مستوجب اتباع ہے کہ رکاوٹوں، عداوتوں اور سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپؐ نے نام نہاد توکل کی راہ اختیار نہیں کی، آپؐ تن بہ تقدیر ہو کر ایک لمحے کے لیے نہیں بیٹھے، آپؐ نے تدبیر اور تنظیم کا اہتمام کیا اور اپنے طرز عمل سے امت پر یہ واضح فرما دیا کہ زندگی حرکت اور تنظیم کا نام ہے، زندہ رہنے کے لیے باخبر ہونا ضروری ہے، کامیابی تقاضا کرتی ہے پیش قدمی کا، بات تو جب ہے کہ فتنہ سر نہ اٹھانے پائے اور اسے فرو کر دیا جائے، جو لوگ اور جو قومیں فتنے اور مصیبت سے بے خبر رہتی ہیں یا آہٹ پا کر ان کا انتظار کرتی ہیں وہ اعداء کے نرغے میں آ جاتی ہیں، مصیبتوں اور عداوتوں کے شکنجے میں پھنس جاتی ہیں اور پھر ان میں قدم چٹان میں گڑو کر مقابلے کا یارا باقی نہیں رہتا، جسے باڑھ بے خبری میں بہا لے جائے گی وہ دوسروں کو کیا بچائے گا۔

رسول اکرم ﷺ کی ساری سیرت عبارت ہے باخبری، تنظیم اور اقدامیت و حرکت سے۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ آپ کی امت ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جائے اور اغیار کی شکایت کرنے کو ہی ان سے مقابلہ کرنے پر تعبیر کرے، وہ اپنی حالت زار پر ترس کھاتی رہے اور اپنے قوائے عمل کو سُن اور بے حرکت ہو جانے دے اور اپنی بدتوفیقی، بے عملی اور کم خبری کے لیے توکل کے عذر کو ڈھال بنا بیٹھے اور کبھی کبھی تو یہ بھی کہنے لگے کہ ہمیں باری تعالیٰ پر بھروسہ ہے، ہم تقدیر کے قائل ہیں، ہمیں کیا پڑی ہے کہ تدبیریں کرتے پھریں، منصوبے بنائیں اور اللہ کے بجائے تنظیم سے لو لگائیں، غالب نے اس عمل ناآشنا امت کی ترجمانی کی ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اور بعض لوگ تو جدوجہد کو ضعف ایمان سے تعبیر کرنے لگتے ہیں، یہ سب افتادِ طبع کی کج ادائیاں اور فکر کی گمراہیاں ہیں۔

مشرکین مکہ نے جب مسلمانوں پر اپنے ظلم کو انتہا تک پہنچا دیا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی کہ ظالموں پر جوابی حملہ کریں کہ اس کے نتیجے میں مظالم اور بڑھ جائیں اور ان کے ساتھ مظلوموں کی تعداد بھی، آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کے

لیے حبشہ ہجرت کر جائیں، ان کی ہجرت کو جو پانچ نبویؐ میں رات کے سایہ تلے کی گئی تھی، مخفی رکھا گیا، پہلی ہجرت کے بعد دوسری ہجرت کو بھی منصوبہ بند طریقے سے عمل میں لایا گیا۔

یہ تو آپؐ کو معلوم ہی ہے کہ ان تاریکیوں اور مایوسیوں کے ہجوم میں روشنی کی پہلی کرن مدینہ کی طرف سے آئی ۶۲۱ء میں موسم حج کے دوران مدینہ کے بارہ آدمی آپؐ کی خدمت میں آئے، ان کے اخلاص میں بظاہر کسی شبہ کی گنجائش نہیں تھی، تاہم جذبۂ تنظیم کا تقاضا تھا کہ ان سے بیعت کی جائے، یہ واقعہ پہلی بیعت عقبہ کے نام سے معروف ہے، دوسری بیعت عقبہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ تجویز رکھی کہ بارہ سربراہ منتخب کیے جائیں جو اپنی اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں، تنظیم پوری آب وتاب کے ساتھ آپؐ کی اس ہدایت میں جلوہ گر تھی۔

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کا سابقہ مختلف قوموں سے پڑا، بجائے اس کے کہ جذباتی انداز سے وہاں کی سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا، ''جو قوم رافت ورحمت یا سختی ودرشتی جس سلوک کی مستحق تھی اس کے ساتھ وہی سلوک کیا''[1] اسے حسن تدبیر کہہ سکتے ہیں یا صلابت تنظیم، تکیہ بہ تقدیر نہیں کہہ سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبویؐ کے لیے منتخب کی ہوئی زمین اس کے مالکوں سے جو دو یتیم بچے تھے، خریدی اور بنفس نفیس مسجد کی تعمیر میں شریک ہوگئے، آپؐ اینٹ اور پتھر ڈھوتے تھے[2]۔ آنحضرت ﷺ نے خود یہ زحمت اٹھائی، یہ حسن تدبیر تھا جس نے آپؐ کے متبعین کے دل بڑھا دیئے اور انھیں ذوق کے ساتھ صعوبت برداشت کرنے کا گر سکھا دیا۔

یہی تنظیم کا وصف مہاجرین اور انصار کے درمیان جو بھائی چارہ آنحضرت ﷺ نے کرایا تھا، اس سے مترشح ہو رہا ہے، اس بھائی چارے نے دلوں کی حالت بدل دی اور جاہلی عصبیتیں تحلیل کر دیں، مقصود یہ تھا کہ حمیت وغیرت جو کچھ ہو وہ اسلام کے لیے ہو، نسل ورنگ اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں۔

تنظیم کا ہاتھ قرأت وحی تک پھیلا ہوا تھا اور اسے آپؐ نے مسلمانوں کی ترتیب کا ذریعہ بنا لیا تھا، آپؐ وحی مسلمانوں کو پڑھ کر سناتے اور مسلمان آپؐ کو پڑھ کر سناتے تاکہ اس عمل سے ان کے اندر فہم وتدبیر کے علاوہ دعوت کے حقوق اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں کا شعور بھی بیدار ہو[3]۔

---

(۱) الرحیق المختوم، ص: ۲۸۲

(۲) الرحیق المختوم، ص: ۲۸۸

(۳) الرحیق المختوم، ص: ۲۹۷

کسی کام میں بے صبری، جلد بازی اور جذبات کا شائبہ بھی نہیں ملتا، آپؐ نے جو جو اصلاحات کیں ان میں تنظیم کے اس نکتے کو ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ نئی بات کو انسان یکمشت آسانی سے قبول نہیں کر پاتا، اس کے دل و دماغ میں نئی بات بتدریج اور بالاقساط سرایت کر پاتی ہے۔

آپؐ جب غزوے کے لیے تشریف لے جاتے تو مدینہ کو اس کے حال پر چھوڑنے کے بجائے جو عدم تنظیم کی ایک ادا ہے، صحابہ میں سے کسی کو اس کا امیر مقرر فرماتے، جب سواریوں کی کمی ہوتی تو اونٹوں پر مجاہدین کی باری باندھ دی جاتی، سریۂ نخلہ میں جو جنوری ۶۲۴ء کو ہوا ہر دو آدمی کے بیچ میں ایک اونٹ تھا جس پر باری باری دونوں سوار ہوتے[1]۔

تنظیم وہ خواہ کسی نوع کی ہو اپنی کامیابی کے لیے ایک حد تک اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اس کی بناء ساری ضروری اطلاعات اور تفصیلات پر ہو، جنگ بدر سے پہلے قریش کا قافلہ لشکر اسلام کی آہٹ پا کر کترا کر نکل گیا تھا، دشمن کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا ایک نوخیز ملت کے حق میں نہ تھا، آنحضرت ﷺ نے قافلے کی واپسی کا انتظار کیا اور طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو اس کے حالات کا پتہ لگانے کے لیے شمال کی جانب روانہ کیا، اور انھوں نے بروقت رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی۔

قریش کے لشکر کا جب میدان بدر میں سامنا ہونے والا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے بظاہر ایک سمت کا رخ کیا اور گئے دوسری سمت میں، تاکہ دشمن کو اسلام کے لشکر کی نقل و حرکت کا علم نہ ہو پائے، دیت نام کی آبادی میں پہنچ کر رسول اللہ ﷺ فراہمیٔ اطلاعات کے لیے نکل پڑے[2]، شام کو پھر آپؐ نے لشکر مکہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے نئے سرے سے جاسوسی دستہ روانہ کیا، رات میں آپؐ نے لشکر کی ترتیب فرمائی۔

اقدامیت یا پیش قدمی کی مثالیں جابجا نظر آتی ہیں۔ غزوۂ بدر کے بعد قبیلۂ غطفان کی شاخ بنوسلیم کے لوگ مدینہ پر چڑھائی کے لیے فوج جمع کر رہے ہیں، اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے دو سو سرداروں کے ساتھ ان پر خود ان کے اپنے علاقے میں اچانک دھاوا بول دیا اور مقام کدر میں ان کی منازل تک جا پہنچے، بنوسلیم میں اس اچانک حملے سے بھگدڑ مچ گئی اور وہ افراتفری کے عالم میں وادی کے اندر پانچ سو اونٹ چھوڑ کر بھاگ گئے جس پر لشکر مدینہ نے قبضہ کر لیا۔

معرکۂ احد میں حسب معمول آنحضرت ﷺ نے اپنے لشکر کے لیے وہ مقام چنا جو جنگی نقطۂ نظر سے میدان جنگ کا بہترین مقام تھا، یعنی آپؐ نے پہاڑ کی بلندیوں کی اوٹ لے کر اپنی پشت اور

(۱) الرحیق المختوم، ص: ۳۱۰

(۲) الرحیق المختوم، ص: ۳۲۵

دایاں بازو محفوظ کرلیا اور بائیں بازو پر دوران جنگ میں جس واحد شگاف سے حملہ کر کے پشت تک پہنچا جا سکتا تھا، اسے تیر اندازوں کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔

حسن تدبیر اور ضبط تنظیم کی یہ ایک بہت اچھی مثال تھی، جب احد میں شکست کے باوجود آپ ؐ نے مشرکین کا تعاقب کیا تو اس سے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو جوڑ دیا اور شکست کی لائی ہوئی بے اعتمادی اور کمزوری کو دور کر دیا۔

میں نے جو کچھ ابھی تک عرض کیا اس کا مدعا یہ ہے کہ جہاں رسول آخر الزماں ﷺ کی سیرت اور ان کی مثال ہمیں حلم، رحم، انصاف، صداقت اور امانت سکھاتی ہے، وہیں وہ ہمیں تنظیم اور حسن تدبیر کا بھی سبق دیتی ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

سیرت نبویؐ قرآن کے آئینے میں

مولانا محمد احمد الاثری، شیخ الجامعہ الاثریہ، مئو

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد البشر وأفضل المرسلين، وعلى من تبعهم باحسان إلى يوم الدين، أما بعد: فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم٦٨:٤)

رسول اللہ ﷺ کی ذات وحیات اتنی کامل، اتنی جامع، اتنی دلکش اور اتنی پرکشش ہے کہ اس کا ہر گوشہ دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمۂ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اور ہر چند اہل قلم نے ہر دور میں اس پیکر جمال وکمال کی پوری تصویر کھینچنے کی سعئ بلیغ کی ہے مگر اپنی پوری توانائی اور زور قلم صرف کرنے کے بعد انھیں اعتراف قصور کرنا پڑا اور یہ کہنا پڑا:

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
گل چیں تو از تنگئ داماں گلہ دارد

اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت خاصہ سے آپ ؐ کی ذات میں ایسی جامعیت، لطافت اور نزاکت بھر دی تھی اور مکارم ومحاسن کے غازے سے اسے اتنا سنوار دیا تھا کہ الفاظ وعبارات کا ہر جامہ اس قدِ موزوں کے لیے نامناسب اور غیر موزوں سا معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایسی صورت حال میں "سیرت رسولؐ" کے موضوع پر قلم اٹھانا، کیا کوئی آسان کام ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ بقول شخصے "سیرت نگاری اپنے فن اور لوازم کے اعتبار سے پل صراط پر چلنے کا نام ہے۔" معمولی سی غفلت اور ذرا ذرا سی بے توجہی شیشۂ سیرت کو بے نور بلکہ چور چور کر دیتی ہے، بنا بریں سیرت نگاروں کی صف میں کم ہی ایسے لوگ نظر آئیں گے جنھوں نے پورے حزم واحتیاط کے ساتھ چمنستان سیرت میں قدم رکھا ہو اور کسی پھول میں خراش نہ آنے دی ہو، غالباً ایسا ہوا ہے کہ سیرت نگاروں نے فرط عقیدت میں اشہب قلم کو مہمیز لگا دی ہے، اور کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر وہ منزل مقصود سے پرے نکل گئے ہیں اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اپنی کوتاہ بینی، بے بصیرتی یا بغض وعناد کے باعث لطافت سیرت کی دریافت سے قاصر رہ گئے ہیں اور سیرت پاک کی نزاکت ان کے ہاتھوں مجروح ہوگئی ہے، مستشرقین کی تحریریں اس کی روشن دلیل ہیں۔

سیرت نگاروں کے مذکورہ ماحول میں حیات رسولؐ کی ہو بہو تصویر بہت مشکل چیز ہے، بنا بریں اس خاکسار نے کوشش کی ہے کہ تمام کتابوں سے صرف نظر کر کے آپؐ کی زندگی کے ان پہلوؤں پر گفتگو کرے جو قرآن کریم سے مستفاد ہوں، قرآن کریم پر گہری نظر ڈالنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات میں جتنی جامعیت اور موزونیت ہے اس کی موزوں ترین تعبیر کے لیے قرآن کریم سے جامع کوئی شے نہیں اور سیرت رسولؐ کے صحیح خدوخال معلوم کرنے کے لیے قرآن سے بڑھ کر کوئی آئینہ نہیں۔

قرآن مجید کے مختلف اوراق میں پھیلی ہوئی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کی زندگی پر دو حیثیتوں سے بحث کی ہے:

اول: اس حیثیت سے کہ آپؐ بشر ہیں۔

دوم: اس حیثیت سے کہ آپؐ رسول ہیں۔

لیکن ان دونوں حیثیتوں پر گفتگو سے پہلے آپؐ کے نام نامی کی تحقیق مناسب ہے۔

اسم مبارک قرآن میں

ترا محمد و احمد زمیں خواند و زماں
حمید باشد و محمود ذات ربانی
فزوں تر از تو کسے را نہ مدح گفت زماں
نہ بر تر از تو کسے گفت حمد سبحانی

قرآن پاک کے اندر چار مقامات پر آپ ؐ کا نام نامی ''محمدؐ'' اور ایک مقام پر ''احمدؐ '' استعمال کیا گیا ہے، سورہ آل عمران میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ﴾(آل عمران:۳/۱۴۴)

''اور محمد (ﷺ) اللہ کے صرف رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اگر آپ ؐ کی (طبعی) موت ہو جائے یا (میدان جنگ میں) قتل کر دیے جائیں تو کیا تم کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے۔''

سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

(الاحزاب:۳۳/۴۰)

''اور محمد (ﷺ) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

سورۂ فتح میں یوں ارشاد ہوا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:۴۸/۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو آپ ؐ کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں ایک دوسرے پر بڑے مہربان ہیں۔''

سورۂ محمد میں یوں ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾(محمد:۴۷/۲)

''اور جو لوگ ایمان دار ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں خاص کر اس کلام پر ان کا ایمان ہے جو محمد ﷺ پر اتارا گیا اور وہ برحق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے ہے، اللہ ان کے گناہ ان سے دور کر دے گا۔ اور ان کی حالت کو سنوار دے گا۔''

اور سورۂ صف میں یوں بیان ہوا:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾(الصف:۶۱/۶)

''اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، میں اپنے سے پہلے کی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام ''احمد'' ہوگا۔''

یہ دونوں نام ''محمد اور احمد'' آپؐ کے اسم ذاتی ہیں۔

آپؐ کے دادا نے آپؐ کا نام محمد اور آپؐ کی والدہ نے فرشتے کی بشارت سے آپؐ کا نام احمد رکھا تھا۔ محمد ستودہ صفات کو کہتے ہیں اور احمد وہ ہے جو بہت حمد کرنے والا ہو، اسم اور مسمّی میں اتنی زبردست مناسبت شاید تلاش بسیار کے بعد بھی نہ مل سکے جو آپؐ میں اور آپؐ کے اسم پاک میں موجود ہے۔

اور آپؐ احمد بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں، آپؐ نے آسمان کے تاروں، زمین کے ذرات، سمندر کے قطراتِ آب سے زیادہ اللہ کی تعریف کی ہے، آپؐ نے دنیا میں بھی حمد کی ہے اور آخرت میں بھی وہ حمد کریں گے جو دنیا کی حمد سے بڑھ کر ہوگی، پھر آپؐ احمد نہ ہوں گے تو کون ہوگا؟

محمد ﷺ بشر اور رسول تھے

قرآن کریم نے بہت زور دے کر یہ اعلان کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ فرد بشر ہیں اور ایک رسول ہیں اور ایسے ہی جتنے بھی رسول اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے پہلے بھیجے وہ سب انسان تھے۔

پس اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جو رسول ہوگا وہ فرد بشر نہیں ہوگا تو یہ بالکل غلط اور مبنی بر ضلالت عقیدہ ہوگا، ایسے ہی جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جو بشر ہوگا وہ رسول نہیں ہوسکتا تو یہ بھی سراسر غلط عقیدہ ہے، قرآن کہتا ہے کہ اہل جاہلیت اس لیے گمراہ ہوئے کہ وہ آپؐ کی بشریت کے تو قائل تھے لیکن آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں تھے، انھیں یہ عجیب سا لگتا تھا کہ ایک شخص جو ہمارے درمیان پیدا ہوا، پلا اور بڑھا اور تمام لوازم بشریت سے جڑا ہوا ہے وہ رسول ہو، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ بنابریں انھوں نے آپؐ کی رسالت کا انکار کردیا اور ضلالت کے شکار ہوگئے، خیر وہ جاہل تھے اور ان کی چشمِ جہالت آپؐ کی رسالت کو نہ پہچان سکی، تعجب تو ان مسلمانوں پر ہے جو آپؐ کی رسالت کے قائل ہیں باوجود اس کے آپؐ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ قرآن ببانگِ دُہل آپؐ کی بشریت کا اعلان کرتا ہے، بلکہ تمام ہی رسل کی بشریت کا اعلان کرتا ہے، پس آپؐ کی بشریت کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپؐ بشریت اور رسالت کے ''مجمع البحرین'' تھے۔

اب میں ان آیات قرآنیہ کو استشہاد کے طور پر ذکر کر رہا ہوں جو بالکل واضح طور پر آپؐ کی

بشریت پر دلالت کرتی ہیں، تا کہ دعوی مدلل ہو سکے:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں فرمایا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾(الکھف:۱۸/۱۱۰)

''یعنی اے نبی کریمؐ! آپ فرما دیجیے کہ میں تمھاری طرح ایک آدمی ہوں، میری طرف یہ بات وحی کی گئی ہے کہ تمھارا معبود برحق ایک ہی ہے، پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات پر یقین رکھے تو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

سورۂ فصلت میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ﴾(فصلت:۴۱/۶)

''اے نبی کریمؐ! آپ فرما دیجیے کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں تمھاری طرح کا ایک آدمی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے، پس تم اس کی طرف سیدھے ہو کر چلو اور اپنے گناہوں پر اس سے بخشش مانگا کرو اور مشرکین کے لیے ہلاکت ہے۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں اس مسئلے کی وضاحت یوں فرمائی گئی:

﴿اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾(بنی اسرائیل:۱۷/۹۳)

''یعنی کفار نے کہا کہ یا تیرا گھر سونے کا بن جائے یا تو (ہمارے سامنے) آسمان پر جائے (مگر) ہم تیرے اوپر چڑھنے کو بھی باور نہ کریں گے جب تک تو اوپر سے ایک کتاب ہمارے پاس نہ لاوے جس کو ہم پڑھیں، (اے رسولؐ) تو ان کے جواب میں کہہ دے میرا پروردگار پاک ہے اور میں تو صرف ایک آدمی اور رسول ہوں۔''

سورۂ الانبیاء میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾(النحل:۱۶/۴۳)

"یعنی ہم نے جتنے رسول تجھ سے پہلے بھیجے ہیں سب کے سب آدم زاد مرد بھیجے ہیں، ان کی طرف ہم وحی کرتے رہتے، پس اگر تم لوگوں کو معلوم نہیں ہے تو اہل علم (یعنی اہل کتاب) سے پوچھ لو۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ملاحظہ ہو:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ﴾(بنی اسرائیل:۱/۱۷)

"یعنی اللہ تعالیٰ (سب عیوب سے) پاک ہے جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) کو راتوں رات کعبہ شریف سے مسجد اقصیٰ تک جس کے اردگرد برکتیں کر رکھی ہیں سیر کرائی۔"

بشریت کے لوازم اور تقاضے

آیات بالا سے یہ حقیقت واشگاف ہوگئی کہ آپؐ ایک بشر تھے، لیکن دوسرے انسانوں میں اور آپؐ میں فرق صرف بایں حیثیت تھا کہ آپؐ کو تاج رسالت سے متوج فرمایا گیا تھا اور آپؐ کے پاس من جانب اللہ وحی آتی تھی، اب ذیل میں ایسی قرآنی شہادتیں پیش کی جائیں گی جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپؐ کے ساتھ بھی وہ تمام لوازم وابستہ تھے جو عام انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوئے ہیں۔

سورۂ فرقان میں اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ کفار نے آپؐ کی رسالت کا انکار کیا، سبب یہ تھا کہ وہ آپؐ کے ساتھ بشریت کے لوازم دیکھتے تھے:

﴿مَا لِھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَہٗ نَذِیْرًا﴾(الفرقان:۷/۲۵)

"یعنی یہ کیسا رسولؐ ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے کیوں اس کے پاس فرشتہ نازل نہیں ہوتا جو اس کے ساتھ ہو کر ڈراتا پھرے۔"

رسول سے بھی بعض اوقات فروگزاشتیں ہوتی رہیں اور اس وقت اللہ تعالیٰ رسولؐ کو تنبیہ و ہدایت بھی فرماتا رہا۔

سورۂ عبس میں ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ O اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی O وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰیٓ O اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی﴾(عبس:۸۰/۱۔۴)

"(رسول) نابینا کے آنے سے چیں بہ جبیں ہوا اور منہ پھیر لیا۔ تجھے کیا علم شاید وہ پاک ہو

جاتا یا نصیحت پا جاتا اور نصیحت اسے فائدہ دیتی۔''

بعض بیویوں کی سازش پر آپؐ نے ایک بار شہد اپنے اوپر حرام کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے سخت ڈانٹ پلائی، فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾(التحریم:۱/۶۶)

''یعنی اے نبی! آپؐ ایسی چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کر رکھی ہے، کیا آپؐ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔''

غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؐ سے چوک ہوگئی کہ آپؐ نے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا تو اللہ تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا، فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ﴾(الأنفال:۸/۶۷)

''یعنی نبیؐ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں (اور وہ انھیں رہا کر دے) یہاں تک کہ وہ زمین میں خون بہا دے۔''

رسول کو بھی حالات کے تقاضے سے رنج وغم ہوتا تھا، جیسے عام انسانوں کو، چنانچہ باری تعالیٰ نے سورۂ یونس میں فرمایا ہے:

﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ﴾(یونس:۱۰/۱۰۹)

''یعنی تو بھی اس تعلیم کی جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے پیروی کر اور تکالیف شاقہ جو پہنچیں ان پر صبر کر، تا آنکہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔''

سورۂ ہود میں فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾(ھود:۱۱/۱۱۵)

''اور تکلیف پہنچے تو صبر کر کیونکہ اللہ محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

اور سورۂ طٰہ میں فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾

(طٰہ:۲۰/۱۳۰)

''اور جو کچھ یہ کفار تیرے بارے میں کہتے ہیں اس پر صبر کر اور سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیا کر۔''

ان جملہ آیات سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ نبی اکرم ﷺ بھی عام انسانوں کی طرح رنج وغم

اور تکلیف واذیت محسوس کرتے تھے۔

اور جیسے عام لوگ غیب سے نابلد ہیں اسی طرح آپ ﷺ بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ کل کیا ہوگا۔ چنانچہ سورۂ انعام میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الأنعام:٦/٥٠)

''یعنی آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ ہی تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، اللہ کی وحی کے سوا کسی چیز کا تابع نہیں ہوں، آپ کہہ دیجیے کہ کیا نابینا اور بینا دونوں برابر ہیں، بھلا تم لوگ کیوں نہیں سوچتے۔''

سورۂ الاعراف میں مزید وضاحت کے ساتھ فرمان باری ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾

(الاعراف:۷/۱۸۸)

''یعنی آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے نفس کے لیے بھی نفع اور ضرر کا اختیار نہیں رکھتا، ہاں جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے اور (نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں) اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سا خیر حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو صرف ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایمان والوں کے لیے۔''

سورۂ یونس میں یوں ارشاد ہوا:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ﴾(یونس:۱۰/۲۰)

''یعنی یہ کفار کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اس کے رب کی جانب سے اس پر کوئی نشان اتارا گیا تو آپ کہہ دیجیے کہ غیب کی خبریں صرف اللہ کے پاس ہیں، پس تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔''

سورۂ الانعام میں کسی بھی شخص کے لیے علم غیب کی نفی کا بیان حصر کے ساتھ کیا گیا، ارشاد باری ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ

وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾(الانعام:۶/۵۹)

''یعنی اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو صرف وہی جانتا ہے۔ جو کچھ دریاؤں اور جنگلوں میں ہے وہ سب کو جانتا ہے اور جو پتہ درخت سے گرتا ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی معمولی سا دانہ خشک ہو یا تر زمین کے نیچے اندھیرے میں بھی ہو وہ بھی اس کی روشن کتاب میں مندرج ہے۔''

سورۂ توبہ میں ارشاد باری یوں ہے:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (التوبۃ:۹/۱۰۱)

''یعنی اے ایمان والو! تمھارے اردگرد رہنے والے دیہاتیوں میں کچھ منافق ہیں اور خود مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں جو نفاق پر اڑے ہیں، اے رسول پاکؐ آپ ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں، ہم ان کو بار بار (دنیا میں) عذاب دیں گے، پھر مرنے کے بعد یہ بڑے عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے۔''

مذکورہ بالا آیات اور اسی طرح کی دیگر آیات وواقعات واضح طور پر دلالت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، ہاں غیب کی جن باتوں کی وحی آپ پر ہوتی تھی آپؐ انھیں بے کم وکاست بیان کردیتے تھے اور اس میں سے کچھ بھی نہیں چھپاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لوگ آپؐ سے کسی چیز کے بارے میں سوالات کرتے اور آپؐ کو ان کا قطعی علم نہ ہوتا تو آپؐ خاموش ہوجاتے اور بغیر علم کے جواب نہ دیتے، پھر جب اللہ کی طرف سے وحی ہوتی اور من جانب اللہ جوابات آجاتے، تب آپؐ سائل کو بلاتے اور اس کو مطمئن کرتے۔

رسول اکرم ﷺ کے مقاصد بعثت

قرآن پاک میں بحیثیت رسول آپ کے جو اوصاف حمیدہ بیان کیے گئے ہیں ان اوصاف سے آپؐ کی زندگی کے جن جن پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور جو جو گوشے اجاگر ہوتے ہیں وہ آئندہ صفحات میں ذکر کیے جائیں گے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپؐ کی بعثت کی غرض وغایت بیان کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾(الجمعة:٦٢/٢)

''وہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسولؐ انھی میں سے جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں سنوارتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

سورۂ آل عمران میں آپؐ کی بعثت کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾

(آل عمران:٣/١٦٤)

''اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا رسولؐ ان میں سے انھی میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت۔''

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت مبارکہ کے چار مقاصد تھے:

① تلاوت آیات اللہ ② تعلیم کتاب اللہ ③ تعلیم حکمت ④ تزکیۂ نفوس۔

محمد ﷺ ایک رسول کی حیثیت سے

چند داعیانہ اوصاف

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد جاننے کے بعد اب قرآن پاک کی روشنی میں یہ بیان کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بحیثیت رسول اور داعی کیا صفات وخصوصیات مرحمت فرمائی تھیں۔

حق تعالیٰ کا سورۃ الاحزاب میں ارشاد گرامی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ○ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾(الاحزاب:٣٣/٤٥ـ٤٦)

''یعنی اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو اس شان کے ساتھ بھیجا ہے کہ آپؐ شاہد ہیں، بشارت دینے والے ہیں، آگاہ کرنے والے ہیں اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور ایک چراغ ہیں نور پھیلانے والے۔''

اس آیت سے آپؐ کی چند داعیانہ خصوصیات واضح کی گئی ہیں:

① آپؐ شہادت دینے والے ہیں۔

② عواقب امور سے آگاہ کرنے والے ہیں۔

③ اللہ کی طرف بلانے والے ہیں۔

④ دعوت دینے میں اللہ کی طرف سے مجاز ہیں۔

⑤ روشن چراغ۔

نبی کریم ﷺ کی چند ایسی خصوصیات جنھوں نے دلوں کو فتح کرلیا:

نہ نوائے عاشقانہ نہ ادائے دلبرانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

باری تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کو ایسے گونا گوں دلربا، پرکشش اور مقناطیسی اثر رکھنے والے اوصاف سے نواز رکھا تھا، جو لوگوں کے قلب وجگر کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے، بنابریں جو شخص آپؐ سے گفتگو کا شرف حاصل کر لیتا یا آپؐ کی صحبت سے بہرہ ور ہوجاتا وہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کا اسیر ہوجاتا، آپؐ نے اپنی دل رُبا صفات کے ذریعے جس طرح لوگوں کے دلوں کو جیتا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس لیے فاتح قلوب بلکہ فاتح زمانہ کا خطاب صرف آپؐ ہی کے لیے موزوں ہے۔

اب میں قرآن کی ان آیات کو ذکر کروں گا جو آپؐ کی صفات جمیلہ اور خصائل حمیدہ کو واضح کرتی ہیں:

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(آل عمران:۳/۱۵۹)

''تو اللہ کی رحمت سے ان کے لیے نرم دل پیدا ہوا ہے، اگر تو سخت دل اور بدخو ہوتا تو یہ تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔''

سورۂ توبہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾(التوبة:۹/۱۲۸)

''تمھارے پاس تمھی میں سے رسول آیا ہے اس پر تمھاری تکلیف شاق گزرتی ہے، تمھاری بھلائی کا حریص ہے اور ایمان داروں کے حال پر نہایت درجے شفیق ومہربان ہے۔''

نیز سورۂ انبیاء میں ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾(الانبياء:۲۱/۱۰۷)

''یعنی ہم نے تجھ آپؐ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

آیات بالا میں رسول اکرم ﷺ کی جن صفات کو بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

① آپؐ نرم دلی کے پیکر تھے۔

② آپؐ ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔

③ آپؐ مومنوں (کی نفع رسانی) کے طالب وشائق تھے۔

④ آپؐ رافت ورحمت کے مجسمہ تھے۔

سیرت نبویؐ عصر حاضر کے لیے مشعل راہ

دنیا میں مذاہب کی کثرت ہے، ان کے بانیان کی تاریخ زندگی کا ورق ورق ہمارے سامنے ہے، گو ان مذاہب میں بھی اچھی باتیں ہیں اور ان کے بانیان کی زندگیاں محاسن سے یکسر خالی نہیں ہیں، لیکن پورے وثوق واعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی دین اسلام سے بہتر نہیں ہے، یہ دین، دین فطرت اور یہ دین، دین رحمت ہے، اس کی ہر تعلیم اور ہر حکم انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، اس لیے کہ یہ دین اس کی جانب سے ہے جس نے انسانی فطرت بنائی ہے اور اس کے لانے والے وہ رسولؐ ہیں جو سراپا رحمت بنا کر بھیجے گئے، جن کا سینہ انسانیت کی حالت زار دیکھ کر درد سے بھر جاتا، جو صورت شمع اندھیرے میں روشنی پیدا کرتے اور سوز دروں سے پگھلے جاتے، جو لوگوں کو ہلاکت کی راہ پر چلتے دیکھ کر رنج وغم میں ڈوبے ڈوبے رہتے'' جو لوگوں کی خیر وفلاح اور نجات وسعادت کے لیے رات اور دن کا ہر ہر لمحہ وقف رکھتے، جو قوم کے ظلم وستم سہتے اور مسکراتے رہتے، جو القاب بد سے نوازے جاتے، گالیاں سنتے اور دعائیں دیتے، جس نے انسان کو اس کی عظمت یاد دلائی، بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کا غلام بنایا، جس نے جہالت کے شکار انسانوں کو تہذیب وتمدن کے اعلیٰ ترین اصول دیئے، جس نے اپنی زندگی کا ورق ورق اور اپنی سیرت کا صفحہ صفحہ تاریخ انسانیت کا سرورق بنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کی بے چین دنیا اور کرب واضطراب میں ڈوبی ہوئی انسانیت کے لیے مداوائے نجات بس ایک چیز ہے اور وہ ہے سیرت نبویؐ پر عمل، کیونکہ دنیا کے کسی مفکر یا ریفارمر کی زندگی اتنی پاکیزہ، اس کے اخلاق اتنے بلند اور اس کے کردار اتنے ستھرے نہیں ہیں جتنے کہ رسول اکرم ﷺ کے، اسی لیے قرآن نے آپؐ کے اسوہ کو قابل اتباع قرار دیا ہے، آپؐ ہی کے آستانے سے وہ دین بھی ملے گا جو اللہ کا پسندیدہ دین ہے، جس نے آپؐ کا آستانہ چھوڑا وہ دنیا اور آخرت کی

سعادت سے محروم ہوا:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
وگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست
محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر اوست

اللہ تعالیٰ جملہ اہل عالم کو بالعموم اور مسلمانان عالم کو بالخصوص سیرت نبویؐ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة

مولانا انیس الرحمٰن اعظمی عمری، لیسانس، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين أما بعد:

سب سے پہلے میں ارباب جامعہ سلفیہ وذمہ داران کانفرنس کی خدمت میں پر خلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے سیرت طیبہ جیسے اہم اور مفید موضوع پر عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔

حقیقت میں آج دنیا کے سامنے سیرت طیبہ کو بحیثیت نمونہ وآئیڈیل پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے، دنیا بڑی تیزی کے ساتھ تباہی وانارکی کی طرف بڑھ رہی ہے اور اخلاق وسیرت سازی کی اقدار پامال ہورہی ہیں، اس بڑھتی ہوئی خرابی، بے اطمینانی، پریشانی اور آج کے سیاسی، سماجی ومعاشرتی مشکلات ومسائل کا صحیح اور مکمل حل صرف سیرت طیبہ کو اپنانے میں ہے۔

سیرت طیبہ کی ہمہ گیری اور جامعیت انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے محیط ہے اور زندگی کو سنوارنے اور صالح بنانے کے لیے بہترین رہنما ہے، سیرت طیبہ کو فراموش کر کے اور رسول اکرم ﷺ کی مثالی زندگی سے دوری اختیار کر کے انسانیت کبھی سکھ اور چین کا سانس نہیں لے سکتی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء:۲۱/۱۰۷) کی آیت مبارکہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آج مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک دنیا کے ہر حصے میں برائیوں اور خرابیوں کا راج ہے اور جن جگہوں میں سیرت طیبہ کو نمونہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے، وہ ممالک کافی حد تک تہذیب جدید کی خرابیوں سے دور ہیں، اس وقت دنیا میں لاکھوں انسان اپنی روحانی تسکین کے لیے دنیا کے گوشے گوشے کا چکر کاٹ رہے ہیں، لیکن ان کی رہنمائی کا کوئی سامان نہیں ہے، یہ لوگ عام طور پر اپنی روحانی تسکین کے سامان کے لیے ان ہی ممالک کا قصد کرتے ہیں جہاں ان کی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہو، اور یہ ممالک عام طور پر وہ ہیں جن کے پاس آسمانی ہدایت اور سیرت طیبہ کتابوں میں تو محفوظ ہے مگر سیرت طیبہ کے عملی مظاہر نہیں ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ روحانیت کے نام پر کسی بھی غلط بات کو اپنا لیتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیت: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ (ابراھیم:۱۴/٤) کے معنی ومفہوم کو صرف ماضی کی ایک حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا ہے، اس آیت کو حال ومستقبل کے لیے رہنما اصول نہیں سمجھا گیا۔

صرف کتاب اور کتاب کی تعلیمات کسی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لیے کافی نہیں ہوتیں بلکہ علم جب تک عمل کے قالب میں نہیں پیش کیا جاتا موثر نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ کتاب کے ساتھ انبیاء بھی آئے اور انھوں نے کتابی تعلیمات کو عملی شکل میں پیش کیا اور آنے والے لوگوں کے لیے ایک عملی نمونہ چھوڑا۔

لہٰذا آج ضرورت ہے کہ سیرت طیبہ کو دنیا کے سامنے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں پیش کیا جائے اور ایسی سوسائٹی کی تعمیر میں بھی کوشش کی جائے کہ جس میں سیرت طیبہ کے عملی نمونے جھلکتے ہوں۔

ہمارے ملک میں عربی مدارس کی تعداد بہت کافی ہے، اس میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے، ان مدارس میں آنے والے بہت سے طلبہ اساتذہ کے لیے خام مال ہوتے ہیں، اگر ان پر توجہ اور محنت صرف کی جائے تو ان کے اخلاق وعادات کو بہت حد تک سیرت طیبہ کے قریب کیا جا سکتا ہے اور ان مدارس کو ایک بہترین اسلامی سوسائٹی بنایا جا سکتا ہے۔

اس کانفرنس میں مقالہ کے لیے میں نے جس عنوان کو اختیار کیا ہے وہ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱) کی تفسیر کتاب وسنت کی روشنی میں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لیے انسانوں کو ہی نبی ورسول بنا کر بھیجا اور قرآن مجید میں دسیوں مقامات پر انبیاء ورسل کے بشر اور آدمی ہونے کا اعلان کیا گیا، کہیں تو یہ اعلان خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا ﴾(البقرة:۲/۱۵۱)

''ہم نے تم ہی انسانوں میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔''

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾(یوسف:۱۲/۱۰۹ النحل:۱۶/۴۳)

''ہم نے تم سے قبل بھی وحی ورسالت کے لیے مردوں کو ہی بھیجا۔''

اور کہیں یہ اعلان انبیاء کرام کی زبانی ہوا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾(الکہف:۱۸/۱۱۰)

''اعلان کردو کہ میں بھی تم ہی جیسا انسان ہوں۔''

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾(إبراهيم:۱۴/۱۱)

''ان سے ان کے پیغمبروں نے کہا کہ ہم بھی تم جیسے ہی انسان ہیں۔''

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر وارد ہیں۔

انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے انسان کو ہی بحیثیت نبی ورسول مقرر کیا جا سکتا ہے، مصلحت اس میں یہ ہے کہ انبیاء اپنی قوم کے لیے نمونہ اور اسوۂ ہوتے ہیں اور ان کا عملی نمونہ دوسروں کے لیے نہ صرف مستحسن بلکہ بسا اوقات فرض وواجب ہوتا ہے، اگر وہ بشر نہ ہوتے اور جن یا ملائکہ ہوتے تو منکرین اور معترضین کو آسانی کے ساتھ اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا کہ جو کام انبیاء کرتے ہیں وہ ہم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جن اور ملک ہیں اور ہم بشر، بنابریں ہم دونوں کا کیا مقابلہ؟

نبی ورسول کے انسان ہونے کی صورت میں یہ اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نبی بنا کر بھیجا اور ان کا نمونہ اپنی عملی زندگی میں اختیار کرنے کی تاکید بھی فرمائی تاکہ جو لوگ نبی کو آدمی اور بشر نہیں مانتے ان کے لیے چیلنج ہو کہ اگر نبی انسان نہ ہوتا تو پھر اس کا عملی نمونہ اختیار کرنا کیا معنی رکھتا؟ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ کسی نبی کا کمال نہ صرف آدمی ہونے میں ہے بلکہ کمال آدمیت کے ساتھ ساتھ کمال عبودیت اختیار کرنے میں ہے۔

قرآن مجید میں جہاں معراج یا کسی دوسری فضیلت کا ذکر آیا ہے وہاں اللہ کے رسولؐ کے لیے لفظ ''عبد'' کا استعمال ہوا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾

(الاسراء:۱۷/۱)

''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے (کامل) بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی۔''
معلوم ہوا کہ نبی انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور اس کا عمل اس کے متبعین کے لیے نمونہ اور اسوہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کے اندر بہترین نمونہ ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

''یعنی اللہ کے رسول میں بہترین عادتیں ہیں جو قابل تقلید وقابل اقتداء ہیں جیسے جنگ کے موقعوں پر ثبات قدمی اور تکالیف میں صبر وتحمل۔

دوسرا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رسول کی ذات، بذات خود دوسروں کے لیے نمونہ اور اسوہ ہے جس کی پیروی بہتر ہے۔'' (روح المعانی، ص:۱۶۷، جزء:۲۱)

مزید آگے لکھتے ہیں ''یہ آیت اگرچہ میدان جنگ میں ثبات قدمی میں آپؐ کی پیروی اختیار کرنے کے سلسلے میں ہے لیکن اس کا حکم آپؐ کی جملہ خصائل وعادات کے لیے عام ہے، الا یہ کہ کوئی بات آپؐ کے ساتھ مخصوص ہو، جیسے بیک وقت چار سے زائد بیویوں کو اپنے نکاح میں رکھنا، یعنی یہ آیت دراصل غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی اور اللہ کے رسولؐ نے اس موقع پر انتہائی پامردی اور بہادری کا ثبوت دیا تھا، مومنوں کو بھی ایسے مواقع پر ہمت وثبات کا مظاہرہ کرنا چاہیے، مگر یہ آیت صرف جنگ کے موقع پر ہمت وثبات کے مظاہرہ میں رسولؐ کا نمونہ اختیار کرنے کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ہر کار خیر میں رسولؐ نمونہ ہیں۔''

صحابہ کرام نے اس آیت سے یہی مفہوم اخذ کیا چنانچہ علامہ محمود آلوسیؒ اس آیت کے ضمن میں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

ابن ماجہ اور ابن ابی حاتم نے حفص بن عاصم سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ آپ حالت سفر میں فرض نماز سے قبل یا بعد سنتیں نہیں پڑھتے ہیں کیا بات ہے؟ آپ نے کہا بھائی بات یہ ہے کہ میں سالوں سفر میں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ تھا، آپؐ کو کبھی فرض سے پہلے یا بعد سنت پڑھتے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: (رسولؐ کی ذات میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے)۔''

عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں حضرت قتادہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(مردوں کے لیے) منقش چادر کے استعمال سے منع کرنا چاہا تو ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ نے اللہ کے رسولؐ کو منقش چادر استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ہاں دیکھا ہے، تو اس آدمی نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے ارشاد نہیں فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

شیخین، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ سے ایک معتمر...... عمرہ کرنے والے...... کے متعلق دریافت کیا گیا کہ کیا وہ خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد سعی بین الصفا والمروہ سے پہلے اپنی بیوی سے صحبت کر سکتا ہے؟

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کے رسولؐ مکہ تشریف لائے تو آپؐ نے کعبۃ اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دوگانہ نماز پڑھی پھر سعی بین الصفا والمروہ سے فارغ ہوئے یعنی یہ سب عمل ایک ساتھ کیا درمیان میں کسی چیز کو حائل ہونے نہیں دیا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳)

شیخین وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی آدمی خود پر اپنی بیوی کو حرام کر لے پھر اس سے ملنا چاہے تو اس کو ''یمین'' قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، پھر آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳:۰۰)

ان سارے نصوص سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے رسولؐ کی زندگی کا ہر قول وعمل قابل تقلید واقتداء ہے، سوائے اس کے جس کی تخصیص ثابت ہو۔

کسی درمیانی کڑی اور واسطے کو قابل تقلید اور اسوۂ نمونہ قرار دینا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اس درمیانی شخص کو اپنے خالق ومعبود کی جانب سے جو ہدایات ملتی ہیں وہ ان پر بلا چون وچرا مکمل طور پر عمل پیرا ہوتا ہے اور خود اپنے ماننے والوں کو جن باتوں کی تلقین کرتا ہے ان پر وہ خود بھی عمل کرتا ہے۔

اللہ کے رسول کی ذات والا صفات میں اور سابق انبیاء میں بھی یہی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے امتیوں کے لیے ان کی ذات کو قابل تقلید اور نمونہ قرار دیا گیا۔

اور قرآن مجید نے اللہ کے رسول کے لیے ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم:۶۸/۴) کی گواہی دی، اے محمدؐ! آپؐ اخلاق عظیم کے مرتبہ پر فائز ہیں۔''

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ، اللہ کے رسول کے اخلاق حسنہ کے مرتبہ پر فائز ہونے اور اس صفت میں سب سے ممتاز ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی حیات اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آ کر آپ کی زندگی تمام انبیاء کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی، دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا، کوہ زیتون کے رحیمانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؟ لیکن مکہ کا معلم امیؐ پکار کر کہتا تھا:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾(الصف:٦١/٢)

''جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو؟''

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا، بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز داں ہوسکتا ہے، چند صاحبوں نے آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ حضرت ﷺ کے اخلاق بیان کیجیے، انھوں نے پوچھا تم قرآن نہیں پڑھتے:

«إِنَّ خُلُقَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنُ »(أبو داود، باب الصلاة في الليل)

''آپؐ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔''

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں، لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے؟ قرآن مجید لاکھوں مخالفین واہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعیٔ حق کی نسبت گویا تھا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾(القلم:٦٨/٤)

''اے محمد! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو'' (سیرۃ النبیؐ، حصہ دوم، ص:۲۸۷۔۲۸۸)

کسی کے حسن اخلاق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے ساتھی اور اس کے راز دار، نہ صرف اس کی زندگی میں اس کے اخلاق حسنہ کی تعریف کریں بلکہ بعد الممات بھی اس کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق فاضلہ کے مداح ہوں، اور اگر کسی مخالف و دشمن نے اس کے حق میں ایسی گواہی دی تو پھر نور علی

نور ہے

اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ کے مداح ومعترف آپ کے سارے صحابہ کرام ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو آپؐ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے آپؐ کے نمونہ پر ڈھالا۔

اس کے علاوہ مخالفین نے بھی زمانۂ ماضی میں اور حال میں آپؐ کی تعریف وتوصیف میں بخل سے کام نہیں لیا، سوائے اس کے جس کے دل میں کینہ ہی کینہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے آپؐ کی زندگی کو دوسروں کے لیے نمونہ قرار دیا۔

یہاں قرآن مجید اور احادیث کی بعض تعلیمات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ان پر کس سختی سے عمل کیا۔

① عزیمت وصبر

کسی بھی داعی ومبلغ کے لیے زیور ایمان سے آراستہ ہونے کے بعد اپنے مشن کو عام کرنے کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہمت وحوصلہ اور عزیمت وصبر کی ہوتی ہے، دعوت وتبلیغ کا مشن ہی ایسا مشن ہے کہ اس میں عام طور پر کامیابی کم اور ناکامی زیادہ ہوتی ہے، آرام کم اور پریشانیاں زیادہ ہوتی ہیں، ماننے والے کم اور مخالفین زیادہ ہوتے ہیں اور یہ بڑا طویل اور دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے زمین میں فلک بوس عمارتیں بنانے، زمین کو سبزہ زار کرنے، ہوا کے دوش پر اڑنے اور چاند پر کمندیں ڈالنے کی ہر اس آدمی کو صلاحیت بخشی، جس نے اس راہ میں کوشش کی اور علی وجہ البصیرت اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور جب وہ اپنے فن میں کامیاب اور ماہر ہوگیا تو دنیا نے اس کو ماہر زراعت اور انجینئر وسائنسدان کا لقب دیا۔

مگر دعوت وتبلیغ کا بارگراں اٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے صرف انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان کے نبی ہونے کا اعلان کیا، کسی بھی نبی کی نبوت کا لقب اس کی دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے تھا، نہ کہ اس کی کامیابی اور مہارت کے بعد اس کو لقب دیا جاتا تھا۔

اللہ کے پیارے رسولؐ ایسی قوم میں مبعوث ہوئے جو دنیا کی انتہائی غیر متمدن اور غیر تہذیب یافتہ قوم مانی جاتی تھی۔ جس کے پاس نہ اصول تجارت تھے، نہ اصول سیاست، نہ قانون وعدل کی حکمرانی اور نہ سلطان وحاکم کی قوت وطاقت، اس کے اصول زندگی وہی تھے جو اس کی عقل اور سمجھ میں آجاتے تھے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا تھا۔

لیکن اللہ کے رسولؐ نے اپنی تعلیمات اور مثالی سیرت ان کے سامنے پیش کرکے اس قوم کو

اخلاقیات کا وہ سبق پڑھایا کہ وہ سراپا اخلاق بن گئے اور آج تک دنیا اس نسل کی مثال پیش نہیں کر سکی۔

لیکن اللہ کے رسولؐ کو یہ کامیابی آسانی سے حاصل نہیں ہوگئی، آپؐ نے اس راہ میں بے پناہ تکلیفوں اور اذیتوں کا سامنا کیا۔ آپؐ نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے غم سہے اور ہر مرحلے میں صبر کا مظاہرہ کرتے رہے، قرآن مجید میں تقریباً سترہ مقامات پر آپؐ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

کوہ صفا کا واقعہ، آل یاسر کی شہادت کا واقعہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ایذا رسانی، رسالت وصداقت کی آواز کو خاموش کرنے کے لیے خاندان قریش کے چوٹی کے افراد کا ابوطالب سے ملاقات کرنا، قبول اسلام کی پاداش میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی پریشانی، خبیب وخباب رضی اللہ عنہما کی ایذا رسانی وشہادت کا واقعہ، مکہ کی گلی کوچوں میں آپؐ کو ساحر ومجنوں کے برے القاب سے یاد کرنا، حالت نماز میں آپؐ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھنے کا واقعہ، ابوجہل کی گستاخی اور ایذا رسانی کا واقعہ، شعب ابی طالب میں آپ کا اور آپؐ کے خاندان والوں کا مقاطعہ ومحاصرہ، طائف کا سفر اور اذیتوں کا سامنا اور پھر اس دور کے آخر میں مکہ سے ہجرت کا واقعہ۔

یہ واقعات ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے چند واقعات بھی کسی بڑے داعی کو پیش آئیں تو وہ پست حوصلہ ہو جائے اور اپنے مشن سے دلچسپی ختم کر دے۔

لیکن اللہ کے رسولؐ نے ان واقعات کا اور ہجرت کے بعد کے واقعات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آپؐ نے کبھی صبر وعزیمت کا دامن نہیں چھوڑا اور اس وقت تک اپنے مشن میں لگے رہے جب تک کہ آپؐ نے اپنا مشن پورا نہیں کر دیا:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر:۱۵/۹۹)

''زندگی کے آخری لمحے تک اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو۔'' کے حکم پر آپ نے عمل کیا۔

آج ایک داعی اور مبلغ کے لیے صبر وثبات اور ہمت وعزیمت سے اپنا مشن انجام دیتے رہنے کے لیے اللہ کے رسول کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

④ ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (الزمر:۳۹/۶۶)

پر اللہ کے رسول کا عمل اور دوسروں کے لیے نمونہ

آج مسلمانوں میں ایک طبقہ اس خیال کا ہے کہ جو لوگ خدا کے محبوب بندے ہوتے ہیں اور وہ

قرب الٰہی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں وہ اللہ کی اجازت سے حدود وقیود عبادت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور یہ جاہل آیت ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر ۱۵:۹۹) کا مطلب بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ یقین کامل آنے تک خدا کی عبادت میں مشغول رہنا چاہیے۔

یہ اعتقاد اگرچہ اہل علم کا نہیں ہے اور وہ آیت کا یہ معنی بیان نہیں کرتے، مگر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ضرور اس گمراہی میں مبتلا ہے اور اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہے کہ چونکہ یہ اولیائے کرام اللہ کے مقرب بندے ہیں اس لیے اللہ ان کو ناراض کرنے والی کوئی بات نہیں کرتا، لہٰذا جو ان اولیاء کے لیے نذر و نیاز مانے گا، ان کی توصیف وتعریف اور ان کی کرامتوں کے بیان میں لگا رہے گا تو یہ اولیاء روز محشر اس کو عذاب وغضب الٰہی سے بچالیں گے، ان انتہائی مہمل اور غلط عقیدوں نے عوام کو اس قدر گمراہ کیا ہے کہ آج وہ احکام اسلام کو پس پشت ڈال کر اپنی زندگی کی ساری محنت اور کمائی کا ایک بڑا حصہ مختلف قسم کی خرافات اور بیہودگیوں میں خرچ کرتے ہیں اور ان کی بجا آوری کے لیے وہ اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی خالص عبادت کے لیے بھی نہیں کرے گا۔

اللہ کے پیارے حبیب سید الانبیاء اور سید ولد آدم تھے، لیکن آپؐ کو بھی اللہ نے عبادت سے آزاد نہیں کیا اور حکم دیا کہ:

﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (الزمر:۳۹/۶۶)

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کا شکر بجالانے والوں میں سے ہو جاؤ۔''

چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں اللہ کے رسولؐ نے شکر وعبادت کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسولؐ اتنا طویل قیام لیل فرماتے تھے کہ آپؐ کے قدم مبارک پر ورم آ جاتا تھا، میں نے عرض کیا اے رسول اللہ! آپؐ کے تو اگلے اور پچھلے گناہ اللہ نے معاف کر دیئے ہیں تو آپؐ اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ اللہ کے رسولؐ نے جواب دیا:

﴿أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا﴾

''یعنی جب اللہ نے میرے سارے گناہ معاف کر دیئے تو میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟۔'' (بخاري كتاب التهجد، ص:٦)

آپؐ فرض نمازوں کے انتہائی پابند تھے ہی لیکن اس کے علاوہ بھی سنن ونوافل کی ادائیگی میں شب وروز کا بڑا حصہ گزار دیتے تھے، اشراق، صلاۃ ضحیٰ، سنن رواتب اور صلاۃ اللیل وغیرہ کا تذکرہ احادیث میں موجود ہے، صلاۃ اللیل تو اس قدر طویل ہوتی کہ بہت کم لوگوں کو آپ کی اقتداء کرنے

کی ہمت ہوتی۔

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے تہجد کی نماز اللہ کے رسول ؐ کی اقتداء میں پڑھی، آپ ؐ نے اتنا طویل قیام فرمایا کہ میرے دل میں بری بات کا خیال آیا، آپ ؐ سے پوچھا گیا کہ وہ بری بات کیا تھی؟ تو جواب دیا، یہی کہ یا تو میں تاب نہ لا کر بیٹھنے کی کوشش کرتا یا آپ ؐ کی اقتداء چھوڑ دیتا۔'' (مسلم،باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل)

روزوں کا بھی یہی حال تھا، ہر مہینے چند نفلی روزے رکھنے کا معمول تھا، رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا بھی معمول تھا۔

آپ ؐ کے اگلے پچھلے گناہ معاف تھے لیکن آپ ؐ کثرت سے توبہ واستغفار کرتے تھے۔

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک ہی مجلس میں ہم نے اللہ کے رسول ؐ کو سو سو مرتبہ توبہ واستغفار کرتے سنا ہے۔''

شب و روز کی آپ ؐ کی دعائیں احادیث میں اس کثرت سے وارد ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کا کوئی لمحہ شکر وسپاس الٰہی سے خالی نہیں جاتا تھا۔

اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ «كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِي كُلِّ أَحْيَانِهِ» کہ آپ ؐ ہمیشہ یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ خدمت خلق اور آج کی اصطلاح میں ''سوشل ورک'' میں مشغول ومنہمک رہتے ہیں وہ عبادات سے اپنا کوئی خاص تعلق نہیں رکھتے «إِلَّا مَنْ عَصِمَهُ اللّٰهُ» اللہ کے رسول سے بڑھ کر خادم خلق کون ہوسکتا تھا، آپ ؐ کی ساری زندگی دعوت وارشاد اور وعظ وتبلیغ، قیام عدل وانصاف اور قرابت داروں اور عام لوگوں کے حقوق دلانے میں گزری لیکن آپ ؐ نے اس خدمت میں مصروف ہو کر کبھی نماز باجماعت یا دیگر عبادات یا اوراد ووظائف کو نہیں چھوڑا۔

پریشانی اور مصیبت کا سامنا ہوتا تو بھی سب سے پہلے خدا ہی کا سہارا ڈھونڈا کرتے تھے، تیز آندھی چلتی تو گھٹنے کے بل بیٹھ کر اللہ سے توبہ واستغفار کرتے اور نفلی نماز ادا کرتے اور فرماتے تھے کہ

«جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ» ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

سچ کہا اللہ تعالیٰ نے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳)

③ انفاق فی سبیل اللہ کے نمونے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾(البقرۃ:۲/۲۶۱)

''یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے، جیسے ایک دانے کی حالت، جس سے سات بالیں اگیں، ہر بال کے اندر سو دانے ہوں اور یہ افزونی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾(البقرۃ:۲/۲۵۴)

''اے ایمان والو! خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آ جاوے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی اور نہ کوئی سفارش ہوگی اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں۔''

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت میں اللہ کے رسولؐ نے بھی بہت زور دیا ہے۔

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو میں سب کا سب راہ خدا میں خرچ کر دیتا اور ایک دینار بھی پس انداز کر کے خوش نہ ہوتا، سوائے اس دینار کے جس کو قرض کی ادائیگی میں دیتا ہو۔''(مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الترغیب فی الصدقۃ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت اور ہے، اس میں کہتے ہیں کہ: اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا ہے کہ: تم خرچ کرو تو میں تم پر خرچ کروں گا، پھر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ: اللہ کا ہاتھ بھرا ہے، اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی، وہ شب و روز اپنے خزانے لٹاتا ہے، جب سے دنیا بنی ہے وہ روزانہ ہی اپنے خزانے نازل کرتا ہے، کیا خدا کے خزانے میں کچھ کمی ہوئی؟ الخ

(مسلم، باب الحث علی النفقہ)

سرداران قریش نے آپؐ سے کہا تھا کہ اگر آپؐ نبوت و رسالت کی دعوت سے مال و زر جمع کرنا

چاہتے ہوں تو بتائیں، ہم آپؐ کو مال وزر پیش کریں گے، مگر آپؐ نے سختی سے اس خیال کی تردید کی۔

مال غنیمت میں سے آپؐ کو خمس ملتا تھا بلکہ خمس الاخماس ملتا تھا، اور یہ بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، خصوصاً خیبر وحنین میں جو مال غنیمت ملا تھا وہ بہت زیادہ تھا، لیکن آپؐ نے سب کچھ راہ خدا میں صرف کر دیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ سب سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان میں آپؐ کی جود وسخا بہت ہو جاتی تھی، تیز آندھی سے بھی زیادہ آپؐ کی سخاوت ہوتی تھی۔" (کتاب الفضائل، باب کان النبی ﷺ اجود الناس...... الخ)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کی زبان مبارک پر کسی جائز سوال کے لیے "نہیں" کا لفظ نہیں آتا تھا۔ (مسلم، کتاب الفضائل، باب ما سئل رسول اللہ ﷺ ...... الخ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے اللہ کے رسولؐ کی وہ ساری بکریاں مانگیں جو وادی میں تھیں، آپؐ نے سب کی سب اس کو دے دیں، اس نے اپنے لوگوں سے آکر بیان کیا کہ محمد ﷺ کو فقر وفاقہ کا مطلق خوف نہیں ہے، بہت بڑا عطیہ دیتے ہیں ...... الخ (مسلم، کتاب الفضائل، باب ما سئل رسول اللہ ﷺ ...... الخ)

اپنی واجبی ضرورت سے زیادہ جو بھی مال ہوتا اس کو خدا کی وہ امانت سمجھتے جو اس کے بندوں تک فوراً پہنچانی ہو۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی اور فوراً گھر میں داخل ہوئے اور فوراً نکل آئے، یہ عمل خلاف معمول تھا، صحابہ سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے، آپؐ نے فرمایا کہ نماز میں یاد آیا کہ گھر میں کچھ سونا پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا کہ رات آنے سے قبل اس کو تقسیم کر دوں، لہٰذا گھر والوں سے اس اس کی تقسیم کے لیے کہہ دیا ہے۔ (بخاری)

غرض اس طرح کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول انفاق فی سبیل اللہ میں بھی دوسروں کے لیے نمونہ تھے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳)

④ عدل وانصاف

آدمی اگر تنہائی کی زندگی گزارے اور لوگوں سے میل جول نہ رکھے اور کوئی ذمہ داری قبول نہ کرے تو عدل وانصاف سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہ پڑے اور اس کے سامنے ایسے مسائل ہی نہ

آئیں جن میں عدل وانصاف کی ضرورت پڑتی ہو۔

لیکن ایک ایسا آدمی جس کی زندگی خلوت کی نہ ہو بلکہ گھر میں اور گھر سے باہر وہ اپنوں میں اور لوگوں میں گھرا ہوا ہو اور وہ سب کا ذمہ دار بھی ہو، تو اس کے سامنے ہمیشہ ہی ایسے مسائل کا انبار رہتا ہے جس میں اس کو عدل وانصاف کی ضرورت پیش آتی ہے اور لوگوں کے نزاعی مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ گھر میں اور گھر سے باہر بھی اپنی ازواج مطہراتؓ، اہل خاندان اور متبعین میں گھرے رہتے ہیں اور آپؐ کے سامنے مسائل ومشاکل کا انبار ہوتا ہے مگر آپؐ نے سب کے حقوق ادا کیے خواہ معاشرتی ہوں یا سماجی ہوں، اور آپ نے عدل وانصاف کی وہ نظیر قائم کی کہ دنیا نوشیرواں کو بھی فراموش کرگئی، آپ کی مثال تو بہت اونچی ہے، آپ کے متبعین میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی عدل وانصاف کا وہ معیار قائم کیا کہ دنیا میں بڑے بڑے مخالفین اسلام کو بھی آپ کے عدل وانصاف کے میزان پر پورا اترنے کی گواہی دینی پڑی۔

اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں حضرت خدیجہ وحضرت زینب ام المساکین رضی اللہ عنہما کے بعد بیک وقت نو بیویاں تھیں، اور بیویوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے، اسی لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ (النساء:٤/٢)

''اگر تم کو عدل قائم نہ رکھنے کا ڈر ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا باندی پر، ظلم وزیادتی سے بچنے کا یہی بہتر راستہ ہے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (النساء:٤/١٢٩)

''اور تم سے یہ تو کبھی نہیں ہوسکے گا کہ سب بیویوں میں برابری رکھو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے، سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکی ہو۔''

لیکن اللہ کے رسولؐ کی خوبی اور آپؐ کے عدل وانصاف کو دیکھیے کہ ان میں سے کوئی بیوی آپؐ سے ادائے حقوق میں ناخوش نہ تھیں، آپؐ سب کے حقوق عدل وانصاف کے ساتھ ادا کرتے تھے، اگر کبھی دل میں کسی بیوی کی محبت کسی سے زیادہ محسوس ہوتی تو اللہ سے فرماتے کہ اس غیر اختیاری

سلوک ومحبت میں میرا کوئی دخل نہیں ہے، یعنی دل کا میلان اگر کبھی کسی بیوی کی طرف کچھ زیادہ ہو جائے تو اس کے لیے مغفرت طلب فرماتے تھے: «اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا لَا اَمْلِكُ»

یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ساری ازواج مطہراتؓ ایک حیثیت، ایک عمر اور ایک رتبہ والی نہیں تھیں، ان میں سے کوئی حسن وجمال میں فائق تھیں، کوئی کم عمر تھیں تو کوئی زیادہ عمر کی تھیں مگر ان کی باری اور ان کے اوقات کی تقسیم مبنی بر عدل تھی۔

اللہ کے رسولؐ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج مطہراتؓ کے مابین قرعہ اندازی کرتے اور جس کا نام قرعہ میں نکل آتا ان کو ساتھ لے جاتے۔ (باب فضل عائشہ رضی اللہ عنہا)

مرض الموت میں آپ کی خواہش تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بقیہ دن گزاریں اور مریض کے لیے عافیت بھی اس میں ہے کہ ایک جگہ قیام کرے، مگر اس مرض میں بھی آپ ازواج مطہراتؓ کی باری کا خیال فرماتے تھے، چونکہ قلبی رجحان ایک جگہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارنے کا تھا اس لیے آپؐ بار بار یہ دریافت فرماتے تھے کہ آج کس کی باری ہے؟ کل کس کی باری ہے؟ ازواج مطہراتؓ نے آپؐ کے قلبی رجحان کو جان کر جب بقیہ دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارنے کی اجازت دی تو آپؐ نے وفات تک کے ایام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ کو اس قدر تعلق تھا لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کبھی کوئی غلط بات کہی یا کوئی غلط حرکت آپؐ سے ہوئی تو آپؐ نے فوراً تنبیہ فرمائی۔

اسی طرح ایک مرتبہ اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی تعریف کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کچھ تحقیری کلمات کہہ دیئے، اس پر اللہ کے رسولؐ نے ان کی تنبیہ فرماتے ہوئے کہا کہ:

''اگر تمھاری بات سمندر میں بھی ڈالی جائے تو اس کا پانی گندہ ہو جائے گا۔'' (ابوداود)

غرض اللہ کے رسول نے اپنی ازواج مطہراتؓ کے درمیان جو عدل وانصاف قائم کیا وہ بینظیر تھا ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کوئی رعایت نہیں کرتے تھے، اللہ کے پیارے رسولؐ کے زمانے میں بنو مخزوم کی ایک عورت سے چوری کا ارتکاب ہوا، اللہ کے رسولؐ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، قریش کا دلی منشا تھا کہ اس کو سزا سے بچالیں لیکن آپؐ سے اس بارے میں سفارش کرنے سے ڈرتے تھے، آخر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو تیار کیا جو

آپ کے چہیتے تھے، انھوں نے اللہ کے رسولؐ سے معافی کی درخواست کی، آپؐ نے غضب ناک ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل کے تباہ ہونے کا سبب یہی تھا کہ وہ غریبوں پر تو حد جاری کرتے اور امراء کے جرائم سے پردہ پوشی کرتے تھے۔

اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

«اَتَشْفَعُ فِی حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللّٰهِ؟»

''کیا اللہ کی مقرر کردہ سزا کے نفاذ کو ٹالنے کی سفارش کرتے ہو؟''

پھر فرمایا:

«وَأَيْمُ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا »(مسلم، باب قطع السارق الشریف وغیرہ)

''یعنی اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کے جرم کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

عدل وانصاف کے قیام میں آپؐ نے اپنے سب سے چہیتے اسامہؓ کی سفارش اور کام کو ناپسند کیا کیونکہ وہ اقامت عدل کے منافی تھی، بلکہ اعلان فرمایا کہ اگر سب سے چہیتی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی کسی جرم کا ارتکاب کرے گی تو وہ محمد ﷺ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بچ نہیں جائے گی بلکہ اس پر بھی سزا کا نفاذ ہوگا۔

فتح مکہ کے بعد آپؐ طائف فتح کرنے کے ارادے سے طائف گئے، اور طائف والوں کا محاصرہ کرلیا، مگر بیس دن گزر جانے کے بعد بھی کامیابی نہ ہوئی، آپؐ نے حصار اٹھالیا، اسی اثنا میں وہاں کے رئیس صخر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی ﷺ سے اجازت لے کر طائف کا محاصرہ کیا اور اہل شہر کو اس قدر دبایا کہ وہ صلح پر آمادہ ہوگئے، جو بڑی کامیابی تھی، صخر اللہ کے رسول کی خدمت میں صلح کی خوش خبری دینے پہنچے، ان ہی کے ساتھ مغیرہ بن شعبہ ثقفی بھی اللہ کے نبیؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میری پھوپھی کو صخر نے قبضے میں کر رکھا ہے، آپؐ نے صخر سے کہا کہ ان کی پھوپھی کو آزاد کر کے ان کے گھر پہنچا دو۔

پھر آپؐ کے پاس بنو سلیم آئے، انھوں نے آپؐ سے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں صخر نے ہمارے چشمے پر قبضہ کرلیا تھا، اب ہم مسلمان ہوگئے ہیں، بنابریں ہمارا چشمہ صخر سے ہم کو واپس ملنا چاہیے، اللہ کے نبیؐ نے صخر سے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان ہوجاتا ہے تو وہ اپنے جان ومال کا مالک ہوجاتا

ہے لہٰذا ان کو ان کا چشمہ واپس کر دو۔

یہ تھا اللہ کے رسولؐ کا عدل وانصاف اپنے اور غیروں کے ساتھ، جس آدمی نے طائف کی صلح میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کا مقدمہ اللہ کے رسولؐ کی عدالت میں پیش ہوا اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی چونکہ اس کا موقف عدل وانصاف کے خلاف تھا۔

غرض کتب احادیث میں کئی واقعات مذکور ہیں جن سے آپؐ کے عدل وانصاف کے باب میں مثل کامل اور اعلیٰ معیار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اللہ کے پیارے رسولؐ کے اخلاق حسنہ کا تفصیلی تذکرے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ آج بڑی سخت ضرورت اس بات کی ہے بلکہ اللہ کے رسولؐ کے ماننے والوں اور آپؐ کی محبت کا دعویٰ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ آپؐ کے اخلاق حسنہ کو اپنائیں اور ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳) کی آیت پر عمل پیرا ہوں۔

آپؐ کے اخلاق حسنہ کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں یہاں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ آپ کے اخلاق حسنہ اور دعوت ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱/۳۳) کے دعوائے صادقہ کی دلیل واضح ہو۔

⑤ اللہ کے رسولؐ بہترین مربی

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کی دس سال تک خدمت کی، اس طویل عرصے میں آپؐ نے مجھے اُف تک نہیں کہا اور جو کام نہیں کیا تو اس کی باز پرس نہیں کی اور جو کام کیا تو اس پر اعتراض نہیں کیا۔'' (مسلم، باب کان رسول اللہ ﷺ احسن الناس خلقا)

⑥ آپ سب کے لیے رحمت تھے

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس نے نبی ﷺ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ میرے دس لڑکے ہیں لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بوسہ نہیں دیا نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔'' (مسلم، باب رحمته ﷺ ...... الخ)

⑦ آپؐ پیکر حیاء تھے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ پردہ والی باکرہ سے بھی زیادہ حیادار تھے،

آپؐ کے سامنے کوئی ناگوار بات ہوتی تو آپؐ کے چہرۂ انور پر اس کا اثر نمایاں ہوتا۔(مسلم، باب کثرة حیاء ﷺ ...... الخ)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نہ بدخلق تھے، نہ بدزبان، آپ ارشاد فرماتے تھے کہ جس کا اخلاق اچھا ہو وہی بہتر ہوگا۔(مسلم، باب ایضا)

اللہ کے نبیؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نشست فرماتے تھے

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مصلے پر تشریف رکھتے، طلوع آفتاب کے بعد آپؐ مصلے پر سے اٹھ جاتے تھے، جب آپؐ کی نشست ہوتی تھی تو صحابۂ کرام اپنے جاہلیت کے واقعات سناتے اور سن کر ہنستے بھی تھے مگر آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے (مسلم، باب تبسمہ ﷺ وحسن عشرتہ)

اللہ کے نبیؐ اور صنف نازک

ابوقلابہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ ازواج مطہراتؓ کے ساتھ تھے، انجشہ نامی آدمی ان کی سواریوں کے ذمہ دار تھے، آپؐ نے دیکھا کہ ان کی سواریاں بڑی تیزی سے ہانکی جارہی ہیں، آپؐ نے فرمایا: انجشہ ذرا دھیرے دھیرے ہانکو اور ان نازک آبگینوں کا خیال رکھو۔

ابوقلابہ کہتے ہیں کہ اگر آج کوئی آدمی عورتوں کو آبگینوں سے تشبیہ دے تو اس کی مذمت کی جائے گی (لیکن نبی ﷺ نے یہ تشبیہ دی ہے)۔(مسلم، باب فی رحمة النبی للنساء)

نبی ﷺ کے زمانے میں مدینہ میں ایک خاتون تھی، اس کا دماغ شاید کمزور تھا، وہ عورت ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ سے ملی اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میرا ایک کام ہے کر دیجئے، رسول برحقؐ نے کہا: مدینہ کی گلیوں میں سے کس گلی میں تم سے ملوں؟ پھر وہ آپؐ کو ایک گلی میں لے گئیں اور آپؐ نے ان کی ضرورت کی تکمیل فرمادی۔

اللہ کے رسولؐ اور نرمی وآسانی کا برتاؤ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر نبی ﷺ کی خدمت میں کوئی دو معاملے پیش ہوتے، ایک میں نرمی وآسانی کا پہلو ہوتا اور دوسرے میں سختی وشدت کا تو آپؐ ہمیشہ نرمی وآسانی کے معاملہ کو پسند فرماتے، البتہ نرمی اختیار کرنے میں خدا کی مرضی کی مخالفت کا پہلو ہوتا تو اس کے اختیار سے بہت دور رہتے۔(مسلم، باب مباعدتہ ﷺ للاثام)

اللہ کے رسولؐ اور بچے

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نبی ﷺ کی اقتداء میں ظہر کی نماز پڑھی، پھر آپؐ گھر کی طرف روانہ ہوئے، دروازے پر آپؐ کو بچے مل گئے، آپؐ نے سب کے گالوں پر محبت و پیار سے اپنے ہاتھ پھیرے، میرے چہرے پر بھی آپؐ نے ہاتھ پھیرا، آپؐ کے ہاتھ میں خنکی اور خوشبو کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی عطار کا خوشبو والا ہاتھ ہو۔(مسلم، باب طیب رائحة النبی ﷺ)

نبی ﷺ کبھی کبھی نماز میں طویل قیام کا ارادہ کرتے اور نماز شروع کر دیتے، مگر عورتوں کی صفوں سے کسی بچے کی رونے کی آواز آتی تو آپؐ اس خیال سے قیام مختصر فرما دیتے کہ اس بچے کے رونے سے ماں کو بے قراری ہوگی۔

لیکن اس رحم وشفقت کے ساتھ آپؐ نے تربیت کے باب میں بوقت ضرورت سختی کا پہلو اختیار کرنے کی بھی تاکید فرمائی، کہ جب بچے سات سال کی عمر کے ہوجائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو پھر دس سال کی عمر ہوجائے اور نماز میں سستی کریں تو ان کی تادیب کرو اور ان کو بستروں سے الگ کردو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کا گزر کچھ بچوں پر سے ہوا، آپؐ نے ان بچوں کو سلام کیا۔(مسلم، باب استحباب السلام علی الصبیان)

اللہ کے رسولؐ اور مریضوں کی عیادت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم میں کوئی آدمی بیمار ہوتا تو نبی ﷺ اس کے پاس جاتے اور اپنے داہنے ہاتھ سے اس کو ملتے اور دعا دیتے ہوئے فرماتے:

«أَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَائُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا» (مسلم، باب استحباب رقیة المریض)

اللہ کے نبیؐ کی تعلیمات اور جانور

ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چیونٹی نے کسی پیغمبر کو کاٹ لیا، انھوں نے چیونٹیوں کے پورے چھتے کو جلانے کا حکم دیا، اللہ کی جانب سے ان پر عتاب نازل ہوا کہ ایک چیونٹی نے تم کو کاٹا تو تم نے پوری چیونٹیوں کا چھتہ جلا دیا! یہ چیونٹیاں تو اللہ کی حمد وثنا کرتی تھیں۔ (مسلم، باب النهی عن قتل النمل)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے ایک بلی کو باندھ رکھا، نہ اس کو پانی دیا نہ کھانا، یہاں تک کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھانے سے بھی اس کو محروم رکھا، اس ایذ رسانی کی پاداش میں وہ جہنم میں گئی۔(مسلم، باب تحریم قتل الهرة)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک کتے کو شدت کی پیاس لگی، وہ کنویں کا چکر لگانے لگا، بنواسرائیل کی ایک بدچلن عورت نے اس کتے کو اس حالت میں دیکھا تو اس کو رحم آ گیا اور اس کتے کو پانی پلا دیا تو اللہ نے اس کار خیر کی وجہ سے اس کی مغفرت فرما دی۔(مسلم، باب فضل ساقی البهائم)

اس کے علاوہ اخلاق، عبادات اور معاملات کا جو باب بھی دیکھا جائے اور جس معیار پر بھی جانچا جائے اور دنیا کے بڑے سے بڑے مصلح وریفارمر، واعظ وناصح، انسانیت کے ہمدرد اور خیرخواہ کی خدمات اور ان کے اعمال کو آپؐ کے اخلاق واعمال کے مقابلے میں رکھا جائے تو آپؐ ان سب پر بہت فائق اور بھاری ہیں، آپؐ ان کے مقابلے میں آفتاب وماہتاب کی مثال رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان سچ ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾(القلم:٦٨/٤)

اور ہم کو تاکید فرمائی:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الأحزاب:٣٣/٢١)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وصلى الله وسلم وبارك على محمد وآله وصحبه أجمعين، والحمد لله رب العالمين

❁......❁......❁

اتباعِ سنتِ نبویؐ کا مفہوم کتاب وسنت واقوال سلف کی روشنی میں

مولانا عبدالسلام رحمانی، وکیل: جامعہ سراج العلوم بونڈیہار، گونڈہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على محمد سيد المرسلين وعلى آله وصحبه ومن اهتدى بهديه إلى يوم الدين، أما بعد!

میرے مقالے کا موضوع ہے: ''اتباع سنت نبویؐ کا مفہوم کتاب وسنت واقوال سلف کی روشنی میں۔''

اس موضوع پر کتاب وسنت کے نصوص اور سلف امت، ائمۂ اسلام، اولیاء عظام اور علماء کرام کے اقوال بہت زیادہ ہیں، ممکن نہیں ہے کہ اس مختصر مقالے میں ان نصوص واقوال کا معتد بہ حصہ بھی ذکر کیا جاسکتے، اسی بنا پر میں کسی خاص تبصرے کے بغیر نہایت ہی اختصار کے ساتھ بعض نصوص واقوال کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا جس سے اتباع سنت نبویؐ کا مفہوم متعین کرنے میں مدد ملے گی، ان شاء اللہ، وباللہ التوفیق۔

① سب سے پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ سنت نبویؐ سے مراد نبی ﷺ سے ثابت قولی وفعلی وتقریری تینوں طرح کی سنتیں ہیں، آپؐ نے جو فرمایا ہے وہ سنت قولی ہے اور جو کیا ہے وہ سنت فعلی ہے اور آپؐ کی موجودگی میں جو کیا گیا اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا وہ سنت تقریری ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر دین کی تکمیل فرما دی ہے، اس نے آپؐ کو دین مکمل عطا فرمایا ہے اور آپؐ نے بھی اسے بلا کم وکاست مکمل طور پر امت تک پہنچا دیا ہے، اس کا کوئی ادنیٰ

شوشہ بھی آپؐ نے امت سے چھپا کر نہیں رکھا ہے، اس لیے اب نہ دین میں کسی اضافے کی گنجائش ہے نہ شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت آپؐ کے ساتھ تھی آپؐ کو اطلاع دی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(المائدۃ:۵/۳)

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت ہدایت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا ہے۔''

طبرانی نے بہ سند صحیح یہ حدیث روایت کی: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا تَرَكْتُ شَيْئًا يُقَرِّبُكُمْ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى إِلَّا وَقَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ، وَمَا تَرَكْتُ شَيْئًا يُبْعِدُكُمْ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى إِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ» (منقول از الابداع فی مضار الابتداع، ص:۴۱)

''میں نے کوئی بھی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو تمھیں اللہ سے قریب کرنے والی ہو مگر میں نے اس کا حکم تمھیں دے دیا ہے اور کوئی بھی ایسی چیز میں نے نہیں چھوڑی، جو خدا سے تمھیں دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمھیں اس سے منع کر دیا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے دین کی کوئی بات چھپالی ہے، امت کو آگاہ نہیں کیا تو اس نے (حضرت) محمد ﷺ پر بہت بڑا الزام لگایا۔'' (صحیح مسلم)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

''جس نے اسلام میں کوئی نئی بات نکالی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ تھی اور اسے وہ دین کا کام سمجھتا ہے تو گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پیغام الٰہی پہنچانے میں خیانت کی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ ہم نے آج تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے، پس جو چیز اس دن (زمانۂ رسالت میں) دین کا کام نہیں تھی وہ آج بھی دین کا کام نہیں ہوسکتی۔'' (مقدمة السنن والمبتدعات لمحمد عبدالسلام الشقیری)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''اصلاح الرسوم'' (ص:۵۶) میں مسند احمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو کسی نے ختنہ میں بلایا، آپ نے تشریف لے جانے سے انکار کر دیا، آپ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: ہم لوگ عہد رسالت میں اس

میں نہ جاتے تھے، گویا صحابہ کرام عہد رسالت کو اپنے عمل کی نظیر ٹھہراتے تھے۔

③ رسول اللہ ﷺ کی اتباع ترک واخذ دونوں صورتوں میں لازم ہے، یعنی بحثیت دین ہم صرف وہ کام کریں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور جو کام آپؐ نے نہیں کیا ہے ہم بھی وہ کام نہ کریں کیونکہ عبادات توقیفی ہیں، جس کام کو بھی ہم عبادت وکار ثواب سمجھ کر کریں ضروری ہے کہ اس کا ثبوت کتاب وسنت میں موجود ہو۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ عیدگاہ میں ہیں، ایک شخص نے نماز عید سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنی چاہی، آپ نے اسے نفل پڑھنے سے روک دیا، اس نے کہا امیر المومنین اتنا تو میں جانتا ہوں کہ نماز پڑھنی کوئی گناہ نہیں جس کی وجہ سے مجھے عذاب ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يُثِيْبُ عَلَى فِعْلٍ حَتّٰى يَفْعَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَوْ يَحُثُّ عَلَيْهِ فَتَكُوْنُ صَلَاتُكَ عَبَثًا وَالْعَبَثُ حَرَامٌ فَلَعَلَّهُ تَعَالَى يُعَذِّبُكَ بِمَخَالِفَتِكَ لِنَبِيِّهِ»

''جب تک کسی کام کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کے قول یا عمل سے نہ ہو اس پر اللہ تعالیٰ ثواب نہیں دیتا، پس یہ تمھاری نماز ثواب سے محروم عبث کام ہوگی اور دین میں عبث کام حرام ہے اس لیے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ تمھیں نبیؐ کی مخالفت کرنے پر عذاب دے۔''(۱)

جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا تھا اس کام کے کرنے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کی مخالفت قرار دیا اور اسے موجب عذاب ٹھہرایا۔

ایک شخص امام مالک رحمہ اللہ کے پاس آیا اور پوچھا: میں احرام کہاں سے باندھوں، امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ذوالحلیفہ سے جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھا ہے، اس نے کہا میں مسجد نبویؐ سے قبر شریف کے پاس سے احرام باندھنا چاہتا ہوں، امام مالک رحمہ اللہ فرمایا: ایسا نہ کرو ورنہ مجھے تمھارے بارے میں فتنے کا خوف ہے، اس نے کہا اس میں فتنے کی بات کیا ہے، بس چند میل کا میں اضافہ کر رہا ہوں، امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

«وأی فتنة أعظم من أن ترى أنك سبقت إلى فضيلة قصر عنها رسول الله ﷺ إني سمعت الله يقول: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾(النور:٢٤/٦٣)

(۱) یہ واقعہ مولانا وحید الزماں صاحب نے موطا امام مالک رحمہ اللہ کے ترجمہ میں «باب ترك الصلاة قبل العيدين وبعدهما» کے تحت «شرح المجمع لابن الصاغاني» کے حوالہ سے اور مولانا محمد جوناگڑھی نے ''میلاد محمدیؐ'' میں بغیر حوالے کے ذکر کیا ہے۔

''اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہوگا کہ تم سمجھتے ہو تمھیں ایک زائد فضیلت حاصل ہو رہی ہے جس سے کہ رسول اللہ ﷺ قاصر رہے، میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ امر رسول کی خلاف ورزی کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنہ میں نہ پڑ جائیں یا ان پر دردناک عذاب آ جائے۔'' (حجة النبی للألبانی، ص:۱۲۰ رواہ الهروی وغیرہ عن ابن عیینه)

گویا امام مالک رحمہ اللہ نے لازم قرار دیا کہ جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھا ہے وہیں سے باندھا جائے دوسری جگہ سے نہ باندھا جائے ورنہ یہ رسولؐ کی مخالفت قرار پائے گی۔

حنفی مسلک کی معتبر ترین کتاب ''هدایة، جلد اول، کتاب الصلاة'' میں ہے کہ ''طلوع فجر کے بعد کی دو ہلکی رکعتوں کے سوا فرض وسنت کے مابین کوئی اور نماز پڑھنی درست نہیں ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ «لانه علیه السلام لم یزد علیهما» اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس وقت میں ان دو ہلکی رکعتوں سے زائد کوئی نماز ثابت نہیں ہے۔

گویا نماز ہو یا عبادت آپؐ سے ثبوت کے بغیر درست نہیں ہے۔

④ شریعت میں کتاب وسنت کی اتباع مطلوب ہے نہ کہ عمل کی کثرت وقلت، مجاہد سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بولا: میں ایک آدمی کے ساتھ سفر کر رہا تھا «فکنت اتم وکان صاحبی یقصر» پس میں دوران سفر پوری چار رکعت نماز پڑھتا تھا اور میرا ساتھی قصر کرتا تھا یعنی صرف دو رکعت پڑھتا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «بل انت الذی کنت تقصر وصاحبك الذی کان یتم» بلکہ تمھاری ہی نماز غیر کامل تھی اور تمھارا ساتھی کامل نماز ادا کرتا رہا تھا۔ (المصنف لابن ابی شیبة)

علامہ البانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی کمال فقاہت تھی کہ انھوں نے سنت رسولؐ کی اتباع کو تمام وکمال قرار دیا اور اس کی ضد کو ناقص وغیر کامل ٹھہرایا اگرچہ وہ عدد میں بھی زیادہ تھی۔ (صلاة التراویح)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی واقعتاً فقیہ ہوگا وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے تجاوز نہ کرے گا بلکہ اسے جملہ شرعی امور میں اصل قرار دے گا کہ اتباع سنت ہی تمام وکمال ہے اور ابتداع واضافہ نقص وعیب ہے۔

علی بن مطہر رافضی کا کہنا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر شب وروز میں ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا: یہ صحیح نہیں ہے، ہمارے نبی ﷺ رات میں تیرہ رکعت سے زائد نہیں پڑھتے تھے اور پوری رات نماز پڑھنی مستحب بھی نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے،

رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (یعنی رات کو کچھ دیر سو ؤ بھی کہ جسم کو راحت ملے)، اور خود آپ ؐ شب و روز میں تقریباً چالیس رکعتیں پڑھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ؐ کی سنت واتباع کی اہمیت کا صحیح علم تھا، وہ آپ ؐ کے طریقے کی اتباع کرنے والے تھے نہ کہ اس کے خلاف کوئی طریقہ اپنانے والے اور آپ ؐ کے صریح طریقے کی مخالفت کرنے والے، نیز جملہ حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہر شب و روز میں ایک ہزار رکعتیں پڑھنا ممکن بھی نہیں ہے، کھانے پینے، سونے اور بول و براز کی حاجات نیز بیویوں اور کنیزوں کے حقوق کی ادائیگی، بال بچوں کی خبر گیری اور رعایا وامور سلطنت کی دیکھ بھال وغیرہ گونا گوں مصروفیات تھیں جو لازماً شب و روز کا کم وبیش نصف وقت لیتی رہی رہوں گی، باقی نصف وقت میں ایک ہزار رکعتیں پڑھنی کیوں کر ممکن ہوسکتی ہیں، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات سے بغیر اعتدال وطمانیت کی نماز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور ان کی ذات اس بات سے اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ منافقوں کی سی نماز پڑھنی گوارہ کریں اور مرغ کے چونچ مارنے کی طرح جلدی جلدی نماز پڑھیں، جبکہ صحیحین میں جلدی جلدی نماز پڑھنی منافقوں کی نماز قرار دی گئی ہے۔ (المنتقی من منهاج الاعتدال، ص:١٦٩، ١٧٠)

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین آدمی (حضرت علی وعبداللہ بن عمرو بن العاص وعثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم) ازواج مطہرات ؓ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کے لیے آئے، جب ان حضرات کو آپ ؐ کی عبادت کا علم ہوا تو انھیں مقدار عبادت کم نظر آئی، وہ کہنے لگے، ہم کو بھلا رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات سے کیا نسبت ہوسکتی ہے، آپ ؐ تو بخشے بخشائے ہیں، آپ ؐ کے لیے اتنی ہی عبادت بہت ہے، پھر ایک صاحب بولے: میں تو پوری پوری رات نماز پڑھوں گا کچھ بھی نہ سوؤں گا، دوسرے نے کہا: میں تو ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی بے روزہ نہ رہوں گا، تیسرے نے کہا: میں تو عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا کبھی شادی ہی نہ کروں گا، (تاکہ عبادت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو) رسول اللہ ﷺ کو جب ان تینوں حضرات کی یہ باتیں معلوم ہوئیں تو آپ ؐ ان سے ملے اور فرمایا: کیا تم ہی لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے، خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی و پرہیز گار ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور بے روزہ بھی رہتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں (مشكاة، باب الاعتصام بالكتاب والسنة)۔

گویا شریعت میں مطلوب عبادت کی کثرت نہیں اتباع سنت ہے، ہمارے اسلاف کرام میں کثرت عبادت کا بھی رجحان وجذبہ رہا ہے اور ان کی زندگی میں اس کے نمونے بھی خاصے ملتے ہیں

مگر متعدد احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ سنت رسولؐ سامنے آنے پر کثرت عبادت کا جذبہ اتباع سنت کے جذبہ پر غالب ہو رہا ہے تو آپؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ایسی صورت حال میں اس رجحان کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

⑤ یہ حقیقت آپ کے علم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت قولی ہو یا فعلی اس کے مقابل کسی کا بھی قول و فعل ٹھہر نہیں سکتا خواہ وہ صحابہ کا ہو یا ائمہ کا یا کسی بھی عظیم سے عظیم تر شخصیت کا، نہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے بہتر کسی کا طریقہ ہوسکتا ہے، نہ آپؐ کے فرمان پر مقدم کسی کا فرمان ہوسکتا ہے۔

یہ کتاب وسنت سے ثابت ایک مسلمہ حقیقت ہے، اس اختصار میں ان آیات واحادیث کا ذکر تو ممکن نہیں ہے کہ اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے البتہ میں بہت ہی اختصار کے ساتھ صرف بطور نمونہ بعض صحابہ کرام وائمہ عظام واکابر امت کے کچھ اقوال آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں، آپ بغور ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان بزرگوں کو حق پر قائم رکھنے والی چیز کیا تھی اور ان آیات واحادیث کے سبب ان کے سوچنے کا انداز کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ہم بھی اپنے سوچنے کا انداز درست کرلیں اور اپنے مصنوعی حصاروں سے نکل کر قبول حق کے جذبے سے کھلے ذہن کے ساتھ ان آیات واحادیث اور ان بزرگوں کے فرمودات پر غور کریں اور ان نصیحتوں پر عمل کریں تو مختلف مسلکی گروہوں میں بٹے ہوئے اہل ایمان کا اسی صراط مستقیم پر گامزن ہوجانا کچھ مستبعد نہیں ہے جس پر اللہ کے رسولؐ نے امت کو چھوڑا تھا، یہ ناممکن ہے کہ پوری امت محمدیہ حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی بھی شخص واحد کی پیشوائی وپیروی پر مجتمع ہوجائے لیکن اس قدوۂ کامل سید الاولین والآخرین فداہ آباء نا وامھاتنا علیہ الصلوات والتسلیمات کی پیشوائی پر اہل ایمان کو مجتمع کرنا بہت مشکل نہیں ہے جس پر صدیوں تک اہل ایمان مسلکی گروہوں میں منقسم ہوئے بغیر مجتمع رہ چکے ہیں، بھلا اس رہبر کاملؐ کے سوا کون ہے جو اہل ایمان کے سب فرقوں کے لیے بلا نزاع مرکز اتصال بن سکتا ہو۔

ملاحظہ فرمائیں اس موضوع پر سلف امت کے سوچنے کا انداز کیا تھا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے تو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پس اللہ کی تعریف کی اور اس پر ثنا بھیجی اور فرمایا: اے لوگو! تمھارے لیے اللہ ورسولؐ کی طرف سے کچھ طریقے مقرر کیے گئے ہیں اور کچھ فرائض لازم کیے گئے ہیں اور تم ایک واضح راستے پر ڈالے گئے ہو، پس خبردار تم اس سے کچھ دائیں یا بائیں مائل ہوکر لوگوں کو گمراہ نہ کردینا۔ (اخرجہ ابن عبدالبر فی جامع العلم:۲/۱۸۷ عن سعید ابن المسیب)

نیز فرمایا: اَلسُّنَّةُ مَا سَنَّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا تَجْعَلُوا خُطأَ الرَّاٴيِ سُنَّة لِلْاُمَّةِ طریقہ تو بس وہی ہے جو اللہ و رسولؐ نے مقرر کیا، لوگوں کی قیاسی خطاؤں کو امت کا طریقہ نہ بناؤ۔

(تاريخ التشريع الاسلامی، ص:۹۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: لوگو! رائے تو بس رسول اللہ ﷺ کی درست ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھاتا ہے، ہماری رائیں تو بس ظن وتکلف پر مبنی ہوتی ہیں۔

(اخرجه ابن عبدالبر فی جامع العلم:۲/۱۳٤)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو نصیحت کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور ہمیشہ یہ نصیحت فرماتے تھے کہ بس اللہ کا کلام اور رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اختیار کرو، اللہ کے کلام سے افضل کوئی کلام نہیں اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے بہتر کوئی طریقہ نہیں اور سب سے برے کام محدثات ہیں اور تمام محدثات بدعت ہیں۔(حوالہ مذکور:۲/۱۸۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے ایک مسئلہ پوچھا: انھوں نے حدیث رسولؐ پڑھ کر اس کا جواب دے دیا، سائل نے اس پر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا قول پیش کیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سخت غضب ناک ہوئے اور فرمایا:

«يُوشِكُ أَنْ تَنزِلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِنَ السَّمَاءِ أَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُولُ قَالَ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ»

’’قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برسا دیے جائیں، میں تو کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور تم حدیث رسولؐ کے مقابل ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا قول پیش کرتے ہو۔‘‘(رفع الملام عن الائمة الاعلام لابن تیمیہ، ص:۳۲، طبع قطر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بابت مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حج قران کے ساتھ لبیک پکارا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی آواز سنی تو لوگوں سے پوچھا وہ کون ہیں؟ بتایا گیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا: «ألم تعلم أنی نهيت عن هٰذا» ’’کیا آپ کو معلوم نہیں ہے؟ میں نے اس سے منع کیا ہے۔‘‘ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: «بلى ولكنى لم أكن ادع قول النبى ﷺ لقولك» ’’کیوں نہیں، سنا تو ہے، لیکن میں آپ کے فرمان کے سبب رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘ (طحاوی:۱/۳۷۶)

ایک اور روایت میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’میں کسی کے قول کے سبب رسول اللہ ﷺ

کی سنت نہیں چھوڑ سکتا، میں نہ تو نبی ہوں نہ میرے پاس وحی آتی ہے لیکن میں حتی الوسع بس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرتا ہوں۔'' (الابداع فی حضار الابتداع، ص:۲۲)

حضرت سالم بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شامی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا، تمتع کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: تمتع درست ہے، شامی نے کہا: آپ کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو تمتع سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: «أ أمر أبی يتبع أم أمر رسول الله؟» ''کیا میرے باپ کے حکم کی پیروی کی جائے گی یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟'' اس نے کہا بے شک رسول اللہ ﷺ کا حکم مقدم ہوگا، فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے تمتع کا حکم دیا ہے۔

(رواہ الترمذی، وقال هذا حديث حسن صحيح)

حضرت مولانا علی میاں صاحب نے تاریخ دعوت وعزیمت (۱۶۴/۲) میں ذکر کیا ہے کہ کسی نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو لکھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی اس کے قائل ہیں کہ اللہ عالم الغیب نہیں ہے، اس کے جواب میں حضرت مجدد الف ثانی نے تحریر فرمایا: ''فقیر کو ہرگز اس طرح کی باتیں سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آ جاتی ہے اور ایسے اقوال کی تاویل وتوجیہہ کی فرصت نہیں دیتی، اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر یمنی کا ہو یا شیخ اکبر شامی کا، ہمیں محمد عربی ﷺ کا کلام درکار ہے نہ کہ محی الدین ابن عربی وصدر الدین قونوی وعبدالرزاق کاشی کا، ہم کو نصوص کتاب وسنت درکار ہیں نہ کہ فصوص الحکم، فتوحات مدنیہ (یعنی تعلیمات کتاب وسنت) نے ہم کو (شیخ اکبر کی) ''فتوحات مکیہ'' سے مستغنی کر دیا ہے۔''

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أياكم والقول فی دين الله تعالى بالرأی وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل»

''اللہ تعالیٰ کے دین میں رائے وقیاس سے کوئی بات نہ کہو اور اپنے اوپر سنت کی اتباع لازم کرلو، جس شخص نے سنت سے قدم باہر نکالا وہ گمراہ ہوگیا۔'' (الميزان الكبرى للشعرانی)

نیز فرمایا: ''میری کوئی بات کتاب اللہ وحدیث رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہو تو میرا قول چھوڑ دو۔''

(ايقاظ الهمم للفلانی، ص:۵۰)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ہمارا قول صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی ہو جاتا ہے تو پہلے اسے دیکھو، اگر وہ کتاب وسنت کے مطابق ہو تو لے لو، اور کتاب وسنت کے خلاف ہو تو چھوڑ دو۔''

(ابن عبدالبر فی الجامع:۳۲/۲)

نیز فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کا ہر قول قابل قبول ہو۔''

(حوالہ مذکور:۲/۹۱)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اگر تم میری کتاب میں سنت رسولؐ کے خلاف کوئی چیز پاؤ تو سنت رسولؐ کو اختیار کرو اور میری بات چھوڑ دو، اور سنت کے مقابل کسی بھی شخص کے قول کی طرف التفات نہ کرو۔'' (ذکرہ الھروی والنووی والفلانی وغیرھم)

نیز فرمایا: ''اگر میرا کوئی قول حدیث رسولؐ کے خلاف آ جائے تو میں اپنے اس قول سے اپنی زندگی میں بھی رجوع کرتا ہوں اور مرنے کے بعد بھی۔'' (ذکرہ الھروی والنووی والفلانی وغیرھم)

امام شافعی رحمہ اللہ نے تمام صحابہ وتابعین اور ان کے بعد والوں کا اجماع اس بات پر نقل کیا ہے کہ جس شخص کو بھی سنت رسولؐ کا علم ہو جائے پھر اس کے لیے جائز نہیں کہ کسی کے قول کے سبب سنت نبیؐ کو ترک کر دے، امام شافعیؒ یہ اجماع نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''بیشک یہی حق ہے کہ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، بھلا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ شارع معصوم ﷺ کے نصوص وفرمودات چھوڑ دیے جائیں اور دوسروں کے اقوال لے لیے جائیں جن سے خطائیں بھی ہو جاتی ہیں، بیشک ہر شخص کی بات قابل قبول بھی ہو سکتی ہے اور قابل رد بھی لیکن ذات رسالت صلوات اللہ وسلامہ علیہ کی کوئی بھی بات رد نہیں کی جا سکتی، اس کے ثبوت میں آیات بہت زیادہ ہیں۔ (الابداع، ص:۲۰)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«من رد حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو على شفا هلكه»

''جس نے حدیث رسول اللہ ﷺ کو رد کر دیا وہ ہلاکت کے کنارے پر ہے۔''

(ابن الجوزی، ص:۱۸۲)

نیز فرمایا: ''تم نہ میری تقلید کرنا نہ مالک، نہ شافعی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی، وہیں سے دین لینا جہاں سے ان حضرات نے لیا ہے۔'' (الفلانی وابن القیم)

اور فرمایا: ''اوزاعی اور مالک کی رائے، ابوحنیفہ کی رائے سب رائے ہے اور ان سب کی حیثیت میرے نزدیک یکساں ہے، دلیل تو بس حدیث رسولؐ میں ہے۔'' (ابن عبدالبر فی الجامع:۲/۱۴۹)

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فتوح الغیب کے دسویں مقالے میں فرماتے ہیں:

«أدخل في الظلمة بالمصباح وهو الحاكم كتاب الله وسنة رسوله ﷺ لا تخرج عنهما، فإن خطر خاطر أو وجد الهام فأعرضهما على الكتاب والسنة»

''اندھیرے میں چراغ کے ساتھ داخل ہو اور چراغ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے، ان دونوں سے قدم باہر نہ نکالو، اگر دل میں کوئی بات کھٹکے یا کوئی الہام محسوس ہو تو ان دونوں کو کتاب وسنت پر پیش کرو۔''

اور ۳۶ ویں مقالے میں فرماتے ہیں:

«اجعل الكتاب والسنة أمامك وانظر فيهما واعمل بهما ولا تغتر بالقيل والقال»

''کتاب وسنت کو اپنے سامنے رکھو، انھی دونوں میں غور کرو اور انھی دونوں پر عمل کرو اور اس دھوکے میں نہ آؤ کہ فلاں کا قول یہ ہے اور فلاں مسئلہ میں یہ بات کہی گئی ہے۔''

نیز فرمایا: «السلامة مع الكتاب والسنة والهلاك مع غيرهما»

''سلامتی کتاب وسنت کے ساتھ ہے اور ان دونوں کے سوا میں ہلاکت ہے۔''

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اپنے وصایا میں فرماتے ہیں: ''ہمیشہ فروعات فقہیہ کو کتاب وسنت پر پیش کرنا چاہیے جو موافق ہو قبول کریں ورنہ اس سے اعراض کریں، کتاب وسنت پر پیش کیے بغیر چارہ نہیں اور ایسے فقیہ کی بات نہ سننی چاہیے کہ جس نے ایک ہی امام کی تقلید لازم پکڑ کر احادیث نبویہؐ کی طرف توجہ چھوڑ دی ہے، ان جیسوں کی طرف توجہ نہ کرنا، خدا کا تقرب ان سے دور ہی رہنے میں حاصل ہوسکتا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ میت کو قبر میں قبلہ کی طرف سے اتارا جائے اور امام شافعی وغیرہ کے نزدیک سل یعنی پائتانے کی طرف سے کھینچ کر اتارنا افضل ہے، مولانا گنگوہی رحمہ اللہ بطور دلیل فرماتے ہیں:

«هذا هو المذهب عندنا لكون فعل النبى ﷺ والسل فعل الصحابة»

(الکوکب الدری:۱/۳۲۰)

''یہی ہمارا مذہب ہے، کیونکہ یہی فعل رسولؐ ہے اور سل صحابہ کا فعل ہے، گویا فعل نبویؐ کے خلاف صحابہ کا فعل بھی حجت نہیں بن سکتا۔''

فقہائے حنفیہ نے یہ بات بطور اصول ذکر کی ہے:

«سنة الرسول أقوى من سنة الصحابة» (کشف اصول البزدوی، ص:۳۰۸)

''رسول اللہ ﷺ کی سنت صحابہ کی سنت سے قوی تر ہوتی ہے۔''

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے:

«لا حجة في الشيوع والكثرة بعد عهد النبي ﷺ فإن العبرة بما كان في عهد صاحب النبوة» (فيض الباری:۳/٤٤٨)

''یعنی نبی ﷺ کے بعد کسی عمل کی اشاعت وکثرت کوئی شرعی حجت نہیں ہے، بلکہ اعتبار اسی عمل کا ہوگا جو عہد نبویؐ میں موجود تھا۔''

مذکورہ فرمودات واصول پر اہل ایمان اگر توجہ دیں اور کھلے دل ودماغ سے اسے قبول فرمالیں تو یقیناً اس تحزب مسلکی اور گروہی عصبیت کی لعنت سے ملت اسلامیہ کو نجات مل جائے اور دین ومسائل دین کو سمجھنے کے لیے وہی دور خیر القرون کا انداز پیدا ہو جائے، آمین!

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه!

اطاعت رسولؐ نصوص وواقعات کی روشنی میں

مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی ،استاذ: جامعہ سلفیہ، بنارس

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على محمد سيد المرسلين وعلى آله وصحبه ومن اهتدى بهديه إلى يوم الدين، أما بعد:

دائمی اور ابدی دنیوی واخروی فوز وفلاح کے ضامن محسن انسانیتؐ، رحمۃ للعالمینؐ اور سب سے بڑھ کر ربانی تعلیمات اورالٰہی وسرمدی قوانین کا علمی وعملی طور پر نفاذ کرنے والے، بھٹکتی ہوئی انسانیت کے سچے رہنما محمد رسول اللہ ﷺ جامع پیغام حیات لے کر اس دنیا کے اندر جس وقت تشریف لائے اس وقت پوری دنیا میں انسانیت دم توڑ رہی تھی، پوری انسانی مخلوق شتر بے مہار کی طرح بے مقصد زندگی گزار رہی تھی، اس کے پاس نہ کوئی لائحہ عمل تھا اور نہ ضابطۂ حیات، وہ ضلالت وگمراہی اور شرک کی آلائشوں سے پوری طرح آلودہ ہوگئی تھی، حضرت عیسیٰ وموسیٰ علیہما السلام کے ماننے والے ان کی تعلیمات کو چھوڑ کر گم گشتہ راہ بن چکے تھے، اپنے انبیاء کے صحیح راستے سے ہٹ کر مغضوب علیھم اور ضالین کے خطاب کے مستحق ہو چکے تھے، ایسے وقت میں ایک ایسے کامل رہنما کی ضرورت تھی جو بنی نوع انسان کی رہنمائی ربانی، تعلیمات کی روشنی میں کرے، ان کو ایک ایسے مکمل وغالب دین سے روشناس کرائے جوان کی دنیا وآخرت میں کامیابی وکامرانی کا ضامن ہو، وہ تمام نقائص وتضادات سے پاک ہو، انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات میں اس کی تعلیمات رہنما ثابت ہوں، کوئی گوشہ تشنہ نہ ہو کہ وہ اس میں دوسروں کا دست نگر رہے، غیروں کی خوشہ چینی کا محتاج ہو، کسی اور کا منتظر ہو جو اس

کے ابدی و مکمل پیغام میں کسی طرح تکمیل کا دعویٰ کرے بلکہ وہ ہر طرح سے کامل و اکمل ہو جس نے پورے اطمینان و وثوق سے جم غفیر اور مجمع عام میں بہ بانگ دُہل اعلان کر دیا ہو کہ:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدۃ:۵/۳)

''آج دین مکمل ہو چکا، اس کے ساتھ ہی نعمتیں بھی تمام ہو گئیں اور دین اسلام ہی رب کریم کے یہاں پسندیدہ دین ٹھہرا۔''

اس تکمیل دین کے بعد اس دین میں کسی قسم کے حک و اضافہ کی گنجائش نہیں کہ ﴿ذلك تقدیر العزیز العلیم﴾ اس دین کا شارع رب کریم ہے جو ابتداء سے انتہا تک تمام انسانی ضروریات سے باخبر ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے اس علیم و خبیر، قادر مطلق و توانا ذات نے اس سرمدی شریعت کو نازل کر دیا ہے، اس میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ کوئی دنیوی ترقی کے لیے مشرق و مغرب کی خوشہ چینی کرے، اصوُل و قوانین اور شریعت میں دوسروں کو نمونہ ٹھہرا کر اس میں تراش خراش کی ضرورت محسوس کرے، اور نہ تطہیر اور تزکیۂ نفس کے لیے ہندی جوگین اور عجمی تصوف کا محتاج ہو، اس کے یہاں تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواہ عبادات ہوں یا معاملات، سیاسیات ہوں کہ اقتصادیات، ثقافت ہو یا معاشرت سب کے لیے واضح تعلیمات اور عملی نمونے موجود ہیں جن کو اپنا کر ایک مومن انسان ہر طرح کی کامیابی سے سرفراز ہو سکتا ہے، کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں وہ پیغام الٰہی ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ (النجم:۵۳/۳۔۴)

''وہ اپنی نفسانی خواہش سے نہیں بولتا (بلکہ) وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی گئی ہے۔''

آپؐ اسی پیغام حیات کو لے کر آئے تھے اور اس کو عملی طور پر پیش فرما کر اس دنیا سے رحلت فرما گئے، اب آپؐ کی کامل اتباع کے بغیر کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی آپ کی اطاعت و اتباع میں مضمر ہے اور ان کی مخالفت کفر کے مرادف ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۴/۸۰)

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾(المائدة:٥/٤٤)

''جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے احکام سے فیصلہ نہ کریں گے وہی کافر ہیں۔''

مومن کے ایمان کی علامت محبت الٰہی ہے، مومنین کی سچی وگہری محبت اللہ ہی سے ہوا کرتی ہے، عباد غیر اللہ بھی اپنے معبودوں سے محبت کرتے ہیں مگر مومن کی اللہ تعالیٰ سے محبت زیادہ سچی اور گہری ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾(البقرة:٢/١٦٥)

''اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے سوا اور معبود بناتے ہیں ان (بناوٹی معبودوں) سے ایسی محبت کرتے ہیں، جیسی خدا سے چاہیے اور جو مومن ہیں وہ دلی لگاؤ سب سے زیادہ اللہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔''

محبت الٰہی کا کھوکھلا دعویٰ کچھ بھی مفید کار نہیں جبکہ وہ اتباع رسولؐ سے عاری ہو، اطاعت رسولؐ ہی محبت الٰہی کی آئینہ دار ہے، اطاعت الٰہی اطاعتِ رسول کو لازم ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(آل عمران:٣/٣١)

''اے رسولؐ! تو کہہ دے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو (خیالات شرکیہ چھوڑ کر) میرے پیچھے چلو۔ خدا تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا، خدا بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

اللہ تعالیٰ اور قیامِ قیامت پر اگر دعویٰ ایمان ہے تو پھر ہر حال میں اطاعت رسول کو حرز جان بنانا ضروری ہے اور ہر مشکل وقت میں اسی کے فرمان کی طرف رجوع کرنا حتمی اور لازمی، ذات باری اور یوم آخرت پر ایمان کی علامت اور شرط اولین انابت الی اللہ اور رجوع الی سنت رسول اللہ ﷺ ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾(النساء:٤/٥٩)

''مسلمانو! اللہ اور رسول (ﷺ) اور اپنے میں سے فرمانرواؤں کی تابعداری کیا کرو پھر اگر کسی معاملے میں تم (افراد) میں جھگڑا پڑے تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیرو، اگر تم

اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔''

ہر انسان چاہے وہ علم وفضل کی بلندیوں کو سر کر چکا ہو اور فضل وکمال کا امام کہلاتا ہو، اس کی ہر بات لائق اتباع، اس کا ہر فرمان موجب اطاعت اور ہر نہی وتنبیہ باعث احتراز اور لائق تعمیل نہیں سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے اور یہی مطلب ہے امام دارالہجرت مالک رحمہ اللہ کے اس قول کا «کل یوخذ بقوله ویرد علیه إلا صاحب هذا القبر» اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۵۹/۷)

''جو کچھ رسول دیں اسے قبول کیا کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جایا کرو۔''

اس آیت کی مناسبت سے صحیحین کے اس واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی، عرض کیا کہ آپؓ ہی فرماتے ہیں:

«لَعَنَ اللّٰهُ النَّامِصَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ» (الحدیث)

''نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: اللہ کی لعنت ہے بال اکھیڑنے والی اور بال اکھڑوانے والی اور گودنا گودنے والی اور گودنا گودوانے والی پر۔''

آپ نے فرمایا: ہاں تو اس نے کہا کہ میں نے کتاب اللہ کو شروع سے اخیر تک پڑھا ہے، اس میں آپؓ کا یہ ارشاد نہیں پاتی، آپ نے فرمایا: اگر تم نے صحیح معنوں میں اسے پڑھا ہوتا تو ضرور پاتی، کیا اس فرمان الٰہی کو تم نے نہیں پڑھا ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۵۹/۷) عورت نے جواب دیا کہ ہاں پڑھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

«لَعَنَ اللّٰهُ النَّامِصَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ»[1]

اسلام کا مطلب ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر سپرد کر دینا، نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اسی کے سامنے سر ٹیک دینا، احکام وقوانین کو اس طرح سے مان لینا کہ ساری کشش اور فوز وفلاح اسی دین کی اتباع میں ہے، اس کے علاوہ جو بھی دین ہے وہ قابل قبول نہ عند الناس ہے اور نہ عند اللہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

(آل عمران:۳/۸۵)

---

(۱) صحیح البخاری مع الفتح:۱۰/۳۱۷، ومسلم:۲/۲۰۵

''اور جو کوئی سوائے اسلام کے اور دین تلاش کرے گا ہرگز اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔''

دنیا وآخرت کی کامیابی کا راز بھی اتباع رسولؐ اور اطاعت محمدیؐ میں ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾(الأحزاب:۳۳/۷۱)

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعداری کرے گا وہ ضرور مراد پائے گا۔''

معاملہ صرف کامیابی وعدم کامرانی کا نہیں بلکہ عدم اتباع اور نافرمانی رسولؐ میں ایمان کا ضیاع اور دین اسلام سے مکمل خروج کا مسئلہ ہے، اگر مرد مومن قضاء نبویؐ سے راضی نہیں، حکم محمدیؐ سے سرتابی کرتا ہے اور فیصلہء رسولؐ سے خوش نہیں تو پھر اس کے ایمان کی بھی خیر نہیں، مومنین کے مقدس زمرہ سے خارج ہے، نگاہ ودل کی مسلمانی کی ترجمانی قول وعمل کے صبغۃ اللہ میں مصبوغ ہونے سے ہے، اتباع نبویؐ کی مکمل پیروی واطاعت میں، اس کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہو اور تسلیم ورضا کا یہ عالم ہو کہ اس کے فیصلے پر سر تسلیم خم ہو، دلشاد ہو اور داخلی وخارجی، ظاہری وباطنی طور پر مکمل راضی برضا، ورنہ کیا ہے کہ اس کے حکم سے دل راضی نہیں اور اس کی تعمیل میں تردد واعتراض ہے اور پھر دامن ایمان کی دولت سے پُر بھی:

ایں خیال است محال است وجنوں

مسلمانو! اگر دعویٰ ایمان میں صادق ہو تو فرمان ربانی کو سنو اور اپنے اعمال کی روشنی میں اپنے ایمان کی خبر لو۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾(النساء:۴/۶۵)

''پس تیرے رب (یعنی ہم کو اپنی ذات بابرکات) کی قسم ہرگز یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک آپس کے جھگڑوں میں تجھ ہی کو منصف نہ بناویں گے، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے ناراض نہ ہوں گے بلکہ اس کو (بخوشی) قبول کرلیں گے۔''

یہ آیت کریمہ ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی، جیسا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے پتھریلی زمین کی ایک نہر کے بارے میں جس سے کھجور کے درختوں کو سیراب کیا جاتا تھا، جھگڑا کیا، انصاری نے کہا پانی آگے گزرنے دو (تم اپنے درخت کو ابھی سیراب نہ کرو) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کو نہ مانا، یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں فیصلے کے لیے حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے زبیرؓ (ضرورت کے مطابق اپنے درختوں کو) سیراب کر لے اور پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے پاس جانے دے، اس پر انصاری کو غصہ آ گیا، کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ یہ اس لیے کہ پھوپھی زادے ہیں (آپؐ ایسا فیصلہ کر رہے ہیں) یہ سن کر حضور ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، پھر آپؐ نے فرمایا: زبیرؓ! تم (اپنے درختوں کو) سیراب کر لو اور پھر پانی روک رکھو تا کہ منڈیر بھر جائے (اتنا بھرنے کے بعد اس کے لیے پانی چھوڑ دو) حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾(النساء:٤/٦٥)

اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ ماننا جس طریقے سے آپؐ کی زندگی میں فرض تھا آپؐ کے مرنے کے بعد بھی آپؐ کے تمام فرمودات وارشادات کا تسلیم کرنا ایمان کی علامت ہے، صحابہ کرام ومحدثین عظام اور سلف صالحین نے آپؐ کے تمام فیصلہ جات کو اپنی بے انتہا کاوشوں سے محفوظ کر دیا ہے، لہٰذا اس آیت کریمہ اور اس کے شان نزول کی روشنی میں ہر مومن کا دائرہ کار متعین ہو جاتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کرے، وہ اپنے تمام چھوٹے بڑے مسائل کا حل آپؐ کی احادیث میں تلاش کرے، آپؐ کے فیصلے کو ماننا اور تسلیم کرنا ہی ہمارے ایمان کے لیے کسوٹی ہے، اس کے بغیر ہمارا دعویٰ ایمان جھوٹا ہے۔

لیکن افسوس کہ آج کا مسلمان رسول اللہ ﷺ کے فیصلے اور حکم سے آزاد ہو چکا ہے، عبادات اور عام دینی امور میں وہ اپنے خود ساختہ آقاؤں کے فیصلے سے راضی ہی نہیں بلکہ تمام امور میں ان ہی کے اقوال وافعال اور ان کے نام پر رائج کیے گئے چھوٹے بڑے مسائل کو حرف آخر سمجھتا ہے، ایک طرف نبی کریم ﷺ کا اسوہ، بعض دعوے داران اسلام کے نزدیک ایک ایسا لا ینحل معمہ بن چکا ہے جس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا دین سے خروج کے مترادف ہے، تو دوسری جانب ایک جماعت کے لیے یہ نظام فرسودہ ہو چکا ہے، رسول رحمتؐ کی کوئی بات اگر قبول کی جاتی ہے تو اس کا ان کے پیشواؤں کے قول کے موافق ہونا ضروری ہے، الغرض تابع کو متبوع اور متبوع کو تابع کا درجہ دے دیا گیا ہے، آج کا مسلمان یہ جانتا ہی نہیں کہ ہمارے تمام مسائل کا حل اور تمام اختلافات کا فیصلہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے فرمودات میں موجود ہے، اسی کی پیروی کر کے وہ دنیا وآخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور اس کو چھوڑ کر اسلام کے زمرہ سے خروج اور دین محمدیؐ سے بغاوت کر رہا ہے۔

ہم کیسے مسلمان ہیں کہ نہ ہمارے پاس کوئی شرعی عدالت ہے اور نہ اس کے اقدام کا احساس ہی ہے، ہم تمام مقدمات میں غیروں کے فیصلہ سے راضی ہیں۔ دینی امور میں خواہش نفس کی اتباع کرتے ہیں تو تمام دنیوی معاملات میں غیروں کے خوشہ چیں ہیں۔ ان تمام کے باوجود ہم سچے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم کو اس زیاں کا ذرہ برابر احساس بھی نہیں:

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

کسی مومن مرد و عورت کے لیے کوئی گنجائش اور اختیار نہیں کہ جب اللہ و رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو اسے قبول نہ کرے، اگر وہ نافرمانی اور حکم عدولی کرتا ہے تو پھر وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾(الأحزاب:۳۶/۳۳)

’’کسی مسلمان مرد یا عورت کو لائق نہیں کہ جب کسی (دین کے) کام میں خدا اور اس کے رسولؐ (ان کے متعلق) فیصلہ کر دیں تو ان (مسلمانوں) کو اپنے کام میں اختیار باقی ہو (ان کو لائق نہیں کہ چون و چرا کریں) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے وہ صریح گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔‘‘

جو مدعی ایمان ہے اور اللہ و رسولؐ کے فرامین کے ملنے کے بعد بغاوت کرتا ہے وہ عقاب شدید کا سزاوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾(الأنفال:۱۳/۸)

’’اور جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے (ایسے کافروں کے لیے) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔‘‘

سنت نبویؐ اور ہدایت مصطفویؐ سے جن کو اختلاف و شقاق ہے، وہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ وہ نہایت ہی بری جگہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾(النساء:۱۱۵/۴)

’’اور جو شخص ہدایت کے معلوم ہونے کے بعد رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور مومنوں کے خلاف راہ کی اتباع کرے گا تو جس طرف اس نے رخ کیا ہے ہم اسی طرف اس کو پھیر

دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو بہت بری جگہ ہے۔''

ہر وہ عمل جو اسوۂ نبویؐ پر پورا نہ اترتا ہو وہ عمل وبال جان اور مردود ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾(الأحزاب:۲۱/۳۳)

''اللہ کے رسول میں تمھارے لیے عمدہ نمونہ ہے یعنی ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور یوم آخرت کی بہتری کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

ارشاد نبویؐ ہے: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارا عمل نہ ہو تو وہ مردود ہے۔''

اگر کوئی اچھی بات سننا اور بولنا چاہتا ہے اور وہ اپنے آپ کو مومن کہتا ہے، بہترین ہدایت اور سچی راہنمائی کا طالب ہے، صراط مستقیم کو اپنانا چاہتا ہے اور برے امور سے بچنے کی فکر میں ہے تو اس کے لیے ایک راہ معین ہے کہ وہ کتاب اللہ کو سنے، اس کی تلاوت کرے اور سنت نبوی پر گامزن ہو۔

ارشاد رسول ﷺ ہے:

«فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ »[2]

''بہتر بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت نبی ﷺ کی ہدایت ہے اور تمام امور میں سب سے بری چیز بدعات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

اگر انسان جنت کا طالب ہے اور امت محمدیؐ کہلانے کا مستحق ہونا چاہتا ہے تو سب سے پہلے در در سے سر ٹکرانے کے بجائے اطاعت رسول اللہ ﷺ کو اپنے اوپر لازم ٹھہرائے، ورنہ امت محمدیؐ ہونے کا زبانی دعویٰ غرور نفس کے سوا کچھ بھی نہیں، فرمان نبویؐ ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قِيلَ وَمَنْ أَبَى؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى »[3]

''اللہ کے نبی فرماتے ہیں کہ میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا، مگر جس نے انکار کیا، کہا گیا

---

(۱) صحیح البخاری مع الفتح:۳۱۷/۱۳

(۲) صحیح مسلم:۲۸٤/۱

(۳) صحیح البخاری مع الفتح:۲۱٤/۱۲

کس نے انکار کیا؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی تحقیق کہ اس نے انکار کیا۔"

سنی خوش نصیب کو باغ وبہار ہے
بدبخت بدعتی کو جہنم کی مار ہے

یہ امت محمدیؐ ہے جو اطاعت رسولؐ سے روگردانی اور طریقۂ نبویؐ سے انکار کے باعث جہنمی ہے، ایمان کی کسوٹی عمل ہے۔ بندۂ مومن اپنے آپ کو اطاعت محمد ﷺ کے تابع کرے، اگر اپنی تمام خواہشات کو فرمان نبویؐ کے تابع نہیں کرتا تو مومن نہیں، اگر کوئی من پسند دین کا طالب ہے اور خواہشات نفس کا بندہ تو وہ مومن نہیں۔ فرمان نبویؐ ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونُ هَوَاهُ تَبْعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ »(شرح السنة)

"تم میں کا کوئی (شخص) مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کی خواہشات میری شریعت کے تابع ہوجائیں۔"

مجرد عقل ورائے کی بنیاد پر ہر وہ کام جو دین کے نام پر کسی مسلمان کو بھلا معلوم ہو وہ نہ جزء دین ہے اور نہ اس کے ذریعے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عبادت وریاضت جس پر اسوۂ نبویؐ کی چھاپ نہ ہو دین کا جزء ہونا تو درکنار سراسر گمراہی اور دین اسلام پر زیادتی اور غلو فی الدین ہے۔ حدیث نبویؐ ہے:

«عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوا بِهَا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوهَا قَالُوْا: أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ الآخَرُ أَنَا أَصُومُ النَّهَارَ أَبَدًا، وَلَا أُفْطِرُ، وَقَالَ الآخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا، وَأَمَّا وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ بِهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»(۱)

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین شخص ازواج مطہراتؓ کے پاس آئے، نبی کریم ﷺ کی عبادت کے متعلق سوال کیا۔ جب ان کو بتایا گیا تو انھوں نے اسے بہت کم سمجھا اور کہا کہ ہمارا اور آپؐ کا کیا مقابلہ:

(۱) البخاری مع الفتح:۸۹/۹

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

آپ تو بخشے بخشائے ہیں، لہٰذا ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا اور دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی دن میں افطار نہیں کروں گا، تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے دور رہوں گا، کبھی بھی شادی نہیں کروں گا، اتنے میں رسول کریم ﷺ ان کے پاس پہنچ گئے، آپؐ نے فرمایا: تم ہی لوگ ہو جو ایسا ویسا کہہ رہے تھے، خدا کی قسم بے شک تمھاری بہ نسبت میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہوں، اور تمھارے مقابلے میں اللہ کا تقویٰ میرے دل میں زیادہ ہے، لیکن اس کے باوجود میں روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، تو یہ میری سنت ہے جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔'' (متفق علیہ)

جو لوگ طریقۂ محمدیؐ پر چلنے کے دعویدار ہیں ساتھ ہی عبادت کی نت نئی راہیں اختراع کرتے ہیں، ان کے لیے سیرت طیبہ کا یہ پہلو باعث عبرت وموعظت ہے، اس واقعہ کی روشنی میں ان کو اپنے ایمان وعبادت کی خبر لینی چاہیے، خصوصاً «اقامة الحجة على ان الاكثار فى التعبد ليس ببدعة» جیسی کتابوں کے مؤلفین کو۔

ایک دوسرا واقعہ جسے امام دارمی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ اس سے عبادت میں اطاعت رسولؐ کی اہمیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

عمرو بن یحییٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: ''میں نے اپنے والد سے سنا وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم صبح کی نماز سے پہلے حصول علم کے شوق میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بیٹھتے تھے، جب آپ گھر سے نکلتے تو ہم آپ کے ہمراہ مسجد جاتے، ایک روز آپ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا ابوعبدالرحمٰنؓ نکل چکے ہیں؟ ہم نے کہا نہیں، تو آپ بھی ہمارے ساتھ انتظار میں بیٹھ گئے، اسی اثنا میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، ہم سب اٹھ کر ساتھ ہو گئے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ ابھی میں نے مسجد میں ایک عجیب ماجرا دیکھا ہے، میرا خیال کہ خدا کے فضل سے وہ خیر ہی ہوگا، آپ نے پوچھا کہ کیا دیکھا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر زندہ رہے تو عنقریب مشاہدہ فرمالیں گے، سردست عرض ہے کہ میں نے مسجد میں لوگوں کو دیکھا کہ مختلف حلقوں کی شکل میں بیٹھے نماز کا انتظار کر رہے ہیں، ہر حلقے کا ایک امیر ہے اور ان تمام لوگوں کے ہاتھ میں کنکریاں ہیں، ان کا امیر کہتا ہے کہ ان کنکریوں پر سو (۱۰۰) مرتبہ اللہ اکبر گنو تو وہ سب سو مرتبہ تکبیر

پڑھتے ہیں، پھر وہ حکم دیتا ہے کہ سو مرتبہ لا الہ الا اللہ گنو تو سب گنتے ہیں، پھر وہ سو مرتبہ سبحان اللہ کہنے کا حکم دیتا ہے وہ ان کنکریوں پر سو مرتبہ تسبیح گنتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے ان سے کیا کہا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کی رائے اور حکم کے انتظار میں خاموش رہا اور انھوں نے فرمایا کہ آپ نے ان کو اپنی برائیوں اور گناہوں کے گننے کا حکم کیوں نہیں دیا اور یہ ضمانت ان کو کیوں نہ دے دی کہ ان کے حسنات اس صورت میں ضائع نہ ہوں گے۔

راوی کہتے ہیں کہ: پھر وہ چلے ہم ان کے ہمراہ تھے یہاں تک کہ ان کے ان حلقہ بنائے ہوئے لوگوں میں سے ایک جماعت کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے اور تلخ لہجے میں فرمایا کہ: تمھیں یہ کیا کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، انھوں نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! یہ کنکریاں ہیں جن پر ہم تسبیح، تکبیر اور تہلیل پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اپنے گناہوں کو گنو میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمھاری نیکیاں غارت نہیں ہوں گی، تمھارا برا ہو، اے امت محمدؐ! تم کتنے جلد ہلاک ہوگئے، یہ صحابہ کرام ہیں جن کی اتنی بڑی تعداد ابھی موجود ہے اور تمھارے نبیؐ کے یہ کپڑے ہیں جو بوسیدہ نہیں ہوئے، ان کے برتن ابھی ٹوٹے بھی نہیں کہ تم گمراہی میں پڑ گئے، اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم ہی بتاؤ کہ تم اپنے اس کرتوت سے جس دین کو ایجاد کیے ہوئے ہو وہ دین زیادہ ہدایت پر ہے یا دین محمدؐ؟ یا تم نے گمراہی کے دروازے وا کر دیے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰنؓ! خدا کی قسم ہم نے یہ کام بھلائی کی نیت سے کیا ہے، آپ نے نہایت تلخ لہجے میں فرمایا کہ کتنے بھلائی چاہنے والے ہیں جو اس بھلائی کو ہرگز نہ پاسکیں گے، سچ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا: ایک قوم قرآن پڑھے گی، مگر تعلیمات قرآنی ان کے حلق سے نہ اتر سکیں گی، خدا کی قسم ان میں سے اکثر تمھاری جماعت کے افراد ہیں، پھر آپ نے ان سے پیٹھ پھیر لی، حضرت عمر بن سلمہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان حلقہ والوں میں سے اکثر کو دیکھا کہ نہروان کے روز خوارج کے ساتھ ہم سے برسرِ پیکار ہیں۔ (۱)

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ خاص امت محمدیہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو نیک نظر آئیں گے مگر نیکی کے زعم میں اطاعت رسولؐ سے کوسوں دور ہوں گے، سلف صالحین ہر وہ عبادت جو نبی کے طریقے کے مطابق نہ ہو اسے منکر گردانتے ہیں، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام بھی اس جدید قسم کی عبادت کو دیکھ کر اس کے خیر ہونے کے وسوسے میں مبتلا ہو گئے تو عام انسان کسی بھی وقت دھوکا کھا سکتا ہے، اس لیے اس کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے اور سنت نبویؐ کے تتبع میں سرگرداں رہنا چاہیے۔

(۱) الدارمی: ۱/۶۱۔

تسبیح وتہلیل اور تکبیر جیسے اہم کلمات کو بھی اگر تعلیمات نبویؐ کے خلاف اختراعی طور پر پڑھا جائے تو معصیت ہے، اپنے گناہوں پر رونا اس قسم کی رواجی وایجادی عبادات اور اوراد و وظائف سے کہیں بہتر ہے۔ نیز اکثر لوگ نیک نیتی کی بنیاد پر ایسے طریقہ کو اختیار کرتے ہیں مگر عند اللہ مبغوض ہوتے ہیں۔

اس طریقۂ عبادت پر ابومسعود رضی اللہ عنہ کی وعید شدید اور بددعا اور اس کو ہلاکت سے تعبیر کرنا، نیز اس کو ملت اسلامیہ کے مقابلے میں ایک نئی ملت کی ایجاد قرار دینا اس کے منافیٔ اسلام ہونے کے لیے کافی ہے اور بدعت کی مذمت اور اطاعت رسولؐ کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اہم چیز ہے اور یہ کہ اس سے گمراہی کا دروازہ کھلتا ہے، انسان چاہے جس جذبے سے بھی عبادت کرے اور رب کے تقرب کا طالب ہو مگر وہ طریقہ اگر سنت نبویؐ کی روشنی میں نہیں ہے تو وہ گمراہی ہے اور وہ بجائے ثواب کے عقاب کا زیادہ مستحق ہے، نیز یہ کہ جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر قناعت واکتفا نہیں کرتا اس کا انجام کار اخروی اعتبار سے بہتر نہیں ہوتا جیسا کہ ان غیر طریق نبوی سے طالبان خیر کا انجام ہوا۔

یہ واقعہ تبلیغ کے نام پر اختراعی عبادات اور من گھڑت ادعیہ کو رواج دینے والوں کی آنکھوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہے اور تازیانۂ عبرت اور ان عوام کے لیے بھی جو ہر صاحب جبہ ودستار اور عالم دین کے فرمودات وملفوظات کو شریعت کا حصہ قرار دیتے نہیں تھکتے اور اس کے ہوتے ہوئے ارشاد نبویؐ کی نہ چنداں ضرورت محسوس کرتے ہیں، اور نہ اس کی طرف ملتفت ہوتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ یہود ونصاریٰ کی طرح ان کے علماء جو کچھ اپنی طرف سے فرمائیں اور جس چیز کے لیے چاہیں حرام وحلال کا حکم لگا دیں اس کو حرف آخری سمجھتے ہیں، گویا زبان حال سے گویا ہیں:

وما أنا إلا من غزية إن غوت   غويت وإن ترشد غزيت أرشد

عدی بن حاتم الطائی نصرانی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپؐ سورۂ براءت کی آیت ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ کی تلاوت فرما رہے تھے، آپؐ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ لوگ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے علماء جس چیز کو حلال گردانتے اسے حلال سمجھ لیتے تھے اور جس چیز کی حرمت کا فتویٰ دیتے تھے اسے ان کی تقلید کر کے حرام مان لیتے۔

درحقیقت اطاعت رسولؐ میں حائل بہت سے عوائق سے سب سے بڑی رکاوٹ تقلید ائمہ، علماء وپیر پرستی اور غلو فی الصالحین ہے، اسی لیے قرآن کریم نے اہل کتاب کو اس سے منع فرما کر امت محمدیہؐ کو چوکنا کر دیا مگر افسوس کہ یہ امت اس کا سب سے زیادہ شکار ہو گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ (النساء:۴/۱۷۱)

''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ تعالیٰ پر حق ہی کہو۔''

ارشاد نبوی ہے:

«إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ »(النسائی:۵/۲۶۸)

''مسلمانو! غلو سے بچو بیشک تم سے پہلے لوگوں کو غلو فی الدین ہی نے ہلاک کیا تھا۔''

صحابہ کرام کی مقدس جماعت دین میں افراط وتفریط سے مکمل گریزاں تھی، اسی پر ان کی تربیت ہوئی تھی، اس سلسلے کا ایک واقعہ جو نہایت ہی سبق آموز ہے، سطور ذیل میں پیش خدمت ہے:

«عَنْ جَابِرٍ أَنَّ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ أَتَى رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ؟ هَذِهِ نُسْخَةٌ مِنَ التَّوْرَاةِ، فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَتَغَيَّرُ، فَقَالَ أَبُوبَكْرٍ: ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَا تَرَى بِوَجْهِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَنَظَرَ عُمَرُ إِلَى وَجْهِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، فَقَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُولِهِ، رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَأَ لَكُمْ مُوسَى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ، وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي» (الدارمی:۱/۹۵)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب خدمت نبویؐ میں تورات کے نسخہ کو لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! یہ تورات کا نسخہ ہے، آپ خاموش رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑھنے لگے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تجھ پر تیری ماں روئے کیا تم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ نہیں دیکھتے؟ (تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلے ہوئے تیور کو نہیں دیکھتے) تب حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہہ پڑے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ کے غضب سے، ہم اللہ سے از روئے رب، اسلام سے از روئے دین اور محمدؐ سے از روئے نبی ہونے کے راضی ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام کا ابھی ظہور ہو اور تم سب ان کی اتباع میں لگ جاؤ اور میری اتباع چھوڑ دو تو تم سب سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے، اگر موسیٰ علیہ السلام باحیات ہوتے اور میری نبوت کے زمانہ کو پالیتے تو انھیں بھی میری اتباع کرنی پڑتی۔''

جب صورت حال یہ ہے کہ انبیاء کرام کی لائی ہوئی شریعت پر شریعت محمدیؐ کے ہوتے ہوئے عمل

کرنا ضلالت ہے تو غور کیجیے اس کی موجودگی میں اقوال غیر پر عمل کرنا کس قدر گمراہ کن ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آ جائیں تو ان کے لیے بھی سوائے اطاعت رسولؐ کے چارۂ کار نہ ہوگا، لَوْكَانَ مُوسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيَ!

تعلیمات نبویؐ کا یہی اثر تھا کہ صحابہ کرام کو سنت رسولؐ کی ادنیٰ مخالفت لائق برداشت نہ تھی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جب حج تمتع کا احرام باندھا تو کسی نے کہا کہ آپ کے والد تو اس سے منع کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ: «أيتبع قول رسول الله ﷺ أم قول أبي؟» ''کیا اللہ کے رسولؐ کے قول کے اتباع کی جائے گی یا میرے باپ کے قول کی۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو کسی بھی بیٹے کے مقابلے میں اپنے باپ کے لیے زیادہ مطیع وفرمانبردار ہیں، باپ جو خلیفۂ وقت ہیں، جن کی زبان پر حق جاری ہونے کی بشارت نبویؐ بھی ہے، مگر اطاعت رسولؐ کی اہمیت کو سمجھنے والے ہونہار بیٹے نے اپنے باپ کی بات کی قولاً وعملاً مخالفت کی۔

یہی ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جن کے شیدائی سنت اور اطاعت رسولؐ کے متوالے ہونے کے دسیوں واقعات مشہور ہیں، ان کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جب عبدالملک بن مروان کی خلافت کی بیعت ہو رہی تھی تو آپ نے ان سے بیعت کرتے وقت لکھ بھیجا:

«أقر لك بالسمع والطاعة على سنة الله وسنة رسوله فيما استطعت» (البخاری مع الفتح:۱۳/۳۰۹)

''کتاب وسنت پر حتی المقدور تمھاری سمع وطاعت کا اقرار کرتا ہوں۔''

یہ ایک صحابی کا امام وقت سے بیعت کا طریقہ ہے جو محبت رسولؐ اور اطاعت رسولؐ کا دلدادہ ہے، رواجی عشق اور بدعی فنافی الذات سے نا آشنا ہے جو اس کے طریق نبویؐ سے شیفتگی کی بین دلیل ہے، دوسری جانب بعد کے عاشقان رسولؐ کا یہ عالم ہے کہ ان کے یہاں بیعت کسی خانقاہ کے پروردہ اور صاحب جبہ ودستار کے ہاتھ پر ہو اور وہ جب تک اصول چشتیہ وقادریہ اور وظائف سہروردیہ اور طرق نقشبندیہ پر نہ ہو بیعت کامل ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ایمان کی حلاوت نصیب ہو سکتی ہے جب تک کہ تصور شیخ قائم نہ ہو جائے، کس قدر قابل رحم ہے حال ان عاشقان رسولؐ کا۔

شاعر کہتا ہے:

تعصي الاله وأنت تظهر حبه — هذا محال في القياس بديع
لو كان حبك صادقا لأطعته — إن المحب لمن يحب يطيع

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور اظہار محبت بھی، بات بہت انوکھی ہے، عقل میں سما نہیں سکتی، دعویٰ محبت کی پہچان تو اطاعت یار میں ہے، کیونکہ محبّ اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔''

یہ سلف تھے جن کا شیوہ تھا کہ کسی کا ہو رہے کوئی، نبیؐ کے ہو رہے ہم، مگر بعد کے عاشقان رسول گا حال یہ ہو گیا کہ وہ اتحاد وحلول کے داعیٔ اکبر ابن عربی وحلاج کے بارے میں کہتے ہیں کہ اتحاد وحلول کے ان منادوں سے کسی کو اختلاف ہو تو ہوا کرے، مگر ان کے حکیمانہ ملفوظات وفرمودات کو جو ادبی شہ پارے ہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جب دعویداران محبت رسولؐ اور پاسداران شریعت کی دورخی کا یہ حال ہو تو پھر گلشن نبویؐ میں بہار کیونکر آئے اور رحمت الٰہی کیوں نہ روٹھے۔

اطاعت رسولؐ کی عاجل برکتیں

مسلمانو! محبت رسولؐ کا دم بھرنے والو! جب تک تم اطاعت رسولؐ پر پورے نہیں اترتے کامیاب نہیں ہو سکتے، اگر تمھارا یقین یوم آخر پر کمزور ہو چکا ہے اور تم نفع عاجل، فتح قریب کے طالب ہو اور دنیا کی کامیابی کو ترجیح دیتے ہو تو وہ بھی تمھیں اطاعت رسولؐ سے ہی حاصل ہوگی، واقعہ ملاحظہ کرو:

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آج ہی خلیفہ ہوئے ہیں، نبی کریم ﷺ کی وفات کا سانحہ کل گزرا ہے، پورے عرب میں ارتداد اور مانعین زکاۃ کا بازار گرم ہے، رومن ایمپائر کی سرکوبی کے لیے لشکر اسامہؓ جس کی تیاری نبی کریم ﷺ نے کی ہے، اس کو مدینہ سے باہر بھیجنے اور نہ بھیجنے پر مباحثہ جاری ہے، اکثریت کی رائے ہے کہ حالات سازگار نہیں ہیں، مدینہ منورہ خود خطرے میں ہے مگر صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ وہ لشکر جس کی تجہیز وتنفیذ خود نبی کریم ﷺ نے کی ہے اس کو میں نافذ کر کے رہوں گا خواہ مجھ کو اس کی مہنگی قیمت چکانی پڑے، اس طرح آپ نے مانعین زکاۃ سے بھی قتال کا حکم صادر فرمایا: بخاری کی روایت ہے، راوی کا بیان ہے...... «لم يلتفت أبوبكر إلى مشورة إذ كان عنده حكم رسول الله» (البخاري مع الفتح:۳۳۹/۱۳)

حضرت ابوبکرؓ فرمان رسولؐ کی موجودگی میں کسی کے مشورے کی طرف ملتفت نہیں ہوئے، دنیا نے دیکھا کہ اس تنفیذ جیش اسامہؓ سے خلافت مدینہ اور مسلمانوں کی پورے عرب پر دھاک بیٹھ گئی، وہ قبائل جو مدینہ کو کمزور سمجھ کر چڑھائی کرنا چاہتے تھے مرعوب ہو گئے کہ مسلمانوں میں اگر قوت نہ ہوتی اور مدینہ کو غیر محفوظ سمجھتے تو پھر شام کی طرف اتنی بڑی فوج ہرگز نہ روانہ کرتے، ادھر جیش اسامہؓ سالم وغانم واپس آیا، یہ ہیں اطاعت رسولؐ کی عاجل برکتیں «فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ»

اس مضمون کے اخیر میں آخرت سے متعلق ایک ایسے صحیح واقعہ کا ذکر کرتا ہوں جس کا تعلق اطاعت رسولؐ سے ہے اور ہر مبتدع اور زبانی دعوی ایمان اور دین میں کمی بیشی کرنے والے کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔

سہل ابن سعد سے مروی ہے، انھوں نے کہا کہ: اللہ کے رسول ﷺ کو میں نے سنا آپ فرماتے تھے میں حوض کوثر پر پہلے سے ہوں گا جو وہاں پہنچے گا اس کا پانی پیئے گا اور جو اس کا پانی پی لے گا وہ اس کے بعد کبھی پیاسا نہ ہوگا، میرے پاس ایسے لوگ بھی آئیں گے جنھیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھ کو پہچانتے ہوں گے (جب میں انھیں پانی پلانا چاہوں گا) تو پھر میرے اور ان کے درمیان پردہ ڈال دیا جائے گا، اس وقت نبی کریم ﷺ فرمائیں گے (ان کو روکو مت) یہ میرے امتی ہیں تو جواب دیا جائے گا کہ آپؐ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد انھوں نے آپؐ کے دین میں کتنی تبدیلی کر دی اور کتنی نئی باتیں پیدا کر دیں، تو میں کہوں گا کہ دوری ہو دوری، رحمت خداوندی سے اور مجھ سے ان کی جنھوں نے میرے بعد تبدیلیاں کر دیں۔(۱)

معلوم ہوا کہ بدعتی کی عبادت قبول نہیں بلکہ وہ راندۂ درگاہ نبویؐ ہے:

پھٹکار ایسی امت نبوی کے بوجھ پر
سنت میں جو ملائی ہے بدعت طرح طرح

حرف آخر

امت مسلمہ کی زبوں حالی کا دور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک امت پورے طور پر «اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً» اور مکمل اطاعت رسولؐ کی پابند نہیں ہو جاتی اور ہمارا تعلق سیرت طیبہ سے پختہ طور پر استوار نہیں ہوتا در در کی گدائی سے ہمیں عزت نہیں مل سکتی، ہمارے اندر سیرت کی تاثیر جب تک جاگزیں نہ ہو ہمارے معاملات درست نہیں ہو سکتے، جب تک امت ہر کام میں اسوۂ محمدیؐ کی متلاشی نہیں ہوگی اس کی ناؤ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، اس لیے پوری امت مسلمہ کو اتباع سنت اور اطاعت رسول اللہ ﷺ پر گامزن ہو جانا چاہیے:

مسلک سنت پہ اے سالک چلا جا بے دھڑک
جنت الفردوس کو سیدھی گئی ہے یہ سڑک

(۱) البخاری مع الفتح: ۳/۱۳

اطاعت رسول ﷺ نصوص وواقعات کی روشنی میں

مولانا عبدالوہاب خلجی، ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلحدیث، ہند

بنی نوع انسان کے جد امجد ابوالانبیاء حضرت آدم علیہ السلام کو اس خاکدان گیتی پر آباد کرنے کا الٰہی حکم اپنی تکمیل کو پہنچا تو اللہ کی طرف سے تنبیہ کی گئی:

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾(البقرۃ:۲/۳۸)

''اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس آیت کریمہ میں جس ہدایت نامہ کے آنے کی بات کہی گئی تھی، اس کا ظہور مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق انبیاء کی بعثت اور ان پر کتب سماویہ کے نزول کی صورت میں ہوا[1] قرآن مجید کی متعدد آیات میں واضح انداز میں بتایا گیا ہے کہ ہر قوم میں ہدایت ورہنمائی کا فرض انجام دینے والے مبعوث کیے گئے ہیں، دنیا کے کسی خطے میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں اللہ کی طرف سے ڈرانے والے نہ ہوئے ہوں۔[2] ہادی ونذیر بن کر آنے والی محترم شخصیات نے وحی الٰہی کی تمام روشنی میں ہر دور میں فاسد عقائد کی اصلاح اور زندگی کے تمام شعبوں میں موجود بے اعتدالیوں کو ختم کرنے کی تاحیات جدوجہد کی۔

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴

(۲) فاطر: ۲۴

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے قبل تشریف لانے والے انبیاء کرام کی قوموں اور امتوں کا حال یہ رہا کہ انھوں نے ان کی وفات کے بعد ان کی تعلیمات گم کر دیں اور اپنی پچھلی گمراہیوں کی طرف لوٹ گئے، اقوام گذشتہ کی ضلالت وگمراہی کی عبرتناک تاریخ کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اولین مرحلہ میں جس غلطی کا صدور اُن سے ہوا، وہ صرف یہ تھی کہ وحی الٰہی اور انبیاء کی سیرت کے درمیان انھوں نے تفریق پیدا کر دی، بعض قومیں رسولؑ کی حیات طیبہ سے بے نیاز ہو کر کتاب الٰہی کو اپنی اغراض ومقاصد کے حصول کی خاطر کافی سمجھ بیٹھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی کتاب بے معنی تاویلات کی نذر ہوگئی۔ تحریف وتنسیخ کے اتنے مراحل سے اسے گزارا گیا کہ دنیا میں اس کی صحیح صورت کا وجود عنقا ہوگیا۔ دوسری طرف بعض قوموں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور انبیاء سے عقیدت ومحبت میں غلو کا ارتکاب کر کے خالق اور مخلوق کے درمیان کا فرق نظر انداز کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جن مقدس ہستیوں نے تا حیات بندوں کو عبودیت کا درس پڑھایا تھا انھی کو ابن اللہ یا معبود قرار دے دیا گیا۔ قرآن مجید نے ضلالت وگمراہی کی ان دونوں صورتوں پر بھرپور انداز میں تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کی حامل امت ان گمراہیوں سے کیوں کر بچ سکتی ہے۔

قرآن مجید نے سب سے پہلے یہ بات ذہنوں میں راسخ کی ہے کہ جو رسول بھی دنیا میں بھیجا جاتا ہے، اس کی امت کو تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے رسول کی اطاعت غیر مشروط طور پر بجا لائے، رسولؑ کی اس اطاعت پر مہر الٰہی کی تصدیق ثبت ہوتی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(النساء:٤/٦٤)

”ہم رسول صرف اسی لیے بھیجتے ہیں کہ ہمارے حکم کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔“

قوموں اور امتوں کو اطاعت رسولؑ کا پابند اس لیے بنایا جاتا ہے کہ رب کائنات کی مرضی کا علم اس کے بغیر غیر ممکن ہے۔ اللہ کے جو احکام وقوانین انسانی زندگی پر نافذ ہونے کے لیے وحی کی صورت میں نازل ہوتے ہیں ان کی تطبیق کا محفوظ ذریعہ رسولؑ کی سیرت ہی ہے۔ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے اور نہ حکم ربانی کے بغیر وہ اپنی زبان کھولتے ہیں، اسی لیے امت کو اس بات کا پابند کر دیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اور اعتقاد کے تمام امور میں رسولؑ کی رہنمائی کو لازم پکڑے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر از اول تا آخر جتنے بھی انبیاء کرام مبعوث ہوئے تمام ہی حضرات نے اللہ کی عبادت کے بعد اپنی اطاعت کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے تفصیل کے ساتھ ہمیں بتایا

ہے کہ اپنی اپنی قوموں کو انبیاء کرام نے دعوت کے اولین مرحلے میں کن بنیادی باتوں کی تعلیم دی، ذیل میں چند قرآنی آیات کا حوالہ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾(نوح:۷۱/۲-۳)

''انھوں نے کہا اے میری قوم! میں تمھیں کھلے طور ڈراتا ہوں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اسی سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

اسی طرح حضرت ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام نے بھی اپنی اپنی اقوام کو خشیت الٰہی اور اپنی غیر مشروط اطاعت کی دعوت دی چنانچہ ان لوگوں نے اپنی قوموں کو مخاطب کر کے کہا:

﴿اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ (الشعراء:۲۶: ۱۲۵-۱۲۶، ۱۴۳-۱۴۴، ۱۶۲-۱۶۳، ۱۷۸-۱۷۹)

''میں تمھارے لیے رسول امین ہوں، سو تم اللہ کی نافرمانی سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

حضرت ہارون علیہ السلام کی دعوت میں بھی امر نبی کی اطاعت کا ذکر صراحتاً مذکور ہے:

﴿وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِىْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِىْ﴾(طٰہٰ:۲۰/۹۰)

''تمھارا رب بلاشبہ خدائے رحمان ہے، سو میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ان الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں:

﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ (الزخرف:۴۳/۶۳)

''کہا میں تمھارے پاس سراپا دانائی لایا ہوں اور اس لیے بھی آیا ہوں کہ بعض ان باتوں کی وضاحت کروں جن میں تم جھگڑتے ہو، سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

مندرجہ بالا آیات میں یہ حقیقت پوری طرح سے واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ کی طرف سے مبعوث تمام انبیاء کرام نے اپنی قوموں کو اللہ واحد کی عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی اطاعت کی دعوت دی ہے۔ قرآن مجید میں انبیائی دعوت کے تذکرے میں اس پہلو کی خصوصی نشاندہی بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس میں ایک بڑی حکمت یہ مضمر ہے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کا تمام تر انحصار اطاعت رسولؐ پر ہے، اگر رسولؐ کی اطاعت کا قلادہ امت اپنی گردن سے اتار دے تو پھر وہ اللہ کی بندگی بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں کر سکے گی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایک جگہ نہایت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾(النساء:۴/۸۰)

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔''

رب کائنات کی محبت کا فطری جذبہ جو ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے اور جس کی آسودگی کے لیے وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں بے چین بھی ہو جاتا ہے، اس کا حصول بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اللہ کے فرستادہ پر کامل ایمان لاکر اس کی غیر مشروط اتباع واطاعت کو اپنی زندگی کا معمول نہ بنالے۔ سورہ آل عمران:۳۱ میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران:۳/۳۱)

''اے پیغمبر! دنیا کو سنا دیجیے اگر تمھیں اللہ سے سچی محبت ہے تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اللہ کا محبوب بندہ بننے اور گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف ہونے کے لیے کسی اور کی نہیں، اطاعت رسولؐ کی ضرورت ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص رسولؐ کی اطاعت سے آزاد ہو کر اللہ کی محبوبیت کا راستہ تلاش کرے گا اس کی یہ کوشش سراسر رائیگاں جائے گی اور وہ دائمی خسران وخسارے سے دوچار ہوگا۔

رضاء الٰہی کے حصول کے لیے اطاعت رسولؐ کیوں ضروری ہے؟ اللہ کی طرف سے کیوں بار بار مختلف ادوار میں اس کی یاد دہانی کرائی جاتی رہی ہے؟ ان امور پر اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں اعتدال وتوازن قائم کرنے میں انسانی ذہن اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا ہے جب تک خالق کائنات کی مکمل رہنمائی اسے حاصل نہ ہو اور خالق کائنات کی ہدایت پانے کا ذریعہ نبی کی ذات کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ نبی بھی چونکہ بشر ہوتا ہے اس لیے بشری تقاضوں کے پیش نظر سہو ونسیان اس سے بھی ممکن ہے، لیکن نبی پر ہمیشہ اللہ کی نظر ہوتی ہے، اس لیے اسے برسر موقع وحی کے ذریعے یاد دہانی کرائی جاتی رہتی ہے۔ نبی کو اس بات کا پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک بات بھی زبان سے نہ نکالے اپنی طرف سے کسی حذف واضافہ کا اختیار بھی نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم:۵۳/۳-٤)

''وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ وہ وحی ہے، جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيْلِ ○ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ﴾

(الحاقة:٦٩/٤٤۔٤٦)

''اگر وہ کوئی بات اپنے پاس سے بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے۔''

حفاظت ونگرانی کا یہ اہتمام اسی لیے ہوتا ہے کہ امت کے سامنے رسول، اللہ کی مرضی کی پوری پوری ترجمانی کریں اور ان کی زندگی امت کے لیے ایک نمونہ ہو، اس الٰہی نظام کا بنیادی مقصد دنیا کے تمام انسانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ جس خالق نے تمھیں پیدا کیا ہے اسی نے تمھاری ہدایت ورہنمائی کا انتظام بھی کیا ہے، اب تمھارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت ورہنمائی کی روشنی میں اپنی زندگی گزارو تا کہ مرنے کے بعد ابدی جنت سے ہمکنار ہوسکو۔ اللہ کی طرف سے یہ اتمام حجت بھی ہے تا کہ کوئی یہ کہہ نہ سکے کہ خدایا! مجھے معلوم نہیں تھا، یا یہ کہ دار العمل میں تیری مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی لائحہ عمل ہمارے پاس نہیں تھا۔

آخری رسولؐ کی اطاعت کا اسلامی تصور

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے ذریعے جو ہدایت نامہ اہل دنیا کے لیے بھیجا گیا وہ ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ گذشتہ آسمانی صحیفے تحریف کا شکار ہوگئے اور پچھلے انبیاء کی سیرتوں کو انھی کے ماننے والوں نے گم کر دیا۔ آخری رسولؐ پر جو کتاب نازل کی گئی اس کی حفاظت خود اللہ نے اپنے ذمے لے لی اور آپؐ کی حیات طیبہ کو محفوظ رکھنے کے ایسے اسباب فراہم کر دیئے کہ اس کو رہتی دنیا تک کوئی داغ دار نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اب دنیا کی نجات وفلاح کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے آخری رسولؐ کی مکمل طریقے سے اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ قرآن وحدیث میں سیرت طیبہ کو اپنانے اور اسی کی روشنی میں زندگی گزارنے کی ضرورت پر مختلف انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ محمد عربی ﷺ کی حیات طیبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کے مطابق قرآن مجید کی مکمل طور پر عملی تصویر تھی۔ قرآن میں جن صفات حسنہ کی نشاندہی کی گئی ہے وہ تمام خوبیاں آپؐ کے اندر موجود تھیں۔ اسی لیے اہل ایمان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ آپؐ کی سیرت کو لازم پکڑیں۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۳۳/۲۱)

''اللہ کے رسولؐ کی زندگی تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ صاف صاف واضح کر رہی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کی پوری زندگی

تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے، اس میں آپ کی زندگی کے کسی شعبہ کو خاص نہیں کیا گیا ہے کہ ہم عقائد میں تو آپؐ کو نمونہ بنائیں اور عبادات میں آپؐ کے اسوہ کو چھوڑ دیں۔ اسی طرح عبادات میں تو آپ کی اطاعت کریں لیکن عقائد کے مسائل دوسری جگہوں سے اخذ کریں۔ اسی طرح اس بات کی بھی گنجائش اس آیت میں نہیں رکھی گئی ہے کہ میدان معیشت وسیاست میں ہمارا نمونہ حیات طیبہ کے علاوہ کوئی اور ہو۔ حیات انسانی کے تمام شعبے آپؐ کی سنتوں سے منور ہیں۔ ایک مومن صادق کو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں آپؐ کی سیرت کو لازم پکڑنا چاہیے۔

اسلام نے سیرت طیبہ سے اخذ واستفادہ کو صرف ایک اخلاقی چیز ہی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ رسولؐ کی اطاعت اور سیرت طیبہ سے اپنی تاریک زندگی روشن کرنے کو عین ایمان قرار دیا ہے، جو اطاعت رسولؐ کی فرضیت کا منکر ہو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت رسولؐ کی فرضیت کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ آل عمران میں کہا گیا:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾(آل عمران:۳/۳۲)

’’آپؐ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی، پھر اگر وہ اعراض کریں تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

اس آیت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے اعراض کرنے والے کو کافر کہا گیا ہے اور کافر کا ٹھکانا جیسا کہ متعدد قرآنی آیات، میں جہنم ہے، اسی لیے اللہ کے رسولؐ نے اپنی ایک حدیث میں یہ فرمایا ہے کہ: صرف میری اطاعت کرنے والے جنت میں جائیں گے، بقیہ تمام لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے، فرمایا:

«كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى؟ قَالُوا: وَمَنْ يَأْبَى؟ قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى »

(صحيح البخاري، كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ)

’’میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جو انکار کرے، صحابہ نے عرض کیا: کون انکار کرے گا؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔‘‘

مسائل واحکام میں معمولی اختلاف کبھی کبھی بڑے خطرناک نتائج کی صورت میں سامنے آتا ہے گذشتہ امتیں فرقوں میں منقسم ہو کر اسی وجہ سے تباہ وبرباد ہوگئی ہیں، امت محمدیہ کو قرآن مجید نے پابند

کیا ہے کہ وہ اپنے نزاعی امور میں جہاں کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے وہاں سنت رسولؐ کی طرف بھی رجوع کرنے کا حکم ہے، ایک مومن کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ رسولؐ کے ہر فیصلے کو صدق دل سے قبول کرتا اور اس کے آگے زبان کھولنے کی جرات نہیں کرتا، فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾(النساء:۴/۵۹)

''اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اولو الامر کی اطاعت کرو پھر اگر تمہارا کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ یہی صورت بہتر اور اچھے نتیجے والی ہے۔''

دوسری جگہ تہدید کے اسلوب میں کہا گیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾(النساء:۴/۶۵)

''تیرے رب کی قسم! یہ مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام نزاعی امور میں آپ کو حکم نہ تسلیم کریں پھر آپؐ کے فیصلے پر اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ پورے طور پر سر تسلیم خم کر دیں۔''

حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ امت کے لیے حیاتِ جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے، قرآن مجید نے آپؐ کی دعوت کو صراحتاً حیات جاوداں سے تعبیر کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾(الانفال:۸/۲۴)

''اے اہل ایمان! اللہ اور رسولؐ کی بات پر لبیک کہو، جب رسولؐ تم کو ایسی چیز کی طرف بلائیں جو تمھیں حیات عطا کرنے والی ہو۔''

دنیا میں رحمت الٰہی سے فیض یاب ہونے اور آخرت میں رضاء الٰہی سے ہمکنار ہونے کے لیے بھی رسولؐ کی اطاعت ضروری ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(آل عمران:۳/۱۳۲)

''اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو تا کہ تمھارے اوپر رحم کیا جائے۔''

اطاعت رسولؐ کا راستہ اختیار کرنے والوں کو بروزِ قیامت بلند ترین درجات عطا کیے جائیں گے

اور اللہ تعالیٰ کے انتہائی محبوب اور مقرب بندوں کی انھیں صحبت نصیب ہو گی۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾(النساء: ۴/۶۹)

''اللہ اور رسولﷺ کی اطاعت کرنے والے آخرت میں اللہ کی طرف سے انعام یافتہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے اور یہ کیا ہی بہترین ساتھی ہیں۔''

قرآن مجید کی تین سورتوں: النساء، النور، الاحزاب میں اسلام کے معاشرتی اور عائلی قوانین تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، امت مسلمہ کو بار بار مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اللہ کی اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرو۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں کتاب وسنت کے احکام پر عمل کرے، اسے اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان احکام میں کسی طرح کی تبدیلی کرے یا کسی حکم کو غیر اہم کہہ کر نظر انداز کر دے۔ خواہشات کی اتباع کو ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ حیات طیبہ کا تیئیس (۲۳) سالہ دور بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپﷺ نے مختلف حیثیتوں سے امت کے سامنے بے مثال نمونہ پیش کیا ہے۔ آج مسلم معاشرہ کچھ اس انداز سے سوچنے لگا ہے کہ چند عقائد اور عبادات کی پیروی نجات کے لیے کافی ہے، جب کہ کتاب وسنت کی محکم تعلیمات اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ سورہ نساء میں وراثت کے احکام تفصیل سے بیان کرنے کے بعد قرآن نے کتنا واضح اعلان کیا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾(النساء: ۴/۱۳، ۱۴)

''اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرنے والے کو وہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی سرحد سے آگے بڑھے گا وہ اسے آگ میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ» (شرح السنة)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشاتِ نفس

میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔"

حیات طیبہ اور سیرت رسولؐ سے الگ ہٹ کر جو زندگی گزرے گی وہ ناکام زندگی ہوگی اسی طرح زندگی کے جس رویے پر سنت رسول کی مہر تصدیق نہ ہو وہ آدمی کو جہنم کی طرف لے جائے گا، عقائد، عبادات اور معاملات کے جملہ امور میں رسولؐ کی اطاعت ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو زندگی کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی اور آدمی کو ان کا کوئی ثواب نہیں ملے گا، بلکہ بدعات کے ایجاد کرنے کی اسے آخرت میں سخت سزا ملے گی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ﴾

(محمد:۳۳/۴۷)

"اے ایمان والو! اللہ کے حکم پر چلو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع مت کرو۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی متفق علیہ روایت اس آیت کی بہترین تفسیر ہے:

«قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»

"رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ہمارے اس دین میں جس نے بھی کوئی نئی بات نکالی وہ مردود ہے اور اس کی بات قابل رد ہے۔"

اطاعت رسولؐ اور صحابہ کرامؓ

اطاعت رسول کی شرعی حیثیت پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر حضرات صحابہ کرام کی زندگی کا مطالعہ نہ کیا جائے، آخری رسول کی تائید و نصرت کے لیے اللہ نے جس مقدس گروہ کا انتخاب فرمایا تھا وہ امت کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے، صحابۂ کرام نے محبت رسولؐ اور اطاعت رسولؐ کی ایسی مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے لیے بصیرت اور روشنی کا مینار بنی رہے گی، قرآن و حدیث کے مندرجہ بالا نصوص کا حقیقی اور صحیح مفہوم انھوں نے سمجھا تھا اور اسی کے مطابق اپنی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کی تھی، نبی اکرم ﷺ کے ایک ایک حکم اور آپؐ کی ہر ہر ادا حتی کہ نشست و برخاست کے طور طریق کو انھوں نے اپنا کر رضاء الٰہی کی سند دنیا ہی میں حاصل کر لی تھی، ان کے آثار و اقوال کا تتبع کرنے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی بھی کسی سنت رسولؐ اور فرمان رسولؐ کی علت و غایت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی سنت کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا کہ دین میں اس کی حیثیت فرض کی نہیں بلکہ استحباب کی ہے۔ کتب احادیث میں ہمیں بے شمار واقعات ایسے ملتے

ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ سے کتنا گہرا لگاؤ تھا اور وہ آپؐ کی ایک ایک ادا پر کس طرح اپنی جانیں نچھاور کیا کرتے تھے، ذیل میں چند واقعات نقل کیے جا رہے ہیں:

رحمۃ للعالمین ﷺ اپنی امت پر حد درجہ شفیق اور مہربان تھے، دین اسلام میں یسر اور آسانی ہمیشہ آپؐ کے پیش نظر ہوتی تھی، بعض احکام جو دقت طلب ہوتے ان کو بیان کرتے وقت آپؐ کے اسلوب میں ایک نیا انداز یہ ہوتا کہ آپؐ ان کو فرض نہ قرار دے کر صرف اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما دیتے یا امت کی مشقت کا حوالہ دے کر اصحاب عزیمت کو ان کی طرف آمادہ فرما دیتے، صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ سے جو الفت و محبت تھی اس کے پیش نظر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس طرح کی احادیث میں وہ آپؐ کی اطاعت نہ کرتے، چنانچہ جب آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ: ''اگر میری امت کے مشقت میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں لوگوں کو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا، تو اس حدیث کے راوی حضرت زید بن خالد جہنی کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ جب نماز کے لیے مسجد آتے تو ان کے کان پر مسواک ہوتی جس طرح کہ لکھنے والا قلم کو کان پر رکھ لیتا ہے، جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو مسواک دانتوں پر گھما لیتے اور پھر اسے اپنی جگہ پر رکھ لیتے۔''(۱)

حضرات صحابہ کرامؓ کا جذبۂ اطاعت نبویؐ دیکھنے کے لیے صحیح مسلم کی یہ روایت ملاحظہ ہو:(۲)

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ میرا گزر نبی ﷺ کے پاس سے اس حال میں ہوا کہ میرا تہبند ڈھیلا ہو کر نیچے چلا گیا تھا، آپؐ نے فرمایا: عبداللہ تہبند اوپر چڑھا لو، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اوپر چڑھا لیا، آپؐ نے فرمایا: اور زیادہ، اس پر میں نے اور زیادہ چڑھا لیا، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر اس کا اہتمام کرتا رہا، حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا: کہاں تک؟ آپؐ نے فرمایا: آدھی پنڈلیوں تک (۳)

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت خریم اسدی رضی اللہ عنہ کا ہے، ان کے بارے میں ایک بار نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: خریم اسدیؓ بہت ہی خوب آدمی ہیں، لیکن صرف دو باتوں کی کمی ہے: ایک یہ کہ ان کے بال لمبے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا تہبند گھسٹتا رہتا ہے، حضرت خریم اسدیؓ کو جب اس فرمان رسولؐ کی اطلاع ملی تو فوراً انھوں نے اپنے بال کاٹ کر کانوں کے برابر کر لیے اور تہبند پنڈلی تک اوپر چڑھا لی۔

---

(۱) ابو داود، کتاب الطهارة، باب السواك

(۲) مسلم

(۳) ابو داود

جدید دنیا چونکہ فیشن پرستی میں تمام حدود کو پامال کر چکی ہے اور اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی ہماری نسلیں اس طرح کے دینی شعائر کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتیں لیکن اطاعت رسولؐ کا صحیح اور اسلامی جذبہ اگر ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے تو حضرات صحابہ کرام کی سی کیفیت پیدا کر کے ہم اپنی دنیا و آخرت سنوار سکتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی شخصیت اس حیثیت سے ممتاز نظر آتی ہے کہ آپ سنن نبویہ کی اتباع میں اس قدر آگے تھے کہ احکام و مسائل کے باب میں صرف سنتوں ہی پر نہیں، بلکہ آپؐ کی عادات اور نقل و حرکت کی بھی پیروی میں اپنی سعادت سمجھتے تھے، دراصل نبی اکرم ﷺ اپنی بشری حیثیت میں جن صفات سے ممیز تھے ان کی اتباع و پیروی سے دلوں کی دنیا منور ہو سکتی ہے اور جذبۂ اطاعت رسولؐ بیدار ہو سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلے میں کتب احادیث میں متعدد واقعات مذکور ہیں، ہم ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کریں گے جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی تاریخ کے سب سے اہم دور کی اہم شخصیات آخری رسولؐ سے عقیدت و محبت میں کس قدر آگے تھیں۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کھلے بٹن نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو میں نے ان سے پوچھا: آپؐ ایسا کیوں کرتے ہیں تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا میں نے رسول ﷺ کو ایسے ہی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔(۱)

حضرت انس ابن سیرین فرماتے ہیں کہ: میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عرفات میں تھا، جب وہ کہیں جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ جاتا، یہاں تک کہ ہم امام کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں، نماز کے بعد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے وقوف فرمایا، آپ کے ساتھ میں نے اور میرے اصحاب نے بھی وقوف کیا، جب امام عرفات سے واپس لوٹے تو ہم بھی ان کے ساتھ واپس لوٹے، راستے میں ''مازمین'' سے پہلے کے تنگ راستہ میں پہنچے تو عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی سواری بٹھادی، آپ کے ساتھ ہم نے بھی اپنی سواریاں بٹھا دیں، ہمارا خیال تھا کہ شاید عبداللہ بن عمرؓ یہاں نماز پڑھیں گے، لیکن ان کے ملازم نے بتایا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہاں نماز نہیں پڑھنا چاہتے بلکہ اس جگہ نبی اکرم ﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر بھی اس جگہ حاجت ضروریہ سے فارغ ہونا پسند کرتے ہیں۔(۲)

حضرت نافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: میں ایک بار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جا رہا تھا

(۱) ابن خزیمة
(۱) مسند أحمد

راستے میں بانسری کی آواز سن کر انھوں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور راستے کی دوسری سمت دور تک نکل گئے، آگے جا کر مجھ سے دریافت کیا: نافع! کچھ سن رہے ہو؟ میں نے کہا نہیں، پھر اپنے کانوں سے انگلیاں ہٹائیں اور فرمایا: میں ایک بار رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، آپؐ نے بانسری کی آواز سن کر اسی طرح کیا تھا جیسے میں نے اب کیا ہے(۱)

حضرت سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ: عبداللہ بن عمرؓ محرم عورتوں کے موزے کاٹ دیا کرتے تھے، لیکن جب صفیہؓ بنت عبید نے حضرت عائشہ ؓ کے حوالے سے بتایا کہ اللہ کے رسولؐ نے اس سلسلے میں عوتوں کو رخصت دی ہے تو آپ رسول ﷺ کا حکم سن کر اس سے باز آگئے۔

اشیاء خورد و نوش کی پسند اور ناپسند کا معاملہ آدمی کے شخصی میلان پر منحصر ہے، ممکن ہے ایک حلال چیز کسی کو زیادہ مرغوب نہ ہو جبکہ وہی چیز دوسروں کو بے حد پسند ہو، اللہ کے رسول ﷺ کو بعض غذائی اشیاء بے حد پسند تھیں، آپؐ نے اپنی پسندیدہ چیزوں کو امت کے لیے فقہی اصطلاح میں مسنون تو نہیں قرار دیا ہے، لیکن صحابہ کرام کا والہانہ تعلق و لگاؤ ہی تھا کہ وہ اس معاملے میں آپؐ کی پسندیدہ اشیاء کو اپنی پسند قرار دے کر تاحیات اس پر عمل پیرا رہے۔

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ خادم رسول ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے: ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک دعوت میں شریک تھا، دعوت میں میزبان نے کدو کا سالن پکوایا تھا، آپؐ نے کدو زیادہ پسندیدگی سے تناول فرمایا، آپؐ پیالے میں کدو تلاش کر کے تناول فرما رہے تھے، آپؐ کی اس پسندیدگی کی وجہ سے اس دن سے مجھے بھی کدو بے حد مرغوب ہے۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عباس نے ایک بار آپ ﷺ کو جس نوعیت کا ازار باندھے ہوئے دیکھا تاحیات اسی طرح ازار باندھتے رہے، سوال کیے جانے پر جواب دیا کہ اس طرح میں نے رسول اللہ ﷺ کو ازار باندھے ہوئے دیکھا ہے(۳)

کتب احادیث میں اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں، ان سے اطاعت رسولؐ کی شرعی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخری نبیؐ کی صحبت کے لیے اللہ تعالی نے جن نفوس قدسیہ کا انتخاب فرمایا تھا انھوں نے کس طرح اس حق کو سمجھا اور اس کو ادا کیا ہے، امت کے لیے دل و دماغ کو روشن کرنے والے یہ واقعات جو اصحاب رسول کی سیرت کا خلاصہ و نچوڑ ہیں ہمیشہ مشعل

---

(۱) مسند أحمد

(۲) سنن أبي داود، كتاب الاطعمة، باب في أكل الربا،

(۳) سنن أبي داود، كتاب اللباس، باب ما جاء في الكبر

راہ بنے رہیں گے، آپ کی ہر آواز پر لبیک کہنے والے اور حکم رسول ﷺ پر اپنی گردن کٹا دینے والے ان صحابہ نے اپنی تابناک زندگی سے آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ قرآن مجید نے رسولؐ کی شخصیت کو جو امت کے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دیا ہے دراصل اس کی عملی صورت کیا ہے، زندگی کے مختلف شعبوں پر اس کا انطباق کیوں کر کیا جاسکتا ہے، عقائد، عبادات اور معاملات کے جملہ احکام و مسائل میں وہ سنت رسولؐ کی اتباع کرتے تھے، اس سے ہٹ کر نہ انھوں نے کبھی سوچا ہے اور نہ اس کی جرأت کی ہے۔

دور جدید میں سیرت رسولؐ سے اخذ واستفادہ کا وہی معیار ضروری ہے جو صحابہ کرامؓ کا تھا، اگر امت اس طریقے پر کاربند ہو جائے تو اس کی دنیا بھی بن جائے اور آخرت میں دائمی راحت وسکون اس کا مقدر بن جائے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین!

رسول ﷺ کی اطاعت نصوص کی روشنی میں

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، نائب قاضی امارت شرعیہ، پٹنہ

حیات بشری کے وہ منتخب نمائندے جن پر خدا نے اپنا کلام نازل کیا اور انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہر قوم اور ہر خطۂ ارض میں پیغامبر بنا کر بھیجا، انھی کو نبی و رسول کہا جاتا ہے، مگر انبیائے کرام نہ تو کوئی اوتار ہوتے ہیں جن میں خدا حلول کرتا ہے، جیسا کہ براہمہ اور جوگیوں کا عقیدہ ہے اور نہ وہ ہیکل انسانی میں خود خدا ہوتے ہیں جن سے باپ اور بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے، جیسا کہ نصاریٰ نے سمجھا ہے اور نہ ہی وہ ایسے مصلح وریفارمر ہوتے ہیں، جن کا وحی الٰہی اور رسالت خداوندی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جیسا کہ موجودہ دور کے الحادزدوں کا خیال ہے، بلکہ وہ خدا کے ایسے انسان فرستادہ اور رسول ہوتے ہیں جن سے خدا ہم کلام ہوتا ہے اور ان پر اپنی وحی نازل کرتا ہے۔

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (الأعراف:۷/۳۵)

''اے بنی آدم (ہم تمھیں ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہے ہیں کہ) جب ہمارے پیغمبر تمھارے پاس آیا کریں اور ہماری آیتیں تم کو سنایا کریں (تو تم ان پر ایمان لایا کرو) جو شخص (ان پر ایمان لا کر اللہ سے) ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا تو ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

چونکہ انبیاء خلاصۂ کائنات اور اپنی فکر وفہم نیز قول وعمل میں معصوم اور خدا کے ترجمان ہوتے ہیں اور ان کی ذات وحدت ملی کا نشان اور ایمان کا محور ہوتی ہے، اس لیے ان کا ہر حکم واجب التعمیل اور مفترض الطاعت ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(النساء:٦٤/٤)

''دنیا میں کبھی پیغمبر اسی لیے بھیجے گئے کہ اللہ کے اذن سے ان کی اطاعت کی جائے۔''

اسی سلسلۂ زریں کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (الفتح:٢٩/٤٨) جو اپنی صفات اور خوبیوں کے اعتبار سے تمام انبیاء سابقین کے اوصاف کے جامع اور آنے والی نسلوں کے قابل تقلید نمونہ ہیں، اس لیے دین کی تکمیل کے اعلان کے ساتھ ہی سلسلۂ نبوت کے اختتام کا بھی من جانب اللہ ان الفاظ میں اعلان کر دیا گیا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾(الأحزاب:٤٠/٣٣)

''اور محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اور چونکہ آپؐ خاتم النبیین ہیں، اس لیے آپ قیامت تک کے لیے ایک زندۂ جاوید پیغمبر، مثالی شخصیت اور قابل تقلید نمونہ ہیں۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾(الأحزاب:٢١/٣٣)

''تم کو رسول اللہ کی پیروی کرنی بہتر ہے یعنی اس شخص کو جسے خدا سے ملنے اور روز قیامت کے آنے کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

اس لیے اب اللہ کی ذات اور آخرت پر ایمان اس وقت تک کامل وصحیح نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ ہو اور نہ اللہ کی محبت قابل تسلیم قرار پائے گی جب تک کہ اللہ کے رسول ﷺ کی محبت دل میں نہ ہو اور اس کی اتباع نہ کی جائے۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(آل عمران:٣١/٣)

''آپ کہہ دیجیے (کہ اے لوگو!) اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم کو دوست رکھے گا۔''

اور چونکہ محبت ایک اندورنی ومخفی چیز ہے، اس لیے مالک حقیقی کی محبت کا پیمانہ رسول کی اطاعت واتباع کو قرار دیا گیا، لہٰذا اب جو شخص اپنے دعوے میں جتنا سچا ہوگا، اتنا ہی رسول اکرم ﷺ کی اتباع کا اہتمام کرے گا اور جو اس اتباع واطاعت سے منہ موڑے گا، وہ منکرین وکافرین میں شمار ہوگا۔

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾(آل عمران:۳/۳۲)

''کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اطاعت رسول ایمان کا لازمی تقاضہ اور دین کا وہ اساسی حصہ ہے، جس کے بغیر نہ تو ایمان ویقین صحیح قرار پا سکتا ہے اور نہ بندہ اس کے بغیر فوز وفلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ رسول چونکہ اپنی گفتار وکردار میں خدا کا ترجمان اور غلطی وخطا سے پاک ہوتا ہے، اس لیے اس کی اطاعت صرف واسطہ ہوتی ہے، کیونکہ اس کی اطاعت ومحبت تو دراصل خدا کی اطاعت ومحبت ہوتی ہے۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾(النساء:۴/۸۰)

''جو شخص رسول کی فرمانداری کرے گا بے شک اس کے اللہ کی فرمانداری کی۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار متعدد پیرایۂ بیان میں اطاعت رسول کا حکم دیا ہے، اگر اطاعت رسول کی آیات کا شمار کیا جائے تو سو(۱۰۰) سے زیادہ قرآنی آیات ایسی ملیں گی جن میں صراحتاً یا اشارتاً اطاعت رسول کا بیان ہے، قرآن نے انبیاء سابقین میں سے جس نبی کا تذکرہ کیا ہے، سب کی زبان سے ان کا یہ پیغام نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی امت سے یہ کہا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾(الشعراء ۲۶/۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۷۹، الزخرف۴۳: ۶۳، النوح ۷۱: ۳)

''یعنی تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔''

اطاعت رسول کی اسی اہمیت کی بنا پر خود رسول اکرم ﷺ نے متعدد مواقع پر لوگوں کو اپنی اطاعت کرنے کی تاکید کی اور فرمایا:

«مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ» (البخاری)

''جس نے میری اطاعت کی یقیناً وہ جنت میں جائے گا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی بھی نافرمانی کی۔''

نیز فرمایا:

«مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى» (البخاری)

''جس نے میری اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی پس اس نے انکار کیا۔''

بلکہ ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے یہ کہا کہ: اگر حضرت موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کے زمانہ کو پاتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

«لَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَا تَّبَعَنِي» (الدارمی)

''اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو جائیں اور میری نبوت کو پائیں تو انھیں بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہیں۔''

بنیادی طور پر اتباع رسول کے دو طریقے اور ذریعے ہیں، ایک کتاب اللہ، دوسرا سنت رسول اللہ ہے، یہ دونوں ہدایت کے ایسے ذریعے ہیں کہ جب تک کوئی ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہے گا گمراہ نہ ہوگا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ مَا إِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهِمَا فَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا، كِتَابُ اللهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهِ» (موطأ مالك)

''میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم انھیں مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ جان لو کہ وہ کتاب اللہ اور میری سنت ہیں۔''

کتاب اللہ اور سنت دونوں ہی وحی الٰہی کا حصہ ہیں فرق یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی ملائکہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے جو بطریقِ تواتر ہم تک پہنچا اور دوسرا منطوق نبی ہے جو حکم و معنی کے اعتبار سے منزل من اللہ ہے، اگرچہ اس کے الفاظ و تعبیرات رسول کے ہوں، مگر ہیں دونوں وحی، اسی کو قرآن نے کہا ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۵۳/۳-۴)

''اور (آپ) خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے، یہ (قرآن) تو اللہ کا حکم ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

اور سورہ حشر میں یوں فرمایا:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾ (الحشر: ۵۹/۷)

''اور رسول جو کچھ تمھیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو۔''

نیز سورہ بقرۃ ۲: ۲۳۱ میں فرمان باری ہے:

﴿وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (البقرة:۲/۲۳۱)

''اگر وہ تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں۔''

جس کے بارے میں امام شافعی ؒ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں لکھا ہے کہ اس آیت میں حکمت سے حدیث رسولؐ مراد ہے کیونکہ یہاں ''الکتاب'' کے ساتھ ''واؤ'' عطف کے بعد حکمت کا ذکر ہے، اس لیے یہاں حکمت سے مراد حدیث رسولؐ ہی ہے، کچھ اور نہیں ہو سکتا ہے۔ (الرسالہ، ص:۱۳)

خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَلَا وَإِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»

''خبردار مجھے قرآن حکیم اور اس کی مثل اور بھی حکمت و دانائی کے امور دیے ہیں۔''

اور کہا:

«مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ» (مسلم)

''جن چیزوں سے تمھیں روکا جائے ان سے باز رہو اور جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا جائے انھیں اپنی استطاعت کے مطابق انجام دو۔''

اسی طرح ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''عنقریب ایسا زمانہ آئے گا جس میں ایک شخص اپنی مسند پر بے فکری سے تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، جس کے سامنے میری حدیث آئے گی تو وہ کہے گا۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کتاب اللہ کافی ہے، ہم نے اس میں جو حرام پایا، اسے حرام کہا، آپ نے پھر کہا: خبردار! رسول اللہ نے جو کچھ حرام کیا وہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہے۔'' (ابن ماجہ)

علامہ ابن عبدالبر ؒ نے ''جامع بيان العلم وفضله'' میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک بار اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث بیان کی کہ آپ نے فرمایا ہے:

''اللہ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو گودنا کرتی یا کراتی ہیں اور ان پر جو چہرے کے بال اکھڑواتی ہیں اور حسن و زیبائش کے لیے اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرتی اور دانتوں کے درمیان دراڑ پیدا کرتی ہیں۔''

بنو اسد کی ایک عورت نے یہ روایت سن کر حضرت عبداللہ ؓ سے پوچھا کہ آپ کی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ آپ فلاں فلاں قسم کی عورتوں پر لعنت کرتے ہیں تو اس کے جواب میں حضرت عبداللہ ؓ نے کہا کہ میں اس پر کیسے لعنت نہ بھیجوں جس پر اللہ کے رسولؐ نے لعنت کی ہے اور جو

کتاب اللہ میں موجود ہے، یہ سن کر اس عورت نے کہا کہ: میں نے قرآن پڑھا ہے، لیکن مجھے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں ملی، اس کے جواب میں حضرت عبداللہ نے کہا: اگر تم نے قرآن غور سے پڑھا ہوتا تو تجھے یہ ضرور ملتا، کیا اللہ نے نہیں کہا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾(الحشر:۷/۵۹)

''اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے اجتناب کرو۔''

رسول اللہ ﷺ کی مخلصانہ اور مکمل اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات نفس اور رسم و رواج کو اسوۂ رسول ﷺ کے تابع کر دیا جائے، حتیٰ کہ اسوۂ نبویؐ کا جو حصہ ہماری عقل و سمجھ کی رسائی سے باہر ہو اس میں بھی پوری فدائیت اور فنائیت کے جذبہ کے ساتھ متابعت کی جائے اور وہاں بھی جہاں توحید الٰہی میں کسی شائبہ کا اندیشہ لگتا ہو، مگر رسول اللہ نے وہ عمل کیا ہو تو اسوۂ نبوی کو نہ چھوڑا جائے اور یہ کہا جائے جیسا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے جب حجر اسود کا بوسہ لیا تو کہا:

''بے شک میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان، اگر میں نے اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کو تیرا بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے نہ چومتا۔''

(بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ کی سنت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ تو وہ ہے، جو آپ ﷺ کے اقوال سے متعلق ہے، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے اطاعت واتباع کرنے کی ہدایت دی ہے اور خود اس کے بارے میں اللہ نے کہا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾(الحشر:۷/۵۹)

''اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے اجتناب کرو۔''

اس کے علاوہ دوسرا حصہ آپ ﷺ کے افعال و اعمال اور اخلاق سے متعلق ہے، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الأحزاب:۲۱/۳۳)

''بے شک تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ ہے۔''

آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سے ایک بار فرمایا تھا:

«اَلَمْ يَكُنْ لَكَ فِيَّ اُسْوَةٌ»

''کیا تیرے لیے میری ذات میں اسوہ اور نمونہ نہیں ہے۔''

یا آپ ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» (البخاری)

''جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو ایسے ہی تم بھی نماز پڑھو۔''

محققین علماءِ اصول نے رسول اللہ ﷺ کے افعال طبعیہ وغیر طبعیہ اور افعال ارادیہ وغیر ارادیہ پر بڑی دقیق بحث کی ہے جس کے اعادہ ونقل کا یہ موقع نہیں، البتہ اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ جو چیزیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص نہ تھیں اور آپ نے اسے کیا ہے تو وہ ہمارے لیے اسوہ ونمونہ ہیں، اگر وہ عمل آپ کے لیے واجب تھا تو ہمارے اوپر بھی واجب ہے اور اگر آپ کے لیے مستحب یا مباح تھا تو پھر وہ ہمارے لیے بھی مستحب یا مباح ہے۔ (دیکھیے اصول الفقہ للسرخسی:۲/۸۷)

اسی طرح سنت میں رسول اللہ ﷺ کے بعض ایسے دلی ارادوں یا تمناؤں کا ذکر ملتا ہے جن پر عمل تو آپؐ نے نہیں کیا البتہ صرف اپنے عمل کرنے یا ارادے کا اظہار کیا، اس بارے میں علماءِ اصول نے دقیق ونفیس بحث کی ہے، علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے رسول اللہ ﷺ کے ارادوں پر عمل کرنے کو مستحب کہا ہے، مگر علامہ ابو اسحاق شاطبی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایسے ارادے جن پر آپؐ نے عمل نہیں کیا یا ایسے امور جو آپؐ کے سامنے آئے اور آپؐ نے ''ترک'' کا طریقہ اختیار کیا ان سب کے احکام الگ الگ ہوں گے، کبھی تو آپؐ نے کسی طبعی کراہت کی بنا پر چھوڑ دیا اور کبھی افضل عمل کی خاطر چھوڑ دیا، یا کبھی کسی امر مطلوب کو کسی اجتماعی مفسدہ کی بنا پر چھوڑ دیا، اس لیے ایسے متروکات میں امت کے لیے الگ الگ حکم ہوں گے۔ (الموافقات)

وصلى الله على خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين!

حب رسول ﷺ کی حقیقت واہمیت کتاب وسنت کی روشنی میں

مولانا عطاء اللہ خان، مقیم حال رسول آباد، بھیونڈی، تھانہ

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(الجمعة :٦٢/٢)

''وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں انھی کی قوم میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھاتے ہیں اور یہ لوگ آپ ؐ کی بعثت سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(آل عمران: ١٦٤/٣)

''حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا ہے جب کہ انھی میں سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی (تزکیۂ نفس) کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور یہ لوگ آپ ؐ کی بعثت سے قبل صریح گمراہی میں تھے۔''

ایک دوسری آیت میں اطاعت رسول ﷺ کی حقیقت واہمیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(الاعراف:۷/۱۵۷)

''جولوگ اس امی رسول و نبیؐ کی پیروی کرتے ہیں، جسے وہ اپنے یہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ رسول انھیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز بتاتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے جو بوجھ اور قیود اب تک تھے اتار دیتا ہے، جولوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے اور ان کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور اس نور (قرآن) کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتارا گیا ہے تو ایسے ہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔''

ایک دوسری آیت میں اطاعت رسول ﷺ کی حقیقت واہمیت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ﴾(طہ:۲۰/۹۰)

''تمھارا رب رحمٰن ہے، تم میری اتباع کرو اور میرے امور واحکام کی تابعداری کرو۔''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اتباع رسول ﷺ کو محبت الٰہی کی علامت ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾(آل عمران:۳/۳۱)

''آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔''

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرنا شیوۂ کفر قرار دیا گیا ہے:

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ﴾(آل عمران:۳/ ۳۲)

''آپؐ کہہ دیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و پیروی کرو، اس کے باوجود بھی اگر وہ روگرداں رہیں تو اللہ تعالیٰ کافروں کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔''

معلوم یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور آپؐ سے بغض رکھنا شیوۂ کفر ہے۔

ایک دوسری آیت میں آپ ﷺ کی اطاعت کو رحمت الٰہی کا موجب قرار دیا گیا ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(آل عمران:۳/ ۱۳۲)

''اور تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری کرو، شاید تمھاری یہ محبت اور جذبۂ اطاعت رحمت الٰہی کا ذریعہ بن جائے۔''

غرض کہ قرآن کریم کی بے شمار آیات میں آپؐ کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اب ذرا اس سلسلے کی چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«من أطاعني فقد اطاع الله، ومن عصاني فقد عصى الله» (البخاری)

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور میری نافرمانی کرنے والا اللہ کا نافرمان ٹھہرے گا۔''

معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت لازم وملزوم کی طرح ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

«كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أبى؟ قالوا: يارسول الله! ومن يأبى قال: من أطاعني فقد دخل الجنة ومن عصاني فقد أبى» (البخاری)

''میری امت کے تمام لوگ جنت میں داخل ہوں گے مگر وہ لوگ جنھوں نے میری شریعت کا انکار کیا ہوگا، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ: اے اللہ کے رسولؐ! انکار کون کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنتی ہے اور میرا نافرمان میرا انکار کرنے والا ہے۔''

ان آیات اور احادیث سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کی اتباع کی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے:

«إن المحب لمن يحب مطيع»

''محبت کرنے والا اپنے محبوب کا تابع فرمان ہوتا ہے۔''

اور سورۂ اعراف کی مندرجہ ذیل آیت میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(الاعراف:۷/۱۵۷)

''جو لوگ ایمان لائے اور آپؐ کی توقیر وتعظیم کی اور جذبۂ احترام کے ساتھ آپؐ کی مدد کی اور آپؐ کی دعوت دمشن کی ترویج میں آپؐ کے دست وبازو بنے رہے اور آپؐ کے مقاصد

کی تکمیل میں اپنی قوتوں، صلاحیتوں، لیاقتوں اور توانائیوں کو صرف کیا اور آپ کی مکمل طور پر اتباع و تابعداری کی، تو یہی وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن نے فلاح یافتہ کہا ہے۔ دراصل اس آیت کے اصل مخاطب یہود و نصاری ہیں جنھیں مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ: یہی رسول النبی الامی ہیں جن کے بارے میں تمھاری کتابوں 'تورات، انجیل' میں پیش گوئیاں موجود ہیں اور جب رسولؐ آ گئے اور اپنی دعوت کو پیش کرنے لگے تو تم نے ان کی دعوت کو اپنے لیے بوجھ محسوس کر لیا۔"

قرآن کریم کی اس آیت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حب رسول ﷺ کی حقیقت و اہمیت کتاب و سنت کی نظر میں کیا ہے؟

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۵۷/۷)

معلوم یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی چار بنیادیں ہیں:

① نبی اکرم ﷺ کی شریعت پر ایمان لایا جائے اور اس کی تصدیق کی جائے۔
② آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔
③ آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔
④ آپ ﷺ پر نازل شدہ نور ہدایت کی پیروی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

یہی وہ چار چیزیں ہیں، جو رسول اکرم ﷺ اور ہمارے درمیان تعلقات کی خاطر بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اب ان چاروں باتوں کی توضیح ملاحظہ کیجیے۔

اول ایمان: جو کہ اقرار باللسان، تصدیق بالقلب اور عمل بالارکان کو مستلزم ہے، ظاہری محبت اور زبانی دعوے کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے نبی ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کیا کرتے تھے بلکہ نماز، روزہ اور زکاۃ ادا کرتے تھے، مگر ان کے دل نور یقین سے خالی تھے جس کی وجہ سے اللہ نے انھیں جہنم میں جھونک دیا۔

اسی طرح اگر کوئی دل میں نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو مگر زبان سے اقرار نہ کرتا ہو تو شریعت کی رو سے وہ بھی کافر ہے: «أشهد أن محمدًا عبده ورسوله»

گویا کہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان

دونوں کے ارتباط واشتراک سے ہوگی۔

دوسری بنیاد توقیر و تعظیم ہے: یہاں یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب ایمان یقین قلبی کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے کچھ مضمرات ونتائج سامنے آتے ہیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ﴾ جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کی''، معلوم یہ ہوا کہ ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے، اس کا اندازہ سورہ حجرات کی اس آیت سے لگائیں:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾(الحجرات:۲/۴۹)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز پر بلند مت کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے وقت بلند آواز اختیار کرتے ہو، مبادا تمھارے سارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمھیں اس کا احساس تک نہ ہو۔''

غور کیجئے کہ یہاں نافرمانی ومعصیت کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ سُوئے ادب اور ایک معمولی سی بے احتیاطی کی وجہ سے یہ دھمکی دی گئی۔

معلوم ہوا کہ ایمان بالقلب کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے اور اسی ایمان بالقلب اور توقیر و تعظیم کی تشریح سمجھنے کے لیے دو چیزیں سامنے آتی ہیں:

① اطاعت رسول ﷺ

② محبت رسول ﷺ

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(النساء:۴/۶۴)

''اور ہم نے تمام رسولوں کو اسی واسطے بھیجا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔''

اور ایک آیت میں کہا گیا۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾(النساء:۴/۸۰)

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اطاعت رسولؐ کے لازمی ہونے کا اندازہ اس آیت سے لگائیں:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾(النساء:٤/٦٥)

''تمھارے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے نزاعات میں آپ ہی کو اپنا حکم اور جج تسلیم نہ کرلیں اور آپؐ کے فیصلے کو اپنے دلوں کی گہرائی سے قبول کر کے اس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔''

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ صرف عزت و توقیر ہی کافی نہیں بلکہ جذبہ اطاعت اور آپؐ کے نقش قدم پر چلنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی ایمان و توقیر کا دوسرا لازمی نتیجہ محبت ہے۔ اس لیے اسلام میں زبردستی اور جور و ظلم کی اطاعت مطلوب نہیں، بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو دل کی گہرائی اور آمادگی و انبساط قلب کے ساتھ ہو، یہی وجہ ہے کہ احادیث میں فرمایا گیا:

«لایومن أحد کم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده والناس أجمعین» (صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب حب الرسول ﷺ من الإیمان)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میںؐ اس کے لیے اس کی آل و اولاد اور دیگر چیزوں سے محبوب ترین نہ ہو جاؤں۔''

ایمان کے بعد محبت رسول ﷺ کی کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کی اس گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے جسے محبت رسول ﷺ کے باب میں عموماً ذکر کیا جاتا ہے۔

اب اطاعت اور محبت کا ایک لازمہ بنتا ہے جسے ہم اتباع کہتے ہیں، چونکہ قلبی اور حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اتباع کے جذبے سے معمور ہو، اس کے دل میں یہ بات گھر کر جاتی ہے کہ میرے محبوب کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طرز کیا تھا، اس کا حکم دیا جائے، یا نہ دیا جائے مگر محبت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی ہر ادا کو حرز جاں بنا لیا جائے۔

«إن المحب لمن یحب مطیع»

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾(آل عمران:٣/٣١)

''اے نبیؐ آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں کو معاف کر دے گا، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنا ہے۔
حضرات! ابھی پیش کردہ آیت ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ﴾ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی دو بنیادیں واضح ہو چکیں، اب تیسری بنیاد «وَنَصَرُوْهُ» کی اصطلاح میں بیان ہوگی، یعنی جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی مدد اور حمایت کی۔

نصرت رسولﷺ: رسول اللہ ﷺ کی نصرت وحمایت کس کام میں کی جائے اس کے لیے یہ بات شرح صدر کے ساتھ سمجھ لیں کہ درحقیقت رسالت و نبوت ایک منصبی فریضہ ہے جو خدائے واحد کی طرف سے نبی و رسول کو تفویض کیا جاتا ہے، گم گشتہ راہ انسانیت کو راہ راست پر لانا، غافلوں کو بیدار کرنا، بیابان کی شب تاریک میں قندیل ربانی فروزاں کرنا، انسانوں کو مکارم اخلاق کا خوگر بنانا، جور واستبداد کو ختم کر کے امن کا رسیا بنانا، لوگوں کو آخرت کا یقین دلانا، کتاب وسنت کی جملہ تعلیمات کو عام کرنا، طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرنا، باطل قوتوں سے نبرد آزما ہونا اور اسلام کے خلاف ہونے والے ہر باطل اعتراض کا دندان شکن جواب دینا۔ درحقیقت یہی نصرت رسول ﷺ ہے کہ اسلام کے جملہ تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

آپ ﷺ کی زندگی ہر اعتبار سے ہمارے لیے مشعل راہ اور لائق اتباع ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی سیرت کی جامعیت کو یوں بیان کیا ہے:

''اسلام اور اس کے متبعین کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں جامعیت ہے اور جہاں کہیں بھی آپ ﷺ کی محبت واتباع کا تذکرہ ہو وہاں انسان کی دنیوی واخروی کامیابی کی ضمانت بھی ہوگی۔ اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال سنو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر ایک نظر دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد و معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی وبیکسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جد وجہد کا نظم درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر، فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہؓ اور آمنہؓ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو،

اگر بچے ہو تو حلیمہ سعدیہؓ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایت کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبہ کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے۔ مدینہ کی کچی مسجد میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کے قصر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ و عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسن و حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، تمھاری زندگی کے لیے نمونہ، تمھاری سیرت کی درستگی و اصلاح کے لیے سامان اور ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ و رہنمائی کا نور محمد عربی ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے، اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالب علم اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد عربی ﷺ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے، جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے اس کے سامنے نوح، ابراہیم، ایوب، یونس، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہوں گی۔

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری

(ماخوذ از خطبات مدراس از علامہ سید سلیمان ندوی)

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

(مولانا ذکراللہ ذاکرندوی، علمی منزل بسکوہر بازار، سدھارتھ نگر)

انوارِ تمہید

رونق تمہید، وزیب عنوان دو منور و مقدس آیات ہیں، آئینہ مقالہ میں مکمل سیرت رحمت کی حسین جھلکیاں نظر نواز ہوں گی اور سامعہ نواز بھی۔

خاک افتادہ ذرۂ بے مقدار اگر آفتاب عالمتاب کے دامن میں جگہ پالے، خزف راہ اگر تاجِ مکلل کا قرب حاصل کر لے اور اگر دالق پوش و بوریہ نشین فقیر حقیر صاحب تخت، شہنشاہ کا حاشیہ بردار بن جائے، تو یہ ذرہ و خزف اور درویش تہی دست کی طالع وری، بلند اقبالی اور اعزاز و اکرام کی کتنی بڑی دلیل ہے، بعینہ آج جب میں سرخیل انبیاء، سید رسل و ولد آدم، حبیب الہ و رسالت کے شہنشاہ، مخدوم ملائک، انتخاب اولین و آخرین، صاحب خلق عظیم، ذات ستودہ صفات رسول اللہ ﷺ کے مدح سراؤں کی صف میں جگہ پا رہا ہوں تو میرے لیے یہ کتنا مقام شرف و خوش بختی ہے، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ محویت کی فضا اور والہانہ خلد میں بہ مائل پرواز ہو کر دربار مکہ و سرکار طیبہ میں زانوئے ادب تہہ کر کے "روض من ریاض الجنة" میں آسودہ و سرشار ہوں اور ایسا لگ رہا ہے کہ رب ذی العرش العظیم کی رضا اور روح القدس کی تائید جاری ہے، کیونکہ آمد مضامین بحر زخار کی طرح موجزن ہے اور دیدۂ تر میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے ہیں۔

جس کا تعارف بخشندۂ القاب مالک الملک خدا خود پیش کرے، جس کے گن حور و ملائک گائیں،

جس کی سیرت حکمتوں سے بھری آخری آسمانی کتاب قرآن کا پرتو ہو، جو نوید عیسیٰ، التجائے خلیل ہو، اس کی بارہ گاہ عالی میں جرأت سخن سازی جرأت بے جا معلوم ہوتی ہے اور افصح العرب محمد عربی ﷺ کے بارے میں پندرھویں صدی کے ایک عجمی کی مجال و تاب کہاں کہ لب کشا ہو سکے؟

لیکن اسی ممدوح و محمود محمد ﷺ کا یہ فرمان کہ شق حجر اور قطمیر تمر ہدیۂ دو، میرے احساس کمتری کے لیے پروانہ برتری اور تازیانہ ہمت افزائی ہے۔

البتہ پس و پیش یہ ہے کہ دربار عالی میں ہدیۂ عالیہ ہی موزوں ہے اور راقم کا یہ حال ہے کہ زبان سخن عاجز اور دامنِ خامہ تنگ، لیکن صاحب جوامع الکلمؐ کے ارشاد عالی کے مطابق، حتی الامکان چمن نبوت کے اس گل سرمدی، دبستان رسالت کے اس گلاب عطر آگیں اور شب معراج کے اس منارۂ نور کے دربار سیرت میں شگفتہ الفاظ، بہار افروز جملے اور حسن وبُو سے بھرپور تراکیب کے گل اور بوٹے، ستارے و کہکشاں صفحات قرطاس پر سجاؤں۔

سیرت کانفرنس کے عناوین رنگارنگ، متنوع، ہمہ جہت اور وسیع ولامحدود ہیں اور حسن یوسف، دم عیسیٰ اور ید بیضا کے مظہر پر قلمکاری کی نیت کی تو کسی ایک صفت پر ذوق مشق قائم و مطمئن نہیں ہوتا کہ اس ذات حمیدہ کی ہر ادا خود دعوت سخن دیتی ہے کہ مجھ پر جواہر سخن برساؤ:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
تماشہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

میں نے فکر عمیق و تفکر دقیق کے بعد فیصلہ کیا کہ تحقیق انیق صفت رحمت ہی پر پیش کروں کہ یہی صف رحمت سرچشمہ صفات و مخزن اخلاق ہے، جو رحم و کرم، عفو و درگزر اور محبت و رافت کا پیکر ہوگا، اس کے نام و کام، رفتار و گفتار، یگانوں اور بیگانوں سے برتاؤ سب میں رحم و بخشائش کا ظہور ہوگا، اس کے نام میں حلاوت، اس کی پیشانی پر نور شرافت، ان کی نگاہ میں پیار کی جھلک، ان کی زبان میں نرمی کی چاشنی اور ان کے معاملات میں ضد و انتقام کے بجائے خاکساری، انکساری، تواضع و فقر اور عفو و رحمت کے جلوے قدم بقدم نور پاش ہوں گے۔

اور یہ دور جو راکٹوں، طیاروں، بموں، میزائلوں اور دہشت گردی و غارت گری کا بھیانک، تاریک اور خونی دور ہے اور ساری دنیا امن کی بھکاری و پیاسی ہے، اس کے سامنے اس سراپا رحمت کی رحمت کو اتنا اجاگر کیا جائے اور اس کے رحمت بھرے ساغر کو ایسا پلایا جائے کہ نشۂ رحم میں جھوم کر والہانہ انداز میں یہ سیرت کانفرنس، اس کا ہاؤس اور اس کی مجلس برناڈ شا کی زبان میں پکار اُٹھے کہ قیام امن کے لیے محمد ﷺ تو موجود نہیں، نظم عالم کسی سچے محمدیؐ کے ہاتھ میں دے دو۔

میں اشارات و کنایات و تشبیہات و استعارات کے حسین و دلکش پیرائے میں مظاہر رحمت کی چند ہی حسین جھلکیاں دکھلاؤں گا کہ کانفرنس میں وقت کی تنگ دامانی اور قید، تفصیل و تشریح میں مانع ہے، کہاں مآثر رحمت کا بحر زخار اور کہاں پندرہ منٹ کی قید و شرط، ان حدود و شرائط میں مشتے نمونہ از خروارے اور سمندر کے چند قطروں ہی سے میزبانی ممکن ہے۔

جلوہائے نو بہ نو

نام میں بھی تابش رحمت

زباں پہ بار خدا میری کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

رسول رحمتؐ کے مقدس و منور اور محمود و معروف نام میں بھی رحمت کی حسین جھلک موجود ہے، اسم گرامی 'محمد' ہے اور ظاہر ہے کہ عزیز و حبیب، رؤف و رحیم، رفیق و شفیق، شریف و سعید، صالح و عادل نرم مزاج اور امن پسند پر حمد و مدح اور عقیدت و ثنا کے موتی نچھاور ہوں گے، ورنہ عبوس عضوض، ترش رُو و بدخلق، زبان دراز و ظالم، ہماز و مشاز پر لعنت و تہمت کی بارش ہوگی۔

نسب میں بھی ضیائے رحمت

درخت اپنے پھل سے اور پھل اپنے درخت سے پہچانا جاتا ہے، چنانچہ سرکار محمد کے والد عبداللہؓ اور والدہ آمنہؓ ہیں اور دونوں ناموں میں رحمت کی سحر آفرینی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے، عبدالعزی، بندۂ لات و منات اور پرستار سومنات میں شرک کا ظلم عظیم قطعاً ہوگا اور اللہ کے بندے میں خدائے واحد کی عبودیت اور «الخلق عيال الله» کی رحمت آفرینی لازماً ہوگی اور آمنہؓ کی گود یقیناً گہوارۂ امن ہوگی اور یہی باعث تھا کہ جاہلیت میں بھی عبداللہؓ کی شرافت اور آمنہؓ کی نجابت کا ڈنکا بج رہا تھا۔

وطن مالوف میں اثر رحمت

مکہ کوہستان و خارستان ضرور تھا، لیکن اولاً 'ابراہیمی فیض سے' پھر جلوۂ محمد ﷺ سے کعبۂ توحید میں گلپاشی، نور آفرینی اور میر فاراں کی ضیاباری ایسی ہوئی کہ آن کی آن میں مکہ پھولوں کی جنت، کلیوں کا فردوس اور گلدستوں کا بہارستان بن گیا۔

وقت پیدائش ابر رحمت

لوٹ، مار، قتل و خوں ریزی، شرک و کفر، فسق و فجور، بدتمیزی و بے حیائی اور جرائم و معاصی کی

تمازت وحرارت میں جب اس رحمت مجسم نے آنکھ کھولی تو آتشکدۂ ایران چاہے نہ ٹھنڈا ہوا ہو، لیکن حرم کے در و دیوار، بطحا کے سنگ و خار اور مکہ کے کوچہ و بازار میں جب آمنہؓ کا چاند نمودار ہوا تو چشم عرب نے یہ بھی دیکھا کہ مہر و وفا اور جود وسخا کا ایک کوکب درخشندہ حاتم اور عدل و مرحمت کا دوسرا نجم تاباں نوشیرواں افق عرب پر چمک رہا تھا اور یہ رحمت و برکت کے لیے بہترین فال وشگون تھا۔

مکی زندگی میں باران رحمت

جبر وظلم، کذب و باطل اور شر وفساد کے خلاف جب کوئی عدل و انصاف، حق وصداقت اور امن و سکون کی زبان کھولتا ہے تو ظالم و جابر، فسادی و قاتل، جھوٹے و بے ایمان، داعی حق پر پل پڑتے ہیں اور «لا تسمعوا لهٰذا القرآن» کا غوغا کرتے ہیں، زبان کاٹتے، بوٹی نوچتے، کانٹے بچھاتے، گڑھا کھودتے اور خنجر چلاتے ہیں، ہر قدم، ہر سمت اور ہر موڑ پر طوفان کھڑا کرتے ہیں اور یہی نبی رحمتؐ کے ساتھ بھی ہوا، مگر وہ پیکر رحمت، کانٹوں میں پھول، پتھروں میں ابریشم اور تلواروں کی آگ میں بردوسلام بنا رہا۔

میدانِ وغا کی زلزلہ افگن گھڑی ہو یا اذان کی ضرب باطل شکن، کعبہ کا جادۂ پرخار ہو یا شعب ابی طالب کی ہولناک گھاٹی، ہجرت کی شب قاتل ہو یا طائف کا سفر طوفانی، وہ رحم مجسم، وہ زبان خیر «اللهم أهد قومي فإنهم لا يعلمون» کہتا اور دعائے خیر کے پھول برساتا رہا۔

مدنی دور میں انوار رحمت

رحمت مکہ کا یہ مہر فارانی جب افق مدینہ پر جلوہ ریز ہوا تو اوس وخزرج کی قسمت چمک گئی، انصارِ یثرب کے طالع بلند پر شہریانِ مکہ کو رشک آنے لگا اور یہودانِ بدکردار کے استحصال وسودخوری کی بستی اجڑنے لگی، سرمایہ داری کے ستائے ہوئے غربائے مدینہ اطمینان کی سانس لینے لگے۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک تارکین وطن کا مسئلہ لاینحل رہا ہے، افغانستان وفلسطین کے مہاجر ہوں یا لبنان وکردستان کے تارکین وطن، بہاری بدقسمت ہوں یا آسامی مسلمان معصوم، سب خانہ بدوشی کی جگہوں، ٹپکتی بوندوں کے جھونپڑوں اور صرصر سے اجڑی کٹیوں اور خیموں میں برسہا برس سے امتحانی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن آغاز عالم سے آج تک اور شاید قیامت تک کے لیے دنیا کا ہر ڈرامہ نگار، ہر تاریخ نگار اور ہر قلمکار رحمۃ للعالمین ﷺ کی آبادکاری ومواخات پر داد دینے اور نذر عقیدت پیش کرنے کے لیے مجبور ہے۔

میدان جنگ میں اعجاز رحمت

جنگ ایک جنون، دیوانگی اور فتح نشہ و سرمستی ہے، جب شمشیر بے نیام ہو جاتی ہے اور خون کا پیاسا دشمن سامنے مغلوب و مجبور نظر آئے تو دل پتھر، آنکھ شعلہ بار اور تیغ خونخوار ہو جاتی ہے، لیکن بدر و احد خندق و سویق اور تمام غزوات میں دیکھو وہ پیغمبر رحمتؐ زمانۂ امن کا رحم دل وعفو گستر نظر آ رہا ہے، سخت ترین اور طاقتور حریف کو ہتھیار رکھوانے اور صلح پر مجبور کرنے کے لیے قتل عام، بے تحاشا بمباری، زہریلی گیس کی بارش اور رسد و ادویہ کی بندش جیسی ذلیل، انسانیت سوز اور قابل مذمت حرکتیں کی جاتی ہیں لیکن بدر جو مکہ و مدینہ کی پہلی جنگ ہے اور کفر زدہ مکہ کا تین گنا زائد مسلح زرہ پوش اور آہن میں غرق لشکر لیے پیش نظر ہے، عرب کی چلچلاتی دھوپ اور بدر کی تپتی زمین دماغ کو کھولا رہی ہے اور اتفاق سے مکی فوج پانی سے محروم ہے اور چشمۂ آب پر آب رحمت ﷺ کا قبضہ ہے، لیکن قلب رحمت کو یہ گوارا نہیں کہ دشمن کی فوج کو تشنہ مرنے پر مجبور کیا جائے اخروی قیامت کے ساقی کوثر ﷺ نے دنیاوی قیامت میں چشمۂ مومن دہانِ کافر کے لیے کھول دیا۔

دنیا کے فاتحو! عالم کے سپہ سالارو، نپولین کے جانشینو، ہٹلر کے پس ماندو، امریکیو، روسیو، اسرائیلیو! میرے نبیٔ رحمت ﷺ کی نظیر تم ہو تو بتاؤ اور ماضی و حال میں کہیں ہو تو دکھلاؤ، اے نبی رحمتؐ، اے رسول عفو و کرمؐ اور اے پیغمبر شفقت و شفاعتؐ:

کیا جانے تجھ میں کیا ہے کہ لوٹے ہیں تجھ پہ جی
یوں اور کیا جہاں میں تجھ سا حسیں نہیں

فتح مکہ میں سحر رحمت

یہ حلال رحمت چودھویں کا چاند، یہ نہال عفو، کرم گستری کا شجر عظیم اور یہ سراج شرافت اس وقت خورشید ہزار انوار بن جاتا ہے جب مکہ فتح ہوتا ہے، ظالم و جابر، قاتل و قاہر، قزاق و خونخوار، فریبی و سازشی انسان نما گرگ زادے و درندے سب تیر محمد ﷺ کے نشانے پر ہیں، ہر ایک خوف و پاداش سے کانپ رہا ہے اور سوچتا ہے کہ ابھی گردن الگ، سر قلم اور دھڑ خاک آلود ہوگا، وحشی پر لرزہ طاری ہے، دیدۂ ہندہ سے اشک جاری ہے، ابوسفیان گھبرایا ہوا ہے، عکرمہ منہ چھپائے ہے۔ لیکن شوٹ، فائرنگ اور شمشیر خارا شگاف کے وار کے بجائے اس رحمت مجسمؐ کی زبان رحمت، عفو کے ساز پر ایک پیار بھری آواز اور ایک صدائے دل نواز یہ دیتی ہے کہ: «لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»

اس صدا سے مکہ جھوم اٹھا، بطحا میں بہار رحمت چھا گئی اور دشمنان رحمت دامان رحمت سے لپٹ

گئے «فصلی اللہ علی النبی الکریم الرحیم»

بزم سیرت کے خوش نصیبو! آج بے شک ہم میں وہ نبی رحمتؐ موجود نہیں، لیکن دین رحمت کے سارے جلوے موجود ہیں، قرآن محفوظ اور سنت محمد ﷺ حصار صحاح میں جلوہ گر ہے:

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اخلاق نبویؐ: کتاب وسنت کی روشنی میں

(مولانا محمد مستقیم سلفی، مدرس جامعہ سلفیہ، بنارس)

''اخلاق'' خلق کی جمع ہے اور خلق اس عادت کو کہتے ہیں جو کسی کام کو ایک ہی ڈھنگ سے کرتے رہنے کی بنا پر پختہ ہو جائے اور خلق کا اطلاق اچھی، بری دونوں طرح کی عادات پر ہوتا ہے، اگر کسی انسان کا نفس شریعت کے تابع رہے اور اس کا عادی ہو جائے تو اخلاق اچھے ہوں گے اور اگر خواہشات نفسانی کے تابع رہے اور شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو پھر اخلاق برے ہوں گے۔

کائنات عالم کی سب سے اہم اور ضروری خدمت یہ ہے کہ لوگوں کو اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی تعلیم دی جائے اور تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اچھے اسلوب اور نرم گفتاری کے ساتھ پند ونصائح کی جائیں، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾(النحل:١٦/١٢٥)

''اے نبی آپؐ اپنے رب کے راستہ کی جانب (لوگوں کو) دانائی اور اچھی نصیحت سے بلائیں۔''

حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو جب فرعون کی جانب بھیجا گیا تو حکم دیا گیا:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی﴾(طه:٢٠/ ٤٤)

''(اے موسیٰ وہارون) تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا، شاید کہ وہ نصیحت پائے یا خدا سے ڈرے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نرمی اور خوش اسلوبی تبلیغ کی پہلی شرط ہے۔

موجودہ زمانے میں تعلیم کا مہذب طریقہ یہ ہے کہ علم اخلاق پر بلند پایہ لٹریچر اور پمفلٹ تیار کر کے اسے مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے، پھر اسے دنیا کے کونے کونے میں پھیلایا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں آج محاسن اخلاق کا جو بھی سرمایہ موجود ہے وہ صرف ان پاکیزہ ہستیوں کے دم قدم سے ہے جنھوں نے اپنے آپ کو حسن اخلاق اور کمالات انسانی کا پیکر بنا کر دنیا والوں کے سامنے پیش کیا، ان پاکیزہ ہستیوں میں سب سے اعلیٰ و افضل نبیوں اور رسولوں کی مقدس جماعت ہے، ان کی بعثت کا اولین مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ:

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران:٣/١٦٤)

''یعنی نفوس انسانی کا تزکیہ کریں، انھیں اچھے اخلاق سے آراستہ کریں اور کتاب وحکمت کی باتیں سکھائیں۔''

انبیاء اور رسولوں کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور اختتام حضرت محمد ﷺ پر ہوا، انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے ہی انسانوں میں برگزیدہ ہوتے ہیں اور منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد معصوم عن الخطاء، اس لیے انبیاء کرام کی جماعت تمام بنی نوع انسان پر فائق اور برتر ہوتی ہے۔

بڑے سے بڑے قائدین اور لیڈرز کی زندگیاں زیادہ سے زیادہ کسی ایک رخ میں کامیاب ہوتی ہیں، زندگی کے تمام پہلوؤں میں کامیاب نہیں ہوتیں۔

دیکھیے! بادشاہوں کی زندگیاں خود غرضی، خودنمائی اور دوسروں کی تحقیر کے افکار واعمال سے آلودہ ہوتی ہیں، فاتحین کی زندگیاں بنی نوع انسان کی تذلیل وتحقیر اور جلب منفعت سے آلودہ ہوتی ہیں، فلسفیوں کی زندگیاں تضاد، تغافل اور شک کا نمونہ ہوتی ہیں، جو شخص سقراط اور افلاطون، ارسطو اور فارابی کی کتابوں پر نظر رکھتا ہے، اس پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

لیکن اس کے برخلاف انبیاء کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجیے، انبیاء جو کچھ کہتے ہیں اس پر یقین بھی رکھتے ہیں اور جس پر یقین رکھتے ہیں اس کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ کبھی اپنے متبعین کو ایسا کام کرنے کا حکم نہیں دیتے جس پر خود عمل نہ کرتے ہوں، ان کا یقین محکم ہوتا ہے، جس پر کسی طرح کے بھی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے، لیکن اس مقدس ترین جماعت میں سے اعلیٰ وافضل سید الکونین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، آپ کی اسی فضیلت و برتری کو

ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں اولاد آدم سے ان کے اپنے سلسلے میں ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کہہ کر عہد و پیمان لیا، وہیں انبیاء کرام کے مقدس گروہ سے نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں بھی عہد و پیمان لیا، ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/۸۱)

''یاد کرو! اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسولؐ تمھارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی، (یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا): کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔''

مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ اس کے پیروؤں پر بھی از خود عائد ہو جاتا ہے کہ جو نبی ہماری طرف سے اس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو اس کا تمھیں ساتھ دینا ہوگا، اس کے ساتھ تعصب نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مخالفت نہ کرنا، بلکہ جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اسی کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

''یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ محمد ﷺ سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد میں آنے والے نبی کی خبر دی اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔''(۱)

حضور اکرم ﷺ کی ذات پر نبوت و کمالات کی انتہا ہوئی، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رافت، رحمت، شفقت، خشیت، عبادت، شجاعت، عدالت، سخاوت، فراست، تواضع، صبر و توکل اور اخلاق و کردار کی وہ خوبیاں اور محاسن عطا کیے جن کی پوری نسل انسانی میں کوئی مثال گزری ہے اور نہ گزرے گی، قرآن آپؐ کو انھیں صفتوں کے ساتھ متصف کرتا ہے:

(۱) تفہیم القرآن: ٤

﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبہ:۹/۱۲۸)

''لوگو! تمھارے پاس اللہ کا ایک رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے، تمہارا رنج وکلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے، وہ تمھاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے، وہ مومنوں کے لیے شفقت رکھنے والا رحمت والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے ان ترحمانہ جذبات کا ذکر کیا ہے، جو آپؐ کے پوری نسل انسانی کے لیے تھے، چنانچہ فرمایا گیا: ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ یعنی تمھارا رنج وکلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ صاحب ''رحمۃ للعالمین'' فرماتے ہیں:

یہ صفت کفار اور مومنین دونوں کے حق میں تھی، نبی ﷺ جب کفار کو کفر وشرک میں دیکھتے اور خیال فرمایا کرتے کہ یہ لوگ کس انجام بد کا شکار ہونے والے ہیں، یہ لوگ کیوں کر اپنے ہاتھوں اپنے لیے چاہ ہلاکت کھود رہے ہیں، تب حضور ﷺ کے دل رحم پرور پر نہایت صدمہ گزرتا تھا۔

بسا اوقات یہ کیفیت اس قدر بڑھ جاتی کہ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کی تسلی اور سکینت کے لیے اپنا کلام و پیغام بھیجنا پڑا:

سورۂ یٰسین میں ہے: ﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾ (یسین:۳۶/۷۶)

سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ (آل عمران:۳/۱۷۶)

''کفر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کی حالت سے آپؐ اندوہ گیں نہ ہوں۔''

① واقعات بدر میں مذکور ہے کہ جب حملہ آور انِ مکہ قید کر لیے گئے تو رات کو نبی ﷺ کو نیند نہ آئی، ادھر سے ادھر حضورؐ کروٹیں لیتے تھے، کرب واضطراب نمایاں تھا، ایک انصاری نے عرض کیا کہ حضورؐ کو کچھ تکلیف ہے، فرمایا نہیں، مگر عباس (حضورؐ کے چچا) کے کراہنے کی آواز میرے کان میں آ رہی ہے، اس لیے مجھے چین نہیں پڑتا، انصاری چپکے سے اٹھا، اس نے جا کر عباس کی مشک بندی کھول دی، انھیں آرام مل گیا تو وہ فوراً سو گئے، انصاری پھر حاضر خدمت ہو گیا، حضورؐ نے پوچھا کہ اب عباس کی آواز کیوں نہیں آتی، انصاری بولے میں نے ان کے بندھن کھول دیے ہیں، فرمایا جاؤ! سب قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرو، جب حضورؐ کو اطلاع دی گئی کہ سب قیدی اب آرام سے ہیں، تب نبی کریم ﷺ کا اضطراب دور ہوا اور حضورؐ خواب شیریں سے استراحت گزیں ہوئے۔ (۱)

(۱) رحمۃ للعالمین: ۳/۲۷

ذرا سوچنا ہے، یہ قیدی وہ تھے جنھوں نے تیرہ (۱۳) سال تک متواتر اہل ایمان کو ستایا تھا، کسی کو آگ پر لٹایا، کسی کو خون میں نہلایا، کسی کو بھاری پتھروں کے نیچے دبایا، کسی کو سخت اذیتوں کے بعد خاک و خون میں سلایا تھا اور پھر اس پر یہ نرمی اور یہ سلوک۔

عباس حضورؐ کے چچا تھے اور جہاں تک معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے وہ بادل نخواستہ صرف قوم کے اکراہ و اجبار سے بدر میں آئے تھے بایں ہمہ حضورؐ کے عدل و انصاف نے ان میں اور دوسرے قیدیوں میں کوئی امتیازی فرق قائم کرنا پسند نہ فرمایا۔

لیکن حضورؐ کی رحم دلی اور طبعی شفقت و رافت کا یہ عالم تھا کہ جب تک سب قیدیوں کے بہ آرام ہونے کی خبر نہ ملی اس وقت تک آپؐ کو نیند تک نہ آئی۔

﴿عَزِیزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ﴾ کا یہ جلوہ ایسے حملہ آوران و دشمنان جانی و ایمانی کے مقابلے میں تھا۔

④ جب نبی ﷺ ہجرت فرما کر رونق افروز مدینہ ہو چکے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنے فرمان:

﴿وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡهِمۡ﴾ (الانفال:۸/۳۳)

کا مفہوم ظاہر فرمایا اور اہل مکہ پر قحط شدید کی آفت کو اتارا، قحط اس شدت کا تھا کہ اہل مکہ کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہو گئی۔

ابوسفیان جو ہمیشہ مسلمانوں سے برسر پرخاش رہا کرتا تھا، وہ خود دربار مصطفویؐ میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے عرض گستر ہوا کہ حضورؐ ہمیشہ احسان اور صلہ رحمی کی تعلیم دیا کرتے ہیں، ہم حضورؐ کے قرابتی ہیں اور رحم کے ملتجی، احسان فرمایئے اور دعا کیجیے کہ اس قحط شدید سے ہم کو نجات ملے۔

نبی ﷺ نے ثمامہ بن اثال سردار نجد کو جو دولت ایمان سے مالا مال ہو چکے تھے حکم بھیج دیا کہ مکہ میں فوراً غلہ پہنچانے کا بندوبست کریں، ان کے علاقہ میں اناج بکثرت تھا، انھوں نے غلہ صرف اس لیے روک رکھا تھا اور منفعت تجارت کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ اہل مکہ دشمنان رسولؐ ہیں، اب حکم نبویؐ کی تعمیل ہوئی اور اہل مکہ کی جان میں جان آئی۔ (۱)

یہ بھی دشمنوں کے مقابلے میں ﴿عَزِیزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ﴾ کا ایک ثبوت تھا۔

⑤ جنگ طائف ان حملہ آوروں کے ساتھ ہوئی، جن سے حنین اور اوطاس میں شدید محاربہ ہوا تھا، یہ لوگ ان مقامات سے شکست کھا کر قلعہ طائف میں متحصن ہو گئے تھے اور ابھی ان کی فوجی طاقت زوروں پر تھی، نبی ﷺ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، چند روز کے بعد حضورؐ کو معلوم ہوا کہ دشمن محاصرے

---

(۱) رحمۃ للعالمین:۳/ ۷۵

کی شدت سے سخت تکلیف میں ہیں، بھوک نے ان کی ہلاکت کو بہت قریب کر دیا ہے، حضورؐ نے محاصرہ اٹھا دینے کا حکم دے دیا، چند صحابہؓ نے جنگی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض کیا کہ اب تو قلعہ فتح ہونے والا ہے، مگر حضورؐ نے از راہ رحم و کرم جو حکم دیا تھا، اس کی تعمیل کرائی، یہ واقعہ ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا تیسرا نمونہ ہے۔ (۱)

امت پر آنحضرت ﷺ کی شفقت، رافت اور رحمت کی گواہی قرآن پاک ایک مقام پر یوں دیتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۳/۱۵۹)

''یعنی خدا کی عنایت سے تم ان لوگوں کے لیے نرم ہوا ے محمدؐ! اگر تم کہیں بد خلق اور سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ (جو تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں) تمھارے گرد و پیش سے ہٹ جاتے۔''

یہ حقیقت مسلّم ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کی بنیاد اخلاق حسنہ پر ہے، لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جتنے مصلح اور پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ان سب نے یہی تعلیم دی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی کی راہ دکھاتا ہے اور ظلم تباہی کی جانب لے جاتا ہے، خیرات نیکی ہے اور چوری بدی ہے۔

نبی ﷺ کی بعثت اور تعلیمات ان ابواب میں تکمیلی حیثیت رکھتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہی اس لیے کہ دینِ فطرت کامل نہیں ہوا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر نبی کو ایک خاص صفت کے ساتھ متصف کرتا رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حق پرستی و توحید شناسی، حضرت یوسف علیہ السلام عفت و امانت، حضرت ایوب علیہ السلام صبر و رضا، حضرت موسیٰ علیہ السلام ذوق جہاد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام حلم و محبت کے مظہر کامل تھے۔

مگر آنحضرت ﷺ میں اس قسم کی تخصیص و تعیین ممکن نہیں، آپؐ کی ذات میں توحید ابراہیم، عفت یوسف، صبر ایوب، موسوی ذوق جہاد اور حلم مسیح وغیرہ جملہ صفات جمع کر دی گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ عالم گیر اور دائمی اعلان ہوا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب:۳۳/۲۱)

''تمھارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔''

نبی ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

---

(۱) رحمة للعالمين:۳/ ۷۵

«إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ» (الموطا للامام مالك، ماجاء في حسن الخلق وكنز العمال:۵/۲)

''یعنی میں کریمانہ اخلاق کو اتمام تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنَهُمْ خُلُقًا»(جامع الترمذی، أبواب الإيمان)

''یعنی مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے، جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

«خِيَارُكُمْ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا»(صحيح البخاری، باب حسن الخلق والسخاء وما يكره من البخل، ص: ۸۹۱)

''یعنی تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

ایک حدیث میں ہے کہ بندے کو خدا کی جانب سے جو کچھ ملا ہے اس میں سب سے بڑا عطیہ حسن اخلاق ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«ما خير ما أعطي العبد؟ قال: خلق حسن» (مصنف ابن أبي شيبة:۳۲۵/۸)

اس حدیث نے حسن اخلاق کو تمام نعمتوں سے بالاتر بنا دیا۔

ترمذی شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«ما من شيء يوضع في الميزان أثقل من حسن الخلق وإن صاحب حسن الخلق ليبلغ به درجة صاحب الصوم والصلاة»(جامع الترمذی، باب حسن الخلق، ص: ۲۱)

''یعنی حسن خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز میزان اعمال میں نہ ہوگی اور اچھے اخلاق والا آدمی اپنے حسن اخلاق سے ہمیشہ روزہ رکھنے والے اور نماز پڑھنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔''

اس حدیث نے پوری طرح یہ واضح کر دیا کہ اسلام میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تہجد کی نماز میں اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

«اللهم اهدني لأحسن الأخلاق لا يهدي لأحسنها إلا أنت واصرف عني سيئها لا يصرف عني سيئها إلا أنت» (صحيح مسلم، باب صلاة النبي ودعائه بالليل ص:۴۴/۶)

''یعنی اے ارحم الراحمین! مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت عطا فرما، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے، کیونکہ مجھ سے برے

اخلاق کو تیرے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبویؐ کا تیسرا باب اخلاق ہے اور اخلاق سے مراد باہم لوگوں کے حقوق وفرائض ہیں جن کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینے کا نام اخلاق ہے، آنحضرت ﷺ کا اخلاق اتنا بلند تھا جس کی مثال نہ دنیا پیش کر سکی ہے نہ قیامت تک پیش کر پائے گی، آپؐ کے اخلاق کریمانہ کا اعلان قرآن ان الفاظ کے ساتھ کرتا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾(القلم:٦٨/٤)

"اے محمدؐ! بلا شبہ آپؐ اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔"

آپؐ نے اپنے اس فریضہ کی انجام دہی اپنی بعثت کے ساتھ ہی شروع کر دی تھی، جس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعات سے واضح ہے:

① ابھی آپؐ مکہ ہی میں تھے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی انیس کو آپؐ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا، واپس آ کر انھوں نے اپنے بھائی کو ان الفاظ کے ساتھ اطلاع دی:

«رأيته يأمر أن مكارم الأخلاق»(صحيح مسلم، فضائل أبي ذر:١٦/٣٣)

"یعنی میں نے ان کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔"

② ابتداء اسلام میں جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تو وہاں کے بادشاہ نے مسلمانوں سے نبی ﷺ کے بارے میں پوچھا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابو طالب نے فرمایا:

«أيها الملك كنا قوما أهل جاهلية، نعبد الأصنام، ونأكل الميتة، ونأتي الفواحش، ونقطع الأرحام، ونسيء الجوار، ويأكل القوى منا الضعيف، فكنا على ذلك حتى بعث الله إلينا رسولا منا، نعرف نسبه، وصدقه ، وأمانته، وعفافه، فدعانا إلى الله لنوحده، ونعبده، ونخلع ما كنا نعبد نحن وآباؤنا من دونه من الحجارة، والأوثان، وأمرنا بصدق الحديث، وأداء الأمانة، وصلة الرحم، وحسن الجوار، والكف عن المحارم، والدماء، ونهانا عن الفواحش، وقول الزور، وأكل مال اليتيم، وقذف المحصنات، وأمرنا ان نعبد الله وحده لا نشرك به شيئا، وأمرنا بالصلاة، والزكاة، والصيام» (سیرۃ ابن ہشام:١/ ٢٢٣)

"یعنی اے بادشاہ! ہم لوگ جاہل تھے، بتوں کو پوجتے، مردار کھاتے، بدکاریاں کرتے، صلہ رحمی کو منقطع کرتے، پڑوسیوں اور کمزوروں پر ظلم وزیادتی کرتے تھے، اسی اثنا میں ہمیں میں

سے اللہ نے ایک رسولؐ مبعوث کیا جس کے حسب نسب، سچائی و امانت داری اور پاکدامنی کو ہم لوگ جانتے ہیں، اس نے ہمیں ایک اللہ کے ماننے، اس کی عبادت کرنے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی اور ہمیں بتایا کہ: سچ بولو یہ لوگوں کی امانتوں کو ادا کرو، صلہ رحمی کرو، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، خونریزی سے باز آؤ، بدکاریاں مت کرو، جھوٹ مت بولو، یتیموں کا مال نہ کھاؤ، پاک دامن عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ، ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور زکاۃ دو۔"

۳ اسلام قبول کرنے سے پہلے ابوسفیان نے قیصر روم کے دربار میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی دعوت کا نقشہ اس طرح کھینچا:

«یقول اعبدوا الله وحده ولا تشرکوا به شیئا، واترکوا ما یقول آباء کم ویأمرنا بالصلاة والصدق والعفاف والصلة»(صحیح البخاري، باب کیف کان بدء الوحی:٤/١)

"یعنی وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، سچ بولو، پاک دامنی اختیار کرو اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرو۔"

قرآن مجید نے بار بار آنحضرت کی تعریف میں یہ کہا ہے:

﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾(البقرۃ:۲/۱۲۹)

"یہ پیغمبر لوگوں کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے۔"

اس مختصر آیت میں دو باتیں خاص طور پر ذکر کی گئی ہیں، ایک پاک وصاف کرنا جسے قرآن نے تزکیہ سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حکمت۔

تزکیہ کے لغوی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل وکچیل دور کرنا کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی گندگیوں اور نجاستوں سے پاک وصاف کیا جائے، قرآن مجید نے دوسری جگہ اس کی وضاحت یوں کی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾(الاعلیٰ:۸۷/۱۴۔۱۵)

"یعنی بلاشبہ وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔"

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق واعمال کو صاف وستھرا بنائیں۔

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت ہے، یہ لفظ قرآن کریم میں عام طور پر علم وعرفان کے معنی میں آتا ہے یعنی ایسے علوم ومعارف جو نور الٰہی کی صورت میں نبیؐ کے سینے میں ودیعت کیے جاتے ہیں جس کے آثار کبھی سنن واحکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی اعمال وافعال کی شکل میں سامنے آتے ہیں جن میں بڑا اور اعلیٰ حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔

حکمت کے اس دوسرے معنی کو قرآن نے کئی جگہ ذکر کیا ہے، چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں توحید، اطاعت والدین، قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل بدکاری اور یتیموں کے ستانے وغیرہ کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾(بنی إسرائیل:۱۷/۳۹)

''یعنی یہ حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جن کی تیرے رب نے تجھ پر وحی کی۔''

ان آیات سے یہ واضح ہوگیا کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت میں اخلاق کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ راز بھی ظاہر ہوگیا کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اخلاق کی بھی ہے، قرآن کریم نے عبادت کے ساتھ اخلاق کی تصریح یوں کی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(الحج:۲۲/۷۷)

''یعنی اے مومنو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیکی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر یہ ثبوت موجود ہے کہ ایمان لانے کے بعد دعوت محمدیؐ کے دو پہلو رہ جاتے ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق یعنی ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد اور انھی کے مجموعے کا نام ''اسلام'' ہے اور کلمۂ توحید کے بعد اسلام کی عمارت کو نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے چار ستونوں پر کھڑا کردیا گیا ہے، اس کا اصل مقصد بھی اخلاق حسنہ کی تکمیل ہے، اس لیے کہ نماز کا ایک فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے اور روزہ تزکیۂ نفس کی تعلیم دیتا ہے، زکاۃ مکمل طور پر انسانی ہمدردی کا سبق سکھاتی ہے اور حج بھی اخلاقی اصلاح کا ذریعہ ہے، اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو بھی ہوں مگر ان کا بنیادی مقصد اخلاقی تعلیم ہے، اگر ان عبادات سے اخلاقی ثمرات ظاہر نہ ہوں تو سمجھ لو کہ ہم نے احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل کی ہے جو بالکل بے کار ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اخلاق فاضلہ پر چند شہادتیں

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ہم لوگ غزوۂ ذات الرقاع میں نبی ﷺ کے ہمراہ تھے، قاعدہ یہ تھا کہ ہم جب کسی سایہ دار درخت کے نیچے پہنچتے تو اسے اللہ کے نبی ﷺ کے لیے چھوڑ دیتے، ایک بار نبی ﷺ نے پڑاؤ ڈالا اور لوگ مختلف درختوں کے درمیان منتشر ہو گئے، رسول اللہ ﷺ بھی ایک درخت کے نیچے اترے اور اپنی تلوار اس درخت کے نیچے لٹکا کر سو گئے، اتنے میں ایک کافر نے آپؐ کو تنہا دیکھ کر آپ کی تلوار آپؐ کے اوپر کھینچ لی اور کہا: بتاؤ «من یمنعك منی» یعنی آج میرے ہاتھ سے تجھے کون بچائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا اللہ! یہ سن کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی جو آپؐ نے اٹھا لی اور فرمایا: بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا، اس پر جب وہ شرمندہ ہوا تو آپؐ نے اسے معاف کر دیا۔"(۱)

② آپؐ تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے، طائف والوں نے آپؐ کو جھٹلانے کے ساتھ اوباش لڑکوں اور غلاموں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا، ان لوگوں نے آپؐ کو گالیاں دینے کے ساتھ اس قدر پتھر برسائے کہ آپؐ لہولہان ہو گئے، مجبور ہو کر آپؐ نے عتبہ اور شیبہ (ابنائے ربیعہ) کے ایک باغ میں پناہ لی، تھوڑی دیر ٹھہر کر باغ سے نکلے اور مکہ کی راہ پر چل پڑے، غم والم کی شدت سے طبیعت نڈھال اور دل پاش پاش تھا، جب قرن منازل پہنچے اور اپنے سر کو اوپر اٹھایا تو دیکھا حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف فرما ہیں، ان کے ہمراہ پہاڑوں کا فرشتہ بھی موجود ہے، پہاڑ کے فرشتے نے سلام کے بعد عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اللہ نے مجھے بھیجا ہے، اگر آپؐ حکم دیں تو ہم ان اہل مکہ کو ان دونوں پہاڑوں (یعنی ابوقبیس اور قعیقان) کے درمیان پیس ڈالیں رحمۃ للعالمینؐ فرماتے ہیں کہ:

«بل أرجو أن یخرج الله عزوجل من أصلابهم من یعبدالله عزوجل وحده لا یشرك به شیئا» (صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب إذا قال أحدکم آمین والملائکة فی السماء:۱/۴۵۸، وصحیح مسلم، باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین:۱۲/۱۵۵)

"(یعنی میں ان لوگوں کے لیے تباہی کی کیوں دعا کروں) مجھے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو ضرور ایک اللہ پر ایمان لانے والی ہو گی اور خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔"

(۱) صحیح البخاری، باب غزوہ ذات الرقاع:۲/۵۹۳۔

③ غزوۂ احد میں دشمنوں نے خدا کے نبی ﷺ پر پتھر پھینکے، جس سے نبی ﷺ کی پیشانی اور بازو زخمی ہوئے اور آپؐ کے چار دانت بھی ٹوٹ گئے، آپؐ ایک غار میں گر گئے، خبر اڑ گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے خواتین دوڑی دوڑی آئیں یہاں آ کر حضرت فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا نے باپ کے زخموں کو دھویا پیشانی کا خون تھمتا نہ تھا تو اس میں چٹائی جلا کر بھری جس سے خون رک گیا۔
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مشکیزے اٹھائے اور پانی لا لا کر زخمیوں کو پلانے لگیں۔"

میدان جنگ میں ستر (۷۰) صحابہ کرام شہید ہوئے، اسی جنگ میں آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے، دشمنوں نے ان کے اعضاء کو کاٹ کر ان کی لاش کی بے حرمتی کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر جس طرح روئے اس سے بڑھ کر روتے ہوئے ہم نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ (۱)

نبی ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش دیکھنے کے لیے تشریف لائیں تو رسول اللہ ﷺ نے آپؐ کے صاحبزادے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اپنی ماں کو روکو، وہ اپنے بھائی کی لاش دیکھ کر صبر نہ کر سکیں گی، حضرت صفیہؓ نے کہا کہ بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ میرے بھائی کی لاش بگاڑ دی گئی ہے لیکن یہ اللہ کی راہ میں ہے، بیٹا نہ روؤں گی اور نہ چلاؤں گی، صرف دعا پڑھ کر لوٹ جاؤں گی۔

اس منظر کو دیکھ کر بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ان مشرکین پر بد دعا فرمائیں، رحمۃ للعالمینؐ جواباً فرماتے ہیں:

«إني لم أبعث لعانا ولكن بعثت داعيا ورحمة» (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب النهي عن لعن الدواب وغيرها:١٦/١٥١)

«اللهم اهد قومي فإنهم لا يعلمون» (الشفاء للقاضي عياض، فصل في بيان اصول هذه الأخلاق وتحقق وصف النبي بها: ١/١٣٧)

"یعنی میں لعنت کرنے کے لیے نبی نہیں بنایا گیا ہوں، میں تو خدا کی طرف بلانے والا اور سراپا رحمت بنایا گیا ہوں، اے خدا! میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتی۔"

④ انسان کے اخلاق و عادات اور اعمال وافعال کا راز دار بیوی سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے، غار حرا میں جب آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تو آپؐ اس قدر گھبرا گئے کہ خوف کھا کر حضرت

(۱) مختصر السيرة للشيخ عبد الله، ص:٢٥٥

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہنے لگے: «لقد خشيت على نفسي» میں ایسے واقعات دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے، اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

«كلا والله لا يحزنك الله أبدا، إنك لتصل الرحم، وتصدق الحديث، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف، وتعين على نوائب الحق»(صحيح مسلم، باب بدء الوحى:۲/۲۰۰، مشكاة، باب المبعث وبدء الوحى:۲/۵۲۲)

''خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی اندوہ گیں نہ فرمائے گا، اس لیے کہ آپ اقرباء پر شفقت فرماتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اور مصیبتوں میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔''

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

«والله ما انتقم (النبى ﷺ) لنفسه فى شيء يؤتى إليه قط حتى تنتهك حرمات الله فينتقم لله»(صحيح البخارى، باب صفة النبى:۱/۵۰۳، باب إقامة الحدود والانتقام لحرمات الله:۲/۱۰۰۳)

''رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو سزا نہیں دی، نہ کبھی بدلا لیا، ہاں اللہ کی حرمت زائل کرنے والوں کو آپ سزا دیتے تھے۔''

آخر دعوانا إن الحمد لله رب العالمين!

''اخلاق نبوی'' کتاب وسنت کی روشنی میں ایک جائزہ

طارق جمیل، فلاحی ریسرچ اسکالر، علی گڑھ

انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہے، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا گیا، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾(التین:۴/۹۵)

''تحقیق ہم نے انسان کو تقویم احسن پر پیدا فرمایا ہے۔''

قادر مطلق نے عرش وفرش اور لامحدود کائنات کو لفظ ''کن'' سے پیدا کیا لیکن آدم (علیہ السلام) خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾(ص:۷۵/۳۸)''میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔''

جس جسد خاکی میں خالق نے خود اپنی روح پھونکی، اس کا تذکرہ﴿نَفَخْتُ فِيهِ رُوْحِي﴾ (الحجر:۲۹/۱۵) کے معنی خیز الفاظ سے کیا، اس کے باوجود اپنی لامحدود صفات کا ہلکا سا پرتو رکھا اور اسے مظہر صفات الٰہی بنایا، اسے وہ علم وعرفان عطا کیا جو فرشتوں کو بھی حاصل نہ تھا، اسے اشرف المخلوقات قرار دے کر فرشتوں سے سجدہ کرایا اور ان سے عظمت آدم تسلیم کرائی گئی اور پھر اسے خلیفۃ اللہ کے عظیم منصب پر فائز کر کے رُوئے زمین پر بھیجا گیا، یہ عظمت ورفعت بلا امتیاز و مذہب وملت ہر انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہے، اسلام نے اعلان کر دیا کہ انسان اپنی خلقت میں سادہ اور پاک ہے، گناہ اور بدخلقی اس کا مایۂ خمیر نہیں ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں صحیح الہام ودیعت ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهوّدانه أو ينصّرانه أو يمجّسانه»

(صحيح البخاری، کتاب الجنائز)

''انسان کی فطری پیدائش سلامتی پر ہوتی ہے، لیکن ماں باپ کی تربیت اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتی ہے۔''

غرض اخلاق کا ملکہ انسان کے اندر ودیعت ہے، اسلام نے اخلاق وفلسفۂ اخلاق اور شخصی وقولی اخلاق پر مفصل بحث کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کا تیسرا نمبر ''اخلاق'' ہے۔

اس انسانی طبقۂ اشراف میں بعض نفوس قدسیہ کو خلافت کے علاوہ ایک اضافی اور خصوصی منصب نبوت کا عطا ہوا، جس نے انہیں دوسرے لوگوں کی نسبت بلند تر درجے پر فائز کر دیا، اس کائنات ارضی میں بے شمار پیغمبر اور مصلح آئے، لاتعداد اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوئیں، مگر اس خصوصی گروہ انبیاء میں سے خالق نے صرف ایک ہستی کو منتخب کر کے اسے خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین کے منصب پر متمکن فرمایا نیز رہتی دنیا تک ﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم۶۸:٤) کی سند جاری کر کے ازل سے ابد تک کے لیے کون ومکان میں عظیم ترین مقام پر فائز کر دیا، اخلاق نبوی ﷺ کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آ کر آپ ﷺ کی زندگی تمام انبیاء کرام اور مصلحین عالم سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کو معلم اخلاق کا یہ بلند مقام ومرتبہ کیوں عطا ہوا؟ اس کا جواب قرآن وسنت کی تفسیر میں تلاش کیا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ حضورؐ نے کار نبوت کی تکمیل فرمائی اور کار نبوت تھی دراصل تکمیل اخلاق، اس کی حکمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپؐ اکثر نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے:

«اللهم اهدني لأحسن الأخلاق لا يهدي لأحسنها إلا أنت واصرف عني سيئاتها لا يصرف عني سيئاتها إلا أنت» (صحیح مسلم، باب الدعاء فی الصلاۃ)

''اے پروردگار! مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت عطا فرما، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ مجھ سے برے اخلاق کو تیرے سوا کوئی پھیر نہیں سکتا۔''

انسان طبعاً دوسری ذی حیات مخلوق سے یکسر مختلف نہیں، اس کا جبلی کردار حیوانات کے جبلی کردار کی طرح خودکار اور احتیاجات، جذبات وعواطف اور احساسات ومیلانات کے لحاظ سے یکساں ہے،

اسے جو چیز حیوانات کی سطح سے بلند کر کے اشرف المخلوقات کی بلندی تک پہنچاتی ہے وہ اس کا اخلاقی کردار ہے، انبیاء ورسل اس اخلاقی کردار کی تعمیر وتشکیل کے لیے بھیجے گئے، صحائف اسی مقصد کے لیے اتارے گئے، خالق کون ومکان نے ازل کے دن انسان کو اخلاق کا پہلا درس سکھایا اور اتمام حجت کردی، تخلیق آدم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۲/۳۱)

''اور اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔''

یہاں «اسماء» کے مفہوم میں جملہ اشیاء کے خواص، منفعت ومضرت، استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ جملہ انسانی متعلقات اور رویے کی نوعیت سب شامل ہیں، علماء مفسرین کے اقوال کے مطابق «کلھا» سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ علم کامل تھا، ناقص نہیں، انسان کو اس دنیا میں زندگی کے آغاز کے لیے اور بحیثیت خلیفہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جتنے علم کی ضرورت تھی وہ علیم وخبیر نے اسے بقدر ضرورت مہیا کر دیا جو انسان کا خالق اور معلم اول بھی ہے، مزید برآں علم واخلاق کا خزانہ لے کر اس دنیا میں جو پہلا انسان بھیجا گیا اسے یہاں اپنی اور ابنائے آدم کی تعلیم وتربیت پر مامور کر کے انسانیت کا معلم اول بنایا گیا، اس کے بعد جتنے انبیاء کرام رشد وہدایت کے لیے مبعوث کئے گئے وہ درحقیقت سب کے سب معلم اخلاق ہی تھے، انبیاء کرام کے سلسلے کی آخری کڑی حضور اکرم ﷺ تھے جنھوں نے اپنے مشن کی وضاحت اس طرح بیان کی:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا» (سنن ابن ماجه)

''مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

اور پھر اس معلم انسانیتؐ نے اپنی تعلیم وحکمت کا اصل مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«قال ﷺ إني بعثت لأتمم مكارم الأخلاق» (مسند أحمد بن حنبل)

آپؐ نے فرمایا کہ: ''میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أكمل المؤمنين إيمانا أحسنهم خلقا» (سنن أبي داؤد، ترمذی، ابن حنبل)

''مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔''

مذکورہ بالا احادیث باہم مربوط اور ایک دوسرے کی تفسیر ہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ علم کا اصل مقصود اخلاق ہے اور علم اس کا ذریعہ، معلم کا کام محض انتقال علم نہیں، تشکیل اخلاق ہے، اب یہ ظاہر

ہے کہ کسی بھی کام کی تکمیل کے لیے خود اس میں کامل ہونا ایک لازمی شرط ہے، کمال کے بغیر تکمیل کا تصور محال ہے، حضور اکرم ﷺ کو یہ کمال کس درجے حاصل تھا اس کا اندازہ خالق کمال کی جاری کردہ اس سند سے ہو جاتا ہے، نیز امت پر آپ ﷺ کی شفقت، مہربانی اور نرم دلی کی گواہی قرآن پاک ایک مقام پر یوں دیتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(آل عمران:۳/۱۵۹)

''خدا کی عنایت سے تم ان سے نرمی سے پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے گرد و پیش سے ہٹ جاتے۔''

اور پھر اخلاق نبوی ﷺ کی حکیمانہ تفصیل یوں بیان کر دی گئی ہے کہ:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الأعراف:۷/۱۹۹)

''عفو کو اسوہ بناؤ، نیکی اور نیک خواہی کا سبق سکھاؤ اور نادان لوگوں سے عفو و درگزر کرو۔''

صاحب خلق عظیم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فریضہ کو انجام دینا شروع کر دیا تھا، صدر اسلام کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر جب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ روانہ کیا، بھائی نے مکہ سے مراجعت پر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

«رأيته يأمر بمكارم الأخلاق» (صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب حسن الخلق والسخا)

''میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔''

اخلاق کامل کے جس بلند ترین مرتبے پر فائز ہونے کی سند پیش کی جا رہی ہے وہ درحقیقت ہے کیا؟ علم و عمل کا مکمل اشتراک اور قول و فعل کی ایسی کامل ہم آہنگی، جس میں علم کا عمل سے اور قول کا فعل سے کوئی فاصلہ نہ ہو، خارجی اعمال اور قلب و ضمیر کی داخلی زندگی سے کہیں ٹکراؤ نہ ہو، شخصیت مربوط و منظم ہو، منتشر اور منقسم نہ ہو، اس نوعیت کی اخلاقی زندگی کے لیے علم کا درست ہونا لازمی ہے، اگر علم کے بجائے کوئی شخصیت محض ظن و گمان پر مبنی جہل کو اپنے اعمال کی بنیاد بنا بیٹھے اور اس کے اندر قول و فعل کی یکجائی بھی موجود ہو تو ہم اس کے کردار کو اخلاق کا معیاری کردار قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ قول بجائے خود ناقص اور جہل پر مبنی ہے، اس سے مربوط اور منسلک اعمال اخلاق کا مظہر نہیں ہو سکتے اور نہ معیار حق بن سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو جو اخلاق و کردار مطلوب ہے وہ اسی علم پر مبنی ہونا چاہیے

جو خود اس کا عطا کردہ ہے، جسے وہ علم قرار دے وہی علم ہے اور جسے جہل قرار دے وہ سراسر جہل ہے۔
ایک طرف آخری معلم کو خلق عظیم کی سند جاری کر کے اس کے مشن کی تکمیل پر اظہار اطمینان کیا گیا اور دوسری طرف متعلم یعنی انسان کو اس کی تعلیم پر سند فراغت جاری کر دی گئی جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے ابتدائی مدرسۂ تعلیم سے ہوا تھا، دین کی یہ نعمت جزءاً جزءاً مختلف انبیاء کے ذریعے اتاری گئی اور نبی آخر الزمان ﷺ پر اس کو مکمل کر دیا گیا، اسلام کا جو کامل و اکمل نقشۂ حیات حضور ﷺ کے دور میں جلوہ گر ہوا اسے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے سند قبولیت عطا کر دی گئی، اس تکمیل دین کا اصل مقصد چونکہ تکمیل اخلاق تھا اور حضور اکرم ﷺ کو اسی کی خاطر مبعوث کیا گیا تھا، اس لیے اپنی ذات میں اور اپنے زیر تعلیم انسانی گروہ میں اسے درجۂ کامل تک پہنچانے کی بنا پر آپ ﷺ کو یہ عظیم فضیلت عطا کی گئی، یوں انسانیت اپنی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی تکمیل تعلیم اور پختگی شعور کی اس سطح تک پہنچی جہاں آ کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:۵/۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کیا اور تم اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔''

اور پھر آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین قرار دے کر قیامت تک آنے والے ہر زمانے کے لیے ہادی و رہنما بنا کر سلسلۂ وحی منقطع اور مدرسۂ نبوت بند کر دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ اب جس کسی کو اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہونا ہے وہ اسی نمونۂ کامل کی اتباع کرے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب:۳۳/۲۱)

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔''

وہ علم اخلاق جو حضرت آدم علیہ السلام کے کنبے سے شروع ہوا تھا ان کی نسل کو ایک مخصوص زمانے، ایک مخصوص علاقے اور ایک مخصوص قوم کے محدود دائروں پر منتقل ہوتا اور پھیلتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور حضرت محمد ﷺ کے عہد مسعود میں پوری انسانیت، پورے کرۂ ارض اور آنے والے ہر زمانے پر محیط ہو گیا۔

قرآن و سنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول پاک ﷺ کا کریمانہ اخلاق کردار سازی میں بنیادی اساس کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام میں جو جاذبیت ہے وہ آپ ﷺ کی ذات کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے عمل تکوینی کے سبب ہے، زندگی کے تمام واقعات کو انتہائی احتیاط کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا، ایسی

جامع سیرت تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی، دنیا میں کوئی جامع اور کامل نمونہ موجود ہے تو صرف ایک ہے، محمد ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور اسی اسوۂ حسنہ کا مطلب ہے معروف میں کامل اور منکر سے یکسر پاک شخصیت، معروف کو پھیلانے اور منکر کو مٹانے والا، ایسا کردار جس کے اندر تضادات کی کسی ادنیٰ سی علامت کا وجود ناممکن بلکہ اس کا تصور تک محال ہے، اس نے مساوات کا درس دیا تو غلام آقا بن گئے اور آقا ان کے غلام، اس نے اخوت کا پیغام دیا تو مدینہ میں اجنبی سگے بھائیوں سے بڑھ گئے، ان کی خاطر بیویوں کو طلاق دے کر ان کے گھر بسائے گئے، گھر کے برتن، کپڑے، مویشی اور کھیتوں کی فصلیں سب تقسیم ہو گئے، جس نے یہ تعلیم دی اس نے اپنا کوئی گھر نہ بسایا، خدا کے گھر مسجد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا، اس کے پاس کبھی دو وقت کی خوراک جمع نہ ہونے پائی، اس نے دنیا کے خزانے لٹائے مگر دنیا کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے گھر میں دو مٹھی جو موجود نہ تھے، آپ ﷺ نے اپنی ان کریمانہ صفات کی بدولت اہل عرب کے دلوں کو مسخر کر کے انھیں رنگ الٰہی میں رنگ دیا اور اس طرح انھیں ایک عظیم و مثالی قوم بنا دیا، اسلام دراصل تحریک رحمۃ للعالمینی تھی اور جو شخص ایمان لا کر اس میں کلیتًا داخل ہو جاتا ہو وہ انسانوں، حیوانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا، وہ خود بھی صاحب حسن و سرور بننے کی کوشش کرتا اور دوسروں کو بھی ایسا بنانے کی کوشش کرتا۔

قرآن پاک انقلاب آفرین کلام الٰہی ہے، نزول کلام الٰہی کا مقصد انسان میں آرزوئے حسن کو زندہ اور نکھار پیدا کرنا، نیز مکارم اخلاق کی تکمیل کرنا، علم و حکمت کے ذریعہ قلب کا تزکیہ کرنا، محبت الٰہی کو شعلہ فگن کر کے شمع رحمت بنانا، تاکہ بنی نوع انسان حسن اخلاق کی نعمت سے یکساں طور پر مستفیض ہو جس طرح اتباع خدا کو رسول پاکؐ کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا، بعینہ مکارم اخلاق کی اس ہمہ گیر تفسیر کے لیے بیان فرمایا گیا کہ سیرت طیبہ اسی کلام الٰہی کی عملی تفسیر ہے:

«إن خلق رسول الله ﷺ كان القرآن» (سنن أبي داؤد، باب الصلاة)

"بلا شبہ رسول اللہ ﷺ کا خلق قرآن تھا۔"

حضور پاک ﷺ کی پوری زندگی حسن اخلاق ہی کی تفسیر ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ:

«كان أحسن الناس وكان أجود الناس وكان أشجع الناس» (صحيح مسلم، باب في شجاعة النبي ﷺ)

احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہ پہنچائی (ماسوا ان باتوں کے جو حکم الٰہی

کے تحت تھیں) اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا، ہر کسی سے عفو فرمایا، یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے ظالموں کو معاف کیا اور منافقین واشرار سے درگزر کیا، اجود الناس کا یہ عالم تھا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا آپ ﷺ نے کبھی ''نہیں'' نہیں فرمایا۔''(۱)

اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریۂ حق کو لے کر تن تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جم کر کھڑے رہے، کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا، غار ثور یا احد وحنین کے معرکے ہر موقع پر یقین محکم کا مظاہرہ کیا۔

مکارم اخلاق کے نمایاں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو 'رحمت وشفقت' بھی ہے، بلکہ یہ ایسا فطری ملکہ ہے جو نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار میں پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ نظام کائنات کی ترتیب وتنظیم میں اس کو بڑا دخل ہے، قرآن پاک نے داعی اسلامؐ کے وجود کا سب سے بڑا شرف اسی 'رحمت' کو بتایا ہے، قرآن مجید کے علاوہ صفت رحمت اور رحم کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے خود رحمت عالم آپ ﷺ نے فرمایا:

«من لا یرحم لا یرحم»(مسلم وبخاری)

''جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، وہ خود رحم کیے جانے کا مستحق نہیں ہے۔''

«الراحمون یرحم الرحمن ارحموا من فی الأرض یرحکم من فی السماء» (ترمذی)

''آپس میں رحم وکرم کا معاملہ رکھو، تاکہ بلند وبرتر خدا تم پر رحم کرے۔''

«لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ إخوانا»(مسلم و بخاری)

''لوگو! آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، خدا کے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

محسن انسانیت ﷺ نے زندگی کے ہر موڑ پر اخلاق کا عملی نمونہ پیش کیا، تاریخ انسانیت میں پہلی مرتبہ اسلام نے انسان سے انسان کے برتاؤ کا اصول پیش کیا، میدان جنگ میں انسانیت کے اصول اپنائے گئے، خیانت نہ کرنے، دھوکا نہ دینے، اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانے، ضعیف مردوں، عورتوں یا بچوں کو ہلاک نہ کرنے، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنے اور نہ جلانے، پجاریوں اور عبادت میں مصروف لوگوں کو ایذا نہ پہنچانے کی سختی سے ہدایت کی گئی۔

---

(۱) باب ما سئل النبی ﷺ ....الخ)

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات رحمت ورافت کے بارے میں غیر مسلم دانشوروں کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ محمد ﷺ کی زندگی میں عظیم کامیابی تلوار کے استعمال سے نہیں، بلکہ صرف اخلاقی اوزاروں سے حاصل ہوئی، جہاں تک عہد نبویؐ میں جنگوں کا تعلق ہے تو مصالحت کی متعدد کوششیں قطعی طور پر ناکام ہو جانے کے سبب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو محض خود حفاظت کے لیے میدان جنگ میں آنا پڑا، حضور پاک ﷺ نے میدان جنگ کی حکمت عملی مکمل طور پر تبدیل کر دی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں جب کہ پورے جزیرۂ عرب نے اسلام قبول کر لیا تھا، جو جنگیں لڑی گئیں ان میں اموات کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں تھی، پیغمبر اسلامؐ کی پوری زندگی میں جنگیں اپنے دفاع کے لیے لڑی گئیں، جنگوں میں صرف چند اموات کا ہونا حیرت کی بات ہے، لیکن اس کے برعکس صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے خاک وخون کی ہولی کھیلی گئی، اسپین، غرناطہ میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور اس گم گشتہ جنت میں تقریباً ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہا تھا، اس کے بعد بیسویں صدی کے نجات دہندوں نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر تاریخ انسانیت کا بدترین باب رقم کیا۔ اسی طرح صابرہ وشتیلہ اور تحریک انتفاضہ پر وہ انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے کہ وقت کے غیر مسلم مفکرین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ آج سے چودہ (۱۴) سو سال پہلے فتح مکہ پر معلم اخلاقؐ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں حالانکہ اہل مکہ کے سر جھکے ہوئے تھے اور جنگ کے اصول کے مطابق ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے کر انصاف کر سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ:

«لا تثريب عليكم اليوم إذهبوا فأنتم الطلقاء» (البداية والنهاية ٤/ ٣٠١)

''آج بدلہ نہیں لیا جائے گا، آج تم سب کے سب آزاد ہو۔''

صرف یہی مثال نہیں بلکہ آپ ﷺ زندگی بھر اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کرتے رہے یہاں تک کہ اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو بھی جنھوں نے ان کی میت کی بے حرمتی کی اور ان کے جگر کے ایک ٹکڑے کو چبایا، معاف کر دیا۔[1]

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ آج کی ترقی یافتہ جارح اقوام سیاہ فاموں کے ساتھ کس حسن سلوک کا مظاہرہ کرتی ہیں، جبکہ چودہ سو سال قبل اخلاق نبوی ﷺ کے دربار میں ایک حبشی غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حالت کا اندازہ لگائیے، اسلام کا ابتدائی مؤذن ہونا ایک اعزاز تصور کیا جاتا تھا اور یہ اعزاز ایک حبشی غلام کو دیا گیا، فتح مکہ کے بعد حضور پاک ﷺ نے بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا تو

(۱) صحيح البخاري، ذكر هنده

وہ سیاہ رنگ اور موٹے ہونٹ والا خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوتا ہے، جو اسلامی دنیا میں ایک تاریخی اور انتہائی مقدس مقام ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے عملی کردار سے ایک اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے معزز ترین خانوادے اسی حبشی غلام سے اپنی بیٹیوں کی شادیوں کے لیے تیار ہو گئے اور تو اور خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حبشی غلام کو دیکھ کر احترام میں فوراً کھڑے ہو جاتے اور ان الفاظ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے کہ ہمارا آقا آیا ہے۔ قرآن کریم اور پیغمبر محمد عربی ﷺ نے عربوں میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے وہ روئے زمین پر باعث فخر اور قابل تقلید سمجھے جاتے تھے۔ موجودہ صدی کے اندر اسلامی اخلاق و تعلیمات کا ماحصل بیان کرتے ہوئے جارج برناڈ شا کہتا ہے کہ آئندہ ایک سو (۱۰۰) سال کے دوران اگر کسی مذہب کو انگلستان اور یورپ پر حکمرانی کا موقع مل سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔

یہ اعلیٰ اخلاق کا معجزہ ہی تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے تمام ہم عصر دوست اور دشمن اسلام کی بلند صفات، بے داغ دینداری، اعلیٰ صلاحیتوں، مکمل اخلاص اور زندگی کے ہر شعبہ اور انسانی کردار کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات پر سختی سے کاربند رہنے کے معترف ہیں، حتیٰ کہ یہودی جو اسلامی تعلیمات کے منکر تھے، ذاتی تنازعات میں آپ ﷺ کو ثالث تسلیم کرتے تھے، اگر اہل مکہ، اعزہ واقارب، دوست و دشمن، جو آپ ﷺ کے پیغام صداقت اور نجی زندگی سے پوری طرح واقف تھے، آپؐ پر رتی برابر بھی لوگ دھوکا، فریب یا دنیاداری کے آثار دیکھتے یا آپؐ کے اخلاق و کردار پر یقین نہ رکھتے تو روحانی بیداری اور سماجی اصلاحات کے سلسلے میں محمد ﷺ کی تمام خلاقی امیدیں ختم ہو جاتیں اور پورا نظام ایک ہی لمحے میں پارہ پارہ ہو جاتا، اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کے ماننے والوں میں اس قدر لگن تھی کہ انھوں نے انتہائی تشدد اور ذہنی اذیت کے دوران بھی آپ ﷺ کا حکم ماننا لازم سمجھا اور آپؐ کو اپنا رہبر مانتے رہے، اگر وہ اپنے رہنما میں ذرا سی بھی لغزش یا اخلاقی کمزوری دیکھتے تو کیا یہ صورت باقی رہتی؟ ابتدائے اسلام کی تاریخ کے جاں گسل واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بے گناہ مرد و خواتین سے وحشیانہ برتاؤ دیکھ کر پتھر دل بھی موم ہو جاتے۔ ایک بے گناہ صحابیہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے جسم میں نیزے پیوست کر کے ان کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ (۱)

> ''حضرت یاسر رضی اللہ عنہ جن کے پاؤں دو اونٹوں کے ساتھ باندھ کر دونوں اونٹوں کو مخالف سمت میں دوڑایا گیا۔'' (۲)

---

(۱) الأصابه تذكرة سمية أم عمار

(۲) ابن سعد، ابن جریر، بیہقی بلاذری وغیرہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

''حضرت خباب رضی اللہ عنہ بن ارت کو دہکتے کوئلوں پر لٹایا گیا اور ان کے سینے پر ایک بے رحم درندے نے اپنے پیر رکھ دیے تا کہ وہ حرکت نہ کرسکیں، یہاں تک کہ ان کی جلد کی نچلی سطح بھی پگھلنے لگی۔''(۱)

حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں وحشیانہ طریقے پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس ظالمانہ تشدد کے باوجود جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اس صورتحال میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری جگہ ہوں، جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنے گھر میں ہیں، اس پر انھوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے وہ اپنے کو، اپنے خاندان کو اور اپنے بچوں اور ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن میرے محبوب رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھنا نہیں چاہیے۔

دل کو ہلا دینے والے اس قسم کے مزید واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن ان تمام واقعات سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا وجہ تھی کہ اسلام کے یہ بیٹے اور بیٹیاں جنھوں نے نہ صرف اپنے کو اپنے پیغمبرؐ کے سپرد کر دیا، بلکہ انھوں نے اپنی ذات، قلوب اور سعید روحوں کو نذرانے کے طور پر پیش کر دیا، حالانکہ یہ لوگ معمولی حیثیت اور کمتر ذہنی صلاحیت کے مالک نہیں تھے، آپؐ کے ابتدائی دور مکہ کے انتہائی معزز اور بہترین افراد، صاحب حیثیت ثروت افراد، آپؐ کے عزیز و اقارب اور وہ لوگ جو آپؐ کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے، یہ سب کچھ قرآنی تعلیمات اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کرشمہ تھا، آپؐ کی فعال شخصیت نے انتہائی پست، وحشی اور اخلاقی انحطاط کو شکار قوم کی ایسی تطہیر کی کہ وہی لوگ علم وتہذیب کے رہنما ہوئے اور معراج اخلاق کو پہنچ گئے۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے عائلی سیر وکردار کا باب بہت ہی روشن اور تابناک ہے، فتح مکہ کے بعد دس (۱۰) لاکھ مربع میل سے زائد زمین عرب کے مالک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں میں تھی، لیکن اس کے باوجود آپؐ اپنے جوتے خود سیتے، کپڑے تیار کرتے، بھیڑوں کا دودھ دوہتے، آگ خود جلاتے، اور اپنے اہل خانہ کے چھوٹے چھوٹے کام بھی خود کیا کرتے تھے، آپؐ کی حیات مبارکہ کے آخری دور میں پورا شہر مدینہ جہاں آپؐ رہائش پذیر تھے دولت مند ہو گیا، سونے چاندی کی افراط تھی، لیکن دو دو مہینے تک آپؐ کے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، کھجور اور پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا ہوا کرتی تھی، آپؐ کے اہل خانہ مسلسل متعدد راتیں فاقوں سے گزارتے تھے کیونکہ ان کے پاس شام میں کھانے کے

(۳) طبقات ابن سعد، تذکرۃ خباب، اس واقعہ کو صحیح بخاری، احمد بن حنبل، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

لیے کچھ نہیں ہوتا تھا، حضرت محمد ﷺ نے کبھی نرم بستر استعمال نہیں کیا، آپؐ دن بھر مصروف رہتے اور رات کا زیادہ وقت عبادت میں گزارنے کے بعد کھجور کی چٹائی پر آرام کیا کرتے تھے، آپ ﷺ اکثر اشکبار آنکھوں سے خدا سے دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فرائض ادا کرنے کی طاقت عطا فرما، بتایا جاتا ہے کہ روتے روتے آپ ﷺ کی آواز بیٹھ جاتی تھی، آپ ﷺ کے وصال کے روز چند سکے آپ ﷺ کا اثاثہ تھے، ان میں سے کچھ قرض میں دے دیئے گئے، جو باقی رہ گئے وہ ان ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے جو خیرات مانگنے آپؐ کے گھر آئے تھے، جن کپڑوں میں آپ کا وصال ہوا ان میں متعدد پیوند لگے تھے، وہ گھر جہاں سے پوری دنیا میں روشنی پھیلی، بظاہر تاریکی میں تھا، کیونکہ چراغ میں تیل نہیں تھا۔

سیرت محمدی ﷺ کی عالمگیری اور آفاقیت

مولانا محمد سالم مہتمم دار العلوم دیو بند و رئیس جامعہ دینیات، دیو بند

خاتم الانبیاء فخر بنی آدم سرور کائنات نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو بایں معنی شخصی سیرت کہا جا سکتا ہے کہ کائنات انسانی میں اس کی جلوہ گری ایک بے مثل و بے مثال انسانی ذات کی صورت میں ہوئی، لیکن اگر وہ سیرت ہدایت انسانی کی تاریخ میں اس منفرد امتیاز کی حامل ہو کہ رنگ و نسل، تہذیب و تمدن اور زبان و ثقافت وغیرہ کے تفاوت اور جغرافیائی حد بندیوں کو تسلیم نہ کرتی ہو اور جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کے تمام علمی و اعجازی کمالات کی حامل بھی ہو انسانی ہدایت کے جامع اور مکمل دستور پر مشتمل عظیم ترین علوم کاملہ اور مکمل ترین اخلاق فاضلہ کی جامعیت سے بھرپور بھی ہو، اور یہی نہیں بلکہ اس غیر معمولی خصوصیت سے بھی آراستہ ہو کہ تہذیبی اور تمدنی، علمی اور فکری بنیادوں پر کسی پیغام کو جانچنے اور پرکھنے کے مختلف اور ترقی پذیر تمام معیاروں کو تسلیم کر کے تمام انسانوں کو اپنی سیرت و پیغام کو ہر ہر معیار پر جانچنے کا آزادانہ حق دے کر انسانی عقل و شعور کو تاریخ ادیان و مذاہب میں بے مثال احترام بھی عطا کرتی ہو تو اس لحاظ سے بلا خوف تردید آپ ﷺ کی سرت کے بارے میں یہ دعویٰ ایک مبنی برحق اور مبنی برحقیقت دعویٰ ہوگا کہ وہ بالیقین شخصی سیرت نہیں، بلکہ اپنی ظاہری وسعتوں اور معنوی ہمہ گیریوں کے ساتھ مدلل بنیادوں پر پوری انسانیت کے لیے ایک مکمل دستور حیات ہے۔

نظریاتی حکمتیں فکر و فلسفے کی گتھیوں کو سلجھا سلجھا کر جہاں تک بھی آگے بڑھیں اور مشاہداتی سائنس کے زاویے سے زمینوں سے گزر کر فضاؤں تک اور فضاؤں سے بڑھ کر خلاؤں تک جہاں

تک بھی فکر و شعور انسانی کو ارتقاء بخشیں لیکن آفاقی سیرت محمد رسول اللہ ﷺ کو، قرنوں کے مشاہدات و تجربات نے اس بارے میں اس کو ہر دلیل سے مستغنی بنا دیا ہے کہ وہ ہر ہر مرحلے پر کامیاب تمدن کو تدین سے ہم آمیز کرنے کے لیے جس طرح ماضی میں منفرد و بے مثل رہی ہے اسی طرح مستقبل میں بھی ہمیشہ اس کی یہ انفرادیت برقرار رہے گی:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف:۷/۱۵۸)

''اے محمدؐ! آپؐ فرما دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں''، کا خدائی اعلان سیرت محمدی ﷺ کی آفاقیت و ابدیت کی وہ اساس اولین ہے کہ جس نے ماضی میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے ایک قوم یا ایک ملک یا ایک خطے کے انسانوں کے سامنے خاکدان عالم میں قیامت تک آنے والی پوری نسل انسانی کو مخاطب بنانے کا حکم دے کر حق تعالیٰ نے سیرت محمدی ﷺ کو آفاقیت و ابدیت کے ساتھ خاتمیت کا منصب عظیم عطا فرما دیا۔

فلک نیلگوں کے نیچے اور خاکدان ارضی کے شرق و غرب اور شمال و جنوب میں بسنے والے انسانوں کے سامنے اس سے زیادہ بڑا اور اس سے زیادہ چونکا دینے والا دعویٰ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا، پھر یہی نہیں بلکہ کل عالم انسانی کو اپنے اپنے مختلف او رمتنوع معیاروں پر اپنے پیش کردہ دستور زندگی کو آزادانہ طور پر پرکھنے کا حق دے کر اس مدعی مکرم ﷺ نے جہاں اپنی ذاتی علمی عظمتوں کو ناقابل انکار بنایا وہیں اپنے دعویٰ کی استدلالی قوتوں کا ناقابل شکست ہونا بھی ثابت فرما دیا۔

چنانچہ گذشتہ چودہ صدیوں کو آج بلا تکلف اور بلا خوف تردید اس پر شاہد عدل بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس طویل ترین زمانے میں دنیا کے تمام ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات پر مشتمل کوئی بھی تعلیمی کتاب یا صاحب کتاب کی سیرت ایسی نہیں ہے کہ جو نظریاتی، مشاہداتی، استدلالی، فنی، منطقی، فلسفی و اکتسابی اور وجدانی بے شمار معیاروں اور لاتعداد کسوٹیوں پر اس طرح پرکھی گئی ہو کہ جس طرح اسلامی تعلیمات کے مصدر علمی 'قرآن کریم' کو اور مصدر عملی یعنی 'سیرت محمدیؐ' کو جانچا اور پرکھا گیا ہے، پھر مزید برآں یہ کہ اس جانچ اور پرکھ کے پس منظر میں اگر کہیں جذبۂ حق طلبی اور عزم حق نیوشی کارفرما رہا ہے تو اس سے کہیں زیادہ جذبۂ عداوت و رقابت بھی اس جانچ اور پرکھ کی پشت پناہی کرتا رہا ہے، لیکن یہ حقیقت آج ایک مسلّم حقیقت بن چکی ہے کہ سیرت محمدی ﷺ ان تمام عالمگیر معیاروں میں سے ہر معیار اور کسوٹی پر پوری اتر کر اپنی آفاقیت کو ایک ناقابل انکار امر واقعہ میں تبدیل کر چکی ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کی اس قرآنی آفاقیت کی توضیح پر سیدہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ وضاحت ہزاروں استدلالات پر بھاری ہے کہ ارشاد خداوندی ﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ کے مصداق کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا تو صاحب نبوت کی اس راز داں ہستی کی زبان مبارک نے (كان خلقه القرآن) کے جامع ترین جواب سے سیرت محمدی ﷺ کی ابدیت و آفاقیت کو قیامت تک ہر قسم کے مزید دلائل وحجج سے اس لیے بے نیاز بنا دیا کہ قرآن کریم کی ابدیت وآفاقیت خود اپنی جگہ ایک امر مسلم ہے جو ہر طرح کے دلائل سے مستغنی ہے۔

لہٰذا اس قرآن مقدس کی علمی اور عرفانی اکتشافات وانکشافات انسانیت کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت فکری ارتقاء کے باوجود کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں اور ان ہی ارتقائی، علمی اور عرفانی ہدایت آفریں عجائبات کی وجہ سے یہ کلام ربانی کبھی پرانا پڑنے والا نہیں ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وضاحت کے مطابق جب آپ کی سیرت قرآن کریم ہے تو اس کے بارے میں بھی بلا تکلف یہی دعویٰ کیا جائے گا کہ آپ کی سیرت مقدسہ کے بھی علمی، عملی اور عرفانی عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں اور نہ یہ سیرت اپنی ہدایت آفرینی کے لحاظ سے کبھی پرانی یعنی ناقابل استفادہ ہونے والی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بھی بلا مبالغہ صحیح اور یقینی ہوگا کہ سیرت محمدی ﷺ جس طرح علماً زمان ومکان پر غالب اور آفاق گیری میں قرآن کریم کی طرح محکم ہے اس طرح عملاً بھی وہ آفاق گیری کے ساتھ اس کائنات میں ہمیشہ ہمیشہ ہدایت آفرینی کے ساتھ جلوہ آراء رہے گی، پھر صاحب سیرت نے «إنما بعثت معلما» اور «بعثت لأتمم مكارم الأخلاق» فرما کر اپنی سیرت کی جو بنیادیں علم اور اخلاق کی تکمیل قرار دی ہیں وہ مرز وبوم، زمان ومکان اور رنگ ونسل کی تمام حد بندیوں کو ختم کر کے آپ کی سیرت کی آفاقیت کو دلائل سے بے نیاز بنا دیتی ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ کی علم واخلاق کی یہ وقیع آفاقی بنیادیں کسی مخصوص وقت خطے یا قوم کی نہیں بلکہ ہدایت وتربیت کی اس عام انسانی ضرورت کو پورا کرتی ہیں کہ جس کا اس کائنات رنگ وبو میں قدم رکھنے والا بلا تخصیص ہر انسان ضرورت مند بن کر ہی پہلا سانس لیتا ہے اور تادم واپسیں اس ضرورت سے مستغنی نہیں ہوتا۔

صاحب سیرت ﷺ نے انسانیت عامہ کے لیے اپنی ہدایت کی آفاقیت کو ذات بابرکات حق کی ''رب العالمین'' اپنی نبوت کی آفاقیت کو ''رحمۃ للعالمین'' اور اس ہدایت ونبوت کے سرمنشاء فیض قرآن کریم کی آفاقیت کو ''ہدی للعالمین'' کے ذریعے دلائل سے ہمیشہ کے لیے مستغنی فرما دیا۔

آفاقیت کے ان مناشی کے بے غبار ہو جانے کے بعد اب یہ استدلالی سیرت وضاحت کی مزید

تشریح کی ضرورت مند نہیں رہتی کہ آپ ؐ کی آفاقی سیرت نے حسب تفصیل ذیل انسانی زندگی کے جملہ اعمال کو آیات احکام سے مزین فرمایا، آیات تکوین کے ذریعے انسانی علم کو آپ ﷺ نے استدلالی قوتوں سے آشنائی عطا فرمائی اور حقائق غیب کی آیات کو آپ ؐ نے اپنا حال بتا کر انسانی عقول سے قریب تر فرما کر وہ احسان فرمایا ہے کہ جس سے انسانیت کبھی سبکدوش نہیں ہو سکے گی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عبدیت و تقید کی آیات کو اپنی مثالی عبدیت کے ذریعے انسانیت کے لیے درس عبرت بنا کر پیش فرمایا۔

آیات حاکمیت سے آپ ؐ نے منصب امارت پر جلوہ فرما ہو کر ارباب اقتدار کو دوامی رہنمائی عطا فرمائی، حسن معیشت کی آیات سے آپ ؐ نے چھوٹوں پر بے نہایت شفقت اور بڑوں کی کماحقہ توقیر وعظمت کر کے انسانی معیشت کو آراستگی بخشی۔

حسن معاشرت کی آیات سے آپ ؐ نے معاملات میں اتلاف حقوق کی تمام راہوں کا سد باب فرما کر انسانی معاشرت کو بے مثال حسن وخوبی مرحمت فرمائی۔

انابت الی اللہ کی آیات کو آپ ؐ نے اپنی تقرب الی اللہ کی کیفیات کے ذریعے منکشف فرما کر انسانی خلوتوں کو جاذبیت بخشی۔

تربیت خلق اللہ کی آیات کو اس مربی انسانیت ؐ نے اپنے بے مثال نمونہء خدمت خلق کے ذریعے پیش فرما کر انسانی جلوتوں کو رونقیں عطا فرمائیں۔ آیات قدرت وتخلیق کو آپ ؐ نے اپنی شان جلال کے ذریعے انسانیت سے متعارف فرمایا۔ رافت ورحمت کی آیات کو آپ ؐ نے اپنی شانِ شعور جمال کو مصداق بنا کر پیش فرمایا، تجلیات حق کی آیات سے آپ ؐ نے اپنے بے نہایت معنوی قرب خداوندی سے انسانیت کو آشنا بنایا۔

استغنا خداوندی کی آیات کے ذریعے آپ ؐ نے بارگاہ صمدیت میں قدم قدم پر اپنی عابدانہ محتاجیت کو انسانیت کے لیے اسوۂ بندگی بنا کر پیش فرمایا۔ ترجیح آخرت کی آیات سے آپ ؐ نے دنیا کی فانی لذتوں سے بے نیازی کا نمونہ قائم فرما کر انسانیت کے لیے روحانی ارتقاء کی راہ مجاہدہ ہموار فرمائی۔

قیام قیامت اور حشر ونشر کی آیات کو آپ ؐ نے اپنے محاسبہء اعمال کے عملی نمونے کے ذریعے انسانی زندگی کی اہم ترین ضروریات میں داخل فرمایا۔ رد شرک کی آیات سے آپ ؐ نے مشاہد فطری دلائل کے ذریعے شرک پادر ہوا بنا دیا۔ توحید ربانی کی آیات کے لیے ہر ذرۂ کائنات کے حجت ہونے کی پردہ کشائی فرما کر انسانیت کے سر عزت کو لازوال نعمتیں عطا فرمائیں، نعیم جنت کی آیات کو آپ ؐ نے اپنے شوق کی صورت میں وسیلہ یقین بنا کر انسانی ہمتِ عمل کو آرزومندی کی بے نہایت قوتوں

سے سرفراز فرمایا، عذاب جہنم کی آیات کو آپؐ نے غم آخرت سے بے فکر انسانیت کے لیے فکر آخرت کا مؤثر ترین وسیلہ بنا کر پیش فرمایا۔

حقیقت ایمان کی آیات کو آپؐ نے امید محض سے پیدا ہونے والے سہل انگاری کے غیر فطری جذبات کو اور خوف محض سے پیدا ہونے والی قنوطیت کے احساسات کو اعتدال آشنا بنایا۔

انعام مغفرت کی آیات کو آپؐ نے انسانی قلوب کے اضطراب کو سکون سے تبدیل فرما دینے کے شفا بخش علاج کے ذریعے انسانیت کو نوازا۔ انتقام کی آیات کے ذریعے آپؐ نے انسانیت کے لیے حزن وغم کی افادیت کا محلِ صحیح متعین فرمایا، جہاد وقصاص کی آیات کو آپؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ کا وسیلہ بنا کر بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کو انسانیت کے لیے منزل مراد بنایا۔

وصول الی اللہ کی آیات کو عبدیت کاملہ کے ذریعے انسانیت کو عروج سے آشنا بنایا۔ تعلیم وتبلیغ کی آیات کے ذریعے اللہ کی پیغام رسانی کو انسانیت کے لیے لازوال کو وجہ عزوشرف بنایا۔

آیات خلافت کے ذریعے آپؐ نے احکام واوامر ربانی کا اجراء فرما کر انسانیت کو ربانی نیابت کی منصبی عظمت سے روشناس کرایا اور آیات طاعت وعبادت کے ذریعے آپؐ نے انسانیت میں احساس عبدیت وبندگی کو اجاگر فرما کر انسانیت کو بے مثال اعزاز عطا فرمایا۔

یہ سیرت نبوی ﷺ کے ان آفاقی ابواب کا اجمال ہے کہ جو انسانیت عامہ کی آفاقی صلاح و اصلاح کے نہ صرف ضامن ہیں بلکہ چودہ سو سال کے شب و روز کو گواہ بنا کر اگر ماضی کے بارے میں یہ کہنا بجا اور درست ہے کہ انسانی فکر اپنی ہزاروں ارتقائی رفعتوں کے باوجود انسانیت کے لیے اس سے زیادہ کامل ومکمل نظام حیات پیش نہیں کر سکی تو مستقبل کے بارے میں بھی تاریخ کی اس توثیق کے بعد اسے ہرگز مبالغہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ انسانی فکر وفلسفہ اسلام سے زیادہ انسانیت عامہ کی صلاح واصلاح کا ضامن مکمل نظام آئندہ بھی کبھی مدوّن نہیں کر سکے گا۔

یہ توضیح جہاں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی علمی اور ایمانی فراست پر شاہد عدل بن رہی ہے وہیں اس حقیقت کی بھی پردہ کشائی اس سے ہوتی ہے کہ ان ابواب سیرت نبوی ﷺ میں سے ہر باب اپنی آفاقیت کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے اور ان اجزائے سیرت میں سے کوئی بھی جز انسانوں کے کسی مخصوص خطے یا طبقے سے خصوصیت رکھتا ہو بلکہ ہر جزو انسانیت عامہ کی آفاقی صلاح ظاہر و باطن اور تمدن کی بنیاد پر اصلاح تمدن کی ان رہنمائیوں پر مشتمل ہے کہ جو ہر قسم کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، ان ہمہ گیر آفاقی اجزاء سیرت کا اگر علمی خلاصہ کیا جائے تو اس کے لیے قول عائشہؓ سے زیادہ جامع خلاصہ دوسرا ممکن نہیں اور اگر اس آفاقی سیرت نبوی ﷺ کی بے نہایت تفاصیل کی تلخیص

کی جائے تو یہ ہوگی کہ اس کا مظہر دیانت ''عقائد'' ہیں اور مظہر عبدیت ''عبادت'' ہے، جس کی بظاہر وجہ یہی ہے کہ اس آفاقی سیرت کی جس طرح آفاقیت، کل عالم انسانی کی پانچ دیاناتی بنیادیں ''نماز''، ''روزہ''، ''حج'' اور ''زکوۃ'' قرار دی گئیں ہیں، اس طرح آپؐ کی سیرت کو عالمگیر اجتماعیت کی پانچ بنیادیں ''الجماعت'' ''السمع'' ''الطاعۃ'' ''الھجرۃ'' اور ''الجھاد'' کی صورت میں مرحمت فرمائی گئی ہیں اور یہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہیں کہ دیاناتی پیغام کی بنیادیں کچھ ہدایاتی فرق کے ساتھ صرف نبی کریم ﷺ ہی کو نہیں بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی دی گئی ہیں، لیکن عالمگیر اجتماعیت کی پانچ بنیادیں نبی کریم ﷺ کو اختصاصی طور پر اس فرق کے ساتھ مرحمت فرمائی گئی ہیں کہ اول الذکر پانچ چیزوں کو اساس اسلام بنایا گیا ہے بخلاف آخرالذکر پانچ چیزوں کے کہ ان کو رنگ عبادت تو دیا گیا ہے لیکن ان کو اساسی حیثیت نہیں دی گئی، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آفاقی سیرت محمدی ﷺ میں اصل الاصول عبادت و دیانت ہے اور جماعت، سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد پر مشتمل اجتماعی اصول اس عبادت و دیانت سے مرکب و مربوط نظام کو محکم بنانے کے لیے خادم و محافظ کے طور پر دیے گئے ہیں، پس اگر اللہ رب العزت کی خالقیت و حاکمیت ہمہ گیر اور آفاقی ہے اور یقیناً ہے تو بتقاضائے عقل و نقل اس کا آخری پیغام ہدایت بھی عالمی اور آفاقی ہی ہونا چاہیے، اس لیے تنہا اسی صاحب سیرتِ آفاقی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پورے عالم انسانی کے کامل ترین اور آخری رہنما ہونے کا اعلان کرے «أنا خاتم النبیین ولا نبی بعدی» میں آخری پیغمبر ہوں اور میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ !

صلح حدیبیہ اسباب ونتائج

مولانا عبدالعلیم ماہر، ناظم جامعہ عربیہ شمس العلوم، سمرا

حامداً ومصلیاً، أما بعد!

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کو جو معنویت اور اہمیت حاصل ہے وہ اہل علم ونظر سے مخفی نہیں، صلح حدیبیہ دراصل اسلام اور اہل اسلام کی ترقی اور ان کے خوشگوار انقلاب کا پیش خیمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ زبان وحی نے اسے ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾(الفتح:۱/۴۸)

گو اس فتح مبین کے بارے میں بعض صحابہ اور کچھ مفسرین کی آراء مختلف ہیں، بعض کا خیال ہے کہ فتح مبین ''فتح مکہ'' ہے، بعض کہتے ہیں: فتح مبین فتح خیبر ہے، بعض کہتے ہیں: فتح مبین فتح فارس و روم اور وہ دیگر بلاد اسلامیہ ہیں جو بعد میں مفتوح ہوئے، لیکن اکثریت کا رجحان اس طرف ہے کہ فتح مبین صلح حدیبیہ ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

① «عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغيره انه قال: إنكم تعدون الفتح فتح مكة ونحن نعد الفتح صلح الحديبية»

② «عن جابر رضی اللہ عنہ قال: ما كنا نعد الفتح إلا يوم الحديبية»

③ «عن البراء رضی اللہ عنہ قال: تعدون أنتم الفتح فتح مكة وقد كان فتح مكة فتحًا ونحن نعد الفتح بيعة الرضوان يوم الحديبية»[1]

(۱) ابن كثير: ۱۸۲/٤

صلح حدیبیہ کا یہ واقعہ مقام حدیبیہ میں ذی القعدہ ۶ ہجری میں پیش آیا ہے جس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے:

تفصیل واقعہ حدیبیہ

شوال ۶ ہجری کی بات ہے، مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تقریباً ساڑھے پانچ سال کی مدت ہو چکی ہے، اس دوران تین بڑی بڑی لڑائیاں بھی مسلمانوں اور مکہ کے کافروں کے مابین ہو چکی ہیں، پہلی لڑائی غزوۂ بدر کہلاتی ہے، دوسری کا نام غزوۂ احد ہے اور تیسری کو غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شوال ۶ ہجری کی کسی رات میں آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں، جب اس خواب کا تذکرہ آپؐ نے صحابہ کرام سے کیا تو صحابہ کرام جو ساڑھے پانچ سال سے اپنے وطن قدیم مکہ اور خانہ کعبہ کی زیارت سے محروم تھے یکا یک ان کے اندر مکہ اور خانۂ کعبہ کی محبت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے مل کر فرمائش کی کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور نبی کا خواب سچا ہوتا ہے، لہٰذا ہم سب کو اپنے ہمراہ لے کر مکہ تشریف لے چلیں، ہم سب لوگ تیار ہیں۔ صحابہ کرام کا یہ شوق و محبت دیکھ کر آپؐ نے ان کی فرمائش منظور کر لی اور تیاری کا حکم دے دیا اور اطراف مدینہ میں بھی اعلان کرا دیا کہ جو ہمارے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ جانا چاہے وہ تیار ہو جائے۔ چنانچہ چند ایام کی تیاری کے بعد ذی القعدۃ ۶ ہجری میں آپؐ چودہ سو (۱۴۰۰) صحابہ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے مدینے سے روانہ ہو گئے۔

مقام ذوالحلیفہ میں جو مدینہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر ہے، آپؐ نے اور آپؐ کے اصحاب نے عمرے کا احرام باندھا اور قربانی کے ستر (۷۰) اونٹوں کا اشعار کیا اور ان کی تقلید بھی کی۔ ذوالحلیفہ سے اتر وانہ ہونے سے پہلے آپ نے قبیلۂ خزاعہ کے ایک جاسوس کو جو کافر تھا اجرت دے کر اس مقصد سے آگے روانہ کر دیا کہ مکہ والوں کی خبر لائے کہ کیا مکہ والے ہماری روانگی سے باخبر ہیں اور یہ کہ مکہ والے ہمارے بارے میں کیا اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ آیا وہ ہمیں بہ آسانی عمرہ کرنے دیں گے یا مزاحمت کریں گے؟

آپ کا قافلہ جب تک مقام عسفان پہنچا اس وقت تک وہ خزاعی جاسوس اہل مکہ کی خبر لے کر مقام عسفان میں واپس آ گیا اور وہیں آپؐ کو رپورٹ دی کہ اہل مکہ کو آپؐ کی روانگی کی خبر ہو چکی ہے اور وہ چند اور مشرک قبائل کو لے کر زبردست تیاریوں کے ساتھ آپؐ کو روکنے کے لیے مقام ذی طویٰ میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور یہ کہ سواروں کے ایک دستے کے ساتھ خالد بن ولید کو مقام کراع

الغمیم کی جانب روانہ کر دیا ہے تا کہ مسلمانوں کو مکہ کی طرف بڑھنے سے روکیں۔

مقام عسفان میں آپؐ نے صحابہ کرام سے مشورہ لیا کہ اب کیا کیا جائے؟ آیا ان لوگوں کے بچوں کو چل کر گرفتار کر لیں جو ہمارا راستہ روکنے کے لیے ذی طویٰ میں قیام کیے ہوئے ہیں یا اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھیں، جناب صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ ہم لوگ عمرہ کرنے کے غرض سے نکلے ہیں، تو خانہ کعبہ ہی کا قصد کریں۔ البتہ اگر کوئی ہماری راہ میں حائل ہوگا تو اس کا مقابلہ کیا جائے گا، آپؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور قافلے کی روانگی کا حکم دے دیا۔ چودہ سو قدسیوں کا قافلہ قربانی کے ستر اونٹوں کے ساتھ روانہ ہو گیا، لیکن آپؐ نے بطور مآل اندیشی سفر کا راستہ تبدیل کر دیا اور عام شاہراہ سے کچھ جانب مغرب ہٹ کر سفر جاری رکھا تا آنکہ اچانک کراع الغمیم پہنچ گئے جہاں خالد بن ولید سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ تاک میں تھے، مسلمانوں کی اس اچانک اور غیر متوقع آمد سے خالد ایسے بدحواس ہوئے کہ وہاں سے سرپٹ گھوڑا دوڑایا اور اہل مکہ کے پاس پہنچے اور انھیں رسول اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کے قریب پہنچ جانے کی اطلاع دی۔

آپ ﷺ اور صحابہ کرام کراع الغمیم سے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اس پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے جہاں سے اتر کر مکہ کا نواحی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس جگہ پہنچے تو آپؐ کی اونٹنی جس کا نام قصواء تھا بیٹھ گئی۔ لوگوں نے لاکھ کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اونٹنی نے دھوکا دے دیا، آپؐ نے فرمایا اونٹنی نے دھوکا نہیں دیا ہے اور نہ یہ اس کی فطرت ہے بلکہ اسے اس ذات نے روک دیا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھی کو روک دیا تھا، یعنی اللہ کو یہ پسند نہیں ہے کہ مکہ پر حملہ کر کے تم حرمت کعبہ کو پامال کرو، پھر آپؐ نے اونٹنی کو زور سے ڈانٹا اور وہ چل پڑی، وہاں سے تھوڑی دور چل کر آپؐ مقام حدیبیہ کے کنویں کے پاس پہنچے اور وہیں قیام کا حکم دیا۔

مقام حدیبیہ

چنانچہ صحابہ کرام نے اپنے اسباب وسامان وہیں پر اتارے اور اپنی اپنی قیام گاہوں کا انتظام کیا۔ نبی اکرم ﷺ سے یہاں پر ایک معجزہ کا بھی ظہور ہوا جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ کنواں جس کے پاس مسلمانوں نے قیام کیا تھا جب پانی لینے کے لیے مسلمان اس کنویں کے پاس پہنچے اور پانی نکالنا شروع کیا تو تھوڑی دیر بعد پانی ختم ہو گیا اور اس میں ایک بوند بھی پانی باقی نہ رہ گیا۔ مسلمانوں نے اللہ کے رسولؐ سے پانی کی شکایت کی تو آپؐ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حضرت براء بن

عازب کو دیا کہ اسے کنویں میں ڈال دو، تیر کنویں میں ڈالتے ہی پانی بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے کنواں بالکل بھر گیا اور اس قدر بھر گیا کہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے ڈول اور رسی کی بھی ضرورت نہ رہ گئی اور مسلمان اس کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے پانی نکال لیتے اور پھر جب تک حدیبیہ میں مسلمانوں کا قیام رہا پانی کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

سفارت کاروں کا تبادلہ

یہ مقام حدیبیہ مکہ سے ۹ میل کے فاصلے پر تھا جب آپؐ یہاں قیام پذیر ہو گئے اور قیام کے سلسلے میں ہر طرح کے انتظام سے فارغ ہو کر مطمئن ہو گئے تو قریش مکہ کی جانب سے بدیل بن ورقاء خزاعی چند لوگوں کے ہمراہ آپؐ کے پاس آیا اور آپ سے مقصد سفر معلوم کیا۔ آپؐ نے فرمایا ہم لوگ عمرے اور زیارت کعبہ کی غرض سے آئے ہیں جنگ اور لڑائی ہمارے پیش نظر نہیں، قریش کو چاہیے کہ ہم سے مزاحمت نہ کریں اور ہمیں اپنی غرض پوری کرنے دیں، ہم لوگ عمرہ کر کے خاموشی کے ساتھ واپس چلے جائیں گے، آپؐ نے بدیل بن ورقاء سے مزید یہ بھی فرمایا کہ اب ایک موقع ہے کہ قریش کچھ مدت کے لیے ہم سے صلح کر لیں اور باہم لڑائی سے وہ بھی اور ہم بھی دستکش ہو جائیں اور ہمیں دوسرے مشرک عرب قبائل کے مقابلے میں چھوڑ دیں، ہم اگر مغلوب ہوتے ہیں تو ان کی آرزو پوری ہو جائے گی اور اگر غالب آتے ہیں تو ان کے لیے اسلام کا دروازہ کھلا ہوا ہے، وہ چاہیں گے تو دوسروں کی طرح اسلام میں داخل ہو کر اپنی عزت و وقار کو بلند کر لیں گے اور اگر وہ آمادۂ پیکار ہی ہیں تو قسم ہے رب العزۃ کی کہ میں ان سے اسلام کی خاطر اس وقت تک لڑوں گا جب تک میری زندگی کی ایک سانس بھی باقی رہے گی یا پھر اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہے گا۔ بدیل بن ورقاء آپ کی باتوں سے متاثر ہوا اور واپس جاتے ہوئے وعدہ کیا کہ آپ کا پیغام قریش مکہ تک پہنچا دوں گا۔

چنانچہ بدیل نے واپس جا کر اہل مکہ کو صورت حال سے آگاہ کیا اور نبی اکرم ﷺ کا پیغام پہنچا دیا۔ جب آپ کا پیغام اہل مکہ کو پہنچا تو ان میں جو فتنہ پرور لوگ تھے، وہ بھڑک اٹھے اور کہا کہ ہم مسلمانوں کو بیت اللہ کی زیارت کے لیے بھی مکہ میں نہیں داخل ہونے دیں گے، البتہ ان میں جو سنجیدہ اور سمجھدار لوگ تھے وہ گہرائی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے لگے اور معاملہ نمٹانے کی فکر میں لگ گئے، بالآخر ایک دوسرے قاصد کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

وہ دوسرے قاصد جن کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا وہ قبائل احابیش کے سردار ''حلیس بن علقمہ کنانی'' تھے۔ ان کا تعلق ان قبائل سے تھا جو قربانی کے جانوروں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اللہ کے رسولؐ

نے ان کو حدیبیہ کی طرف آتے دیکھا تو صحابہ سے فرمایا کہ قربانی کے اونٹوں کو آگے کر دو، چنانچہ جب حلیس نے قربانی کے جانوروں کی قطاریں دیکھیں تو اللہ کے رسولؐ سے ملے بغیر واپس اہل مکہ کے پاس چلا آیا اور کہا کہ مسلمان صرف زیارت کعبہ کی غرض سے آئے ہیں، ان کا ارادہ لڑائی کرنے کا نہیں ہے، لہٰذا میری رائے ہے کہ ان سے تعرض نہ کیا جائے اور ان کو بیت اللہ کی زیارت کرنے دی جائے، لوگوں نے کہا تم احمق اور جنگلی آدمی ہو، تم کچھ نہیں سمجھتے، اس پر حلیس کو غصہ آ گیا، اس نے کہا اگر تم لوگوں نے مسلمانوں کو عمرہ نہ کرنے دیا تو میں اپنے تمام آدمیوں کو لے کر تم سے لڑوں گا، حلیس کا یہ رنگ اور رویہ دیکھ کر اہل مکہ نے بڑی منت وسماجت کی اور بہت مشکل سے اسے اونچ نیچ سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

اس کے بعد اب نبی اکرم ﷺ نے قریش مکہ کے پاس خراش بن امیہ کو تغلب نامی اونٹ دے کر اپنا پیغام بھیجا کہ ہم لوگ جنگ کی نیت سے نہیں آئے ہیں، ہمارا مقصد صرف خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف ہے اور اس کے بعد قربانی اور بس، پھر ہم لوگ خاموشی سے مدینہ واپس چلے جائیں گے لہٰذا ہمارے ساتھ مزاحمت نہ کرو اور ہمیں اپنا مقصد پورا کرنے دو، قریش نے نہ صرف یہ کہ خراش کے اونٹ کو ذبح کر دیا بلکہ خراش کے قتل کے بھی درپے ہو گئے لیکن حلیس اور اس کے ساتھیوں نے خراش کو قریش مکہ کے چنگل سے بچا لیا اور بحفاظت حدیبیہ تک پہنچا دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سفارتی مہم پر

اس کے بعد رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلیری، ہمت اور بہادری کو دیکھتے ہوئے انھیں مکہ والوں کے پاس بھیجنا چاہا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مکہ میں میرے خاندان بنو عدی کا کوئی ایسا طاقتور اور بااثر فرد نہیں ہے جو میری پشت پناہی کر سکے، اس لیے مجھے مکہ والوں سے خطرہ ہے البتہ میں اس مقصد کے لیے سب سے بہتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سمجھتا ہوں جن کے خاندان بنو امیہ کے کئی بااثر لوگ مکہ میں ہیں جو ہر طرح سے ان کی حمایت اور پشت پناہی کریں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اللہ کے رسولؐ کو پسند آ گئی اور آپؐ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر اہل مکہ کے پاس روانہ کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ گئے اور سرداران مکہ ابوسفیان وغیرہ سے ملاقات کی اور نبی اکرم ﷺ کا پیغام سنایا، اہل مکہ نے کہا کہ تمھیں طواف کرنا ہے تو جا کر خانہ کعبہ کا طواف کر لو، دوسروں کو اجازت نہیں ملے گی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی ﷺ کے بغیر میں ہرگز طواف نہ کروں گا، اس بات پر مکہ والے برہم ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محبوس کر دیا۔

بیعت کا واقعہ

مسلمانوں کے خیمے میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ والوں نے شہید کر دیا ہے، اس خبر کا سننا تھا کہ مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے، خود رسول اللہ ﷺ بھی غیظ وغضب میں آگئے اور کہا کہ اب خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لیے بغیر ہماری واپسی ناممکن ہے اور آپؐ نے صحابہ کرام کو آواز دی کہ آؤ اس بات پر مجھ سے عہد اور بیعت کرو کہ اب خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لیے بغیر مدینہ واپس نہیں جاؤ گے، بس پھر کیا تھا صحابہ کرام پروانہ وار بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے اور سوائے ایک جد بن قیس کے باقی تمام صحابہؓ نے آپؐ سے بیعت کی اور یہ عہد کیا کہ آپؐ کے حکم پر اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑنے کے لیے تیار ہیں، اسلامی تاریخ میں اس بیعت کا نام ''بیعت رضوان'' ہے کیونکہ رب کائنات نے اس بیعت سے اپنی رضامندی اور خوشنودی ظاہر فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح:۴۸/۱۸)

ابھی یہ بیعت کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس آگئے اور معلوم ہوا کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر غلط طور پر مشہور ہوگئی تھی۔

اسی دوران ایک اور واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ مکہ کے تقریباً اسی (۸۰) نوجوان رات کے پچھلے پہر ''کوہ تنعیم'' سے اتر کر مسلمانوں کی قیام گاہ کے پاس آئے، ان کا ارادہ تھا کہ مسلمان جب فجر کی نماز میں مشغول ہوں تو اچانک ان پر حملہ کر دیا جائے مگر پہرے داری کرنے والے صحابہ نے انھیں دیکھ لیا اور بڑی چابک دستی سے ان کو گرفتار کر لیا، یہ تمام مجرم اللہ کے رسولؐ کے سامنے پیش کیے گئے مگر آپؐ نے اپنی ''رحمۃ للعالمینی'' کا جلوہ دکھاتے ہوئے عفو و درگزر سے کام لیا اور ان سب کو رہا کر دیا۔

عروہ ثقفی قریش کا نمائندہ

ایک طرف مکہ کے ان نوجوانوں کی رہائی کا معاملہ اور دوسری طرف جنگ اور مقابلہ کے لیے مسلمانوں کی آمادگی اور اس کے لیے بیعت و معاہدہ، جب ان دونوں باتوں کی خبر اہل مکہ کو پہنچی تو انھیں بھی رسول اکرم ﷺ کے پیغام صلح کی طرف سنجیدگی سے سوچنا پڑا، چنانچہ اسی بات کا جائزہ لینے اور صحیح صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے اہل مکہ نے عروہ بن مسعود ثقفی کو رسولؐ اکرم کے پاس روانہ کیا۔ عروہ اللہ کے رسولؐ کے پاس پہنچے اور بات چیت شروع کرتے ہوئے کہا کہ محمدؐ! اپنی قوم سے مقابلہ کرنے کے لیے کیسے کیسے لوگوں کو اکٹھا کر لائے ہو، خدا کی قسم قریش کے تمام قبائل بہت

زبردست تیاریوں کے ساتھ تمھارے مقابلے کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں اور تمھارے یہ ساتھی ان کے سامنے ہرگز نہ ٹک سکیں گے اور تمھیں تنہا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پاس ہی بیٹھے تھے، عروہ کی یہ بات سن کر جوش میں آ گئے اور نہایت زوردار طریقے سے عروہ کو ڈانٹتے اور جھڑکتے ہوئے فرمایا کہ عروہ تمھاری خام خیالی اور کوتاہ نظری ہے جو ہمارے بارے میں ایسا سمجھتے ہو، خدا کی قسم ہم زندگی کی آخری سانس تک بھی نہ دامن رسول چھوڑ سکتے ہیں اور نہ کبھی ان سے جدا ہو سکتے ہیں۔

عروہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے وقت عرب کے دستور کے مطابق اپنا ہاتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے قریب لے جاتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تلوار لیے پاس ہی کھڑے تھے، انھیں عروہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی، چنانچہ انھوں نے اپنی تلوار کے دستے سے عروہ کے ہاتھ پر مارا اور کہا گستاخ اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لے ورنہ ہاتھ سے محروم ہو جائے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ کی باتوں کے جواب میں وہی کچھ فرمایا جو اس سے قبل بدیل بن ورقاء سے آپ نے فرمایا تھا کہ ہم لوگوں کے آنے کا مقصد جنگ نہیں ہے بلکہ عمرہ ہے اور قریش چاہیں تو کچھ مدت کے لیے ہم سے صلح کر لیں اور ہمیں دیگر عرب قبائل سے نمٹنے دیں، اگر ہم شکست کھاتے ہیں تو ان کی مراد پوری ہو جائے گی اور اگر فتح یاب ہوتے ہیں تو ان کے لیے اسلام کا دروازہ کھلا ہوا ہے، وہ عزت و وقار کے ساتھ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں اور اگر مکہ والے جنگ ہی چاہتے ہیں تو رب کائنات کی قسم! میں اہل مکہ سے اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے یا پھر اللہ تعالیٰ اپنا حکم نافذ کر دے۔

اس مختصر سے وقفے میں عروہ رسول اکرمؐ کے ساتھ صحابہ کرام کی شیفتگی کے مناظر بہت غور سے دیکھتا رہا تھا، جب واپس اہل مکہ کے پاس آیا تو کہا اے قریش مکہ! میں نے شاہ ایران کسریٰ کا بھی دربار دیکھا ہے اور شاہ روم قیصر کا بھی اور شاہ حبش نجاشی کے یہاں بھی میں گیا ہوں مگر جو عزت و قدر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے ساتھیوں کے دلوں میں ہے ایسا میں نے کسی کے دربار میں نہیں دیکھا، محمدؐ کے ساتھی تو محمدؐ کے ایسے فدائی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھوکتے ہیں تو ان کی تھوک زمین پر نہیں گرنے پاتی، اسے وہ لوگ اپنے ہاتھوں پر روک کر اپنے چہرے پر مل لیتے ہیں اور وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے وضو کا پانی بھی اپنے ہاتھوں پر روک کر چہرے اور جسم پر مل لیتے ہیں، ان کا کوئی بال گر جاتا ہے تو اسے عزت و احترام سے اٹھا کر رکھ لیتے ہیں، وہ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے اور ان سے ایسی والہانہ محبت کرتے ہیں جس کی مثال دنیا میں پیش نہیں کی جا سکتی، لہٰذا اے قریش مکہ! اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم محمدؐ سے صلح کر لیں، عروہ کی رپورٹ سے صحیح اور سچی تصویر قریش مکہ کے پاس

آ گئی، لہٰذا انھوں نے صلح پر رضا مندی ظاہر کر دی۔

قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو اور معاہدۂ صلح

اس مقصد کے لیے قریش نے سہیل بن عمرو کو اللہ کے رسولؐ کے پاس روانہ کر دیا، سہیل کو آتا دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سہیل آ رہے ہیں، اب معاملہ سہل ہو جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

چنانچہ سہیل آئے اور نبی اکرم ﷺ سے بات چیت شروع ہوئی اور شرائط صلح پر گفتگو ہونے لگی۔ سہیل نے چار شرطیں پیش کیں اور آپؐ نے چاروں شرطیں بغیر کسی پس و پیش کے قبول فرما لیں۔ شرائط کی تفصیل یہ ہے:

① اس سال مسلمانوں کو عمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، آئندہ سال آ کر عمرہ کریں لیکن مکے میں داخلے کے وقت سوائے تلوار کے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو اور تلوار بھی میان میں رہے گی اور تین دن سے زیادہ مکہ میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔

② دس سال تک جنگ بندی رہے گی، اس عرصے میں دونوں فریق حرب و پیکار سے گریز کریں گے اور ایک دوسرے کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

③ عرب کے تمام قبائل اور تمام قوموں کو پورا پورا اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی فریق کے حلیف ہو سکتے ہیں اور اس صلح کی شرائط ان پر بھی نافذ ہوں گی۔

④ قریش میں سے اگر کوئی مسلمان ہو کر بغیر اپنے ولی کی اجازت کے مدینہ جائے گا تو اسے مکہ واپس کرنا ہوگا لیکن اگر مدینہ سے کوئی اسلام چھوڑ کر مکہ آئے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

یہ چوتھی شرط مسلمانوں کے لیے بہت تکلیف دہ اور ناگوار تھی اور انھیں اس طرح دب کر صلح کرنا بالکل پسند نہیں آیا خاص طور پر عمرؓ بن خطاب بہت بے چین اور مضطرب تھے اور انھیں کسی طرح بھی اس صلح پر شرح صدر نہیں ہو رہا تھا، چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ سے بات کی پھر خود نبی اکرم ﷺ سے بھی بات کی مگر انھیں اس وقت تک تسلی و تشفی نہیں ہوئی مگر بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اسی چوتھی شرط نے مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچایا ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال زبانی طور پر شرائط صلح پر بات چیت مکمل کر لینے کے بعد طے ہوا کہ اب اس زبانی صلح کو تحریری شکل دے دی جائے اور اس پر فریقین کے منتخب لوگوں کے دستخط بھی ثبت ہو جائیں، چنانچہ اس مقصد کے لیے آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انھیں صلح نامہ لکھنے کا حکم دیا، حضرت علیؓ نے

پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو اس پر سہیل معترض ہوا کہ ہم رحمان کو نہیں جانتے اس لیے باسمك اللھم لکھئے جیسا کہ ہمارا دستور ہے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا ٹھیک ہے باسمك اللھم ہی لکھئے پھر حضرت علیؓ نے آپؐ کے نام کے ساتھ محمد رسول اللہ لکھا، اس پر بھی سہیل نے اعتراض کیا کہ اگر آپ کو ہم لوگ رسول مانتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی، اس لیے رسول اللہ کاٹ دیجیے اور صرف محمد بن عبداللہ لکھیے۔ آپؐ نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں چاہے تم مانو یا نہ مانو، بہرحال آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ کاٹ دو اور صرف محمد بن عبداللہ لکھو۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ نہیں کاٹ سکتا، آپؐ نے فرمایا مجھے دکھاؤ میں کاٹ دیتا ہوں، چنانچہ آپؐ نے الفاظ رسول اللہ پر قلم پھرایا۔

صلح نامہ مرتب ہونے کے بعد اس پر درج ذیل حضرات کے بطور گواہ دستخط ہوئے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن سہیل بن عمرو، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت محمود بن سلمہ، حضرت مکرز بن حفص، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم، حضرت علیؓ ہی کاتب تحریر بھی تھے۔

ابوجندلؓ کا واقعہ

یہ چوتھی شرط قریش کی طرف سے اس لیے تھی کہ اس شرط کے ہوتے ہوئے اب کوئی اسلام کی طرف مائل نہ ہوگا، مگر قدرت کی کاریگری دیکھیے کہ ابھی صلح نامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ صلح نامہ لکھانے والے سہیل بن عمرو ہی کے صاحبزادے خیمۂ اسلام میں پہنچ گئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں مسلمان ہو چکا ہوں، مجھے میرے گھر اور خاندان والے بے انتہا مصائب و آلام میں مبتلا کیے ہوئے ہیں، یہ دیکھیے میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، مجھے مقید کیے ہوئے تھے لیکن کسی طرح میں وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا اور اب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں، مجھے اپنے ساتھ مدینہ لیتے چلیں، سہیل ابوجندل کو دیکھتے ہی آگ بگولہ ہوگیا اور کہا ہمارے آپ کے معاہدے کی رو سے اب آپ کو اسے واپس کرنا ہوگا، صحابہ نے کہا معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے اس لیے ابھی ابوجندلؓ کا معاملہ اس معاہدے سے مستثنیٰ ہے، سہیل بگڑ گیا اور کہنے لگا اگر ابوجندلؓ کو واپس نہ کیا گیا تو میں معاہدہ ہی نہیں کروں گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں معاہدے پر قائم ہوں اور ابوجندلؓ کو واپس کر دوں گا، تم صلح نامہ مکمل کرو۔

ابوجندلؓ نے نہایت گریہ و زاری سے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ مجھے مشرکین کے یہاں

واپس کر دیں گے، آپؐ نے فرمایا ابوجندلؓ! صبر کرو مصلحت خداوندی یہی ہے، میں نے معاہدہ کیا ہے اور میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا لیکن امید کرتا ہوں کہ رب دو عالم تمھاری کشائش کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالیں گے، بہر حال صلح نامہ کی تکمیل کے بعد سہیل نے ابوجندلؓ کی مشکیں وہیں خیمۂ اسلام میں صحابہ کرام کے سامنے کسیں اور نہایت بے دردی کے ساتھ باندھ کر ابوجندل کو اپنے ہمراہ لے کر وہاں سے روانہ ہوا۔ صحابہ کرام پہلے ہی سے اس معاہدے سے آزردہ خاطر تھے، اب جو ابوجندلؓ کا دردناک منظر دیکھا تو اور بھی آبدیدہ ہو گئے اور ان کے اضطراب اور بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ صحابہ کرام ابھی اسی اضطراب و بے چینی کے عالم میں تھے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اب سب لوگ اپنے اپنے جانوروں کی قربانی اسی مقام حدیبیہ میں کر ڈالو اور اپنے بالوں کا حلق کرا لو یا قصر کرا لو لیکن کوئی بھی آپؐ کے حکم کی طرف متوجہ نہ ہوا، آپؐ نے دوبارہ حکم دیا مگر اس بار بھی کوئی نہیں متوجہ ہوا، آپؐ نے تیسری بار حکم دیا مگر اس بار بھی کوئی متوجہ نہیں ہوا۔

آپؐ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ ؓ کے پاس تشریف لے گئے اور صورت حال سے انھیں آگاہ کیا، حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ آپؐ خاموشی سے جا کر اپنی قربانی کر ڈالیں اور بال منڈوا ڈالیں، آپؐ کو قربانی کرتے اور بال منڈواتے دیکھ کر ان شاء اللہ صحابہ کرام بھی تامل نہیں کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب آپؐ نے اپنی قربانی کر دی، بال منڈوا لیے اور احرام کھول دیا تو صحابہ کرام بھی دوڑ پڑے اور یکے بعد دیگرے سبھی نے اپنی اپنی قربانی کر ڈالی اور اس کے بعد کچھ لوگوں نے بال منڈوائے اور کچھ نے بال ترشوائے اور پھر اپنے اپنے احرام کھول لیے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپؐ نے جن اونٹوں کی قربانی دی ان میں ایک اونٹ وہ بھی تھا جو ابوجہل کا تھا جس کی ناک میں چاندی کی نکیل تھی، جو آپ ﷺ کو غزوۂ بدر کے مال غنیمت میں سے ملا تھا اور ابوجہل والے اس اونٹ کی قربانی آپؐ نے اسی نیت سے کی تھی کہ اس سے مشرکین کے دل پر چوٹ لگے، بہر حال قربانی وغیرہ سے فارغ ہو کر اللہ کے رسولؐ صحابہ کے ساتھ حدیبیہ سے مدینہ واپس ہو گئے۔

صلح حدیبیہ کے نتائج و فوائد

① صلح کے بعد جو پہلا فائدہ اور نتیجہ سامنے آیا وہ یہ کہ امن و امان کا دور دورہ ہو گیا، لوگ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے، لوگوں کو ایک دوسرے کے عادات و اخلاق اور افکار و خیالات کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ اسلام اور اہل اسلام کے کمالات و محاسن سامنے

آ ئے، بس پھر کیا تھا اسلام کی فطری کشش نے انھیں متاثر کیا اور ایک بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد چودہ سو تھی، لیکن دو ہی سال کے بعد فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا تو اس میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس صلح کو ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا ہے اور حالات و واقعات بھی اس صلح کو فتح مبین ہی ثابت کرتے ہیں کیونکہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق تین بڑی بڑی جنگیں کافروں اور مسلمانوں کے مابین ہوچکی تھیں مگر ان تینوں غزوات نے مل کر اسلام کی حقانیت کا اتنا ثبوت بہم نہیں پہنچایا جتنا کہ صلح حدیبیہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجا دیا اور لوگ پروانہ وار اسلام کے دامن عافیت میں پناہ لینے لگے۔

۲ دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اب مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کے مواقع حاصل ہوگئے، پہلے یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ سفر کرنا آسان کام نہیں تھا، سفر میں ہر وقت جان و مال کا خطرہ لگا رہتا تھا لیکن اب صلح کے بعد فضا پر امن ہوگئی، حالات سازگار ہوگئے تو اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں نے اسلام کے آفاقی پیغام کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آئے۔

۳ اس صلح سے فریقین کو اقتصادی اور معاشی فوائد بھی حاصل ہوئے کیونکہ صلح کے بعد سامان تجارت کے ادھر ادھر منتقل کرنے کی آسانی ہوگئی اور اب مدینہ کے بازاروں میں مکہ کے تاجر اور مکہ کے بازاروں میں مدینہ کے تاجر اپنے اپنے اسباب و سامان آزادی سے فروخت کرنے لگے جس سے یقیناً دونوں فریقوں کو بیش بہا منافع جات حاصل ہوئے۔

۴ قریش کی طرف سے اطمینان حاصل ہونے اور راستہ پر امن ہوجانے کے باعث اس صلح سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ آپ ﷺ کو اب دنیا کے دوسرے بادشاہوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کا موقع مل گیا، چنانچہ آپؐ نے شاہان عمان، شاہ روم، شاہ ایران، شاہ حبش، شاہ مصر، شاہ یمامہ اور شاہ بحرین وغیرہم کے پاس مختلف صحابہ کرام کے ذریعے تبلیغی خطوط ارسال کیے۔

جن بادشاہوں کے پاس رسول اکرمؐ کے خطوط پہنچے ان میں سے بعض محروم القسمت رہے، انھیں اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، لیکن بعض خوش قسمت رہے اور انھیں اسلام کی نعمت سے سرفراز ہونے کا موقع ملا، علاوہ ازیں جہاں کے بادشاہوں نے اسلام قبول کیا وہاں ان کی رعایا نے بھی اسلام کو سر اور آنکھوں سے لگایا اور جہاں کے بادشاہوں نے اسلام قبول نہیں کیا وہاں کی رعایا میں کم

ازکم اسلام کا چرچا تو ہوا، خطوط بھیجنے سے آپ ﷺ کا مقصد بھی یہی تھا، جن خوش بخت بادشاہوں کو رسول اللہ کے خطوط سے اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ شاہ حبش، شاہ بحرین اور شاہان عمان ہیں۔ شاہ روم اور شاہ مصر کو اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ملی لیکن ان دونوں نے آپؐ کے نامۂ مبارک کی عزت وتکریم کی بلکہ بادشاہ مصر نے آپؐ کے لیے ہدایا اور تحائف بھی ارسال کیے۔ یہ سارے فوائد ونتائج صلح نامہ کی دفعہ ۲ سے حاصل ہوئے۔

⑤ صلح نامہ کی دفعہ ایک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب مسلمان دوسرے سال عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد دو ہزار تھی۔ اہل مکہ اپنے گھروں کو قفل لگا کر بوقبیس کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔ اسی پہاڑی کے نیچے مکہ آباد تھا، اہل مکہ پہاڑی پر سے مسلمانوں کی حرکات وسکنات اور اعمال وکردار کو غور سے دیکھتے رہے، ان کی سادگی، شائستگی اور سنجیدگی کے ساتھ عبادت کرنے کے طریقے پر بھی نظر ڈالتے رہے، ان کی اعلیٰ دیانت وامانت کا بھی مظاہرہ ہوا کیونکہ پورا شہر خالی تھا مگر کسی کا ایک پائی کا بھی نقصان نہ ہوا، اعلیٰ اخلاق وکردار کی یہ ایسی مثالیں تھیں جو اہل مکہ کے دلوں پر اثر انداز ہوئیں اور اہل مکہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسلام کی طرف مائل کردیا۔

⑥ دفعہ ۳ سے یہ فائدہ ہوا کہ قبیلۂ خزاعہ اور قبیلہء بنو بکر میں مدتوں سے دشمنی چلی آرہی تھی اور باہم جنگ وجدال کا بازار گرم رہتا تھا مگر اسی صلح نامہ سے قبیلۂ خزاعہ رسول اکرم ﷺ کا حلیف ہوگیا اور قبیلہء بنو بکر قریش کا حلیف ہوگیا اور اس طرح ان دونوں قبیلوں میں بھی باہم امن وامان کے ساتھ رہنے کا عہد وپیمان ہوگیا اور دونوں کے مابین صلح قائم ہوگئی، اگرچہ یہ صلح عارضی ہی ثابت ہوئی۔

⑦ صلح نامہ کی دفعہ ۴ تو صحابہ کرام کے لیے بہت بھاری ذہنی بوجھ تھی، چنانچہ بہت سے صحابہ کرام کو اس دفعہ سے شرح صدر نہیں تھا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ جس دفعہ سے بظاہر مسلمانوں کی ذلت وتحقیر ثابت ہورہی تھی، دراصل وہی دفعہ مسلمانوں کی عزت وتوقیر میں اضافے کی موجب بنی ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابوجندلؓ جن کو مقام حدیبیہ ہی میں شرائط صلح کے مطابق کافروں کے حوالے کردیا گیا تھا ان کو جب دوبارہ مکہ میں لاکر محبوس ومقید کردیا گیا، تو جو شخص ان کی نگرانی پر مامور ہوا اس کو انھوں نے اسلام کی خوبیاں بتائیں، اسلام کا تعارف کرایا اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوکر اسلام قبول کر کے مسلمان ہوگیا۔ اہل مکہ نے اس کو بھی محبوس کردیا، اب ان کی نگرانی پر دوسرا آدمی مقرر ہوا،

اس کو ان دونوں نے مل کر سمجھایا، وہ بھی مسلمان ہوگیا، تیسرا نگران آیا وہ بھی مسلمان ہوگیا، غرض یہ کہ اس طرح سال بھر کے اندر ہی تین سو افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے سچے شیدائی بن گئے۔

قریش مکہ کے لیے یہ مسلمان ایک بڑا بوجھ بن گئے، قریش کو اپنی جس شرط پر بڑا ناز تھا کہ ہم نے اس صلح نامہ سے مسلمانوں کو دبا لیا ہے، آج وہی شرط ان کے گلے کا کانٹا بن گئی۔ قریش اب پچھتا رہے تھے کہ ناحق ہم نے یہ شرط لگائی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ قریش نے اپنے کچھ منتخب لوگوں کو اللہ کے رسولؐ کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ معاہدے کی اس شرط سے ہم دست بردار ہوتے ہیں، آپؐ نومسلموں کو اپنے پاس بلا لیجئے، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے صلح نامے کی خلاف ورزی کرنے سے انکار کر دیا۔

⑧ اسی چوتھی دفعہ کے فوائد میں یہ بھی شامل ہے کہ ابو بصیرؓ نام کے ایک نئے مسلمان مکہ سے مدینہ پہنچے۔ قریش نے آپؐ کے پاس خط لکھ کر دو آدمیوں کو اس مقصد سے بھیجا کہ آپؐ شرائط صلح کے مطابق ابو بصیرؓ کو مکہ واپس کر دیں۔ آپؐ نے ابو بصیرؓ کو بلایا اور کہا کہ دیکھو ہم نے قریش سے مصالحت کی ہے اور چند باتوں پر معاہدہ ہوا ہے، اسی میں یہ بھی ہے کہ اگر مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا تو ہمیں قریش کی طلب پر اسے واپس کرنا ہوگا چونکہ ہمیں معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرنی، اس لیے تم ان دونوں کے ساتھ واپس جاؤ، ابو بصیرؓ نے کہا، کیا آپؐ ہمیں کافروں کے پاس بھیجیں گے، وہ تو ہمارے دین کو برباد کر دیں گے، آپؐ نے فرمایا واپس جاؤ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو، وہ کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گا۔

چنانچہ ابو بصیرؓ ان دونوں آدمیوں کے ہمراہ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہو گئے، ابھی ذوالحلیفہ تک پہنچے تھے جو مدینہ سے ۲ میل کے فاصلے پر تھا، وہیں بیٹھ کر یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک ابو بصیرؓ کو ایک تدبیر سوجھی اور اس کو کر گزرے، ہوا یہ کہ ابو بصیرؓ نے ایک آدمی سے کہا کہ تمھاری تلوار بہت اچھی معلوم ہو رہی ہے، دوسرے ساتھی نے کہا ہاں بے شک یہ تلوار بہت اچھی ہے اور یہ کہتے ہوئے تلوار میان سے نکال دی، ابو بصیرؓ نے کہا کیا مجھ کو دکھا سکتے ہو، اس نے تلوار ابو بصیرؓ کے ہاتھ میں دے دی۔ اب ابو بصیرؓ نے تلوار کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پوری قوت سے تلوار کے مالک پر وار کر دیا، ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہو گیا، یہ منظر دیکھتے ہی دوسرا ساتھی وہاں سے بھاگا اور سیدھا مدینہ آ گیا اور رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ ابو بصیرؓ نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا ہے، اتنے میں پیچھے سے ابو بصیرؓ بھی وہیں پہنچ گئے، اللہ کے رسولؐ نے دیکھا تو کہا یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکا

دے گا، اگر اس کے ساتھ اور بھی آدمی ہوں، ابوبصیرؓ سمجھ گئے کہ اللہ کے رسولؐ مجھے مدینہ نہیں ٹھہرنے دیں گے اور مکہ واپس کر دیں گے۔ اس لیے خود ہی وہاں سے چلے آئے اور ساحل سمندر پر جا کر مقام عمیص میں مقیم ہو گئے، یہ جگہ ایسی تھی کہ مکہ کے تاجر تجارتی مقاصد سے جب شام کا سفر کرتے تھے تو اسی جگہ سے گزرتے تھے، ابوجندلؓ جن کا تذکرہ گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے، جب انھیں ابوبصیرؓ کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مکہ سے بھاگ کر یہیں ابوبصیرؓ کے پاس مقام عمیص میں آ گئے اور رفتہ رفتہ مکہ کے نومسلموں کی ایک بہت بڑی تعداد ابوبصیرؓ کے ساتھ آباد ہو گئی۔ اب یہ گروہ مکہ کے تجارتی قافلوں پر جو ملک شام کی طرف تجارتی سامانوں کے ساتھ آتے جاتے تھے، چھاپا مار کر ان کے مال و اسباب لوٹ لیتا تھا اور مار بھی ڈالتا تھا، ابوبصیرؓ کے گروہ نے مکہ والوں کی ناک میں دم کر دیا اور ان کا سفر کرنا دوبھر ہو گیا، بالآخر قریش نے عاجز و مجبور ہو کر اللہ کے رسولؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ معاہدے کی چوتھی شرط کو ہم منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اب اس کے بعد جو شخص مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے مکہ نہ واپس کیا جائے اور مزید یہ بھی گزارش کی کہ براہ کرم آپؐ عمیص کے مسلمانوں کو مدینہ واپس بلا لیں۔ آپؐ نے قریش کی یہ درخواست منظور فرمالی اور ابوبصیرؓ کے ساتھیوں کو مدینے واپس بلا لیا۔ جب ابوبصیرؓ کے پاس آپ کا یہ فرمان پہنچا تو وہ سخت بیمار تھے اور اسی بیماری میں ان کا انتقال بھی وہیں ہو گیا، البتہ قبل از انتقال ابوبصیرؓ نے ابوجندلؓ کو وصیت کر دی تھی کہ اب تم لوگ مدینہ واپس چلے جاؤ چنانچہ ابوجندلؓ اپنے رفقاء سمیت مدینہ چلے آئے۔

قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ جس شرط کے ذریعے قریش مسلمانوں کو دبانے کا ارادہ رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا مکر انھی پر پلٹ دیا اور اس شرط کی وجہ سے ان کی ایسی درگت بنی اور ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ از خود اس شرط سے دست بردار ہونے کی پیشکش کی، فالحمد للہ علی ذلک۔

⑨ اسلام چونکہ امن و شانتی کا دین ہے اور امن و شانتی کو وہ دنیا میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس صلح سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ خطۂ عرب میں جنگ و جدال کا ماحول ختم ہو گیا اور امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ اسلام میں اگرچہ لڑائیاں بھی لڑی گئی ہیں مگر یہ لڑائیاں لڑائیوں کے لیے نہیں بلکہ امن و امان قائم کرنے کے لیے لڑی گئی ہیں۔

⑩ ایک فائدہ اس صلح سے یہ بھی حاصل ہوا کہ حبش کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمان ابھی تک حبش میں ہی تھے، ان کو نہ اپنے خویش و اقارب سے ملنے کا موقع ملا اور نہ ان کو ابھی تک کسی غزوہ و جہاد میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ انھیں نبی اکرم ﷺ سے دوری اور جدائی کا غم بھی اٹھانا پڑ رہا تھا لیکن اس صلح کے بعد اللہ کے رسولؐ نے

انھیں مدینے بلا لیا۔ اب دیدار رسولؐ سے ان کی آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوگئیں، خویش واقارب سے بھی ملاقات ہوگئی اور غزوہ وجہاد میں شرکت کی سعادت بھی ان شاء اللہ نصیب ہوگی۔

⑪ فتح مکہ کا عظیم معرکہ بھی صلح حدیبیہ کے نتیجے میں پیش آیا، ہوا یہ کہ قریش مکہ نے شرائط صلح کی خلاف ورزی کی تو اس کی سزا دینے کے لیے اللہ کے رسولؐ نے دس ہزار اسلامی لشکر کے ساتھ اہل مکہ پر فوج کشی کی اور نتیجے کے طور پر بہت آسانی کے ساتھ مکہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور اس طرح سے وہ مکہ جہاں ابھی دو (۲) سال قبل مسلمانوں کو عمرے کی اجازت نہیں ملی تھی اور مسلمان بظاہر وہاں سے ناکام ہوکر واپس چلے گئے تھے، اس صلح کے نتیجے میں صرف دو ہی سال کے بعد مکہ کے حاکم ومختار بن گئے۔

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ اور خطبۂ حجۃ الوداع

ڈاکٹر عبید اللہ فہد، شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

مغرب میں کلیت پسندانہ روایت کو، جس کی بنیاد کلیسا اور ریاست کے اختیارات کی یکجائی پر رکھی گئی تھی، سب سے پہلے سترہویں صدی عیسوی میں پروٹسٹنٹ پارلیمان (Puritan Parliament) کے ذریعے للکارا گیا، برطانیہ کا انقلاب ذواحتشام (Glorious Revolution) بیرونی حملہ آور کے چنگل سے رہائی اور آزادی وخودمختاری کی ایک واضح علامت ہی نہیں تھا بلکہ یہ دراصل اشرافیہ اور شہنشاہ چارلس اوّل کے ظالمانہ اقتدار کے خاتمے کا اعلان بھی تھا، انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن (John Milton) (۱۶۰۸-۱۶۷۴ء) کی نظموں نے اس انقلاب میں روح پھونکی، اس کی شاعری نے برطانیہ کی اس تحریک آزادی کو جاگیرداری کے خلاف ایک مخصوص رخ عطا کیا اور طبقۂ اشراف و ملوک کی بدترین غلامی کے سلاسل توڑ دینے پر عوام کو آمادہ کیا۔ (۱)

تاہم حقوق انسانی کی مغربی تاریخ کا آغاز بہت سے مصنفین Magna Carta سے کرتے ہیں۔ مغرب میں یہ وہ اولین دستاویز باور کرائی جاتی ہے، جس میں بعض افراد کے حقوق کا اعتراف کیا گیا تھا۔ آج میگنا کارٹا کو "شہری آزادیوں کا عظیم چارٹر" تصور کیا جاتا ہے، یہ دراصل شہنشاہ جان کے اختیارات کو محدود کرنے اور اس کی انتظامی وعدالتی بے اعتدالیوں پر بندش عائد کرنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا، یہ فریقین کے درمیان ایک قسم کا قانونی وسیاسی سمجھوتا تھا، جسے مملکت کی فلاح و بہبود

① Hans Kohn. Nationalism:Its Meanins and History, Van Notrand Reinhold Co, New York, 1971.p,16.

کی خاطر ناگزیر سمجھا گیا تھا(۱)۔

لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ یہ اہم اوّلین دستاویز عوام کے حقوق کے تئیں بالکل خاموش ہے، اس میں شاہ اور اس کے امراء کے حقوق بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، ایک آدھ بار ''مردِ حُر'' کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر اس عوامی مردِ حُر کے حقوق کا تفصیلی بیان کہیں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر چارٹر کی دفعہ ۳۹ کی عبارت ہے:

''کوئی مرد آزاد گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ اسے حوالۂ زنداں کیا جائے گا، نہ اس کی آزادی سلب کی جائے گی، نہ اسے جلاوطن کیا جائے گا، نہ شہر بدر کیا جائے گا، نہ کسی بہانے سے اسے تنگ کیا جائے گا اور ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے، نہ اسے کسی سزا کا مستوجب سمجھیں گے جب تک کہ اس کے امراء کسی قانونی یا جائز انصاف کا تقاضا نہ کریں اور ملک کا آئین اس کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت نہ دے(۲)۔

اس چارٹر کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے تنفیذ اور عمل درآمد کی کوئی تاریخ نہیں ہے، یہاں تک کہ بادشاہ جان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے خود اس چارٹر کی دفعات کی دھجیاں اڑائیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغرب میں بنیادی انسانی حقوق کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی اس چارٹر کا تذکرہ ضرور ہوگا کیونکہ پہلی بار اس نے حکومتی اختیارات پر بندش لگانے کا نظریہ پیش کیا۔

بنیادی حقوق کی تاریخ میں دوسرا اہم کارنامہ برطانوی مسودۂ حقوق (British Bill of Rights) کی تیاری ہے، برطانوی بادشاہوں اور پارلیمان کے درمیان ایک طویل سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں مسودۂ حقوق کی منظوری دراصل بادشاہت کے آمرانہ اختیارات پر پارلیمان کی فتح اور برتری کا اعلان تھی، ۲۳ر دسمبر ۱۶۸۸ء کو شہنشاہ جیمس دوم (James II) کا برطانیہ سے فرار اور فرانس میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش اور اس کے بعد ۲۲ر جون ۱۶۸۹ء کو لندن میں پارلیمنٹ کے ذریعہ مسودۂ حقوق کی منظوری کی تاریخ عوامی حقوق کے اعتراف وتحفظ کی تاریخ ہے(۳)۔

اس مسودے نے شہنشاہ جیمس دوم کی کلیت پسندانہ حکومت کی مذمت کی، مسودے کے پہلے حصے

1 W.Y. Elliott and N.A. Mc Donald, Western Political Heritage, Prentics Hall Inc. New York, 1949, P.347.

2 Z. Chafee. Documents on Fundamental Human Rights: The Anglo-American Tradition, Atheneum, New York, 1963, Vol. 1, P.251.

(۳) چافی، ڈاکومینٹس آن فنڈامینٹل ہیومن رائٹس، حوالہ بالا، ص ۲۶۷-۲۶۸۔

میں بادشاہ کے استحصال اور حکومتی اختیارات کے غلط استعمال پر سخت تنقید کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں پارلیمان کو مقتدر اعلیٰ تصور کیا گیا ہے اور اس کی طویل سیاسی کشمکش کی تعریف کی گئی ہے اور اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ پارلیمان کی منظوری کے بغیر قوانین کی تنسیخ یا ان کی تنفیذ غیر قانونی ہے(۱)۔

بادشاہ جیمس دوم کے خلاف پارلیمان کی یہ فتح انگلستان کی سیاسی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے، یہ جمہوری وعوامی طرز حکومت کی اوّلین بنیاد ہے۔ اس کے بعد ہی پارلیمانی برتری کا تصور اُجاگر ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ حقوق انسانی کی محافظ قرار دی گئی۔

برطانوی پارلیمان میں مساوی نمائندگی کے لیے سالوں تک جدوجہد کرنے کے بعد امریکی عوام نے بالآخر برطانوی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور ۲؍ جولائی ۱۷۷۶ء کو امریکیوں کی آزادی کا پروانہ تیار ہوگیا اور دو دنوں کے بعد ۴؍ جولائی ۱۷۷۶ء کو یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

ا) تمام انسان یکساں اور مساوی پیدا کیے گئے ہیں۔
ب) انھیں خدا کی طرف سے متعدد حقوق پیدائشی طور پر ودیعت ہوئے ہیں، حیات، حریت اور خوشی و مسرت کے حقوق ان سے سلب نہیں کیے جاسکتے۔
ج) حکومت انھی حقوق کے تحفظ کے لیے قائم ہوتی ہے اور وہ اپنے اختیارات عوام کی مرضی و منظوری سے ہی حاصل کرتی ہے۔
د) جب حکومت ان حقوق کی پامالی پر اتر آتی ہے تو عوام کو چاہیے کہ اس کا خاتمہ کر دیں یا اس کو تبدیل کر دیں(۲)۔

ان بنیادی نکات کے بعد اس اعلامیے نے شہنشاہ انگلینڈ جارج سوم کے ظالمانہ نظام حکومت اور استحصال و جبر کی پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اعلامیہ کہتا ہے:

”موجودہ شاہ برطانیہ کی تاریخ مسلسل جراحتوں اور ناجائز قبضوں اور مداخلتوں کی تاریخ ہے۔ ان سارے اقدامات کا مقصد تمام ریاستوں پر مطلق العنان ظلم و استحصال کے قیام کے سوا کچھ نہیں(۳)۔“

---

(۱) جانی، ڈاکومینٹس ہیومن رائٹس، حوالہ بالا ص ۱۷۰۔
(۲) ایلیٹ اور میکڈونلڈ، ویسٹرن پولیٹیکل ہیری ٹیج، حوالہ بالا ص ۶۰۰۔
(۳) ایلیٹ اور میکڈونلڈ، ویسٹرن پولیٹیکل ہیری ٹیج، حوالہ بالا ص ۶۰۰۔

اعلامیہ کا اختتام مندرجہ ذیل عبارت پر ہوتا ہے:

''ان تمام مظالم کے ہر مرحلہ میں ہم نے انتہائی عاجزی و انکساری سے اشک شوئی کی درخواست پیش کی۔ ہماری مسلسل رحم آمیز التجاؤں کا جواب بہ تکرار جراحتوں سے دیا گیا، ایک شہزادہ، جس کا ہر عمل ظلم و آمریت کی طرف پیش رفت کرتا ہو، مردانِ حُر پر حکومت کرنے کا اہل نہیں ہے(۱)۔''

اعلامیہ کی عبارتوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امریکی عوام کے ساتھ کس درجہ ناروا اور ظالمانہ سلوک کیا گیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ایسے مطلق العنان اور بے نکیل آمر کے خلاف اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے وہ کمر بستہ ہوئے۔ آزادی وحریت کے اس اعلامیہ نے برطانوی شہنشاہیت کی مذمت بھی کی اور عوامی حقوق کی حمایت بھی۔

ریاست ہائے متحدہ کا دستور ۱۷ رستمبر ۱۷۸۷ء کو تیار اور نافذ ہوا۔ اصل دستور میں مسودۂ حقوق (Bill of Rights) شامل نہیں تھا۔ یہ اضافہ بعد میں ہوا اور اوّلین ترمیمی بل کے نام سے معروف ہوا۔ تاہم اصل دستور میں حقوق انسانی سے متعلق کچھ دوسرے نکات شامل تھے، جن سے تحدید اختیارات (Limitation of Powers) کے کچھ نشانات ملتے ہیں۔ دستور میں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے اختیارات الگ کردیئے گئے، تاہم یہ تقسیم کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ یہ پتہ چلانا دشوار ہوگیا کہ ان تینوں شعبوں میں اعلیٰ اور برتر شعبہ کون سا ہے، صدر کو انتظامیہ کا سربراہ متعین کیا گیا مگر تمام اہم معاملات میں ایوان بالا (Senate) سے مشورہ لینا، اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا، حکومت کے تینوں شعبوں میں اختیارات کی تقسیم اور تحدید کا مقصد دراصل حقوق انسانی کا تحفظ اور حکومت کو طاقت کے غلط استعمال سے روکنا تھا۔

تحدید اختیارات کی تنفیذ کے باوجود جب قانون یا دستور کا مسودہ تیار ہوا تو تمام ریاستوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیونکہ اس تحدید وتقسیم پر عوام مطمئن نہ تھے اور اسے اپنی آزادی و حریت کے تحفظ کے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل عوام جب حقوق کی بات کرتے ہیں تو چافی کے بقول ''آزادی وحریت کی برکتوں'' پر ان کی نگاہ ہوتی ہے(۲)۔ اور اس طرح کی نعمتیں دستور میں موجود نہ تھیں اس لیے پہلے ترمیمی بل کے نام سے مسودۂ حقوق کا اس میں اضافہ کیا گیا۔

(۱) ایلیٹ اور میکڈونلڈ، ویسٹرن پولیٹیکل ہیری ٹیج، حوالہ بالا ص ۲۰۲۔
(۲) چافی، ڈاکومینٹس آن فنڈامینٹل ہیومن رائٹس، حوالہ بالا، ص ۱-۳

مسودۂ حقوق میں دس دفعات شامل ہیں۔ یہ مسودہ مذہبی آزادی، اظہار رائے اور تقریر کی آزادی اور پریس و اجتماع کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ قانون کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر کسی شہری کو حیات، حریت اور جائیداد کے حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں کالے امریکیوں کے مطالبہ پر دفعہ ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کا اضافہ کیا گیا اور غلامی ممنوع قرار پائی اور بلیک امریکیوں کو بھی حق رائے دہندگی عطا کیا گیا، نیز عوامی مقامات پر امتیاز اور تفوق کا خاتمہ ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں انیسویں ترمیم کے ذریعے حق رائے دہندگی کو عام کیا گیا اور خواتین کو بھی ووٹ کے حق سے نوازا گیا(۱)۔

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ میں فرانس کی جدوجہد اور اس کے مفکرین کی نظریہ سازی کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۴/۵۔ اگست ۱۷۸۹ء کی درمیانی شب کو فرانس کی نیشنل اسمبلی نے جاگیرداری کے خاتمے کا اعلان کیا(۲)۔ اس نے شہریوں کے فطری حقوق کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ بنیادی حقوق کا مسودہ تیار کر سکے۔ یہ مسودہ ۲۶/ اگست ۱۷۸۹ء کو آخری اور قطعی شکل پا کر نئے دستور کے تمہیدی حصے (Preamble) میں شامل ہوا(۳)۔

اس فرانسیسی مسودے میں بنیادی حقوق سے متعلق سترہ (۱۷) دفعات ہیں۔ پہلی اور دوسری دفعات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہر فرد آزاد اور مساوی الحقوق پیدا ہوا ہے۔ سماجی امتیازات معروف اور بھلائی ہی کی بنیاد پر قائم ہوسکتے ہیں۔ آزادی، جائیداد، تحفظ اور ظلم کا دفاع فطری حقوق میں شامل ہیں جو ہر فرد کو ملنے چاہئیں۔

دفعہ تین کے مطابق اقتدار اعلیٰ پوری قوم کا ورثہ ہے اور قوم کی براہ راست یا اس کے نمائندوں کے ذریعے معلوم ہونے والی مرضی اور رائے سے ہی حاکمیت کا استعمال جائز ہے۔ اس مسودے نے مذہبی عبادت اور تحریر و تقریر کی آزادی کی ضمانت بھی دی، جبری مزدوری کو ممنوع قرار دیا، تمام شہریوں کو قانون کی نگاہ میں برابر قرار دیا اور یہ کہ قانون کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر کسی شخص کو حراست میں لیا جاسکتا ہے نہ جیل میں ڈالا جاسکتا ہے، نہ اسے ہراساں کیا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ جائیداد ہر شخص کا

(۱) دستور ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ترمیم ۱۳، ۱۴، ۱۵، اور ۱۹۔

2) James H. Robinson, ed.Translations and Reprints from the Original Sources of European History, University of Pen nsylvania Press, Philadelphia, 1900, P.2.

3) Crane Briuton, Declaration of the Rights of Man and the Citizen, Encyclopedia of the Social Sciences, Mecmillan Co. New York, 1932, Vol.5 P.99.

فطری حق ہے اور کسی شخص کو اس وقت تک اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ عوامی ضروریات جائز طور پر اس کا تقاضا نہ کریں[۱]۔ بنیادی حقوق کا یہ فرانسیسی اعلامیہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت اور اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے مغربی اقوام کو ہی نہیں بلکہ بہت سی ایشیائی اور افریقی مملکتوں کو بھی مہمیز کیا۔ متعدد ممالک نے فرانس کی تقلید کی اور اپنے دساتیر میں اس اعلامیے کو مناسب جگہ دی۔

حقوق انسانی کی مغربی تاریخ میں اقوام متحدہ کا چارٹر زریں حروف سے لکھا جاتا ہے کہ پہلی بار اتنے جامع انداز میں مغربی اقوام نے انسانی حقوق کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اقوام متحدہ نے بنیادی انسانی حقوق کی سفارشات اور تجاویز کو طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں امریکہ کی نمائندگی ایلی نار روز ویلٹ (Eleanor Roosevelt) کررہی تھیں۔ انھوں نے تمام انسانی حقوق کا تفصیلی مطالعہ کر کے جون ۱۹۴۸ء میں ایک ڈرافٹ تیار کیا، جو کمیٹی کے تمام اراکین نے سوائے سوویٹ بلاک کے من وعن تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو یہ ڈرافٹ منظور ہوگیا۔

اقوام متحدہ کا یہ اعلامیہ ایک تمہید اور تیس (۳۰) دفعات پر مشتمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی دستور کے مسودۂ حقوق کا یہ ایک جامع اور تفصیلی مطالعہ ہے۔ پریس، تحریر وتقریر اور تنظیم و اجتماع کی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے یہ اعلامیہ حیات، حریت اور جائیداد کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کے مطابق تمام شہری ذات پات، مذہب ودین اور رنگ ونسل کی تفریق کے بغیر قانون کی نگاہ میں مساوی ہیں۔ اقوام متحدہ کا یہ چارٹر یکساں اور مساوی حقوق کا علمبردار ہے تاکہ پوری دنیا کے عوام آزادی سے جی سکیں اور انھیں ظلم واستحصال کا کوئی خوف نہ رہے، یہ تو کاغذی دستاویزات کی تفصیلات ہیں، جہاں تک ان کی تنفیذ اور عمل درآمد کا تعلق ہے تو اقوام متحدہ کا یہ چارٹر ''مقدس خواہشات'' (Pious Wishes) سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ ان کے پیچھے کوئی سند اور کوئی قوت نافذ نہیں ہے، پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس بین الاقوامی منشور کے عین سائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہورہا ہے اور خود مہذب ترین اور سرکردہ ممالک میں ہورہا ہے جو اسے منظور کرنے والے تھے[۲]۔

اس تفصیلی تجزیے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں بنیادی حقوق کا تصور دو تین صدیوں سے

(۱) جیمس ایچ رابنسن، حوالہ بالا، ص ۶-۸۔

(۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۵۵۴۔

پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا اور اگر آج ان حقوق کا خوشنما تذکرہ ہو رہا ہے تو اپنے پیچھے کسی قوت نافذہ اور ہیئت حاکمہ کا وجود نہیں رکھتا، اس کے مقابلے میں قرآن نے حقوق انسانی کا جو منشور دیا اور جس کا خلاصہ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے مبارک موقع پر نشر فرمایا، وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کے لیے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی، پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان حقوق کو عملاً نافذ کرنے کے لیے سیرت رسول اللہ ﷺ کی بے مثل نظیریں موجود ہیں، اللہ کے رسول فداہ ابی وامی ﷺ نے میدان عرفہ میں ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو حمد وثنا کے بعد فرمایا:

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں، خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔
لوگو! میری بات سنو! میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں یکجا ہو سکیں گے!

لوگو! اللہ کا ارشاد ہے کہ ''انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ تم باہم پہچانے جاسکو۔ تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے، اب نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر، نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے، ہاں بزرگی اور فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

انسان سارے ہی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے، خون ومال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جاچکے ہیں۔ بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علیٰ حالہ باقی رہیں گی۔

پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمھاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامان آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمھارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمھاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر ومباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمھارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں، ہمیشہ کے لیے ان چیزوں کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی تمھارے اس دن کی اور اس ماہ مبارک کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پرس

کرے گا۔

دیکھو! کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں کشت وخون کرنے لگو۔ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ صاحب امانت تک اسے پہنچا دے۔

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو۔ انھیں وہی کھلاؤ، جو خود کھاتے ہو۔ ایسا ہی پہناؤ، جیسا تم خود پہنتے ہو۔

دورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں سے روند دیا۔ زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں، میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، میں اُسے معاف کرتا ہوں، دورِ جاہلیت کا سود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سود، جسے میں چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے، اب یہ ختم ہو گیا۔

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا ہے۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔ بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا، جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو، اس کی سزا سنگساری ہے، حساب وکتاب خدا کے ہاں ہوگا۔ جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت ہے۔

قرض قابل ادا ہے، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کی جانی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے۔ اپنے نفس پر اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال بغیر اس کی اجازت کے کسی کو دے۔

دیکھو! تمھارے اوپر تمھاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں، اس طرح ان پر تمھارے حقوق واجب ہیں، عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی خیانت نہ کریں نہ کوئی کام کھلی بے حیائی کا کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انھیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آ جائیں تو انھیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔

عورتوں سے بہتر سلوک کرو کیونکہ وہ تو تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ان کے بارے میں خدا کا پاس ولحاظ رکھو کہ تم نے انھیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ

تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو، میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔
میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہوگے اگر اس پر قائم رہے اور وہ خدا کی کتاب ہے اور ہاں دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انھی باتوں کے سبب ہلاک کر دیئے گئے۔
شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنھیں تم کم اہمیت دیتے ہو، اس کی بات مان لی جائے اور وہ اسی پر راضی ہے، اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔
لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، مہینے بھر کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی سے دیتے رہو، اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہل امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔
سن لو! مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا، نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔
دیکھو! جو لوگ یہاں موجود ہیں انھیں چاہیے کہ یہ احکام اور باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔
اور لوگو! تم سے میرے بارے میں خدا کے ہاں سوال کیا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟
لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ ﷺ نے امانت پہنچا دی اور آپؐ نے حق رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔
یہ سن کر حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا(۱)۔
۱۰ھ کا یہ حجۃ الوداعی چارٹر اس بات کا اعلان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے انسانی حقوق کی کامل ضمانت اس وقت دے دی تھی، جب کہ دنیا اس تصور سے یکسر نا آشنا تھی اور یہ دراصل الہامی ہدایت کا اعجاز ہے کہ وہ زندگی کی ان بنیادوں کو واضح کرتی ہے، جن تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں ہے، حجۃ الوداع کا یہ خطبہ درج ذیل بنیادی حقوق کا اعلان کرتا ہے:
① حرمت جان یا جینے کا حق (۲)۔

(۱) ابو محمد عبدالملک بن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید الجزء الرابع، دار الفکر، ص ۲۷۵-۲۷۷
(۲) المائدہ: ۳۲

② معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ۔

③ تحفظ ناموس خواتین۔

④ معاشی تحفظ [۱]۔

⑤ عدل وانصاف [۲]۔

⑥ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون [۳]۔

⑦ مساوات کا حق [۴]۔

⑧ معصیت سے اجتناب کا حق۔

⑨ ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق [۵]۔

⑩ سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق [۶]۔

⑪ آزادی کا تحفظ۔

⑫ تحفظ ملکیت [۷]۔

⑬ عزت کا تحفظ [۸]۔

⑭ نجی زندگی کا تحفظ [۹]۔

⑮ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق [۱۰]۔

⑯ آزادی اظہار رائے [۱۱]۔

⑰ ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق [۱۲]۔

⑱ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق [۱۳]۔

⑲ آزادئ اجتماع کا حق [۱۴]۔

⑳ عمل غیر کی ذمہ داری سے برأت [۱۵]۔

㉑ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی [۱۶]۔

---

(۱) ذاریات:۱۹، ودھر:۸ (۲) مائدہ: ۸

(۳) مائدہ: ۲ (۴) حجرات:۱۳

(۵) شعراء:۱۵۱، وکہف:۲۸، ونحل:۲۶، وھود:۵۹

(۶) نور:۵۵، شوریٰ:۳۸ (۷) بقرہ:۱۸۸ (۸) حجرات:۱۱-۱۲

(۹) نور:۲۷، حجرات: ۱۲ (۱۰) نساء:۱۴۸ (۱۱) آل عمران:۱۱۰

(۱۲) بقرہ:۲۵۶ (۱۳) انعام:۱۰۸ (۱۴) آل عمران:۱۰۴

(۱۵) انعام: ۱۶۴ (۱۶) حجرات:۶، ۱۲

ان اکیس (۲۱) بنیادی حقوق پر مولانا مودودی نے سیر حاصل بحث کی ہے، تفصیل کے لیے مولانا کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (اسلامی ریاست، حوالۂ بالا ص ۵۵۴-۵۷۱)

خطبۂ حجۃ الوداع کے ان اکیس (۲۱) بنیادی حقوق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ سیرت نبویؐ کی تعلیمات میں حقوق انسانی کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے۔ اس کے مقابلے میں (Declaration of Human Rights) کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اتنی صراحت و وضاحت نہیں ہے جو یہاں جلوہ گر ہے، پھر دوسری بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے بس ایک بلند معیار پیش کر دیا ہے، کوئی قوم اس پر عمل درآمد کی پابند نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ایسا مؤثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری دنیا سے منوا سکے، لیکن حجۃ الوداع کے یہ نکات واجب الاتباع ہیں، ہر مسلمان فرد اور ریاست اس ہدایت کی پوری طرح پابند ہے، جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی، اسے بغیر کسی معاہدے یا سمجھوتے کے یہ حقوق لازماً دینے ہوں گے اور اس میں اپنوں اور پرایوں، دوستوں اور دشمنوں کی کوئی تفریق نہ ہوگی، اس لیے تو قرآن نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(المائدہ:۵/۳)

اور علامہ اقبال رحمہ اللہ کو یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ:

بمصطفیٰ برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

❁......❁......❁

معجزات خاتم الانبیاء ﷺ اور کرامات اولیاء رحمہم اللہ
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحریروں کی روشنی میں

مولانا عبدالوہاب حجازی، استاد: جامعہ سلفیہ، بنارس

اساسی طور پر صفات کمال تین ہیں:

① علم ② قدرت ③ غنٰی۔

یہ صفات علی وجہ الکمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، اس لیے کہ وہی ہے جسے ہر چیز کا علم محیط ہے، وہی ہے جو ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اور وہی ہے جو تمام کائنات سے مستغنی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ ان تینوں باتوں کے دعویٰ سے برأت کا اعلان کر دیں:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ﴾(الانعام:٦/٥٠)

”(اے نبیؐ) کہو! میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں، نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں صرف اسی کی اتباع کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔“

یہ اعلان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کرایا گیا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے علم غیب اور قدرت وتاثیر کا مطالبہ کرتے رہتے تھے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾

”اور یہ لوگ کہتے ہیں: یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ بتاؤ اگر سچے ہو! کہو! اے نبیؐ! اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔“(الملك:٦٧/٢٥-٢٦)

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾(الاسراء:١٧/٩٠-٩٣)

”یہ لوگ کہتے ہیں ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے، جب تک تم زمین سے ہمارے لیے چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں اور تم ان کے درمیان خوب نہریں جاری کر دو یا جیسا تمھارا خیال ہے، آسمان کو ہم پر ٹکڑے کر کے گرا دے، یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لا دکھاؤ...... کہو! اے نبیؐ! میرا رب پاک ہے میں تو صرف انسان رسول ہوں۔“

یہ تینوں اوصاف رسول اللہ ﷺ کو اتنے ہی حاصل ہوئے جتنا اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ علم، قدرت اور غنی کے اوصاف کمال میں سے عادت عامہ یا اکثر لوگوں کی عادت کے برخلاف جتنا علم، قدرت و تاثیر اور غنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کیا وہی عرف عام میں معجزہ کہلاتا ہے جسے ائمہ متقدمین آیات کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور اسے ہر خارق عادت چیز کے لیے عام مانتے تھے، اگرچہ اکثر متاخرین لفظ معجزہ نبی کے لیے اور کرامت ولی کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن امر خارق عادت دونوں میں مشترک ہے۔

خارق عادت علم جو اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا وہ ایسا تھا کہ کبھی آپ ﷺ وہ کچھ سنتے تھے جسے دوسرا نہیں سنتا، وہ کچھ دیکھتے تھے، جسے دوسرا نہیں دیکھتا، یہ بیداری اور خواب دونوں میں ہوتا تھا، وحی والہام کے ذریعے کبھی آپ ﷺ وہ باتیں جانتے تھے جنھیں دوسرا نہیں جانتا تھا، یا آپ ﷺ کو فراست صادقہ عطا کی جاتی اور خارق عادت قدرت و تاثیر جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا کی وہ ہمت، صدق اور دعاء مستجاب تھی، کبھی رسول اللہ ﷺ کی قدرت و تاثیر کے بغیر صرف اللہ کے فعل سے اس قدرت و تاثیر کا ظہور ہوتا تھا، یعنی اس میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، جیسے آپ ﷺ کے دشمن کو ہلاک کر دینا جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

«من عادى لي وليا فقد بارزني بالمحاربة وإني لأثأر لأوليائي كما يثأر الليث الحرب»

''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی، اس نے مجھے دعوت جنگ دی، میں اپنے اولیاء کے حق میں ایسے ہی انتقام لیتا ہوں جیسے جنگجو شیر انتقام لیتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو معجزات اور خوارق عادات کے تمام اقسام عطا فرمائے تھے۔

خارق عادت علم، اخبار غیب، سماع اور رویت کے سیکڑوں واقعات کتب سیرت وتفسیر وحدیث اور مغازی میں صحیح سندوں کے ساتھ مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کی خبر دی، اسراء ومعراج کے موقع پر ان سے گفتگو کی اور ان کے ساتھ نماز ادا کی، ان کے اولیاء اور دیگر افراد کے احوال اس طرح بتائے جو اہل کتاب کے متوارث علم کے مطابق تھے، حالانکہ آپ ﷺ نے ان سے کبھی نہ سیکھا نہ معلوم کیا، اسی طرح آپؐ نے ربوبیت، ملائکہ، جنت اور جہنم کے احوال کی خبر دی جو انبیاء سابقین کے بالکل مطابق ہے اور ایسی باتوں کی خبر دی جنھیں صرف ان کے خواص علماء ہی جانتے تھے، ماضی اور حال کی طرح مستقبل کے امور کی بھی آپ ﷺ نے خبر دی جیسے فارس اور روم کی مملکت ختم ہو جائے گی اور امت مسلمہ کی حکومت قائم ہوگی، ترکوں سے جنگ کی خبر، فتح یمن اور فتح شام کی خبر، بحر روم کی جنگ کی خبر، فتح قسطنطنیہ کی بشارت وغیرہ۔

خارق عادت قدرت وتاثیر جو آپ ﷺ کو اللہ نے عطا کی تو اس میں سے کچھ کا تعلق عالم علوی سے ہے جیسے شق قمر، حضرت علیؓ کے لیے آفتاب کا لوٹانا بشرط صحت ''روایت''، آسمانوں کی طرف معراج کا عظیم واقعہ، بعض واقعات فضا سے متعلق ہیں جیسے مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اسراء کا عظیم واقعہ، آپ ﷺ کے ظہور کے وقت کثرت سے ستارے ٹوٹنا اور بارہا استسقاء اور بارش کے واقعات، بعض خوارق زمین اور پانی سے متعلق ہیں۔ جیسے آپ ﷺ کے نیچے پہاڑ کا لرزے میں آجانا، تبوک اور حدیبیہ کے چشموں میں پانی کا زیادہ ہو جانا، اور بار بار آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں کے درمیان سے پانی اُبلنا، بعض خوارق مرکب اشیاء سے متعلق ہیں جیسے غزوۂ خندق وغیرہ کے موقع پر بارہا کھانے میں اضافہ ہونا، کھجور کے درخت کا اپنی جگہ سے اکھڑنا پھر وہیں لوٹ جانا، محمد بن مسلمہ کے ٹوٹے پاؤں کو مس کر کے بالکل صحیح وسالم کر دینا، آپ ﷺ کی ہتھیلی پر کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، کھجور کے تنے کا آپ ﷺ کی جدائی میں رونا اور آپ ﷺ کی تسلی سے اس کا چپ ہو جانا، ابوقتادہؓ کی پھوٹی ہوئی آنکھ کو پہلے سے بہتر حالت میں کر دینا، اس طرح کے ہزاروں خوارق عادات صحیح اسناد سے ثابت ہیں، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو علم اور قدرت وتاثیر سے متعلق جو خوارق اور معجزات عطا فرمائے وہ دین اور رسالت کی حجت قائم کرنے اور جماعت مسلمین کی حاجات وضروریات کی تکمیل کے لیے تھے۔

اسی طرح اللہ کے وہ متقی اولیاء جو رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہیں، آپؐ کے احکام بجالاتے اور منہیات سے باز رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعے ان کی تائید کرتا ہے، ان کے دلوں میں اپنے انوار ڈالتا ہے، ان متقی اور مومن اولیاء کو اللہ تعالیٰ ایسی کرامات عطا کرتا ہے جن کے ذریعے وہ ان کا اکرام کرتا ہے، معجزات نبی ﷺ کی طرح ان اولیاء اللہ کی یہ کرامات بھی دین کے لیے حجت اور مسلمانوں کی حاجات کی تکمیل کے لیے ہوتی ہیں، اولیاء اللہ کو یہ کرامات محمد رسول ﷺ کی اتباع کی برکت سے حاصل ہوتی ہیں، اس لیے حقیقتاً بقول شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہ کرامات رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں داخل ہیں، چنانچہ اصحاب کرام، تابعین عظام اور صالحین و متقین امت کی کرامات بارش کے قطرات کی طرح بے شمار ہیں۔

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سورۂ کہف کی تلاوت کر رہے تھے تو فرشتے چتر کے سایہ میں نازل ہوئے، عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو فرشتے سلام کرتے تھے، سلمان اور ابوذر رضی اللہ عنہما ایک ساتھ کھا رہے تھے تو برتن یا کھانے نے تسبیح پڑھی، عباد بن بشر اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما شب تاریک میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکلے تو ان کے ساتھ نور نکلا، پھر دونوں جب جدا ہوئے تو روشنی بھی بٹ گئی، صحیحین میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، تین مہمانوں کے ساتھ گھر گئے، کھانا کھانے لگے تو جو لقمہ اٹھاتے اس کے نیچے سے کھانا بڑھ جاتا، سب آسودہ ہو گئے، رسول اللہ ﷺ کے پاس بچا ہوا کھانا بھیجا گیا اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سب نے آسودہ ہو کر کھایا، خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ مشرکین کی قید میں تھے اور ان کے پاس انگور آتے تھے، جب کہ مکہ میں انگور نہیں تھے، عامر بن فہیرہ شہید کیے گئے تو فرشتے ان کو آسمان پر اٹھا لے گئے، عامر بن طفیل اور بہت سے صحابہ نے رفع کا یہ واقعہ و منظر دیکھا، سفینہ رضی اللہ عنہ مولی رسول اللہ ﷺ نے شیر کو بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قاصد ہیں تو شیر ان کے ساتھ چلا اور انھیں منزل تک پہنچا دیا، براء ابن مالک رضی اللہ عنہ اللہ پر جب کوئی قسم رکھ دیتے تھے تو اللہ اسے ضرور پورا کرتا تھا، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زہر کی تھیلی پھانک لی اور اس نے کچھ نقصان نہ پہنچایا، حسن بصری کو حجاج نے تلاش کرایا، وہ اللہ سے دعا کر کے چھپ گئے تھے، چھ بار لوگ ان کے پاس آئے لیکن نہ دیکھ سکے، ایک خارجی کو جو انھیں اذیت دیتا تھا بددعا کر دی تو وہ مر گیا، ابراہیم تیمی ایک اور دو مہینہ تک کچھ نہ کھاتے تھے وغیرہ۔

اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان میں فرق

① خاتم الانبیاء، امام المتقین، سید ولد آدم، امام الانبیاء، صاحب مقام محمود، صاحب لواء الحمد،

صاحب حوض کوثر، شفیع الخلائق، صاحب الوسیلہ والفضیلہ جنھیں اللہ نے سب سے افضل کتاب قرآن عطا کی اور اپنے دین کی سب سے افضل شریعت عطا کی اور آپ ﷺ کی امت کو سب سے افضل امت بنایا، آپ ﷺ کی شریعت اور کتاب تمام شرائع اور کتب آسمانی کی جامع ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسانی کے لیے آپ ﷺ کو رسول بنایا ہے اور آپ ﷺ کی اتباع کو لازم ٹھہرایا ہے، آپ ﷺ پر ایمان تمام کتب سماویہ و رسل پر ایمان کو شامل ہے، کفر و نفاق کی اصل رسولوں اور ان کی شریعتوں سے انکار ہے، اس لیے اولیاء اللہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں اور آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کی اتباع کریں، فرائض شریعت ادا کریں، محارم سے اجتناب کریں، قرآن کی تلاوت اور ذکر الٰہی سے شغل رکھیں اور شرک اور غیر اللہ کی استعانت سے بچیں، ایسے لوگ اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(آل عمران:۳/۳۱)

''کہو! اے نبیؐ! اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔''

یہود، نصاریٰ، مشرکین اور کفار میں سے بہت سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ ہیں لیکن چونکہ وہ خاتم النبیین کی اتباع نہیں کرتے اس لیے اولیاء اللہ نہیں ہو سکتے، ایسے لوگ زہد و عبادت میں بڑے ہونے کے باوجود اولیاء اللہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ خاتم الانبیاء والرسلؐ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی اتباع اللہ نے لازم کر دی ہے۔

④ ایمان، تقویٰ اور اتباع میں تفاوت درجات کے سبب درجۂ ولایت میں فرق ہوتا ہے، اولیاء اللہ میں سب سے افضل انبیاء ہوتے ہیں، انبیاء میں سب سے افضل رسول ہوتے ہیں، رسولوں میں سب سے افضل اولوالعزم رسول ہوتے ہیں، جیسے نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور اولوالعزم رسولوں میں سب سے افضل حضرت محمد ﷺ ہیں، آپ ﷺ کی امت افضل الامم ہے اور آپ ﷺ کی امت میں سب سے افضل قرن اول ہے۔

«خير القرون القرنی الذی بعثت فيه ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم»

''سب سے بہتر عہد وہ عہد ہے جس میں میں مبعوث کیا گیا پھر ان کا عہد جو اس عہد والوں سے قریب ہیں پھر ان کا عہد جو اس عہد والوں میں قریب ہیں۔''

اور مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾(الحدید:۵۷/۱۰)

''تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کیا ہے اور جہاد کیا ہے وہ برابر نہیں ہو سکتے، وہ درجے میں ان لوگوں سے بہت بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا ہے اور جہاد کیا ہے اور اللہ نے سب سے اچھا وعدہ کیا ہے۔''

سابقین اوّلین میں سب سے افضل خلفاء اربعہ ہیں اور خلفاء اربعہ میں سب سے افضل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور ان دونوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

«ما طلعت الشمس ولا غربت على أحد بعد النبيين والمرسلين أفضل من أبي بكر»

''نبیوں اور رسولوں کے بعد لیل و نہار کی آمد و رفت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل کسی شخص پر نہیں ہوئی۔''

صحابہ کرام کے بعد آنے والے صحابہ سے افضل نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ افضل اولیاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے زیادہ جاننے والے اور اس کی زیادہ اتباع کرنے والے ہوتے ہیں اور صحابہ کرام کا مقام اس میں سب سے بلند ہے، اسی لیے امت محمدیہ میں سب سے افضل ولی اللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور اس پر عمل میں وہ سب سے کامل تھے۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خود تین قسموں میں تقسیم فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾(الفاطر:۳۵/۳۲)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے تو ان میں کچھ اپنے حق میں ظالم ہوں گے اور کچھ میانہ رو اور کچھ اللہ کے حکم سے نیکیوں میں آگے بڑھنے والے ہوں گے، یہی بڑا فضل ہے۔''

انبیاء کرام میں بھی اس تقسیم کی نظیر ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عبد رسول اور نبی ملک کی دو قسموں میں تقسیم فرمایا: اور خاتم الانبیاء کو اختیار دیا تھا کہ ان دونوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد رسول کا منصب اختیار فرمایا:

«إني والله لا أعطي أحدا ولا أمنع أحدا، إنما أنا قاسم أصنع حيث أمرت»

''میں واللہ نہ کسی کو دیتا ہوں اور نہ کسی کو منع کرتا ہوں، میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، جہاں

مجھے حکم دیا گیا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اموال شرعیہ کو اللہ اور رسولؐ کی طرف منسوب کیا ہے:

﴿قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾(الأنفال:۸/۱)

"کہو۔اے نبیؐ! غنیمت کے مال اللہ اور رسولؐ کے لیے ہیں۔"

لیکن نبی ملک جیسے داؤد وسلیمان علیہما السلام واجبات ومحارم کی پابندی کے ساتھ ولایت اور مال میں بلا گناہ کے اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں۔

③ اولیاء اللہ انبیاء کرام کی طرح معصوم نہیں ہوتے بلکہ ان سے خطا اور غلطی سرزد ہوتی ہے، یہ عین ممکن ہے کہ شریعت کے کچھ امور ان پر مخفی رہ جائیں، اس امر میں لوگ تین طریقوں کے پابند ہیں:

① کچھ لوگ ولی کی ہر بات کی اتباع کرتے ہیں اس اعتقاد پر کہ ان کا دل اللہ سے کلام کرتا ہے۔

② کچھ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے بعض کام یا باتیں شریعت کے خلاف ہیں تو انھیں بالکل ولایت سے خارج کر دیتے ہیں گو وہ مجتہد مخطی ہوں۔

③ کچھ لوگ نہ انھیں معصوم مانتے ہیں نہ ہر بات میں ان کی اتباع کرتے ہیں بلکہ مجتہد مخطی ہونے کی بنا پر انھیں گنہگار تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث رسولؐ ہے:

«قد كان في الأمم قبلكم محدثون فإن يكن في أمتي أحد فعمر منهم»

"تم سے پہلے کی امتوں میں اصحاب الہام ہوا کرتے تھے، میری امت میں سے اگر کوئی ہے تو عمرؓ اُن میں سے ہیں۔"

ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«ما كان عمر يقول في شيء: إني لأراه كذا إلا كان كما يقول»

"عمرؓ جب کسی چیز کے متعلق کہتے کہ میں اسے ایسا سمجھتا ہوں تو جیسا وہ کہتے ویسا ہی ہوتا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں:

«اقتربوا عن افواه المطيعين واسمعوا منهم ما يقولون، فإنه تتجلى لهم أمور صادقة»

"اللہ کی اطاعت کرنے والوں کے منہ سے قریب رہو اور جو وہ کہتے ہوں اسے سنو کیونکہ سچے امور ان کے لیے روشن ہوتے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے والے اولیاء اللہ سے جو امور صادقہ ظاہر ہوتے ہیں یہی ہیں جنھیں اللہ ان کے لیے کشف کرتا ہے، لیکن امت میں کوئی بھی ملہم اور صاحب کشف ہو عمر فاروق رضی اللہ عنہ

اس سے افضل ہیں، کیونکہ اس کشف اور الہام کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ کی ہر حال میں اتباع کرتے تھے، اپنی رائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تھے، کبھی آپ ﷺ موافقت کرتے بلکہ قرآن ان کی موافقت میں نازل ہوتا، یہ سب فضائلِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں سے ہوتا اور کبھی رسول اللہ ﷺ موافقت نہ کرتے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس سے رجوع کر لیتے جیسے کہ صلح حدیبیہ والے دن اپنے خیال سے رجوع کر لیا تھا، رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی موت کو تسلیم نہیں کیا لیکن جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انتقال ہوگیا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رجوع کر لیا، مانعین زکوٰۃ کے متعلق عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے رکھی، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے جنگ کرنے کی تھی، بعد میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی رائے کی طرف رجوع کر لیا اور فرمایا: «فعلمت أنه الحق»

''پھر مجھے یقین ہوگیا کہ یہی حق ہے۔''

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ محدث اور ملہم ہونے کے باوجود رتبۂ صدیق رضی اللہ عنہ سے کمتر ہیں، کیونکہ صدیق رضی اللہ عنہ ہر بات اور ہر کام رسول اللہ ﷺ سے لیتا ہے اور ملہم و محدث اپنے دل سے لیتا ہے جب کہ رسول معصوم ہیں اور انسان کا دل معصوم نہیں ہے بلکہ محتاج ہے کہ دل کے الہام کو رسول کی شریعت پر پیش کرے، اسی لیے عمر فاروق رضی اللہ عنہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کرتے تھے اور بعض امور میں انھی کی بات تسلیم کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ میں ملہم اور محدث ہوں، تم پر لازم ہے کہ میری بات قبول کرو، اس لیے اگر کوئی شخص یا اس کے ماننے والے دعویٰ کریں کہ وہ ملہم ہے، اس کی اتباع سب پر واجب ہے اور اس کی باتوں کو کتاب و سنت پر پیش نہ کریں تو ایسے لوگ خطا کار اور گمراہ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ پر اعتصام بالکتاب والسنۃ واجب ہے، ان میں سے کوئی معصوم نہیں، ہر شخص کی بات کو کتاب و سنت پر پیش کیا جائے گا، جو موافق ہو قبول کیا جائے گا اور جو نا موافق ہو رد کر دیا جائے گا، اس امر پر سچے اولیاء اللہ کا اتفاق ہے، اس کا مخالف اولیاء اللہ میں سے نہیں ہوسکتا بلکہ یا تو کافر ہوگا یا غایت درجہ جاہل، ابوالقاسم جنید رحمہ اللہ کہتے ہیں:

«علمنا هذا مقيد بالكتاب والسنة»

''ہمارا یہ علم کتاب و سنت سے مقید ہے۔''

کسی سے خارق عادت تصرفات یا مکاشفات صادر ہوتے ہوں، مثلاً کسی کی طرف اشارہ کر دے تو وہ مر جائے یا وہ ہوا میں اڑتا ہو اور پانی پر چلتا ہو، کبھی لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہو، غائب ہو یا مر گیا ہو، لوگوں نے اس سے استغاثہ کیا تو آ کر ان کی ضرورت اس نے پوری کر دی۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جن سے نباتات کلام کرتے ہیں، شجر و حجر بات کرتے اور کہتے ہیں: «هنيئا لك يا ولي الله» اور وہ جب آیت الکرسی صدق دل سے پڑھ دیتے ہیں تو وہ رُک جاتے ہیں، اس طرح ایک شخص گھر میں ہوتا ہے اور وہ بند ہے پھر وہ دیکھتا ہے کہ وہ گھر سے باہر ہے اور گھر بالکل بند ہے اور اس کا عکس۔''

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں عبداللہ بن صیاد کے متعلق صحابہ دجال ہونے کا گمان کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے بعد میں فرمایا کہ: یہ کاہنوں میں سے ہے۔ ایک بار آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: «قد خبأت لك خبأ، قال: الدخ الدخ» آپ ﷺ نے سورہ الدخان کو اپنے دل میں مخفی طور پر سوچ رکھا تھا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «أجثنا فلن تعدو قدرك» یعنی تم کاہنوں میں سے ہو، کاہنوں کے پاس شیاطین چوری سے غیب کی خبریں لاتے ہیں۔

مدعی نبوت اسود عنسی کے پاس شیاطین آتے تھے، چنانچہ مسلمانوں نے جب اس سے جنگ کی، تو ڈرتے رہتے تھے کہ وہ جو کچھ اس کے متعلق کہتے ہیں شیاطین اسے جا کر بتلا دیں گے۔ آخر اس کی عورت کی مدد سے جس پر اس کا کفر واضح ہو گیا تھا، اسے قتل کر دیا گیا، یہی حال مسیلمہ کذاب اور حارث دمشقی مدعیان نبوت کا تھا، ایسے خوارق عادات اور تصرفات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ ایسے لوگ اولیاء اللہ ہیں کیونکہ ایسے خوارق کفار، مشرکین، اہل کتاب، منافقین، اہل بدعات اور ملحدین وغیرہ سے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں اور شیاطین کی طرف سے ہوتے ہیں، اولیاء اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس طرح کے امور سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ایسے احوال والے لوگ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہیں یا نہیں، آپ ﷺ کے اوامر و نواہی بجا لاتے ہیں یا نہیں، ان کے اقوال، افعال، احوال اور اوصاف کتاب و سنت کی دلالت کے مطابق ہیں یا نہیں، ایمان اور قرآن کا نور، ایمان کے باطنی حقائق اور اسلام کے ظاہری شرائع کا اثر ان پر نمایاں ہے یا نہیں۔ اگر وہ متبع رسول اللہ ﷺ ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اولیاء اللہ ہیں اور اگر متبع رسول نہیں ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اولیاء الشیطان ہیں۔

اولیاء الشیطان عموماً نہ وضو کرتے ہیں نہ فرائض نماز ادا کرتے ہیں، نجس اور گندے رہتے ہیں، کتوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں، گندی جگہوں میں رہنا پسند کرتے ہیں، جیسے حمام، پاخانہ گھر اور کوڑے کرکٹ کی جگہیں، شرعی طہارت و نظافت انھیں سے بُعد ہوتا ہے، خبیث اور گندی چیزیں مرغوب ہوتی ہیں مثلاً سانپ، بچھو، بھڑ، گبریلا، خون اور پیشاب کھاتے پیتے ہیں، غیر اللہ سے

استغاثہ کرتے ہیں اور اپنے شیخ کی جانب سجدہ کرتے ہیں اور مقابر خاص طور سے کفار اور مشرکین کے مقابر سے شغف رکھتے ہیں، قرآن کا سماع ناپسند کرتے ہیں، غنا اور مزامیر کا سماع انھیں اچھا لگتا اور اسے قرآن کے سماع پر ترجیح دیتے ہیں، شیطان انھی اشیاء، انھی مقامات اور انھی افعال کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾(الزخرف:۴۳/۳٦)

’’جو شخص رحمٰن کے ذکر سے غفلت کی زندگی گزارتا ہے تو ہم اس کے لیے شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر دم اس کے ساتھ رہتا ہے۔‘‘

اس لیے ایسے لوگ اولیاء اللہ نہیں بلکہ اولیاء الشیطان ہوتے ہیں۔ شیطانی احوال کو غنا اور سماع دف وکف اور لہو سے تقویت ملتی ہے حالانکہ یہ مشرکین کا سماع اور ان کی عبادت ہے۔

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً﴾(الأنفال:۸/۳۵)

’’بیت اللہ کے پاس ان کی نماز صرف سیٹیاں اور تالیاں ہوتی تھیں۔‘‘

ایسے احوال رکھنے والے غنا سے وجد میں آ کر طویل عرصے تک رقص کرتے ہیں، خاص طور سے اجنبی عورتوں اور لونڈوں کے ساتھ گئی رات تک بے خود ہو کر محو رقص رہتے ہیں، ایسے احوال رکھنے والے قرآن سننے سے پژمردہ اور مزامیر شیطان سے قوی ہو جاتے ہیں اور نماز کا وقت آتا ہے تو بیٹھ کر پڑھتے ہیں یا مرغ کی طرح چونچ مارتے ہیں، یہ سب اولیاء الشیطان ہیں، کف ودف اور وجد و رقص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کبھی سماع غنا کے لیے اکٹھے نہیں ہوتے۔ اس طرح کے لوگوں سے جو خوارق صادر ہوتے ہیں، وہ شیطان کی جانب سے ہوتے ہیں اور شیطان مکر کے ساتھ لوگوں کے عقائد و اعمال کو برباد کرتا ہے مثلاً قبر کے پاس آسیب زدہ مریض کو رکھا جاتا ہے، اس کا شیطان گمراہ کرنے کے لیے جدا ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ قبر والے نے شفا دے دی ہے۔

خوارق علم سے متعلق ہوں یا قدرت وتاثیر سے متعلق، اگر ان سے ایسا کام لیا جائے جن سے اللہ اور اس کے رسولؐ راضی ہوں تو ان سے اصحاب خوارق کی اللہ اور رسولؐ کی طرف قربت میں اضافہ ہوگا اور یہ خوارق ان کے اعمالِ صالحہ میں شمار ہوں گے اور اگر ان خوارق سے ظلم، شرک اور فواحش وغیرہ اعمال سیئہ کو تقویت پہنچتی ہو تو ان سے اصحاب خوارق ذم وعقاب کے مستحق ہوں گے اور یہ مشاہدہ ہے کہ اصحاب خوارق کثرت سے عقوبت میں گرفتار ہوتے ہیں جیسے بادشاہ کی بادشاہت چھن جاتی ہے، عالم کا علم سلب ہو جاتا ہے اور ولایت خاصہ سے عامہ کے درجے میں آ جاتے ہیں، بلکہ کبھی

فساق کے درجے میں آجاتے ہیں اور کبھی مرتد ہوجاتے ہیں، یہ عقوبات ان کو پیش آتی ہیں جن کے خوارق شیطانی ہوتے ہیں گو وہ انھیں کرامات اولیاء ہی سمجھتے ہوں، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی لیے بہت سے صالحین اس طرح کے خوارق سے توبہ واستغفار کیا کرتے تھے، ابوعلی الجوزجانی کہتے ہیں:

«كن طالبا للاستقامة لا طالبا للكرامة فإن نفسك منجبلة على طلب الكرامة وربك يطلب منك الاستقامة»

''استقامت کے طلب گار بنو، کرامت کے طلب گار نہ بنو، تمھارے نفس میں کرامت کی طلب رکھی گئی ہے اور تمھارا رب تم سے استقامت چاہتا ہے۔''

شیخ الاسلامؒ مزید فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو علم اور قدرت وتاثیر میں کوئی خرق عادت اور تسخیر حاصل نہیں ہے تو اس سے اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ کم نہیں ہوگا بلکہ دینی اعتبار سے اس کا نہ ہونا اس کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، خصوصاً جب کہ اس کا وجود اس کے حق میں امر ایجاب واستحباب نہ ہو، لیکن دین اور عمل کے نہ ہونے سے انسان ناقص اور مذموم ہوجائے گا یا تو اسے عذاب کا مستحق بنا دے گا یا ثواب سے محروم کر دے گا کیوں کہ علم وتعلیم دین سے بندہ اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے اور علم کون و تاثیر سے اللہ کی رضا حاصل نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ دین میں داخل ہو۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں ایک بات خصوصیت سے جان لینی چاہیے کہ کرامات کا ظہور بسا اوقات انسان کی حاجت اور ضرورت کے حساب سے ہوتا ہے، ضعیف الایمان یا محتاج آدمی کو جب اس کی حاجت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دے دیتا ہے، جس سے اس کا ایمان قوی ہوجائے اور اس کی حاجت وضرورت کی تکمیل ہوجائے لیکن جو شخص کامل الایمان ہوتا ہے وہ اس سے مستغنی ہوتا ہے، اس لیے اس کے درجے کی بلندی کی وجہ سے اس طرح کی کرامات کا ظہور اس کے لیے نہیں ہوتا، یعنی کرامات کا ظہور کبھی ضعف ایمان کے سبب سے ہوتا ہے اور کبھی کمال ایمان اس نوع کی کرامات سے مستغنی ہوتا ہے، اسی لیے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح کے امور کم اور تابعین کرام میں ان کی بہ نسبت زیادہ تھے، البتہ خلق کی ہدایت اور ان کے درمیان اسلام اور شریعت محمدیؐ کی محبت قائم کرنے اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے جن اولیاء اللہ کے ذریعے خوارق عادات کا ظہور ہوتا ہے ان کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے۔

دعوت نبویؐ میں معجزات کی حیثیت

پروفیسر محمد راشد ندوی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

معجزات کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اس سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی کتابوں میں موجود ہیں، ہم یہاں محض معجزات کے سلسلے میں گفتگو نہیں کریں گے بلکہ ہمارا موضوع دعوت نبویؐ میں اس کی حیثیت متعین کرنا ہے۔

انبیاء کرام کا ایک سلسلہ اس کائنات میں جاری رہا جنھوں نے لوگوں کے حالات کے مطابق رشد وہدایت کی خدمت انجام دی اور ہر نبی نے اپنے زمانے کے اعتبار سے خدا کی وحدانیت، اس کی ربوبیت اور اس کی قدرت کے لیے جو دلائل دے سکتے تھے دیئے، جن کو خدا نے توفیق دی، ان کی دعوت پر ایمان لائے اور صراط مستقیم پر گامزن ہوئے۔

ہر نبی نے بڑی صفائی سے اپنی دعوت اور تبلیغ کے دوران یہ بات کہی کہ وہ انسان ہے اور خدا کی مخلوق ہے، فرق ان میں اور دوسروں میں صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو لوگوں کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا، بعض حالات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جلوے ان سے صادر ہوئے، جن کو قرآن مجید نے بینات اور آیات کے ناموں سے ذکر کیا ہے۔

تمام انبیاء (جن کا ذکر کلام پاک میں ہے) سے اس طرح کی چیزیں صادر ہوئیں، مثلاً: موسیٰ علیہ السلام کا دریا میں ڈالا جانا اور اس کے بعد فرعون کے گھر میں ان کی پرورش ہونا، اس کے بعد فرعون کو خدا کی طرف دعوت دینا اور اس کے غضب وعتاب کا نشانہ بننا اور آخر میں مصر چھوڑ کر فلسطین کی طرف روانہ ہونا اور بحر قلزم میں فرعون اور اس کی قوم کا ڈوبنا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام انبیاء کرام علیہم السلام جن کا ذکر کلام پاک میں موجود ہے، ان کی پوری زندگی دوسروں کے مقابلے میں مختلف رہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک نبی کی زندگی خود اپنی جگہ پر ایک آیت بینہ یا معجزہ ہے۔

آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو وہ بھی اپنی جگہ پر ایک مثال ہے، مثال کے طور پر نبوت سے پہلے کی زندگی، آپؐ کیسے پیدا ہوئے، کس گھرانے میں پیدا ہوئے، کیسے آپؐ کی پرورش ہوئی، بچوں کے درمیان وہ کیسے تھے، ان کی جوانی کیسے کٹی، نوجوانوں میں ان کا کیا مقام تھا، یہاں تک کہ چالیس (۴۰) سال کی عمر کے بعد آپؐ کو نبوت ملی۔ چنانچہ نبوت سے پہلے کی زندگی کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ نبوت کے بعد کی زندگی سے بالکل مربوط ہے، تمام مؤرخین سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ اس طویل عرصے میں آپؐ کی زبان اور آپؐ کے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، آپؐ کے باہمی تعلقات اور معاملات لوگوں کے درمیان بڑے صاف ستھرے تھے حتیٰ کہ لوگ آپؐ کو اپنے باہمی نزاعات میں حکم بناتے اور ان کے درمیان آپؐ ضرب المثل تھے۔

چالیس سال کی زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نبوت سے نوازا، یہ نعمت جتنی آپؐ کے لیے تھی، اس سے بڑھ کر پورے عربوں بلکہ آنے والی تمام نسلوں کے لیے ایسی تھی کہ جس کے مقابلے میں کوئی نعمت نہیں ہوسکتی، نبوت کے بعد نبی کریم ﷺ نے اس دین کا پیغام لوگوں تک پہنچانا شروع کیا جس کے لیے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔

مکہ کے لوگ جنھوں نے چالیس سال تک آپؐ کو ہر اعتبار سے دیکھا تھا اور ہر دور میں آپؐ کو دوسروں کے مقابلے میں بے مثال پایا تھا، اس پر چھوٹے بڑے سب کا اتفاق تھا لیکن جس دین کی آپؐ نے دعوت دینی شروع کی وہ ان کے لیے نئی تھی۔ عقلی اعتبار سے نہیں بلکہ عملی اعتبار سے، کیوں کہ جن عادات و تقالید کے وہ عادی ہوچکے تھے اور خاص طور پر وہ مذہبی رسوم جو ان کی زندگی میں عام ہوچکی تھیں، بت پرستی کا جو طریقہ ان کے یہاں چلا آرہا تھا، نئے دین کو قبول کرنے کے بعد ان سب سے دست بردار ہونا تھا، مذہبی رسوم ہوں یا سماجی رسوم، ان کا چھوڑنا اور چھڑوانا کوئی آسان کام نہیں، چنانچہ مکہ کے لوگ کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ ان کی نگاہوں میں تھا اور جن کی عظمت اور شخصیت پر ان کو اعتقاد کامل تھا، انھی لوگوں نے اپنے اِس حبیب ترین انسانؐ کو مصائب اور مشقتوں میں ڈالا اور ایک لمحہ بھی ان پر ترس نہیں آیا، ان کو پریشان اور خوفزدہ کرنے کے جتنے طریقے اور وسائل ہوسکتے ہیں، سب استعمال کیے، یہ سوچ کر کہ شاید وہ اپنے نئے دین کی تبلیغ سے باز آجائیں اور اگر ان کے اصرار اور ان کی ایذا رسانی کے بعد اس دعوت کی تبلیغ سے باز آجاتے تو وہ

ان کو اپنے سینوں سے لگانے کے لیے تیار تھے۔

چنانچہ یہ واقعہ کہ کفار مکہ نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) اگر تم دولت چاہتے ہو تو تمھارے لیے دولت کا خزانہ حاضر ہے، مکہ کے شریف سے شریف خاندان میں حسین سے حسین لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو وہ تمھارے لیے حاضر ہے، مکہ کی قیادت و سیادت مطلوب ہے تو وہ بھی تمھارے لیے پیش ہے، لیکن اس کا جواب کیا تھا کہ خدا کی قسم ایک ہاتھ پر سورج اور ایک ہاتھ پر چاند رکھ دیں، تب بھی میں اس دین کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا، جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔

وجہ کیا تھی کہ نبی کا کوئی کام اس کی ذات کے لیے نہیں ہوتا نہ اس کے خاندان اور نہ اس کی قوم کے لیے ہوتا ہے بلکہ اس کا ہر کام عام انسانوں کے لیے ہوتا ہے اور ایک انسان کا صحیح راہ پر آ جانا ان کے نزدیک زمین و آسمان کی دولت سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اور بندوں کی ہدایت و رشد کے سلسلے میں جو بھی ایذا پہنچتی ہے، ان کے چہرے پر شکن نہیں آتی، کیونکہ ان کا دل ہر انسان کی محبت سے معمور ہوتا ہے اور محبوب کی کامیابی کے لیے محبّ کو تکلیف کے بجائے سکون ملتا ہے، چنانچہ مسکراتے ہوئے اس کی زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں:

«اللھم اھد قوی فإنھم لایعلمون»

''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت سے بہرہ یاب فرما، اس لیے کہ یہ اس کی برکات سے بے خبر ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی دعوت کا سارا سرچشمہ اس کلام الٰہی سے مربوط ہے جو آپؐ پر پہلے ہی دن سے نازل ہونا شروع ہوا تھا، اور مکی زندگی میں کلام پاک کا جو حصہ نازل ہوا وہی آپ کی دعوت کا محور اور مرکز تھا، اسی لیے آپ کا قول و عمل کلام پاک کی تفسیر و توضیح تھا:

﴿اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾(النجم:۵۳/۴)

''یہ وہ وحی ہے جو آپ ﷺ پر کی جاتی ہے۔''

مکی زندگی میں آپ ﷺ کی دعوت کا سارا محور و مرکز توحید الٰہی اور رسالت رہا اور اسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے آپؐ کلام پاک کی آیات اور اپنی تقریروں سے کام لیتے رہے اور جو بھی اس کلام پاک کو سنتا اور آپؐ سے قریب ہوتا وہ آپؐ کا گرویدہ و عاشق ہو جاتا، کلام پاک کی تاثیر اور آپؐ کی عملی زندگی لوگوں کے لیے رشد و ہدایت کا سبب بنی، کلام پاک کا انداز بیان، اس کی معنویت، اس کی بلاغت اور اس کی آفاقیت ہر چیز عربوں کے لیے نئی تھی اور انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ﴿مَا ھذا قول البشر﴾ چنانچہ یہ پہلا مرحلہ ہے لوگوں کے اسلام کے دائرہ میں آنے کا۔

مکی زندگی میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جو بالکل نرالے اور انوکھے تھے، جن کو ہم نئی

اصطلاح میں ''معجزات'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن کوئی بھی انسان ایسا نظر نہیں آتا جو ان واقعات کو دیکھ کر یا سن کر اسلام کے دائرے میں آیا ہو اور نبی کریم ﷺ کا عاشق وشیدائی بن گیا ہو۔

چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ معجزات کی اہمیت مکی زندگی میں بھی نہیں تھی، جو کہ اسلامی تاریخ کا سب سے اہم مرحلہ تھا اور نہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان واقعات کو اپنی دعوت وتبلیغ میں کوئی اہمیت دی، بلکہ توحید کی حقیقت اور رسالت کی اہمیت ہی کو انسانوں کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا اور اپنی ساری توجہ اس بات پر لگا دی کہ لوگ اللہ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت کو سمجھیں کیونکہ یہ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، چنانچہ کلام پاک میں ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾(آل عمران:۳/۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی (یعنی اس کے دین یا عہد یا جماعت یا قرآن کو) تھامے رہو اور پھوٹ نہ کرو (جیسے یہود و نصاریٰ الگ الگ فرقے ہو گئے) اور اللہ کا وہ احسان یاد کرو (اے اوس اور خزرج کے لوگو) جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے (رات دن تم دونوں میں لڑائی رہتی) پھر اللہ تعالیٰ نے تمھارے دل ملا دیے تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے) اور تم آگ کے گڑھے (دوزخ) کے کنارے آ لگے تھے (اب اس میں گرنے والے تھے) اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا، اللہ اسی طرح تم سے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے اس لیے کہ تم سچے راہ پر قائم رہو۔''

اس طرح دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(الجمعة:٦٢/٢)

''وہی خدا ہے جس نے عرب کے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے (حالانکہ ان پڑھ ہے) اور ان کو (شرک اور کفر گندگی سے) پاک کرتا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی) کتاب اور سمجھ کی باتیں سکھلاتا ہے (دانائی اور عقلمندی کی) اور (اس پیغمبرؐ کے آنے سے) پہلے تو وہ کھلے گمراہ تھے۔''

تیسری جگہ فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ

بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾(بنی إسرائیل:۱۷/۱)

''وہ (خداوند ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے جو اپنے بندے محمدؐ کو راتوں رات ادب والی مسجد (خانہ کعبہ) سے دور کی مسجد (بیت المقدس) میں لے گیا جس کے گرد ہم نے برکت کر رکھی ہے اس لیے کہ ہم محمدؐ کو اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہی اللہ ہے جو (ہر بات کو اور ہر چیز کو) سنتا اور دیکھتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کو قرآن نے انسان کی حیثیت سے پیش کیا کیونکہ وہ انسانوں کے لیے ھادی و رہبر تھے، ہدایت و رہبری کے لیے جنس وصنف کی یکسانیت ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

''اور محمدؐ تو صرف رسول ہیں (یعنی اللہ کا بھیجا ہوا بندہ) اس سے پہلے اور کئی رسول ہو گزرے ہیں، کیا اگر وہ مر جائے یا مارا جائے تو تم الٹے پاؤں (اسلام سے کفر کی طرف) پھر جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پیروں (کفر کی طرف) پھر جائے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا (اپنا ہی بگاڑ کرے گا) اور اللہ جلد بدلہ دے گا شکر کرنے والوں کو۔'' (آل عمران:۳/۱٤٤)

اس طرح مکی زندگی میں جہاں لوگوں کوئی دعوت دینے کے لیے ان تمام وسائل کی ضرورت تھی، جن کے ذریعے سے انھیں اسلام کی طرف بلایا جاتا بلکہ کبھی کبھی محیر العقول چیزوں کو پیش کر کے ان کو مرعوب کر کے اسلام کے دائرے میں داخل کیا جاتا، لیکن ہمیں ایسا نہیں ملتا بلکہ انسانیت کی ہدایت اور فلاح کے لیے جو سیدھے سادے راستے ہو سکتے تھے انھی کو اپنایا گیا، اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

قرآن مجید کے مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں، وہ لوگوں کو ہمیشہ روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں، اسلام دنیا میں دین الٰہی کی تکمیل اور گذشتہ مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لیے آیا تھا، ان ظاہری معجزات نے گذشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیے تھے، جن انبیاء اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے، ان میں الوہیت اور خدائی کا عنصر تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصلی حقیقت جس پر دین الٰہی کی بنیاد ہے، متزلزل ہو گئی، اس لیے قرآن مجید نے نہایت وضاحت، صفائی اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید و نبوت کی اصلی حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی گئی کہ آئندہ فساد اور سوء عقیدہ کے سیل طوفان سے اس

کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہا، سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں، نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبِ وحیٔ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں، اس بناء پر جب معاندین نے معجزے کا مطالبہ کیا تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾(البقرۃ:۲/۱۱۸-۱۱۹)

''اور جو لوگ (عرب کے کافروں میں سے یا یہود و نصاریٰ میں سے) جاہل ہیں وہ کہتے ہیں اللہ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، اگلے لوگوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں جیسے یہ کرتے ہیں ان کے اور ان کے دل مل گئے، جن لوگوں کو یقین ہے ان کو تو ہم نشانیاں دکھا چکے۔ ہم نے تجھ کو سچائی کے ساتھ (مسلمانوں کو) خوشخبری دینے والا (اور کافروں کو) ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور دوزخیوں کی پوچھ تجھ سے نہ ہوگی۔''

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾(بنی اسرائیل:۱۷/۹۰-۹۳)

''اور کہتے (کیا) ہیں ہم تو کبھی تیری بات ماننے والے نہیں جب تک تو ہمارے لیے ایک چشمہ پانی کا زمین سے نہ بہائے۔ یا (ایسا تو بھی ہو کہ خود) تیرا ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا اس کے بیچ میں تو پانی کی بھرپور نہریں بہادے یا جیسا تو کہا کرتا ہے ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے آمنے سامنے لا کھڑا کر (ہم خود آنکھ سے دیکھیں)۔ یا تیرا ایک گھر ہو سونے کا (طلائی) یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور صرف چڑھ جانے سے ہم ماننے والے نہیں جب تک (وہاں سے) ہم پر ایک کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم (خود) پڑھ لیں (اے پیغمبر ان لوگوں کے جواب میں) کہہ دے، سبحان اللہ میں ہوں کیا، ایک بندہ ہوں (اللہ کا) پیام پہنچانے والا۔''

کلام مجید میں سب سے زیادہ زور خدا کی ربوبیت، اس کی وحدانیت اور اس کے بعد رسالت پر دیا گیا ہے، توحید و رسالت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت کا صحیح تصور رسالت ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے، جہاں توحید اور رسالت کو الگ الگ کر دیا گیا تو دونوں بے معنی رہ جائیں گے، مثلاً خدا تو ایک ہے، خدا رازق ہے، خدا غفار ہے، خدا ستار ہے، اور بغیر اس کے اشارے کے دنیا کی کوئی چیز ہل نہیں سکتی۔ یہ عقیدہ اس وقت تک صحیح معنوں میں منضبط اور مستحکم ہو نہیں سکتا جب تک کہ رسالت کی روشنی میں اس کو نہ سمجھا جائے۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے وہ ایک حقیقت ہیں لیکن ان کے ذریعے سے جو دین کا صحیح مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ دین جب تک لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں نہ اتر جائے سوسائٹی اور سماج پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ جو مذاہب ہیں، ان میں انبیاء کرام علیہم السلام کی فکر سے زیادہ ان کی شخصیت ہی مظہر دین بن کر رہ گئی ہے اور حقیقی خدا پردے میں چلا گیا ہے، اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ توحید خالص کو مختلف انداز میں کلام پاک اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس طرح واضح کیا گیا کہ قیامت تک شرک اور توحید کے درمیان خلط ملط نہیں ہو سکتا، بلکہ اسلام نے ایک ایسی حد فاصل قائم کی جس کو کبھی بھی توڑا نہیں جا سکتا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاندین نے اسلام پر جب حملے کیے تو اس کا جو سب سے پہلا محاذ عقیدۂ توحید ہے، اس کی طرف رُخ کرنے کی ہمت ان میں نہیں ہوئی بلکہ اسلام کے وہ مسائل جن کی حیثیت ثانوی تھی، انھی کو انھوں نے اپنا نشانہ بنایا، جس میں معجزہ بھی شامل ہے، خاص طور سے مذہب اور سائنس کی کشمکش کا سب سے پہلا نشانہ معجزات ہی تھے کیوں کہ یہ عام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے مختلف بادشاہوں اور امراء کو جو خطوط بھیجے جن میں آپؐ نے اسلام کی دعوت دی، کہیں بھی کسی بھی خط میں آپؐ نے اپنے کسی معجزے کا ذکر نہیں کیا بلکہ اسلام کی جو صحیح تعلیمات ہیں انھی کو اپنی دعوت کا مرکز اور محور بنایا۔

اس کے بعد ہم صحابہ کرام کی سیرت اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، جن کے ذریعے اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلا، انھوں نے اپنے کسی پیغام یا تقریر و تحریر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزے کا ذکر نہیں کیا اور نہ اس کو اپنی دعوت کی اشاعت کا ذریعہ و وسیلہ بنایا، کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی ہر تعلیم دنیا کے لیے رحمت ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے اور یہ خود اپنی جگہ پر ایک معجزہ ہے۔

تاجدارِ مدینہ ﷺ کا آخری سفر

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، پروفیسر شعبۂ عربی راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

آنحضرت ﷺ پہلے ہی سے یہ بخوبی بھانپ چکے تھے کہ اب آخری سفر کی تیاری کرنی ہے، بنابریں آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ تمام جاں نثارانِ اسلام کو آخری دیدار بھی نصیب ہو جائے اور اپنی وصیت و نصیحت سے شمع اسلام کے پروانوں کو مستفید کر دیا جائے اور سب سے بڑھ کر فیصلۂ ایزدی سے قبل آخری حج بھی انجام دے دیا جائے، تاریخ جسے ''حجۃ الوداع'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آپ ﷺ وہاں سے اپنے دین حنیف کی تکمیل کا مژدۂ جان فزا لے کر واپس لوٹ رہے تھے اور جس دعوت و تبلیغ کی خاطر آپ ﷺ اپنے کنبہ و برادری و وطن مالوف کو بھی ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے تھے۔ اس کی تکمیل پر آپؐ نہ صرف مسرور مطمئن تھے بلکہ اپنے پروردگار کرم گستر کی حمد وثنا میں رطب اللسان تھے۔

دسیوں جنگوں میں آپؐ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی، فتح و کامرانی کا پرچم کبھی تو آپ ﷺ کے حق میں لہرا اور شاذ و نادر ہی آپ ﷺ کے خلاف، لیکن اسے بھی ہم سراسر ہزیمت و شکست کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتے، مگر چونکہ خالق کائنات کو ہر حالت میں اپنے دین متین کو سربلند اور قائم و دائم رکھنا منظور تھا اس لیے اس کے فیصلے کے مطابق آخری وداعی فتح یابی و نصرت آپ ﷺ کے قدم چومتی رہی۔

چنانچہ آپ ﷺ اپنے فریضۂ دعوت کی ادائیگی سے سبکدوش ہو کر اپنے آقا و رفیق اعلیٰ سے

آخری ملاقات کے منتظر ہی بیٹھے تھے کہ ۱۱ھ ماہ صفر اپنے اختتام کو پہنچ چکا۔

ادھر آپ ﷺ کی طبیعت کو اضمحلال، لاغری اور نقاہت پوری طرح لاحق ہوئی، عین اسی وقت ایوان نبوت سے شام پر قدم جما کر اسے سر کرنے کا فیصلہ صادر ہوگیا، چنانچہ فوج کشی کا فرمان بھی جاری ہوا، آپ ﷺ نے اس لاؤ لشکر میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سالارِ کارواں کا منصب تفویض فرمایا، کیوں کہ ان کے والد محترم نے بھی اس راہ میں اپنی جان کو نچھاور کرنے میں کوئی دریغ یا گریز نہیں کیا تھا، انتہائی شدت مرض کے باوجود اگلے روز آپ ﷺ نے خود اسامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں پھریرۂ اسلام عطا فرما دیا حالانکہ اس لشکر میں صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جیسی قابل قدر و عظیم شخصیتیں بھی عام سپاہیوں کے صف میں شامل تھیں، اس اٹل فیصلے میں آپ ﷺ نے اسلام کی عظیم مساوات، معدلت گستری اور جمہوریت کا سبق پڑھایا، چنانچہ اس لشکر جرار نے مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالا، مگر دریں اثنا یکایک تاجدار مدینہ کی طبیعت تشویشناک حد تک علیل ہوگئی، بنابریں مسلح فوج کی روانگی بھی اب ملتوی ہو کر رہ گئی۔

دریں اثناء آپ ﷺ نے اپنی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے اس جان لیوا علالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رہنے کی اجازت لے لی اور اپنی وفات حسرت آیات تک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دل و جان سے آپ ﷺ کی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف ہوگئیں، علالت کے دوران آپ ﷺ تقریباً ایک ہفتے تک مسجد نبویؐ کو تشریف لے جاتے، امامت کا فریضہ بھی بدستور انجام دیتے مگر نقاہت کا یہ عالم کہ بولنے تک کی بھی سکت و تاب نہیں ہوا کرتی تھی۔

ایک دن جی بھر کر سر پر پانی ڈلوایا، پھر سر باندھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ کرام کو پند و نصیحت بھی فرمائی، پھر یوں گویا ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو دنیا و عقبیٰ میں سے ایک کو اختیار کرنے کی تجویز پیش کی تو اس بندے نے دنیا پر آخرت ہی کو ترجیح دے دی، اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے، دراصل رازدار نبوت ہونے کی حیثیت سے وہ بخوبی یہ بھانپ گئے تھے کہ اس بندے سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے سوا اور کوئی نہیں۔

پھر آپ ﷺ نے یہ فرمان جاری کیا کہ مسجد میں جتنے دروازے ہیں سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے، تمام دروازے مسدود کر دیئے جائیں پھر مہاجرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

بھائیو! انصار مدینہ کا ہمیشہ خیال رکھنا کیونکہ میرے بعد ان کی تعداد یوں گھٹ جائے گی جیسے کھانے میں نمک، وہ تو اپنی طرف سے اپنا فرض منصبی ادا کر چکے ہیں، اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے لیے جسم میں بمنزلہ معدہ کے ہیں۔

حد سے زیادہ لاغر ونحیف تو تھے ہی، چنانچہ نماز کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بلانے پر وضو کے لیے اُٹھنے بیٹھنے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہو سکی، تاہم جب تک آمدورفت کی رہی سہی سکت باقی تھی تمام نمازیں مسجد ہی میں ادا فرماتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی وہ مغرب کی تھی، دردِ سر کے مارے سر پر رومال باندھ کر مسجد نبوی تشریف لائے اور سورۃ المرسلات کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی۔ عشاء کا وقت آپہنچا تو دریافت فرمایا کہ آیا یہ نماز بھی ختم ہوگئی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ سب لوگ آپؐ ہی کے منتظر ہیں، برتن میں مزید پانی بھروا کر نہا دھو کر جب مسجد جانے کی کوشش کرنے لگے تو دفعتاً غش کھا کر گر پڑے، ذرا سا افاقہ ہوا تو وہی پہلا سوال دہرایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ شدت تپش کی بنا پر پوری طرح بیہوشی طاری تھی، یکا یک آنکھیں کھلیں تو فرمانے لگے کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم نے کہا نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ سارے مصلیان آپؐ ہی کے منتظر بیٹھے ہیں پھر فرمایا لگن میں پانی رکھو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرما کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غشی طاری ہوگئی، اسی طرح کئی دفعہ یہ بات پیش آئی کہ تپش فرو کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرما کر اُٹھنا چاہا تو غشی طاری ہوگئی، بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہلوا بھیجا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ وہ تو انتہائی رقیق القلب انسان ہیں پھر آپؐ کی جگہ وہ نماز پڑھانے کے قابل کیسے ہوں گے؟ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیداً وہی حکم دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نماز پڑھائیں، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کئی دنوں تک تعمیل ارشاد کرتے رہے۔

بروز ہفتہ یا اتوار اپنی طبیعت میں ذرا سی تخفیف محسوس کی تو دو آدمیوں کے درمیان چل کر ظہر کی نماز کے لیے تشریف لائے، ادھر امامت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب یہ بات محسوس ہوئی تو فوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے فرمایا کہ پیچھے نہ ہٹیں پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بازو میں دائیں جانب بیٹھ گئے، اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے اور صحابہ کرام کو تکبیر بھی سنا رہے تھے۔

بروز پیر سارے مصلیان نماز فجر میں مصروف تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امامت فرما رہے تھے، آپؐ نے تھوڑا سا افاقہ محسوس کیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی چلمن ہٹائی، صحابہ کرام صفیں باندھ کر نماز میں مصروف تھے، یہ سماں دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس مارے خوشی کے دمک اُٹھا، لب ہائے مبارک پر مسکراہٹ طاری ہوئی، نمازیوں کو آپؐ کی آمد کی آہٹ محسوس ہوئی تو فرطِ مسرت سے وہ اپنے آپ

پر قابو نہ پا سکے اور قریب تھا کہ ان کی نمازیں بھی ٹوٹ جاتیں، کیونکہ سب صحابہ یہ چاہتے تھے کہ نماز چھوڑ کر آپ ﷺ کی مزاج پرسی کریں، ادھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی بیتاب ہو کر یہ چاہا کہ امامت چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں اور تمام صحابہ کرام کو اپنی جگہ قائم رہنے کا اشارہ کیا اور پردہ ڈال کر اندر تشریف لے گئے، آپؐ کی نقاہت اور لاغری کا یہ عالم تھا کہ اچھی طرح پردہ بھی نہ ڈال سکے، یہی وہ آخری وقت تھا کہ صحابہ کرام جمال اقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے، ادھر سورج کے عروج کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی غشی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور کبھی کبھار تھوڑی دیر کے لیے افاقہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔

بالآخر نزع کی حالت شروع ہوگئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تن تنہا آپ ﷺ کو اپنے اوپر سہارا دے رہی تھیں، ان کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عظیم نعمتوں سے مجھے نوازا ہے وہ یہ ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے میرے گھر میں میری ہی باری کے دن میرے سر اور سینے کے درمیان وفات پائی اور آپ ﷺ کے وصال کے وقت اللہ نے میرا لعاب اور آپ ﷺ کا لعاب اکٹھا کر دیا، وہ اس طرح کہ جب میں آپ ﷺ کو ٹیکے ہوئے تھی تو میرے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا مسواک کرتے ہوئے یکایک ادھر سے گزر ہوا، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ ٹکٹکی لگا کر مسواک کی طرف تاکنے لگ گئے، میں اپنی فراست سے یہ تاڑ گئی کہ آپ ﷺ مسواک کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا: آپؐ کے لیے اپنے بھائی کے ہاتھوں سے وہ مسواک لے لوں؟ آپ ﷺ نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں، میں نے مسواک لے کر آپؐ کو دی تو سخت اور کڑی محسوس ہوئی، میں نے کہا اسے آپؐ کے لیے نرم کردوں؟ آپؐ نے پھر سر ہلا کر اشارہ کیا کہ ہاں، میں نے اپنے دانتوں سے رگڑ کر اور چبا چبا کر اسے نرم کر دیا تو آپ ﷺ نے بڑی مسرت، مسکراہٹ اور شادمانی کے ساتھ اچھی طرح مسواک کی، پھر سامنے رکھے ہوئے کٹورے کے پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرہ پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے: اللہ کے سوا لائق پرستش کوئی نہیں، موت کے لیے بڑی سختیاں ہیں۔

مسواک فرماتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ بالکل ہی تندرست ہیں، مسواک سے فارغ ہوتے ہی آپ ﷺ نے ہاتھ یا انگلی اُٹھائی، نگاہ چھت کی طرف بلند کی اور دونوں ہونٹوں پر کچھ جنبش سی نظر آئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کان لگایا، تو آپ ﷺ یوں فرما رہے تھے: ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ہمراہ جنھیں تو نے انعامات سے نوازا، پھر «إلى رفيق أعلى» کا فقرہ بھی زبان مبارک سے بار بار دہراتے جاتے تھے، دراصل جب انسانوں کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کر چکے اور اسے اوج کمال تک پہنچا چکے تو اب رفیق اعلیٰ سے ملنے کو بیتاب ہو گئے، اب وقت بالکل

قریب آ رہا تھا، اتنے میں اوپر ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا: «بل الرفیق الأعلٰی» اب ہاتھ لٹک گئے، آنکھیں بھی پھٹ گئیں اور روح پاک عالم آب وگل سے پرواز کر کے عالم قدس وجاودانی کو سدھار گئی، «انا للّٰه وانا الیه راجعون»۔

یہ المناک واقعہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ کے دن چاشت کی شدت کے وقت پیش آیا، آپ ﷺ کی عمر اس وقت تریسٹھ (۶۳) سال چار دن کی تھی۔

اس حادثۂ فاجعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سے چاروں طرف آناً فاناً پھیل گئی، اہل مدینہ پر کوہ غم ٹوٹ پڑا، لوگ ٹولی در ٹولی اور جوق در جوق جمع ہونے لگے مگر آپ ﷺ کی جانشینی کے اختلاف میں پھنس کر اس روز تجہیز، تکفین اور تدفین کی نوبت نہیں آئی، منگل کو حضرت اسامہ بن زید، فضل بن عباس وقثم بن عباس، شقران اور اوس بن خولی رضی اللہ عنہم نے غسل دلایا، پھر تین سفید یمنی چادروں میں ہی آپ ﷺ کو کفنایا گیا جن میں کرتا اور پگڑی نہ تھی۔

آپ ﷺ کی آخری خواب گاہ کے متعلق جب رائیں مختلف ہونے لگیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کسی نبی کی لاش نہیں اٹھائی گئی مگر اس کی تدفین وہیں ہوئی جہاں سے اٹھائی گئی، علاوہ ازیں اپنی وفات حسرت آیات اور وصال پر ملال سے پانچ روز قبل آپ ﷺ نے مسجد نبویؐ کے منبر پر فروکش ہو کر جبکہ صحابہ کرام گردونواح میں جمع تھے یہ وصیت فرمائی کہ یہود ونصاریٰ پر اللہ کی مار اور پھٹکار ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنالیا، تم لوگ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پوجا کی جائے۔

چنانچہ ان احادیث اور وصایا کے پیش نظر یہ فیصلہ طے پایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ہی آپ ﷺ کی آخری خواب گاہ بنے گی، کیونکہ کھلے میدان میں اگر دفن کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کوئی بدعتی شخص آرام گاہ نبویؐ پر مسجد وگنبد کی تعمیر کر دے اور وہاں نذر و نیاز اور پوجا پاٹ بھی شروع ہو جائے، خیر اب اٹل فیصلے کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا وہ بستر اٹھایا جس پر آپ ﷺ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ پھر اسی کے نیچے لحد والی (بغلی) قبر کھودی۔

بعد ازاں نوبت بہ نوبت دس دس صحابہ کرام نے حجرۂ شریف میں داخل ہو کر نماز جنازہ پڑھی، اس میں کوئی امام نہ تھا، سب سے پہلے آپ ﷺ کے خانوادہ بنوہاشم نے جنازے کی نماز پڑھی، پھر مہاجرین، پھر انصار، پھر مردوں کے بعد عورتوں اور ان کے بعد بچوں نے۔

نماز جنازہ پڑھنے میں منگل کا پورا دن بیت گیا اور بدھ کی رات آ گئی، رات میں آپ ﷺ کے جسد پاک کو سپرد خاک کیا گیا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی

تدفین کا قطعاً علم نہ ہوا یہاں تک کہ ہم نے چہار شنبہ کی رات کے درمیانی اوقات میں پھاوڑوں اور بیلچوں کی آواز سنی۔

یہ ہے نبی ﷺ کا آخری سفر جس کی متفقہ تاریخ ہے ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ، لیکن آپ ﷺ کی تاریخ ولادت باسعادت میں مؤرخین کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، کسی کے نزدیک ۹ اور کسی کے نزدیک ۱۲ ربیع الاول اور انگریزی سال کے حساب سے ۲۰ یا ۲۲ اپریل ۵۷۰ء ہے۔ اب مقام تعجب ہے کہ ایک مختلف فیہ تاریخ پیدائش میں ہم جشن میلاد النبی ﷺ بڑے طمطراق اور تزک و احتشام کے ساتھ مناتے ہیں حالانکہ اس تاریخ کی صحیح تعیین میں پوری طرح اختلاف ہے، البتہ یہ جو غم واندوہ کا یا وفات النبی ﷺ کا دن ہے، اس میں کسی بھی اختلاف یا شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے یہ جشن میلاد النبی ﷺ بدعت ہے، حالانکہ بعثت نبوی کا واحد مقصد ہی دراصل روئے زمین سے بدعات وخرافات کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر قوم کو فلاح و بہبود سے مالا مال کرنا ہے، ہم پورے وثوق اور یقین سے یہ بھی جانتے ہیں کہ خود نبی اکرم ﷺ نے بھی کبھی اپنے سے پہلے انبیاء کے جشن میلاد نہیں منائے اور نہ صحابہ کرام نے ہی کبھی آپ ﷺ کا جشن میلاد منایا، حالانکہ آپ ﷺ اپنے صحابہ میں بنی نوع انسان کے اندر سب سے بڑھ کر قابل احترام وعزت تھے، اسی طرح ائمہ سلف صالحین کے کسی دور میں بھی اس کا وجود نہیں ملتا۔

سب سے پہلے مصر کے فاطمیوں نے عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ان بدعات وخرافات کو رائج کیا، اب ہمارے علماء سوء اور پیٹ کے چند پجاریوں نے اس بدعت کو شہہ دے کر اور اسے حصہ دین سمجھ کر ملک کے کونے کونے اور چپے چپے میں پھیلانے کی ناکام کوشش کی، نصاریٰ کی تقلید اور شرک و بدعات کی تقریب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے صرف کیے جاتے ہیں، حالانکہ فضول خرچی کرنے والا شیطان کا بھائی ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت عقل ونقل کی روشنی میں

مولانا احسان اللہ سلفی، استاذ جامعہ رحمانی، بنارس

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد:

تمہیدی کلمات

انسانیت اورنبوت

دنیا کا مقدر انسان کے مقدر سے برابر وابستہ رہا ہے اور رہے گا، اس کی سعادت اور شقاوت، بلند اقبالی اورنحوست کا تعلق انسان ہی کی ذات سے رہا ہے، چنانچہ اگر حقیقی انسان کا وجود رہے اور دنیا کی ہر قابل فخر چیز مال و دولت زیب و زینت ختم ہو جائے تب بھی کوئی ایسی بڑی مصیبت نہیں آجائے گی اور نہ دنیا کا کوئی بہت بڑا خسارہ ہو جائے گا، بلکہ حقیقی انسان کا وجود ہر گم شدہ چیز کا نعم البدل، ہرمحرومی کی تلافی اور ہر بیچارگی کا درماں ثابت ہوگا۔ انسان اپنے نشاط کار، جوش عمل، قوت کارکردگی اورمحنت و ہمت سے دنیا کو وہ تمام چیزیں دوبارہ مہیا کردے گا جو دنیا نے کھودی ہوں گی اور صرف یہی نہیں بلکہ پہلے سے بہتر اور بڑھ کر فراہم کردے گا اور اگر دنیا یا دنیا کے کسی ذمہ دار کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ انسان بغیر دنیا یا دنیا بغیر انسان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے تو اس کا انتخاب یقیناً انسان ہی ہوگا اور اس میں اسے کسی تردد وتذبذب کا شکار نہیں ہونا پڑے گا، اس لیے کہ دنیا انسان ہی کے لیے بنائی گئی ہے اور اس کی عزت وقدر و قیمت اسی کے سبب سے ہے، لیکن اگر انسان اور اس کی فطرت کے اسرار و رموز اورمخفی صلاحیتوں، قلب انسانی کی گہرائیوں، فکر انسانی کی

بلند پروازیوں، اس کی لا متناہی امیدوں اور آرزوؤں اور اس کی بلند ہمتی اور عالی نظری کا مقابلہ دنیا کے اسرار و عجائب سے کیا جائے تو یہ وسیع کائنات اس کے سامنے سمندر کے آگے ایک قطرے یا صحرا کے مقابل ایک ذرے کی طرح معلوم ہوگی اور اپنی پوری وسعت کے ساتھ قلب انسانی کی وسعت اور گہرائی میں اس طرح گم ہو جائے گی جیسے ایک چھوٹی سی کنکری ایک بحر بیکراں میں گم ہو جاتی ہے، اس کے مضبوط اور غیر متزلزل ایمان کے آگے پہاڑ ہیچ ہو جاتے ہیں اور خوف خدا یا کسی ناتواں پر ترس کھانے یا گناہوں سے ندامت پر نکلے ہوئے آنسو کے قطرے کو دیکھ کر سمندر پانی پانی ہو جاتے ہیں اور اپنی تنگ ظرفی کا ماتم کرتے ہیں۔ انسان کی ذات اس کائنات میں گوہر مقصود اور بیت الغزل کی حیثیت رکھتی ہے اور خلاق عالم کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے، جسے اس نے بہترین صورت، مکمل سیرت اور بلند ترین ساخت عطا کی ہے۔ انسان اگر اپنے آپ کو پہچان لے اور اپنی قیمت طلب کرے تو یہ دنیا اس کے دام لگانے سے عاجز ہو جائے گی اور اگر اس کی ذات وسعت اختیار کرے اور اپنے عزم و ہمت کی عنان ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ دنیا اس کے لیے تنگ ہو جائے گی:

گھٹے اگر تو بس اک مشت خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

لیکن جب انسان کی اسی ساخت میں کجی آ جاتی ہے، اس کی تہذیب فاسد ہو جاتی ہے اور حقیقی انسان نادر و نایاب ہو جاتا ہے تو اس کو نبوت اور رسالت کی ضرورت پڑتی ہے اور ہر نبی اپنے زمانے میں اسی مہم کو لے کر اُٹھتا ہے اور ایسے انسانوں کا ایسی کیت اور کیفیت میں اٹھ کھڑا ہونا جس کا منظر تاریخ کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا ہو اور نہ ایسا نظارہ چشم فلک کے سامنے آیا ہو کہ وہ ایک سلکِ گہر، ایک شیشہ پلائی ہوئی دیوار اور مضبوط ملت و جماعت بن گئے ہوں اور ایک مشترکہ مقصد و عقیدہ کے لیے باہمی تعاون کرنے لگے ہوں تو یہ نبوت اور رسالت کا ہی کارنامہ اور عظیم معجزہ ہے، نبوت اور رسالت کا ڈھالا ہوا انسان اپنی ذات میں ایک مستقل معجزہ اور نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کے ابدی کارناموں میں سے ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، جس کی مثال کے طور پر کسی مصور نے اپنے فن کار قلم اور صناع ذہن سے اس سے بہتر تصویر پیش نہیں کی ہوگی نہ کسی شاعر نے اپنے شاداب تخیل، مواج طبیعت اور شعری صلاحیت سے کام لے کر ایسے اوصاف جمیلہ، ایسی پاکیزہ سیرتوں اور ایسے برگزیدہ محاسن کا خیالی پیکر تیار کیا ہوگا جس کا نمونہ ان کی ذات میں موجود تھا، دنیا کے تمام ادیب اگر جمع ہو کر انسانیت کا کوئی بلند ترین نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں تو ان کا تخیل اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا جہاں واقعاتی زندگی میں وہ لوگ موجود تھے جو آغوش نبوت کے پروردہ اور

تربیت یافتہ تھے۔ نبوت اور رسالت سے جو لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں ان کا ایمان قوی، علم عمیق، دل خیر پسند اور ان کی زندگی ہر تکلف اور ریا و نفاق سے پاک ہوتی ہے۔

مختلف انبیاء کرام کی آمد

مختلف انبیاء کرام کے ذکر سے قرآن کا اسلوب، زندگی سے لبریز، بشارت و مسرت سے بھرپور اور محبت سے سرشار نظر آتا ہے، گویا کہ وہ نبوت کی ایک داستان شوق اور ذکر جمیل ہے، جس میں جتنا بھی طول و وسعت تنوع اور شاخ در شاخ کی کیفیت ہو کم معلوم ہوتی ہے گویا:

عزیز بود حکایت دراز تر گفتم

میرا یقین ہے کہ جس کو بھی مذاق سلیم، ذوق جمال اور جذبہ محبت کا کچھ بھی حصہ ملا ہے وہ اس تذکرے سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ مختلف انبیاء کرام کی آمد کے سلسلے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی، ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، بیشک تمھارا پروردگار دانا اور خبردار ہے اور ہم نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور سب کو ہدایت دی اور اس سے پہلے نوحؑ کو بھی ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو بھی ہدایت دی تھی اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کو بھی ہدایت دی تھی یہ سب نیکوکار تھے اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام کو بھی ہدایت دی تھی اور ان سب کو دنیا والوں پر فضیلت دی اور بعض کو ان کے باپ دادا اور اولاد اور بھائیوں میں سے بھی ہدایت دی اور ان کو برگزیدہ بھی بنایا اور سیدھا راستہ بھی دکھایا، یہ خدا کی ہدایت ہے، اس راستے پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہے چلائے اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو لوگ وہ عمل کرتے وہ سب ضائع ہو جاتے، یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم شریعت و نبوت عطا فرمائی تھی، اگر یہ کفار ان باتوں سے انکار کریں تو ہم نے ان پر ایمان لانے کے لیے اپنے لوگ مقرر کر دیئے ہیں کہ وہ ان سے کبھی انکار کرنے والے نہیں۔ (الانعام: ۶/۸۳_۸۹)

قرآن کبھی انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر اصطفاء و اجتباء اور محبت و رضا کے الفاظ سے کرتا ہے تو کبھی انھیں بہترین تعریفوں اور عقلی و عملی صلاحیتوں کا حامل قرار دیتا ہے، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام خلاصۂ مخلوقات اور انسانیت کے لیے کامل نمونہ اور خدا کی پیامبری اور دعوت دین کے لحاظ سے سب سے زیادہ باصلاحیت اور باہمت افراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾(الأنعام:۶/۱۲۵)

''اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ رسالت کا کون سا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے۔''

ان آیات کی روشنی میں مختلف انبیاء کرام کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے آخری نبیؐ کی تشریف آوری

ہمارے نبی ﷺ کی تشریف آوری ایسے وقت اور ماحول میں ہوئی جب خدا طلبی اور تلاش حق کا جذبہ مفقود ہو گیا تھا اور باہمی محبت کے شعلے بجھ چکے تھے، دل کی انگیٹھیاں سرد پڑ گئی تھیں اور ان پہ حب دنیا کی برف جم گئی تھی، دین کے مظاہر و آثار میں صرف خرافاتی بت پرستی اور سطحی قسم کے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے۔

اب ایسے حالات میں ضرورت تھی ایک ایسے معلم اور نبی کی جو لوگوں کو خدا طلبی اور تلاش حق کی طرف مائل کرے، اور صحیح دین کی دعوت پیش کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ کو مبعوث فرمایا۔

ہمارے نبی ﷺ کی ولادت و بعثت صرف ایک نبی کی یا صرف ایک امت کی یا ایک عصر کی نہیں ہے، بلکہ ایک نئی دنیا کی پیدائش ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔

عقیدۂ ختم نبوت

ختم نبوت کا مطلب

قرآن مجید نے سلسلۂ نبوت کے محمد رسول ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہونے اور آپؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت کی عملاً ضرورت نہ ہونے کے لیے گوناگوں اور نہایت بلیغ اسالیب بیان اختیار کیے ہیں جو بیک وقت قلب و دماغ کو پورے طور پر اپیل کرتے ہیں، اس لیے قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کے خصائص و اوصاف اپنے انداز میں بیان کیے ہیں جن سے عقل سلیم رکھنے والا ہر انسان بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ آپ ﷺ ایک عظیم الشان پیغمبر اور تا قیامت قابل تقلید نمونہ اور مثالی شخصیت ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾(الأحزاب:۳۳/۴۰)

''محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔''

قرآن مجید نے آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے اس قوم کی زبان اور تعبیرات سے کام لیا ہے جن کی زبان میں وہ اترا ہے اور جو اس کے اولین مخاطب اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے پر مامور تھے، یہ زبان ان کے درمیان رابطے، بول چال اور ادائے مطلب کی زبان تھی اور اس زبان کی محیر العقول وسعت وصلاحیت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس میں کمال وانتہاء کا مفہوم بتانے والا کوئی لفظ خاتم سے بڑھ کر موجود نہیں تھا اور اس مطلب کو واضح کرنے کے لیے یہی لفظ گفتگو میں اور شعر وادب میں ان کی نوک زبان تھا، اسی لیے ان کی زبان میں خاتم، ختام اور ختم کا وہی معنی پایا جاتا ہے جو قرآن نے مراد لیا ہے، یعنی یہ کہ رسول اللہ ﷺ آخری رسول اور خاتم الانبیاء ہیں، جن کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں، جیسا کہ لغت کی متعدد کتابوں میں اس کی تشریح موجود ہے۔

لسان العرب میں ہے:

«خاتمهم وخاتمهم واخرهم عن الحياني ومحمد ﷺ خاتم الأنبياء ﷺ»

تاج العروس میں ہے:

«ومن أسمائه ﷺ الخاتم والخاتم وهو الذى ختم النبوة بمجيئه»

قاموس میں ہے:

«الخاتم آخر القوم ، ومنه قوله تعالٰى : (وخاتم النبيين) أى آخرهم»

مفردات القرآن جو امام راغب اصفہانی کی نادر اور عجیب تصنیف ہے، اس میں مرقوم ہے:

«وخاتم النبيين لأنه ختم النبوة أى تممها بمجيئه»

بطور نمونہ عربی لغت کی کتابوں سے یہ چند مثالیں پیش کی گئیں ہیں جن سے یہ یقین ہو گیا کہ ازروئے لغت عرب اس آیت میں خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے اور اگر اس آیت کی تاویل کی جائے کہ خاتم کے معنی مصدق کے ہیں تو یہ ایک غلط اور لغو تاویل ہوگی جو درحقیقت معنوی تحریف ہے کیونکہ لفظ کے حقیقی معنی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا معنی بغیر کسی قوی قرینے کے مراد لینا عقل ونقل اور لغت وقواعد کے اعتبار سے بالکل غلط ہے، اس لیے خاتم کے حقیقی معنی وہی ہوں گے، جو ابھی لغت کے اعتبار سے ثابت ہوا ہے۔ یہ آیت منکرین ختم نبوت کے باطل دعوے کے لیے پیام موت وہلاکت ہے۔

ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں

اس کے بارے میں سب سے پہلے ہماری نگاہ اس آیت کریمہ پر جاتی ہے جو آیت ختم نبوت کے نام سے موسوم ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الأحزاب:۳۳/۴۰)

''محمد (ﷺ) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین یعنی آخری نبی ورسول ہیں، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

یہ پاکیزہ آیت اس باب میں نص قطعی اور برہان جلی کی حیثیت رکھتی ہے جو صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی اور انبیاء کے سلسلے کا ختم کرنے والا ظاہر کررہی ہے۔

اسی سے متعلق دوسری آیت جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اسلوب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی عالمگیر رسالت اور آپ ﷺ کی شریعت کے تعارف میں بیان کیا ہے جس میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہے، یہ کہ دین حنیف اپنے کمال و انسانی ضروریات کی تکمیل اور بقائے دوام کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدة:۵/۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔''

یہ آیت عرفہ کے دن حجۃ الوداع کے موقع پر سن ۱۰ ھ میں نازل ہوئی جس کے بعد حلت وحرمت کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا اور اس دن کے بعد نبی کریم ﷺ اکیاسی (۸۱) دن اس دار فانی میں رہے اور اکابر صحابہ جو اس دین کے اسرار کو سمجھتے تھے اس آیت سے آنحضرت ﷺ کے وقت مفارقت کے قریب اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کا وقت قریب آجانے کو بھانپ گئے اور بعض صحابہ رونے لگے اور بعض لوگوں نے قیامت کے قریب آجانے کی خبر دی اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی سمجھا اور حجۃ الوداع کے خطبے میں جس میں ایک لاکھ صحابہ کرام حاضر تھے ارشاد فرمایا:

«أيها الناس أنه لا نبي بعدي ولا أمة بعدكم إلا فاعبدوا ربكم، وصلوا خمسكم، وصوموا شهركم، وأدوا زكاة أموالكم طيبة بها أنفسكم، وأطيعوا ولاة أمركم

تدخلوا جنة ربكم» (ابن جریر، تہذیب الآثار)

"اے لوگو! نہ میرے بعد کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے اور نہ تمھارے بعد کوئی امت آنے والی ہے، خوب سن لو کہ اپنے رب کی عبادت کرنا، پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنا، رمضان کے روزے رکھنا اور خوشی سے اپنے مال کی زکوٰۃ دینا، اپنے حاکموں کی اطاعت کرنا، ایسا کرو گے تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

اس باب کی تیسری آیت وہ ہے جس سے اس امت کی خیریت اور افضلیت ثابت ہوتی ہے اور ختم نبوت کا مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۳/۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اس آیت کریمہ نے امت محمدیہ کے شرف عظیم کا اعلان فرمانے کے ساتھ خیر الانبیاء والرسل ﷺ پر ختم نبوت کی طرف سے بھی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ دونوں مضامین کی لطیف مناسبت صاحب ذوق کے لیے مخفی نہیں ہے کہ کمالات نبوت و رسالت کو نبی کریم ﷺ پر ختم کر دیا گیا اس لیے وہ خیر الانبیاء والرسل ہیں، کیا اس مرتبۂ عظمیٰ کے عطا ہو جانے کے بعد کسی نبی کے بعثت کی حاجت و ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

اس سلسلے کی چوتھی آیت جو ختم نبوت کے عقیدے کو بہت واضح طور پر بیان کر رہی ہے حسب ذیل ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ: ۲/۱۴۳)

"ایسے ہی ہم نے تمھیں بہترین امت بنایا تاکہ تم سب لوگوں پر گواہ ہو اور رسول اللہ (ﷺ) تم پر گواہ ہوں۔"

اس آیت میں ختم نبوت کے عقیدے کو بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس باب کی پانچویں آیت جس میں ختم نبوت کی قوی دلیل موجود ہے، ارشاد باری ہے:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الأنبیاء: ۲۱/۱۰۷)

''ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اس آیت کریمہ کے اندر دو طرح سے عقیدۂ ختم نبوت پر قوی ثبوت موجود ہے: پہلے یہ کہ اس آیت میں آپ کی بعثت پر عموم کے ساتھ دلیل موجود ہے اور عموم بعثت کے لیے ختم نبوت کا ہونا لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت کے اندر یہ حکم موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام اہل عالم کے لیے رحمت ہیں اور آپ ﷺ پر ایمان لانا باعث نجات ہے اور اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا نبی دنیا میں پیدا ہو تو آپ ﷺ کی امت کو آپ ﷺ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کی پیروی کرنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ اس نبی پر ایمان لانا اور اس کے فرمان پر چلنا ضروری ہوگا تو ایسی صورت میں آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد دنیا میں کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، آپؐ ہی آخری نبی ہیں۔

اس سلسلے کی چھٹی اور آخری آیت جس میں عقیدۂ ختم نبوت و رسالت کا ثبوت ملتا ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(الأعراف: ۱۵۸/۷)

''اے محمد (ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ میں تمام لوگوں کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، وہ اللہ جس کے لیے زمینوں اور آسمانوں کی حکومت ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا ہے کہ محمد ﷺ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، جس میں عرب و عجم، شرق و غرب کے تمام انسان داخل ہیں۔

الغرض آنحضور ﷺ کی بعثت تمام اقوام عالم کے لیے عام ہے، خواہ موجود ہوں یا آئندہ قیامت تک پیدا ہوں بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان کی بعثت خاص قوموں اور شہروں کی طرف ہوتی تھی جبکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم، افراد اور زمانے کی طرف نہیں ہوئی تھی، بلکہ قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے والے سارے لوگ آپؐ ہی کے امتی ہیں۔

ختم نبوت سے متعلق احادیث صحیحہ

نبی کریم ﷺ نے صرف قرآن کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ نے امت کے لیے اس حقیقت کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ کسی شبے کی گنجائش نہ رہے، اس لیے آپ ﷺ نے نہایت بلیغ اور دل نشیں انداز میں مثالیں دی ہیں جن کو پڑھ کر دیدۂ بینا رکھنے والوں کے سامنے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

① «إن رسول اللّٰه ﷺ قال: فضلت على الأنبياء بست أعطيت جوامع الكلم ونصرت بالرعب وأحلت لی الغنائم وجعلت لی الأرض مسجدا وطهورا أرسلت إلى الخلق كافة وختم بی النبيون» (مسلم، ترمذی، ابن ماجه)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دوسرے نبیوں پر چھ چیزوں کے ذریعے فضیلت عنایت کی گئی ہے۔ مجھے جامع کلمہ عطاء ہوا ہے، رعب وہیبت سے میری مدد کی گئی ہے، مال غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا ہے، زمین میرے لیے عبادت گاہ اور پاک کرنے والی چیز بنائی گئی ہے، میں تمام مخلوقات کی طرف بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر سلسلۂ نبوت کو مکمل کر دیا گیا ہے۔''

② «قال النبی ﷺ : وإن مثلی ومثل الأنبياء من قبلی كمثل رجل بنى بيتا فأحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاوية فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين»(صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب خاتم النبيين)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری اور میرے سے پہلے کے نبیوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے ایک خوبصورت مکان بنایا لیکن اس میں ایک اینٹ چھوڑ دی اور لوگ اسے گھوم گھوم کر دیکھتے اور تعجب کرتے اور کہتے کہ یہاں یہ اینٹ کیوں چھوڑ دی گئی تو میں وہی اینٹ اور خاتم النبیین ہوں۔''

③ «قال رسول اللّٰه إن الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی بعدی»(الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت منقطع ہو گئی ہے اور میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔''

④ «قال النبی ﷺ : وأنا محمد أنا أحمد وأنا الماحی يمحو اللّٰه به الكفر وأنا الحاشر الذی يحشر الناس على عقبی وأنا العاقب الذی ليس بعده نبی» (بخاری، مسلم، كتاب الفضائل)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں اور میں محو کرنے والا ہوں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو محو کرے گا اور میں حاشر ہوں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو میرے بعد حشر کے موقع پر اٹھائے گا اور میں عاقب ہوں (یعنی بعد میں آنے والا ہوں) جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

⑤ قال رسول اللّٰه ﷺ «لم يبعث نبيا إلا حذر أمته الدجال وأنا آخر الأنبياء وأنتم آخر الأمم وهو خارج فيكم لا محالة»(سنن ابن ماجه كتب الفتن)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ نکلا)، اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امتی ہو، لامحالہ اب اس کو تمھارے اندر ہی نکلنا ہے۔''

⑥ قال رسول اللّٰه ﷺ لعلي: أنت مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبي بعدي»

(بخاري، مسلم كتاب المناقب)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اے علیؓ! میرے ساتھ تمھاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کی تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

⑦ قال رسول اللّٰه ﷺ: «وإنه سيكون في أمتي كذابون ثلاثون كلهم يزعم أنه نبي وأنا خاتم النبيين» (أبوداؤد، كتاب الفتن)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری امت میں تیس (۳۰) کذاب ہوں گے، جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

⑧ قال النبي ﷺ: «لو كان بعدي نبي لكان عمر بن الخطاب» (الترمذي، كتاب المناقب)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ بن خطاب ہوتے۔''

⑨ قال رسول اللّٰه ﷺ: «فاني آخر الأنبياء وإن مسجدي آخر المساجد» (مسلم، كتاب الحج)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔''

⑩ قال رسول اللّٰه ﷺ في خطبة يوم حجة الوداع: «يأيها الناس! إنه لا نبي بعدي ولا أمة بعدكم ألا فاعبدوا ربكم، وصلوا خمسكم، وصوموا شهركم، وأدوا زكاة أموالكم طيبة بها أنفسكم، وأطيعوا أمراء كم تدخلوا جنة ربكم» (مسند أحمد ۳۹۱/۲)

''رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ ''اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمھارے بعد کوئی امت نہیں تو اپنے رب کی عبادت کرو، نمازیں پڑھو، رمضان شریف کے روزے رکھو، اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو اور اپنے امیروں کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''[1]

عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں لہٰذا ان ہی چند حدیثوں پر اکتفا کرتا ہوں جو طالب حق کے لیے کافی ووافی ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: تفہیم القرآن سورہ الأحزاب کا ضمیمہ بعنوان ختم نبوت

ختم نبوت عقلی نقطۂ نظر سے

ابر رحمت اس وقت برستا ہے، جب زمین کے لب خشک صدائے العطش بلند کرتے ہیں، باد بہاری چمن کے لیے حیات تازہ کا پیام اس وقت لاتی ہے جب وہ بیدادخزاں سے عاجز آ کر سراپا فریاد و الغیاث بن جاتا ہے، مہر عالم افروز اپنا رخ انور اس وقت بے نقاب کرتا ہے جب تیرگیٔ شب حد سے گزر جاتی ہے اور رداء ظلمت میں دنیا کا دم گھٹنے لگتا ہے، اگر دنیا کے حوادث وتغیرات پر غور کریں تو نظر آئے گا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز بغیر احتیاج وضرورت کے وجود میں نہیں آتی تو کیا عقل سلیم یہ باور کر سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی ورسول اس خاکدان عالم میں اس وقت آ سکتا ہے جب یہاں اس کی کوئی احتیاج وضرورت نہ ہو؟ مقام نبوت انسانیت کی آخری معراج اور ارتقاء انسانی کی اعلیٰ ترین منزل ہے، اس اعلیٰ منزلت کی شخصیت ایسے وقت اور ایسے ظروف واحوال میں بھیجی جائے جب اس کی کوئی ضرورت نہ ہو یہ بات بالکل عقل وفہم کے خلاف معلوم ہوتی ہے، ہمارے نبی کریم ﷺ تیئیس (۲۳) سال تک اپنے وجود مسعود اور ذات گرامی سے اس عالم تیرہ وتار کو منور فرماتے رہے، اس کے بعد اس عالم دنیا سے عالم آخرت میں اپنے رب کریم کے حضور میں تشریف لے گئے اور اپنے ترکے میں آپؐ نے دو چیزیں چھوڑیں، ایک اللہ تعالیٰ کی نورانی کتاب اور دوسری اپنی سنت صحیحہ یعنی اپنے اقوال وافعال وتقریرات اور ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز جماعت صحابہ یعنی ایک لاکھ سے زائد ایسی پاکیزہ شخصیتیں جو براہ راست معلم اعظم ﷺ سے مستفید ہوئی تھیں اور ان کے علوم عالیہ کی حامل ومحافظ اور ان کا عملی نمونہ تھیں۔ قرآن کریم سینوں میں اس طرح محفوظ رہا کہ اس کا ایک ایک حرف ایک ایک شوشہ آج تک محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے جو اسباب حق تعالیٰ نے مہیا فرمادیئے ہیں انھیں دیکھ کر ہر شخص یقین کرنے پر مجبور ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام تا قیام قیامت محفوظ رہے گا۔ اور ہر قسم کے تحریف سے پاک رہے گا، اس کی حفاظت ایسی ہوئی کہ معاند سے معاند غیر مسلم بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ قرآن کریم ہر قسم کی تحریف ُسے مبرا ہے، نہ اس میں کمی ہوئی ہے نہ زیادتی اور نہ اس کے الفاظ وآیتوں میں فرق پڑا ہے بلکہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا اور جو آنحضرت ﷺ نے قبل از وفات امت کے سپرد فرمایا تھا ۔قرآن مجید کا ہر ہر حرف متواتر ہے اور سنت بھی مجموعی طور پر متواتر اور محفوظ ہے۔ کتاب وسنت کی اسی موجودگی کی صورت میں کسی نبی کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے، رشد وہدایت کے یہ دو سرچشمے موجود ہیں اور سارے عالم اسلام کو سیراب کرنے کے لیے بالکل کافی ووافی ہیں۔ ان کے

ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ کسی نبی کی بعثت کی بھی ضرورت ہے ایک سفیہانہ بات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ دین قیامت تک باقی رہے گا اور ظاہری اسباب بھی یہی بتا رہے ہیں کہ اسلام دائمی اور ابدی دین ہے اور کتاب و سنت امت مسلمہ کے لیے دو ایسے سرچشمے ہیں جو کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔ آب حیات کے ان لافانی اور ابدی سرچشموں کے ہوتے ہوئے کسی نبی کے وجود کی پیاس جھوٹی پیاس ہے جو دل و دماغ کی بیماری اور عقل و فہم کی خطرناک علالت کی علامت ہے۔

اگر ہم کسی نئے نبی کی بعثت فرض کریں تو فطرتاً بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں کہ اس نبی کا کام کیا ہوگا؟ وہ شریعت محمدؐیہ کو منسوخ کر کے کسی نئی شریعت کی تعلیم دے گا یا اسی شریعت کا اجرا کرے گا؟ وہ کسی نئی کتاب اور نئی شریعت سے قرآن مجید اور سنت محمدؐیہ کو منسوخ کرے گا یا اسی کتاب اور سنت کی تشریح اور تفصیل کرے گا اور اسی طرح کے بہت سے بے معنی اور بے مقصد سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کا جواب خلاصے کے طور پر یہ ہے کہ آخری نبیؐ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی دوسرے نبی کا اس مقصد سے آنا بالکل بے ضرورت ہے اور یہ مسئلہ صاف ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کے بعد کسی نبی کی بعثت کی کوئی احتیاج اور ضرورت نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث کی رہنمائی قیامت تک کافی اور وافی ہے۔

مدعیان نبوت کا ایک سرسری جائزہ

ان واضح اور محکم آیات اور صحیح و متواتر حدیثوں کی موجودگی میں صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع تھا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد نبوت ختم ہو چکی ہے اور اب کوئی بھی نبی نبوت کے کسی بھی مفہوم میں آنے والا نہیں ہے۔ صحابہ کرام اس لفظ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسی لیے مسیلمہ کذاب کے خلاف قتال کرنے اور اسے کافر اور مرتد قرار دینے پر ہر فرد متفق تھا حالانکہ مسیلمہ بھی نبوت محمدی کا اقرار کرتا تھا اور اذان میں ''اشهد ان محمد رسول الله'' کہتا اور کہلواتا تھا، اسی طرح قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے اس پر عمل کو فرض کہتا تھا لیکن اس کے ساتھ قرآن کی من مانی تفسیر اور الہام کا دعویٰ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ نبوت محمدیؐ میں اسے بھی شریک بنایا گیا ہے، اس طرح وہ نبوت کا ضمنی دروازہ کھولنے والا تھا۔ وہ جنگ یمامہ میں مارا گیا جس میں بارہ سو (۱۲۰۰) منتخب مسلمان شہید ہوئے۔ اسی طرح اسود عنسی نے بھی عہد نبویؐ میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اسے بھی اسی زمانے میں قتل کیا گیا، بعینہٖ بعد کے دور میں بھی یہ فتنہ سر اُٹھاتا رہا، چنانچہ برصغیر ہند کے اندر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کا بہت برا حشر

ہوا۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا انھوں نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی اور نہ اپنے پیروؤں کی کوئی معتد بہ تعداد بنا سکے جس کا مسلمانوں کی جہالت اور مدعیان نبوت کی چالاکی اور ذہانت کی وجہ سے قوی اندیشہ تھا۔ صحیح احادیث میں قیامت تک پیدا ہونے والے مدعیان نبوت کی تعداد ستر (۷۰) سے زیادہ بیان نہیں کی گئی ہے اور یہ امتداد زمانہ امت کی وسعت، جہالت کی کثرت اور عقائد کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے اور یہ مسلمانوں کے ذہن میں ختم نبوت کے عقیدے کے راسخ ہونے اور ان کے رگ و ریشے میں سما جانے اور ان واضح آیات اور صریح و متواتر و مشہور احادیث کا نتیجہ ہے جو ختم نبوت کا اعلان کرتی ہیں۔

بعض دوسری حدیثوں میں قیامت تک ہونے والے مدعیان نبوت کی تعداد تیس (۳۰) بتائی گئی ہے(۱)۔

«عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللّٰه ﷺ أنه سيكون في أمتي كذابون ثلاثون كلهم يزعم أنه نبي اللّٰه وأنا خاتم النبيين لا نبي بعدي»(ابوداؤد، ترمذی)

’’حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’’تحقیق کہ میرے بعد میری امت میں تیس جھوٹے ہوں گے، ان میں سے ہر ایک گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔‘‘

«عن عبداللّٰه بن عمرو الليثي قال : قال رسول اللّٰه ﷺ لا تقوم الساعة حتى يخرج ثلاثون كذابون كلهم يزعم أنه نبي قبل يوم القيامة» (ترمذی)

’’عبداللہ بن عمرو لیثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’قیامت قائم ہونے سے پہلے تیس جھوٹے نبی اپنی نبوت کا دعویٰ کریں گے کہ وہ نبی ہیں۔‘‘

«عن جابر بن سمره رضی اللہ عنہ قال: سمعت النبي ﷺ يقول: أن بين يدي الساعة كذابون فاحذروهم» (مسلم)

’’جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ فرماتے ہیں بیشک میرے اور قیامت کے درمیان جھوٹے نبی بہت ہوں گے، اے مسلمانو! تم ان سے بچو۔‘‘

(۱) فتنۂ قادیانیت اور علامہ ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ، تالیف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، قادیانی مسئلہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ

ان احادیث کی روشنی میں اس مسئلے کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ تاریخ اسلام میں اسلام اور مسلمانوں کو مدعیان نبوت کے فتنے سے زیادہ کسی بڑے اور نازک فتنہ سے دوچار نہیں ہونا پڑا، لیکن ان سب مدعیوں کو کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی، وہ حباب کی طرح اٹھے اور بیٹھ گئے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کی توفیق عطا کرے (آمین)، واللہ ولی التوفیق۔

دعوت و تبلیغ کے میدان میں نبی ﷺ کی بے مثال کامیابی کے مظاہر و اسباب

مولانا نظام الدین اصلاحی، صدر جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

سیرت رسول ﷺ پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ موضوع نہایت ہی مشکل موضوع ہے لیکن اس موضوع اور عنوان پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ دنیا کے کسی موضوع اور عنوان پر شاید ہی اتنا لکھا گیا ہو، ہماری زبان اور قلم کی سعادت ہی یہ ہے کہ اسی عنوان پر لکھنے اور بولنے میں مصروف رہے اور یہ داستان دراز سے دراز تر ہوتی چلی جائے، کچھ ہو اس کا حق ادا کرنے سے انسان قاصر ہی رہے گا۔ یہ ایسا موضوع ہے کہ بڑے سے بڑے اہل قلم بھی اس کا حق ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔

نبی اکرم ﷺ کا سب سے بڑا اُسوہ

ابن آدم کی زندگی کے ہر گوشے کے لیے نمونہ، مثال اور اسوہ آپ ﷺ کی ہی زندگی میں ملے گا، اس کی نجی زندگی ہو یا معاشرتی اور سماجی زندگی ہو، اس کی اجتماعی زندگی ہو یا اس کی سیاسی زندگی ہو، وہ اپنے بال بچوں میں ہو یا ایوان سلطنت پر جلوہ افروز ہو، وہ پیار و محبت اور صلح و آشتی کا درس دے رہا ہو یا میدان جنگ میں داد شجاعت دے رہا ہو، ہر جگہ وہ نبی کاملؐ کے اسوہ کا ہی محتاج ہوگا کیونکہ اسی سے اُسے رہنمائی اور ہدایت مل سکے گی، اس حقیقت کو ماننے اور تسلیم کرنے کے بعد میں جس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کروں گا وہ آپ ﷺ کا اعلاء کلمۃ اللہ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے

آپ ﷺ نے دنیائے عرب میں برپا کیا۔

جب بھی ظلمت شب گہری ہوتی ہے تو روشنی کی ضرورت شدید بھی ہوتی ہے اور قابل قدر بھی، آپ ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا شرک و بت پرستی کی ظلمت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ غلط اور فاسد رسوم و رواج کا دور دورہ تھا، بڑا چھوٹے کا خدا بن بیٹھا، سوسائٹی میں کمزور کا کوئی حق نہیں تھا، عورتیں مردوں کے مظالم کے نیچے سسک رہی تھیں، یہ وراثت میں مال کی طرح تقسیم ہوتی تھیں، ان کی آہ و فغاں سننے والا کوئی نہیں تھا، نوزائیدہ بچیوں کو زندہ رہنے کا حق نہ تھا بلکہ انھیں زندہ دفن کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا، جاگیردارانہ نظام نے پوری سوسائٹی پر پنجے گاڑ رکھے تھے، انسانیت اور تہذیب وتمدن نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی، خاندانی فخر وغرور اور نخوت جاہلیت میں ڈوبی ہوئی انسانیت متعفن اور بدبودار ہو چکی تھی اور اسی نخوت وغرور کا نتیجہ تھا کہ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے برسہا برس یہ لوگ برسر پیکار رہتے اور خون کی ہولی کھیلتے رہتے اور اسے کار شرافت تصور کرتے، اسی کو حالی نے اس طرح بیان کیا ہے:

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا
یوں ہی ہوتی رہتی تھی تکرار ان میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں
وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

عرب کے علاوہ پڑوسی ملکوں کا حال بھی بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا، غربت وافلاس میں دبے، کچلے ہوئے انسان جاگیردارانہ نظام کے نیچے سسک رہے تھے، کوئی ان کی آواز سننے والا نہ تھا، عیش و عشرت کے بازار گرم تھے، جاگیردار طبقہ اپنی دولت وسلطنت کا زور داد عیش دینے میں صرف کر رہا تھا اور اپنی زبان سے برملا اعلان کر رہا تھا:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست [1]

ان حالات بد کے اندر محسن انسانیت رحمۃ للعالمین پیغمبر عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مظلوم و مقہور انسانوں کے نجات دہندہ بن کر تشریف لائے جن کی بعثت کا مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:

---

(۱) ملاحظہ ہو السیرۃ النبویۃ، سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۰۔۳۷۔

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾(الجمعة:٦٢/٢)

''وہی اللہ ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول ﷺ خود انھی میں سے اٹھایا، جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

آپ ﷺ کی انقلابی دعوت

اس انقلابی دعوت کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾(الفتح:٤٨/٢٨)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

معمولی تغیر کے ساتھ یہی آیہ سورہ ''توبہ'' اور سورہ ''صف'' میں بھی وارد ہوئی ہے، ظاہر ہے قرآن مجید میں آپ ؐ کی بعثت کا مقصد بار بار مختلف اسالیب میں بیان کرنے کی ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ومصلحت ہوگی اور وہ حکمت یہی معلوم ہوتی ہے کہ امت کو بھی اس عظیم مقصد کی طرف متوجہ کیا جائے، اس آیت کا مفہوم ومطلب کیا ہے اس کی وضاحت علامہ شوکانی صاحب تفسیر فتح القدیر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

«لیظهره علی الذین کله أی یعلیه علی کل الأدیان (کما یفیده تأکید الجنس وقیل: لیظهر رسوله، والأول أولی) وقد کان ذلك بحمد الله فإن دین الإسلام قد ظهر علی جمیع الأدیان والقهر کل أهل الملل» (فتح القدیر للشوکانی:٥/٥٥، سورہ فتح)

«لیظهره علی الدین کله» کا مطلب یہ ہے کہ آپ ؐ دین اسلام کو دیگر تمام ادیان پر غالب کرنے کی جدوجہد کریں جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ رسول کو تمام ادیان پر غالب کردے) (لیکن پہلا مفہوم بہتر ہے) اور یہ کام بفضلہ تعالیٰ ہو کے رہا، کیونکہ دین اسلام (عملاً) تمام ادیان پر غالب آ گیا اور تمام ملتوں کے لوگ اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔''

دوسری جگہ سورہ ''صف'' میں اسی آیت کے تحت علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«معنی دین الحق الملة الحقة وهی ملة الإسلام، ومعنی لیظهره لیجعله ظاهرا

على جميع الأديان عاليا عليها غالبا لها ولوكره المشركون ذلك فإنه كأن لا محالة» (فتح القدير:۲۲۷/۵، سورہ صف)

''دین حق کے معنی طریقۂ صحیحہ کے ہیں اور وہ طریقہ اسلام کا ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور لیظھرہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طریقۂ اسلامی کو تمام دیگر ادیان پر غالب اور اس کے اوپر حاوی کردے خواہ اسے مشرکین ناپسند ہی کیوں نہ کریں کیونکہ یہ کام تو ہو کر ہی رہے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی دوسرے معبود کی کبریائی یا کسی خانہ ساز خدا کی خدائی منظور نہیں، اسے تو اس دنیا سے مٹ ہی جانا ہے اور صرف خدائے وحدہ لاشریک کی کبریائی دنیا میں قائم ہونی ہے، الرحیق المختوم کے مصنف رقم طراز ہیں:

''رب کی بڑائی و کبریائی بجالانے کی آخری منزل یہ ہے کہ رُوئے زمین پر کسی اور کی کبریائی برقرار نہ رہنے دی جائے بلکہ اس کی شوکت توڑ دی جائے اور اسے الٹ کر رکھ دیا جائے یہاں تک کہ رُوئے زمین پر صرف اللہ کی بڑائی باقی رہے۔''

صاحب کتاب نے یہ مفہوم سورۂ مدثر کی آیت سے اخذ کیا ہے جو مکی سورہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مکی سورتوں میں بھی الملك لله کا واضح تصور پیش کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ o اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ o وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾(الصافات:۳۷/۱۷۱ـ۱۷۳)

''اپنے پیغمبر بندوں کے سلسلے میں ہمارا یہ فیصلہ پہلے گزر چکا ہے، بیشک وہ لوگ منصور ہوں گے اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾(المجادلة:۵۸/۲۱)

''اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب ہو کر رہیں گے، اللہ تعالیٰ قوی اور عزیز ہے۔''

پھر فرمایا:﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾(القمر:۵۴/۴۵)

''عنقریب (مشرکین کا) لشکر شکست کھا جائے گا اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''

پھر فرمایا:

﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾(الأنبياء:۲۱/٤٤)

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم (مکے) کی سرزمین کو تنگ کرتے جارہے ہیں کناروں سے، کیا پھر بھی یہ لوگ غالب ہوسکیں گے۔''

پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾(آل عمران:۳/۱۳۹)

''تم لوگ دل شکستہ نہ ہواور نہ غم کرو، تمھی لوگ بلند و برتر ہوکر رہو گے اگر تم مومن ہو۔''

پھر فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾(المائدہ:٥/٥٦)

''جو لوگ اللہ و رسول اور اہل ایمان کو اپنا ولی بنائیں تو یہ خدا کی جماعت ہی غالب ہوگی۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانۂ قیام مکہ میں اپنی زبان مبارک سے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

«كلمة واحدة تطيعونها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم»(ابن هشام ۲/۲۷)

''یہ ایسا کلمہ ہے کہ اگر تم اس کو تسلیم کرلو گے تو تم اس کے ذریعے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمھارا محکوم ہو جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مکی دور میں خود ھادیٔ برحق ﷺ اور آپؐ کے توسط سے دوسرے لوگ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اسلام کسی نہ کسی دن غالب آ کر رہے گا۔ ایک دوسری حدیث میں وارد ہے:

حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے خباب رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ ایک چادر کا تکیہ لگائے ہوئے کعبہ کے سایہ میں تھے، میں نے عرض کیا ''ہم نے مشرکین سے بڑی اذیتیں برداشت کی ہیں، کیا آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا نہ فرمائیں گے، یہ سن کر آپؐ بیٹھ گئے اور آپ کا چہرۂ اقدس سرخ تھا، پھر فرمایا: تم سے پہلے لوگوں کا لوہے کی کنگھی سے گوشت نوچا جاتا مگر یہ تکلیف ان کو دین سے پھیر نہیں سکتی تھی، ان کے سروں پر آرے رکھ دیئے جاتے تھے اور دو حصوں میں پھاڑ دیئے جاتے تھے، مگر یہ بھی ان کو دین سے پھیر نہیں سکتی تھی، اسلام کو اللہ غالب کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک مسافر صنعاء سے حضر موت تک کا سفر کرے گا اور اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا اور بھیڑیے کا بھی ڈر نہیں ہوگا بکریوں کے سامنے میں، لیکن تم لوگ عجلت کر رہے ہو۔ (۱)

(۱) البخاري، باب دلائل النبوة في الاسلام۔

یہ حدیث اس کشمکش کی پوری داستان حیات بیان کر رہی ہے جو مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان برپا تھی، اس حدیث سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو رہی ہے کہ جس مشن پر آپ ﷺ کو مامور کیا گیا ہے وہ لازماً کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہے گا اور ایک مناسب موقع پر آپؐ نے قسم کھا کر اس حقیقت کو صحابہ کے سامنے کھول دیا اور اسلامی غلبے کے یقینی ہونے کو اس انداز سے واضح فرمایا جس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ آپؐ کے پاس ایک آدمی آیا اور فاقہ کشی کی شکایت کی، پھر ایک دوسرا آدمی آیا اور اس نے ڈاکے کی شکایت کی، پھر آپؐ نے فرمایا: اے عدی! شاید تم اس وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے ہو کہ مسلمان تھوڑے ہیں اور ان کے دشمن بہت ہیں، پس قسم ہے خدا کی عنقریب تنہا عورت قادسیہ سے سفر کر کے مکہ کی زیارت کو آئے گی اور اسے کسی کا خوف نہ ہوگا اور اگر تمھاری زندگی نے تمھارا ساتھ دیا تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے، میں نے عرض کیا کہ کیا کسریٰ بن ہرمز! آپؐ نے فرمایا: ہاں کسریٰ بن ہرمز تو حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ: میں نے مسافر عورت کو سفر کرتے دیکھا کہ وہ قادسیہ سے سفر کر کے کعبہ کا طواف کرتی تھی اور اللہ کے سوا کسی سے ڈرتی نہیں تھی اور میں ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے کسریٰ کے خزانوں کو فتح کیا۔(۱)

اس واقعے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ غلبہء اسلام کا تصور آپؐ کے ذہن میں مکی دور کے اندر واضح تھا، لیکن ایک بنیادی اور اہم بات کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کسی بھی نبی کی دعوت میں خصوصیت سے نبی آخر الزماں ﷺ کی دعوت میں اقتدار پر قبضہ یا حکومت کا حصول اس شکل میں ہرگز مقصود نہیں رہا ہے جو دنیاوی ارباب اقتدار کے یہاں پایا جاتا ہے، نبیؐ کی دعوت میں ایک اہم بات یہ تھی کہ آپؐ نے انسانوں کی زندگیوں کو بدل دیا، ارباب دنیا لوگوں کی گردنوں کو جھکا لیتے ہیں، لیکن ان کے دلوں کو جھکانا نہ ان کے بس میں ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے مقصد میں شامل ہوتا ہے، مگر ہمارے نبیؐ نے لوگوں کے دلوں کو اس طرح جھکایا کہ ان کی گردنیں بخوشی بغیر کسی اکراہ و جبر کے جھکتی چلی گئیں۔

موجودہ دور کے تازہ انقلاب کو آپ ملاحظہ فرمائیں، کارل مارکس اور لینن نے اشتراکیت کے پرفریب نعرے کے ذریعے لوگوں کو مسحور کیا پھر گولی کے ذریعے ان کی گردنوں کو جھکایا اور لاکھوں انسانوں کے سر قلم کر دیئے تاکہ ان کی لاشوں کے ملبے کے اوپر اپنے عیش کدے تعمیر کر سکیں تاکہ یہ

---

(۱) الرسول مصنفہ سعیدی حوی ص ۱۹۹ مطبوعہ ۱۹۶۹ء۔

لوگ رب کائنات کے بجائے خود ہی لوگوں کے ارباب من دُون اللہ بن جائیں، ایسا ہو تو گیا لیکن جس نسل نے اس غیر فطری انقلاب کا منظر دیکھا تھا اسی نسل نے اس کے عبرتناک زوال کا منظر بھی دیکھ لیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لینن اور اسٹالن کے مجسمے ٹھوکریں مار مار کر گرائے جانے لگے اور ان کی قبریں کھول کر ہڈیوں سے بدلہ لینے کے جذبات بھڑک اُٹھے، مگر جو انقلاب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے آیا اس نے لوگوں کی پوری اندرونی حالت کو بدل کر رکھ دیا۔

عادات واطوار، عقیدہ وخیال، نگاہ کا زاویہ، آبائی رسوم ورواج، حقوق وفرائض کے جاہلانہ تصورات، خیر وشر کے معیار اور اطوار زندگی، حرام وحلال اور حق و باطل کے تصورات، صلح و جنگ کے اصول، معاشی و سیاسی اقدار اور سماج و معاشرت کے آداب یہ سب کے سب بدل گئے، غرضیکہ نجی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے ایک ایک گوشے میں ایسی کایا پلٹ گئی جسے چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب تک دل کی دنیا میں انقلاب برپا نہ ہو باہر کی دنیا میں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا اور اگر کسی اتفاقی حادثے کی وجہ سے ایسا ہو بھی جائے تو ایسا انقلاب تادیر قائم نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ اسلام کے اس تصور انقلاب کو ہرگز ذہن سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے یہ اعلان فرمایا:

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (بقرۃ:۲/۲۱)

''اے انسانو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمھیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلے والے لوگوں کو بھی، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ارسل معنا بنی اسرائیل کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں:

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى﴾ (النازعات:۷۹/۱۸۔۱۹)

''پس اس (فرعون) سے کہہ کہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو۔''

بہرحال ان چند سطروں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی کامیابی کے دو نمایاں ترین مظاہر ہیں جن کو کتب سیرت میں روشن باب کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے، ایک انسانی قلوب میں انقلاب برپا کر کے انھیں تقویٰ اور خشیت الٰہی کی دولت سے مالا مال کرنا اور دوسرے اسلام کو ایک حاکم اور طاقت ور نظریے کی حیثیت سے زمین پر برپا کر دینا۔

یہی دونوں مظاہر ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی دعوت وتبلیغ میں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔

بے مثال کامیابی کے اسباب

میرے عنوان کے آخری جزء کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس کامیابی کے اسباب سے بھی بحث کروں، میرے ناقص مطالعے کے مطابق اس کے چند اسباب حسب ذیل ہیں:

① انتھک جدوجہد

آپ ؐ کی اس مقصد کے لیے انتھک جدوجہد اور بے مثال قربانیاں اور آپ ؐ کی محنت شاقہ کا یہ حال تھا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ خطاب کرنا پڑا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾(الکهف:۱۸/۶)

''اچھا تو اے نبیؐ، شاید آپؐ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہیں اگر یہ لوگ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔''

دوسری جگہ فرمایا:﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾(الشعراء:۲۶/۳)

''(اے نبیؐ) شاید آپؐ اس غم میں جان کھودیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

پھر فرمایا:﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾(یونس:۱۰/۹۹)

''تو کیا آپؐ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ ایمان لے آئیں؟''

② قول وعمل میں کامل تطابق

آپؐ نے اپنی زبان سے جو کچھ فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے جو حکم صادر فرمایا اس کو آپؐ نے کر دکھایا اور کیا بھی تو اعلیٰ پیمانے پر کیا۔قرآن مجید میں وارد ہوا:

﴿فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾(الزمر:۳۹/۶۶)

''پس (اے پیغمبرؐ) میری عبادت کیجیے اور شکر گزاروں میں سے ہو جایئے۔''

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اور ہدایت ربانی کے پیش نظر آپؐ کے عمل کا مطالعہ کیا جائے تو بڑی ہی تابناک مثالیں سامنے آتی ہیں۔

آپ ﷺ کی عبادت وشب بیداری کے احوال کثرت سے احادیث میں بیان کئے گئے ہیں، سب کا احاطہ تو ممکن نہیں، البتہ دو احادیث ضرور سماعت فرمائیں:

«أخرج الشيخان عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كان النبي ﷺ يقوم من الليل حتى تنفطر قدماه، فقلت له لم تصنع هذا يارسول الله! وقد غفرلك ما تقدم من ذنبك، وما تأخر، قال: أفلا أكون عبدًا شكورًا»

''شیخین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ آپؐ رات کو تہجد ادا فرماتے یہاں تک کہ آپؐ کے قدم ورم کر جاتے تو میں نے عرض کیا کہ آپؐ ایسا کیوں کرتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مقدم و موخر تمام گناہوں کو معاف کر دیا ہے، آپؐ نے فرمایا: کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

دوسری حدیث میں وارد ہے:

«وأخرج البخاري عن عائشة رضی اللہ عنہا أن رسول الله ﷺ كان يصلي إحدى عشرة ركعة يسجد السجدة من ذلك قدر ما يقرأ أحدكم خمسين آية قبل أن يرفع رأسه ويركع ركعتين قبل صلاة الفجر، ثم يضطجع على شقه الأيمن حتى يأتيه المنادي للصلاة»

''امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گیارہ (۱۱) رکعتیں پڑھتے تھے اور سجدہ اتنا لمبا کرتے تھے کہ جتنے لمبے سجدے میں تم پچاس (۵۰) آیتیں پڑھ لو اور نماز فجر سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے پھر داہنے پہلو پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوتی۔''

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو سراپا رحمت قرار دیا اور اہل ایمان کے حق میں رؤف و رحیم بتایا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبہ:۹/۱۲۸)

''یقیناً تم لوگوں کے پاس ایک رسولؐ آیا ہے جو خود تمھی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اسے شاق گزرتا ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔''

اس کا ایک مثالی نمونہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں: ایک مرتبہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنے والد ماجد سے نبی ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا:

«كان رسول الله ﷺ دائم البشر سهل الخلق لين الجانب ليس بفظ، ولا غليظ،

ولا سخاب، ولا فحاش، ولا عياب، ولا مزاح يتغافل عما لا يشتهي إلى آخر الحديث» (الرسول: ۷٦/۱ سعيد حوى)

''رسول اللہ ﷺ خندہ پیشانی سے ملنے والے، اچھے اخلاق والے اور نرم خو تھے، سخت اور ترش رُو گالی دینے والے یا عیب جُو یا بہت زیادہ مذاق کرنے والے نہیں تھے، غیر پسندیدہ چیزوں سے آپؐ بچتے تھے۔''

اس کے برعکس جب یہ آیت اتری:

﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التحريم:٦٦/٩)

''اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔''

گویا کہ آپؐ عمل جہاد میں سب لوگوں سے فائق تر تھے اور نازک سے نازک مراحل میں بھی کبھی پیچھے نہیں ہٹے میدان بدر میں تین سو تیرہ (۳۱۳) جانبازوں کو لے کر تین گنا دشمن کے مقابلے میں صف آراء ہو گئے اور کامیاب رہے۔

سعید حوی اپنی مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں:

والمعروف أن رسول الله ﷺ ثبت يوم حنين بعشرة من أصحابه إدارتهم المعركة التي فر فيها اثنا عشر إلفا ثم كان النصر بعد الهزيمة (ص:۷۹)

مشہور بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ حنین میں دس ساتھیوں کے ساتھ ثابت قدم رہے، اس جنگ نے لوگوں کو اپنے اندر گھیر رکھا تھا یہاں تک کہ بارہ ہزار آدمی ان سب سے بھاگ گئے تھے، بالآخر شکست کے بعد فتح حاصل ہوئی۔

ان واقعات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کا عمل کس قدر مطابقت رکھتا تھا آپؐ کے نظریے اور اسلامی تعلیم و احکام سے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے جس طرح مقناطیس کی طرف لوہا کھینچتا ہے، یہ بات سب کے نزدیک مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر گئی ہے کہ کوئی دعوت، تحریک اور نظریہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے علمبرداروں کا عمل اُن کے قول کے مطابق نہ ہو جائے، زبانی دعویٰ کرنے والے دنیا میں بہت ملیں گے اور یہی کام سب سے سستا کام ہے، مگر نبی ﷺ کی حیات طیبہ کا آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ وہاں یہ کردار پائیں گے کہ یہاں قول و عمل میں کامل یکسانیت ہے، اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف:٦١/٢-٣)

''تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم وہ بات کہو جسے کرتے نہیں ہو۔''

تالیف قلب: تیسرا سبب جس کی بنا پر آپ ؐ کی دعوت کو بے مثال کامیابی حاصل ہوتی وہ یہ ہے کہ آپ ؐ نے اپنے پیروؤں اور متبعین کو باہم اس طرح شیر وشکر کردیا کہ وہ دو جان یک قالب بن گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا»

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

«المؤمن للمؤمن کالجسد الواحد إذا اشتکی عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی»

''مومن تو آپس میں جسم واحد کی طرح ہوتے ہیں، کہ جسم کے کسی ایک حصے میں تکلیف ہو تو سارا بدن تکلیف اور بخار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

پھر فرمایا: «المؤمن أخو المؤمن لا یسلمه ولا یخذله ....الخ»

''ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہوتا ہے، نہ وہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اُسے رسوا کرتا ہے۔''

ان تعلیمات کی بنا پر آپ نے اپنے متبعین کو سیسہ پلائی ہوئی ایسی دیوار بنا دیا جسے بڑے سے بڑا سیل رواں بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا، یہ لوگ جس میدان میں اُتر جاتے دشمن پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہو جاتا، دل کانپ اُٹھتے اور «تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى» (الحشر:۱۴/۵۹) کا منظر صاف نظر آتا۔

حضرات! آپ اس بات کا یقین رکھیں کہ آپ کی نجات اگر کسی نسخے سے ممکن ہے تو وہ یہی نسخہ کیمیا ہے، اگر سرزمین ہندوستان میں عزت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو اسوۂ رسول ﷺ کو اپنائیے، داعی اسلام بنئے، قول وعمل میں مطابقت پیدا کیجئے، تناقض اور منافقت سے باز آجائیے، نبی کریم علیہ السلام کے لیے اپنی زندگیوں، مال ومتاع حتیٰ کہ آخری قطرۂ خون کو اس راہ حق میں قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جائیے، مسلکی اور گروہی اختلافات کو خیرباد کہیے، فروع کو فروع کی جگہ پر اور اصول کو اصول کی جگہ رکھئے، پھر حالات زمانہ پر نظر رکھ کر اپنے اندر فراستِ مومن پیدا کیجئے اور ہندوستان کی اسلام دشمن طاقتوں اور مسلم دشمن عناصر کو پہچاننے کی کوشش کیجئے، یوں ایک منظم گروہ بن کر میدان عمل میں اُتریے، ان شاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾(الرعد:۱۳/۱۱)

اس آیت کریمہ کا مفہوم حسب ذیل شعر میں بیان ہوا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو خیال جس کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

وآخر دعوانا إن الحمد لله رب العالمين!

❀......❀......❀

علم کا تصور حدیث کی روشنی میں

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ادارہ علوم القرآن، سر سید نگر، علی گڑھ

علوم وفنون کے میدان میں اسلام کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم کی صحیح قدر و قیمت واضح کی اور اس کا ایک بلند و وسیع تصور پیش کرتے ہوئے ان تمام علوم وفنون کی تحصیل و اشاعت کی ترغیب دی جو اللہ تعالیٰ کی صحیح پہچان اس کی مرضی کے مطابق زندگی کی تعمیر اور اس کی مخلوق کے لیے نفع رسانی کا ذریعہ بن سکیں، اس طرح اس نے ''علم برائے علم'' کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے اسے ایک عظیم مقصد کے ساتھ مرتبط و منضبط کیا اور اسی اعتبار سے اس کی معنویت و افادیت کا پیمانہ مقرر کیا، اسلام کا یہ تصور علم قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں کے آئینہ میں صاف دیکھا جا سکتا ہے، یہاں بالخصوص احادیث کی روشنی میں اس علم کی وضاحت مقصود ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کے متعدد اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ ان سب پر اگر غور کیا جائے تو معلم کی حیثیت سے آپ کی شخصیت کا پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر اپنا یہ فضل و کرم قرار دیا ہے کہ اس نے ان میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرمایا جس کے امتیازی اوصاف میں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی شامل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(آل عمران:۳/۱۶٤)

''اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اس نے انھی میں سے ایک رسولؐ مبعوث فرمایا، جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

اس آیت سے نہ صرف یہ کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے مقاصد واضح ہوتے ہیں، بلکہ علم اور تعلیم کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی شخصیت کے جتنے پہلو ہیں ان سب کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں ''معلم'' سے ضرور جڑتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ایک بار مسجد نبویؐ میں کچھ صحابہ کو تعلیم وتعلم کی ایک مجلس میں مصروف دیکھ کر پسند فرمایا اور اس میں شرکت کرتے ہوئے یہ وضاحت فرمائی:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا»(۱) ''اور میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

آپ ﷺ کی بعثت کے مقصد کی وضاحت میں سب سے زیادہ جس حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہے: «إنما بعثت لأتمم حسن الأخلاق»(۲)

''میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین اخلاق کی تکمیل کروں۔''

ظاہر ہے کہ تعلیم وتربیت اس مقصد کی تکمیل کا لازمی جز تھا اور اسی کے ذریعے آپؐ نے اپنے پیغمبرانہ مشن کو پورا کیا۔

احادیث کی روشنی میں تصورِ علم پر غور وفکر کرتے وقت سب سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ نبی ﷺ نے مختلف پیرایوں میں علم کی قدر وقیمت واضح کی ہے اور اس ضمن میں متعدد احادیث مروی ہیں، یہاں ان سب کے احاطہ کی گنجائش نہیں لیکن چند احادیث کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وأغد عالما أو متعلما أو مستمعا أو محبا، ولا تكن الخامس، فتهلك»(۳)

''عالم کی حیثیت سے نکلو یا متعلم کی حیثیت سے یا سننے والے کی حیثیت سے یا (ان سے) محبت کرنے والے کی حیثیت سے، پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔''

---

(۱) جامع الترمذی، أبواب العلم، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، وابن ماجه باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ودارمی، باب فی فضل العلم والعالم۔

(۲) موطأ للامام مالك عيسى البابی الحلبی ۱۹۵۱ء۔ کتاب حسن الخلق، باب ما جاء فی حسن الخلق

(۳) طبرانی، المعجم الصغیر، دهلی، ص:۱۶۲، نیز دیکھئے ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضله، دارالکتب الحدیثة، القاهرة:۱۹۷۵ء، ص:۳۰، ودارمی، باب فی فضل العلم والعلماء۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ان چار صورتوں، عالم، متعلم، مستمع ومحب، میں سے کوئی نہ کوئی صورت ضرور اختیار کرے ورنہ وہ تباہی میں پڑ جائے گا۔ اس حدیث سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو مطلوب تھا کہ انسان اس طرح زندگی بسر کرے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں علم یا اہل علم سے ضرور قائم رہے۔

ایک دوسری حدیث میں علم کی فضیلت واہمیت اس پیرائے میں بیان کی گئی کہ حاصل کی جانے والی چیزوں میں علم سے بڑھ کر اور کوئی دولت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«ما اكتسب مكتسب مثل فضل علم يهدي صاحبه إلى الهدى ويرده عن ردى»(۱)

''کسی حاصل کرنے والے نے علم جیسی فضیلت والی کوئی دوسری چیز حاصل نہ کی جو سیدھی راہ دکھاتی ہے اور ہلاکت سے بچاتی ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ علم کی قدر ومنزلت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ معلم اعظم نبی اکرم ﷺ نے حکمت ودانائی کی بات کو مومن کی متاع گم شدہ قرار دیا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«كلمة الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها»(۲)

''حکمت کا کلمہ مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے، جہاں سے بھی وہ ملے وہ اس کے حصول کا زیادہ مستحق ہے۔''

ہر شخص کو اپنی کھوئی ہوئی چیز کی طلب ہوتی ہے خواہ وہ معمولی ہی درجے کی کیوں نہ ہو اور اس کے ملنے پر جو خوشی ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں، اس لطیف پیرائے میں علم کی تعبیر پیش کرکے آپ ﷺ نے نہ صرف اس کی مہتم بالشان حیثیت کو واضح کیا بلکہ اس حقیقت کی جانب بھی اہل ایمان کو متوجہ کیا کہ علم کی تلاش میں ہر ممکن حد تک کوشش کرنی چاہیے، اور اس تلاش میں اپنے اور بیگانے میں کوئی تفریق روا نہیں رکھنی چاہیے۔

---

(۱) الطبراني، ص:۱۴۰، نیز دیکھیے الديلمي، ارشاد القلوب فی الحکم والمواعظ، دار الفکر، بیروت (بدون تاریخ) ص:۱۱۔

(۲) جامع الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه على العبادة، وابن ماجه ابواب الزهد باب الحكمة (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حدیث کے متن میں حکمت کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے علم مراد لینا غلط نہ ہوگا اس لیے کہ علم کا ماحصل ہی حکمت ودانائی ہوتا ہے اور دوسرے محدثین نے عام طور پر اس روایت کو کتاب العلم کے تحت ذکر کیا ہے)

اس حقیقت پر مزید ثبوت انصار مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھانے کے عوض غزوۂ بدر کے نادار قیدیوں کی رہائی کے مشہور واقعہ سے فراہم ہوتا ہے۔ بادی النظر (۱) میں یہ فدیہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں جنگی قیدیوں کی ایک متبادل شکل میں رہائی کا عام واقعہ ہے، لیکن حقیقت یہ کہ اس سے علم سے متعلق حسب ذیل تین اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

اول یہ کہ: اس سے نبی ﷺ کی نگاہ میں علم و ہنر کی غیر معمولی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے، آپؐ نادار قیدیوں کی رہائی کے لیے دوسری متبادل صورتیں اختیار کر سکتے تھے، لیکن آپؐ نے علم کی اہمیت کے پیش نظر مسلم لڑکوں کو لکھنا سکھانے کی صورت کو ترجیح دی۔

دوسرے یہ کہ: اس سے یہ نکتہ بھی اُبھرتا ہے کہ علوم وفنون کی تحصیل میں معاشرے کی ضروریات اور عصری تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے اس لیے آپ ﷺ نے مدینہ کے زیر تعمیر مسلم معاشرہ کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے لکھنے کا ہنر سکھانے پر خاص زور دیا اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس وقت مدینہ کے مسلمانوں میں اس ہنر کے جاننے والوں کی کمی تھی، خود نبی ﷺ نے قیدیوں کی رہائی کی اس صورت کو پیش کرتے ہوئے اس ضرورت کی جانب اشارہ کیا تھا۔ (۲)

تیسرے یہ کہ: اس امر سے کہ نبی ﷺ نے اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین مخالفین یعنی کفار مکہ سے مسلمانوں کو کتابت کی تعلیم دلانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا، اس سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ حصول علم کے میدان میں اسلام اپنوں اور غیروں میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتا بلکہ وہ اس تصور کا داعی ہے کہ علم وفن کی روشنی اگر دیار غیر میں نظر آئے تو اسے بھی یہ ذوق وشوق حاصل کرنا چاہیے۔

احادیث نبویؐ سے علم کی فضیلت واہمیت اور حصول علم کی ترغیب کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن اس کی تفصیل میں جائے بغیر اصل موضوع کی رعایت سے قابل غور بات یہ ہے کہ ان سب میں بغیر کسی قید کے مطلق "علم" کا لفظ مذکور ہوا ہے، ان احادیث کی تشریح وتوضیح کرتے وقت بعض اوقات "علم" کو علم دین کے ساتھ مقید کر دیا جاتا ہے، لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کا جو وسیع تصور پیش کیا ہے اور اسے بامعنی وبامقصد بنانے کے لیے جو جامع نظام عطا کیا

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، دار المعارف، مصر، ۱۹۴۸ء، ۴/۴۷(۲۲۱۶)۔

(۲) ابن سعد، الطبقات الکبری، بیروت، ۱۹۶۰ء، ۲/۲۲، روایت کے الفاظ یہ ہیں: «وكان أهل مكة يكتبون وأهل المدينة لا يكتبون فمن لم يكن عنده فداء دفع إليه عشرة غلمان من غلمان المدينة فعلمهم فأذا حذقوا فهو فداؤه»

ہے اور جس کا ثبوت خود نبی کریم ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں سے ملتا ہے اس کی روشنی میں علم کے دائرے کو محدود کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، دراصل دینی و دنیوی خانوں میں علم کی تقسیم ایک ایسے تصور حیات پر مبنی ہے جو اسلامی نقطہء نظر سے میل نہیں کھاتا، اسلام میں تعلیم و تعلم سے مقصود جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا عرفان الٰہی کا حصول، اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو ماننا، ان کے مطابق اپنی زندگی سنوارنا اور ایک ایسے معاشرے کو پروان چڑھانا ہے جو صالح وصحت مند روایات کا علمبردار اور انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو، اس لیے اسلام میں دینی علم اور علم دنیوی میں کوئی تفریق ہوسکتی ہے تو وہ انھی مقاصد کی تکمیل وعدم تکمیل کے اعتبار سے اور اسی طرح اگر علم کی اہمیت وافادیت کا کوئی پیمانہ مقرر کیا جاسکتا ہے تو وہ بھی انھی مقاصد کی روشنی میں، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ علوم جو بظاہر دنیوی تصور کیے جاتے ہیں اگر مذکورہ مقاصد کے تحت حاصل کیے جائیں اور انھی کی تکمیل میں استعمال کیے جائیں تو وہ اسلام کی نگاہ میں قابل قدر اور باعث خیر و برکت قرار پائیں گے۔

یہاں اس حقیقت کی جانب اشارہ بہت ضروری ہے کہ اسلام میں علم تفسیر، حدیث وفقہ کو اساسی علوم کی حیثیت حاصل ہے، ان کی اولیت وافضلیت اپنی جگہ مسلم ہے جن سے کسی بھی صورت انکار و اعراض کی گنجائش نہیں، ان کے بغیر نہ تو اسلام میں علم کا تصور ممکن ہوسکتا ہے اور نہ مسلمانوں کا کوئی تعلیمی نظام مکمل ہوسکتا ہے، لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے علوم وفنون بھی ہیں جو ان اساسی علوم کی تحصیل اور ان میں مہارت حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، مثلاً: نحو وصرف، عربی زبان و ادب، علم معانی و بلاغت وغیرہ اور کچھ ایسے علوم بھی ہیں جو ان بنیادی علوم کی افادیت بڑھانے اور ان کے فضائل و برکات کو عام کرنے میں اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً: عربی کے علاوہ دیگر زبانوں کا علم اور مختلف سماجی اور سائنسی علوم، اسلام اپنے وسیع تر تصور علم کے مطابق ان مؤخر الذکر علوم کی ضرورت وافادیت بھی تسلیم کرتا ہے اور ان کے حصول کی ترغیب بھی دیتا ہے جیسا کہ سیرت نبویؐ سے بھی اس کا بین ثبوت ملتا ہے۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عہد نبویؐ میں جملہ تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا محور و مرکز قرآن کریم تھا، حضور اکرم ﷺ نے اس کے معنی ومفہوم کو واضح کرنے اور اس پیغام کو پھیلانے کے لیے مختلف طریقے اور ذرائع اختیار کیے، مقامی طور پر آپؐ خود قرآن کی تعلیم کے سب سے بڑے مرکز تھے جس سے بغیر کسی تفریق کے ہر شخص استفادہ کرسکتا تھا اور علوم و معارف کے خزانے حاصل کرسکتا تھا، ہدایت الٰہی کے مطابق آپ ﷺ صحابہ کے سامنے قرآن کریم کے منشا و مطلب کو واضح کرتے، قرآن کو سمجھنے یا دین کے کسی بھی مسئلے میں انھیں کوئی دشواری پیش آتی تو آپؐ ان کی رہنمائی

فرماتے، اس کے علاوہ آپؐ نے ان کی اجتماعی تعلیم کا بھی اہتمام فرمایا، اس وقت مسجد نبویؐ مسلمانوں کی سب سے بڑی اجتماعی تعلیم گاہ تھی جہاں قرآن وحدیث کی تعلیمات کا مذاکرہ ہوتا تھا اور ان کی روشنی میں زندگی کے مختلف مسائل بھی زیر بحث آتے تھے، مزید برآں مسجد نبویؐ سے ملحق صفہ کے نام سے ایک مخصوص درسگاہ بھی قائم تھی جو خاص طور سے نادار صحابہ کی تعلیم و تربیت کا مرکز تھی، یہ مسلمانوں کی پہلی اقامتی تعلیم گاہ تھی جہاں نبی کریم ﷺ خود بھی درس دیتے تھے اور آپؐ کی ہدایت کے مطابق بعض صحابہ کرام بھی وہاں لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔

قرآن کریم کی تعلیم عام کرنے اور اسلام کے اصول و آداب سکھانے کے لیے آپ ﷺ نے بعض صحابہ کرام کو معلم و مبلغ بنا کر دوسرے علاقوں میں بھی بھیجا، مدینہ کے اطراف اور آس پاس کے علاقوں سے قرآن کریم کی دعوت اور اسلام کے پیغام کو سمجھنے کے لیے جو لوگ انفرادی طور پر یا وفود کی صورت میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے آپ ﷺ ان کی رہنمائی بھی فرماتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے، اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت دور دراز علاقوں تک پھیلانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے تحریری ذریعہ بھی اختیار کیا اور مختلف ملکوں اور علاقوں کے بادشاہوں و حکمرانوں کے یہاں اپنے مخصوص سفراء اپنے تحریری پیغام کے ساتھ روانہ کیے۔

ان ساری تفصیلات سے یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ عہد نبویؐ میں تعلیم و تربیت کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے اور اس نظام تعلیم میں سب سے مقدم و اہم قرآن وحدیث کی تعلیم تھی لیکن اسی کے ساتھ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نگاہ میں ان علوم کی بھی اہمیت تھی جو قرآن وحدیث کی تعلیمات کی اشاعت اور اسلامی ریاست و مسلم معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے، اس کا ایک واضح ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آپؐ نے ضرورت ہی کے تحت صحابہ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی، اللہ کے رسولؐ اور اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے آپؐ کا اور خود مسلم امت کا سابقہ و معاملہ ایسے لوگوں سے بھی تھا جن سے زبانی یا تحریری طور پر رابطہ یا معاملات طے کرنے کے لیے مسلمانوں کو عبرانی زبان سے واقفیت درکار تھی اور آپؐ ہی کی ہدایت کے مطابق بعض صحابہ بالخصوص حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ زبان اچھی طرح سیکھی۔ (۱)

جس کی وجہ سے دوسری قوموں سے مراسلت و معاملات میں آسانی ہوئی، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مختلف زبانوں سے واقف تھے اور دوسرے

(۱) ابن سعد، الطبقات الکبری، بیروت ۱۹۶۰ء، ۲/۳۵۸۔

علاقے کے لوگوں سے انھی کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔(۱)

مزید برآں یہ روایت بھی کافی معروف ہے کہ عرب سے باہر مختلف ملکوں کے حکمرانوں کے نام دعوتی و تبلیغی خطوط بھیجتے وقت نبی کریم ﷺ نے ہر ملک کے لیے خاص طور سے ایسے قاصد منتخب کیے، جو وہاں کی مقامی زبان سے واقف اور وہاں کے ماحول سے مانوس تھے۔(۲)

یہ بات اس سے پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں کی ضرورت ہی کے تحت جنگ بدر کے کچھ قیدیوں کی رہائی کا فدیہ یہ قرار دیا کہ وہ مسلم لڑکوں کو لکھنا سکھا دیں۔

علم فرائض یا احکام شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم کے فن میں مہارت کے لیے فقہ کے ساتھ علم ریاضی سے واقفیت بھی درکار ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد:

«تعلموا الفرائض والقرآن»(۳)

''فرائض کا علم سیکھو اور قرآن مجید کو بھی سیکھو۔''

میں فرائض سے کیا مراد ہے اس باب میں محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد علم الفرائض ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث میں نہ صرف یہ کہ علم فرائض کی اہمیت واضح ہوتی ہے، بلکہ اس کے سیکھنے کی خصوصی تاکید بھی ملتی ہے، یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول:

«إذا لهوتم فالهوا بالرمي وإذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض»

''یعنی جب کھیل کھیلو تو تیر اندازی کا اور جب آپس میں بات چیت کرو تو فرائض کے مسئلہ پر۔''

کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''الفرائض'' سے ''علم فرائض'' مراد لیا ہے اور اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ علم فرائض کے دو پہلو ہیں: ایک احکام میراث کا علم، اور دوسرے علم حساب (۴)

اس کے ساتھ اس کے بھی واضح ثبوت ملتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے بعض حضرات نے اس فن میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی، اس کی تصدیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

«من كان يريد أن يسأل عن الفرائض فليأت زيد بن ثابت» (ابن سعد ۲/۳۵۹)

(۱) محمد بن عبداللہ الحاکم، المستدرک، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳٤۱ھ، ۳/۵٤۹۔

(۲) ابن سعد ۱/۲۵۸۔

(۳) جامع الترمذی، ابواب الفرائض، باب ما جاء فی تعلیم الفرائض،

(٤) کتاب الرد علی المنطقیین، شرف الدین الکتبی واولادہ، بمبئی ۱۹٤۹ء، ص ۲۵۵۔۲۵٦۔

''جو شخص فرائض کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہے وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے رجوع کرے۔''

علم فرائض اور ریاضی میں گہرا تعلق اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے فرائض کا کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے اسے جواب دیا کہ سعید بن جبیر کے پاس چلے جاؤ اس لیے کہ انھیں مجھ سے زیادہ ریاضی کا علم ہے آپ نے فرمایا:

«فإنه أعلم بالحساب مني»(۱)

''پس وہ میری بہ نسبت علم حساب کے زیادہ ماہر ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں علم ریاضی کو اس نقطۂ نظر سے بھی مفید سمجھا جاتا تھا کہ اس سے فرائض کے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی تھی اور دوسری ضروریات کے علاوہ خاص اس مقصد سے بھی اس کے حصول میں دل چسپی لی جاتی تھی۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں ان فنون حرب کے سیکھنے اور ان کی مشق جاری رکھنے کی واضح ہدایات ملتی ہیں جو اس وقت مسلمانوں کی دفاعی قوت کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری تصور کیے جاتے تھے، یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ خود قرآن کریم میں مسلمانوں کو ہر ممکن حد تک اپنی دفاعی قوت مضبوط کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾(الأنفال:۸/۶۰)

''اور تم لوگ جہاں تک تمھارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو۔''

اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس وقت عرب میں جنگی تدابیر میں تیر اندازی کو خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ اس زمانے کے فنون حرب کا لازمی جزو تھا، نبی کریم ﷺ نے مختلف انداز میں اس کی اہمیت واضح کی اور اس کے سیکھنے کی ترغیب دی، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بار منبر پر خطبہ دیتے ہوئے تین دفعہ فرمایا:

«ألا أن القوة الرمي»(۲) ''سنو! بیشک قوت تیر اندازی (میں) ہے۔''

---

(۱) الذهبي، سير اعلام النبلاء ٤/٣٣٦۔

(۲) البخاري، الجهاد، باب التحريض على الرمي وقول الله تعالىٰ:«وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة»

یہاں یہ واضح رہے کہ اسی حدیث میں یہ مذکور ہے کہ اس ارشاد سے قبل نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تیر اندازی کی اہمیت کی جانب توجہ دلانے سے آپ ؐ کا مقصود کیا تھا۔

ایک دوسری حدیث میں اس فن کی فضیلت ایک اور انداز میں بیان کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعے تین اشخاص کو جنت میں داخل فرماتا ہے، اس کا بنانے والا جو اپنی کاریگری کے ذریعے خیر وثواب کا طالب ہو، اس تیر کا چلانے والا اور تیر کے چلانے میں مدد کرنے والا، تم تیراندازی اور گھوڑ سواری کرو اور تمھارا تیراندازی کرنا گھوڑ سواری سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ متعدد احادیث میں تیراندازی سیکھنے کے بعد اس کی مشق جاری رکھنے کی بھی ترغیب ملتی ہے، مثال کے لیے ایک حدیث ملاحظہ ہو، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«ستفتح عليكم أرضون ويكفيكم اللّٰه فلا يعجز أحدكم أن يلهو باسمهه» (۲)

''عنقریب ممالک تمھارے لیے فتح ہوں گے اور اللہ تعالیٰ تمھاری کفایت کرے گا، لیکن تم میں سے کوئی بھی تیراندازی میں کوتاہی وکمزوری نہ دکھائے۔''

قطعی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس فن کے سیکھنے میں دلچسپی لی اور وہ باقاعدہ اس کی مشق کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ (۳)

بعض اوقات نبی اکرم ﷺ اس طرح کی مشقوں اور اس فن کے مظاہروں کو بڑی دل چسپی سے دیکھتے تھے۔ (۴)

جس سے صحابہ کرام میں اس فن کے سیکھنے سکھانے کا اور شوق پیدا ہوتا تھا۔

احادیث شریفہ میں تیراندازی کے علاوہ گھوڑ سواری سیکھنے سکھانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے، ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے کہ اس دور میں اس فن سے بھی جنگی مہمات میں کام لیا جاتا تھا اور

(۱) جامع الترمذی، أبواب الجهاد، باب ما جاء فی فضل الرمی فی سبیل اللّٰه، وابوداؤد، کتاب الجهاد، باب الرمی۔

(۲) مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الرمی والحث علیها۔

(۳) أبوداؤد، کتاب الصلاة، باب وقت المغرب، باب الکسوف، ومسلم، کتاب الامارة، باب فضل الرمی والحث علیها۔

(٤) صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب التحریض علی الرمی، کتاب المغازی، باب غزوة أحد۔

میدان جنگ میں دشمنوں کے مقابلے میں تیزی و پھرتی سے اقدام کرنے میں یہ بہت مؤثر ثابت ہوتا تھا، متعدد احادیث میں گھوڑوں کی پرورش و پرداخت کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور اسے باعث اجر و ثواب بتایا گیا ہے۔(۱)

اس کی وجہ یہی ہے کہ سواری اور معاشی نقطۂ نظر سے مفید ہونے کے علاوہ گھوڑا جہاد کے لیے تیاری اور مسلمانوں کی دفاعی قوت کی مضبوطی کا ذریعہ بنتا تھا اور اس طرح دین کی سربلندی کا سامان فراہم کرتا تھا، اس سے قبل وہ حدیث ذکر کی جاچکی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے تیراندازی اور گھوڑ سواری کی مشق کے لیے ہدایت فرمائی ہے، آپ ﷺ نے جس طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گھوڑ سواری کی ترغیب دی اور ان میں اس کا شوق پیدا کرنا چاہا اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے گھوڑوں (گھڑ سواروں) کے مابین مسابقت کرائی اور سبقت لے جانے والے گھوڑے کو انعام بھی دیا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

«سبق النبی ﷺ بین الخیل وأعطی السابق» (۲)

''نبی کریم ﷺ نے گھوڑوں (گھڑ سواروں) کے مابین مسابقت (دوڑ کا مقابلہ) کرایا اور آگے نکل جانے والے کو (انعام) دیا۔''

ظاہر ہے کہ گھڑ سواری یا تیراندازی کے اس طرح کے مقابلوں اور مشقوں سے مقصود ان فنون میں مسلمانوں کی دل چسپی بڑھانا اور اس میدان میں ان کی استعداد کو پروان چڑھانا تھا، تا کہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔

مذکورہ نوعیت کے علوم وفنون کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے اور حدیثیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اس ضمن میں اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں وہ میرے خیال میں اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہیں کہ احادیث سے نہ صرف یہ کہ قرآن وحدیث کی تعلیم کی اولیت اور دین وشریعت کا علم حاصل کرنے کی افضلیت ثابت ہوتی ہے بلکہ ان سے بعض دیگر علوم وفنون کے سیکھنے سکھانے کی بھی ترغیب ملتی ہے خاص طور سے ان علوم کی جو وقت کے تقاضوں اور مسلم معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کے اعتبار

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل ثلاثة، باب من احتبس فرسا فی سبیل الله، المسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الخیل، النسائی، کتاب الخیل، باب حب الخیل، الترمذی، أبواب الجهاد، باب ماجاء فی فضل الخیل، أحمد بن حنبل:٤/٣٠٠_٣٠١ (٢٨٣٨)، ٢٨٢/٦ (٤٦١٦)،

(۲) أبوداؤد، کتاب الجهاد، باب السبق، مسند أحمد بن حنبل، دارالمعارف، مصر (بدون تاریخ) ٥٣/٨ (٥٦٥٦) نیز دیکھئے ٢٢٥/٩ (٦٤٦٦)

سے مفید اور دین کے افہام وتفہیم اور اس کی تعلیمات کی اشاعت کے لیے کارآمد ثابت ہوں۔

اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ زمانے کی تبدیلی سے معاشرے کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں اور اس طرح ہر دور کے اعتبار سے عصری علوم ومفید فنون کی نوعیت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور ان سب سے اہم یہ کہ افکار و خیالات کی ترجمانی وتشریح کے اسلوب اور علوم وفنون کی نشر و اشاعت کے ذرائع ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتے، بلکہ وہ بھی تغیر وتبدل کے مراحل اور تدریجی ارتقاء کی منازل طے کرتے رہتے ہیں، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں اسلام کے پیغام کو دور دراز علاقوں تک پہنچانے اور ایک وسیع حلقے میں اسے متعارف کرانے کے لیے عبرانی، سریانی، فارسی و رومی، قبطی اور حبشی زبانوں کی واقفیت درکار تھی، تو دور حاضر میں اسلام کی موثر ترجمانی اور وسیع پیمانے پر اس کی تبلیغ کے لیے عربی و فارسی کے علاوہ نئی نئی زبانوں کی جانکاری اور ذرائع وابلاغ کی جدید تکنیک سے واقفیت از بس ضروری ہوگئی ہے۔

اسی طرح اس زمانے میں دفاعی قوت کی مضبوطی اور جنگی مقاصد کے لیے تیاری کافی حد تک تیر اندازی، گھوڑ سواری، تلوار، نیزہ و ڈھال وغیرہ کے استعمال سے منسلک تھی تو آج کے دور میں توپ، میزائیل، بمبار طیاروں، ٹینک و بکتر بند گاڑیوں اور بہت سے جدید ہتھیاروں کی فراہمی اور ان کے استعمال کی مہارت جنگی قوت کی ضامن ہوتی ہے، پہلے کسب معاش کے سیدھے سادے اصول اور صنعت وحرفت کے سادہ طریقے معمول بہ تھے لیکن اب معاش کے ذرائع اتنے ترقی کر چکے ہیں اور ان کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ انسانوں کی معاشی فلاح و بہبود کی خاطر نئے نئے علوم کا اکتساب ناگزیر ہوگیا ہے۔

مزید برآں قرآن کریم کی تصریح کے مطابق قدرت کے بیش بہا وسائل انسانوں کے فائدے کے لیے کائنات میں موجود ہیں، انھیں کام میں لانے اور قابل استعمال بنانے کے لیے ماضی میں جو بھی طریقے رہے ہیں، عصر حاضر میں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصہ بن چکے ہیں۔

درحقیقت اسلام میں بغیر کسی تفریق کے ان علوم وفنون کی تحصیل مطلوب ومحمود ہے جو نفع بخش ہوں اور یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم کا نفع بخش ہونا اس پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے مقاصد کو پورا کر رہا ہے۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ احادیث نبویؐ میں علم نافع کی طلب پر خصوصی زور ملتا ہے، خود نبی کریم ﷺ سے علم نافع کی دعا منقول ہے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ صبح بیدار ہو کر یہ دعا مانگتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّى أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَيِّبًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا» (۱)

''اے اللہ میں تجھ سے نفع بخش علم، پاک روزی اور مقبول عمل مانگتا ہوں۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی ان میں غیر نافع علم بھی شامل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کی ایک مناجات یہ بھی تھی:

«اللّٰهم إنى أعوذبك من الأربع من علم لا ينتفع، ومن دعاء لا يسمع، ومن قلب لا يخشع، ومن نفس لا تشبع» (۲)

''اے اللہ تیری پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ پہنچائے، اس دعاء سے جو قبول نہ ہو، اس دل سے جو نرم نہ ہو اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو۔''

ایک دوسری حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مومنین کو یہ تعلیم دی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع کے لیے دعا کریں اور غیر نفع بخش علم سے پناہ مانگیں۔ (۳)

ان سب کے علاوہ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس علم کو آدمی کی وفات کے بعد بھی اس کے لیے کارآمد بتایا ہے اس کے ساتھ بھی نفع بخش کی صفت لگی ہوئی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إذا مات الانسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له»(٤)

''جب انسان وفات پاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، نفع بخش علم اور صالح اولاد جو متوفی کے لیے دعا کرے۔''

مزید برآں ایک حدیث میں ''بارش و زمین'' کے تمثیلی پیرایہ میں حاملین علم کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ (۵) اور اس تقسیم میں بھی علم کی نافعیت وعدم نافعیت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اگرچہ یہ حدیث خاص طور سے اس علم و ہدایت سے تعلق رکھتی ہے جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے لیکن اس حدیث کے تمثیلی بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حاملین علم تین طرح کے ہوتے ہیں:

---

(۱) ابن ماجه، إقامة الصلاة، باب ما يقال بعد التسليم، نیز دیکھئے ابن ماجه، باب دعاء رسول الله ﷺ

(۲) سنن ابن ماجه، أبواب العلم، باب الانتفاع بالعلم والعمل به، ابن عبدالبر، ص: ۲۱۴، ۲۱۵۔

(۳) سنن ابن ماجه، باب الدعاء، ابن عبدالبر، ص: ۲۱۵۔

(٤) مسلم، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ابن عبدالبر ص: ۱۷۔

(۵) صحيح البخاری، كتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، ابن عبدالبر، ص: ۱۱۔

① اپنے علم سے خود فائدہ اٹھانے والے اور دوسروں کو بھی مستفید کرنے والے۔
② خود فائدہ نہ اٹھانے والے اور دوسروں کو بھی مستفید کرنے والے۔
③ نہ خود فائدہ اٹھانے والے اور نہ دوسروں کو نفع پہنچانے والے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مذکورہ حدیث کی رو سے پہلے طبقے کے اہل علم افضل و قابل قدر قرار پائیں گے۔ ان تفصیلات سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ احادیث میں علم کے باب میں اس پہلو کو خاص اہمیت دی گئی ہے کہ وہ نفع بخش ہو، علم کے نافع ہونے کے دو اہم پہلو ہو سکتے ہیں: ایک خود صاحب علم کے لیے اور دوسرے اوروں کے لیے۔ صاحب علم کے لیے علم کے نفع بخش ہونے سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کرے اور جو کچھ بھی خیر کی بات سیکھے اسے اپنی زندگی میں رچائے بسائے، اگر کسی کا علم اسے بھلائی کی طرف راغب نہیں کرتا اور اس میں خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت پروان نہیں چڑھاتا تو تحصیل علم کے لیے اس کی ساری تگ و دو لا حاصل و بے سود ہوگی۔ حدیث میں واضح انداز میں ایسے عالم کی مذمت کی گئی ہے جو خود اپنے علم سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہتا ہے، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إن من شر الناس عند الله منزلة يوم القيامة عالم لا ينتفع بعلمه» (۱)

''قیامت میں خدا کے نزدیک سب سے بدتر عالم وہ ہوگا جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔''

اسی حقیقت کو ایک دوسری حدیث میں اس پیرائے میں ذہن نشین کرایا گیا ہے، عبدالرحمٰن بن غنم روایت کرتے ہیں کہ ان سے دس صحابیوں نے یہ بیان کیا کہ:

ہم مسجد قبا میں بیٹھے علمی مذاکرے میں مصروف تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمیں دیکھ کر فرمایا کہ: ''جتنا چاہو علم حاصل کرو مگر اللہ تعالیٰ ثواب اسی وقت بخشے گا، جب اپنے علم پر عمل کرو گے۔'' (۲)

علم و عمل کے اسی گہرے تعلق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«يا حملة العلم إعملوا به فإنما العالم من عمل بما علم ووافق علمه عمله» (۳)

''اے اہل علم اپنے علم پر عمل کرو کیونکہ عالم وہی ہے جس نے اپنے حاصل کردہ علم پر عمل کیا اور جس کے علم و عمل میں اختلاف و تباین نہیں ہے۔''

---

(۱) سنن الدارمي، باب العمل بالعلم وحسن النية فيه، ابن عبدالبر، ص:۲۱۶۔
(۲) ابن عبدالبر، ص:۲۴۴۔
(۳) سنن الدارمي، باب من طلب العلم بغير نية فرده العلم إلى النية، ابن عبدالبر، ص:۲۴۵۔

اس طرح ان احادیث سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ علم کے نافع ہونے کا اولین مرحلہ یہ ہے کہ صاحب علم کی زندگی میں اس کی برکات ظاہر ہوں اور اس کا علم اس کی اپنی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہو، کسی کے علم کے دوسروں کے لیے نفع بخش ہونے کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے بھی خیر و نیکی کی طرف رہنمائی کا ذریعہ بنے اور سچ یہ ہے کہ علم کے بنیادی اوصاف میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اچھائی اور نیکی کی راہ دکھائے، نبی کریم ﷺ نے علم کی فضیلت کی وجہ بھی یہی بتائی ہے کہ وہ نیک کاموں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ہلاکت کے کاموں سے بچاتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا۔

احادیث نبویؐ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دین کی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو خصوصی ہدایات ارشاد فرمائیں۔ اس ضمن میں آپ ﷺ کے دو ارشادات بہت معروف ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بلغوا عني ولو آية» (۱) ''مجھ سے (دوسروں تک) پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''

حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے آپ ﷺ نے آخر میں یہ ہدایت فرمائی:

«فليبلغ الشاهد الغائب» (۲)

''پس جو موجود ہیں وہ (میری باتوں کو) ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''

اس کے علاوہ اس سے قبل حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بیان کی جا چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ذکر و دعاء اور علمی مذاکرہ کی دو مجلسوں کو دیکھ کر دوسری مجلس میں شرکت فرمائی اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ لوگ خود بھی علم (دین) سیکھتے ہیں اور جو نہیں جانتے انھیں بھی سکھاتے ہیں۔

مزید براں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی اشاعت علم کی خاص تاکید ملتی ہے:

«تعلموا العلم وعلموه الناس، تعلموا الفرائض وعلموه الناس، تعلموا القرآن وعلموه الناس فإني امرء مقبوض» (۳)

''علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، فرائض کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو سکھاؤ، قرآن سیکھو اور لوگوں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأنبياء، باب ما ذكر عن بني اسرائيل، الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء في الحديث عن بني اسرائيل۔

(۲) البخاري، كتاب العلم، باب قول النبي ﷺ رب مبلغ اوعى من سامع، ابن ماجه، باب من بلغ علما

(۳) سنن الدارمي، باب الاقتداء بالعلماء۔

کو سکھاؤ، اس لیے کہ میں دنیا سے رخصت ہوجانے والا ہوں۔''

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عرب کے مختلف حصوں سے جو افراد یا وفود دین کی طلب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے آپ ﷺ انھیں واضح طور پر یہ ہدایت فرماتے تھے کہ وہ واپس جا کر دوسروں کو بھی اس علم سے مستفید کریں۔

وفد عبدالقیس کے ایک ممبر مالک بن حویرث اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ ہماری واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ارجعوا إلى أهليكم وعلموهم»(۱)

''اپنے گھر والوں کی طرف واپس جاؤ اور انھیں بھی سکھاؤ۔''

اس میں شبہ نہیں کہ آپ ﷺ کے یہ ارشادات بالخصوص قرآن و حدیث کی تعلیمات اور دین کی باتوں کی تبلیغ و اشاعت سے متعلق ہیں، لیکن ان سے ان تمام علوم کی اشاعت کی اہمیت پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جو دین اور اس کے تقاضوں کو جاننے اور ان سے دوسروں کو واقف کرانے کا ذریعہ بنیں، اسی کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن میں عمومی انداز میں علم کی اشاعت پر زور دیا گیا ہے اور مختلف پیرایوں میں اس سے دوسروں کو بہرہ ور کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ علم کو نافع بنانے کا یہ پہلو ذہن نشین ہوجائے۔ نمونے کے طور پر چند احادیث ملاحظہ ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أفضلُ الصدقة أن يتعلم المرء المسلم علما ثم يعلم أخاه المسلم»(۲)

''بہترین صدقہ یہ ہے کہ مسلمان خود علم حاصل کرے اور پھر اپنے مسلم بھائی کو سکھائے۔''

ایک دوسری حدیث میں اسے ایک قیمتی تحفہ قرار دیا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی حکمت و دانائی کی بات سنے اسے دوسروں تک پہنچائے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«نعمت العطية ونعت الهدية كلمة حكمة تسمعها فتنطوى عليها ثم تحملها إلى أخ لك مسلم تعلمه إياها»(۳)

(۱) صحيح البخاری، کتاب العلم، باب تحريض النبی ﷺ وفد عبدالقيس على إن يحفظوا الايمان والعلم ويخبروا من ورائهم

(۲) سنن ابن ماجه، باب ثواب معلم الناس الخير

(۳) ابن عبدالبر، ص:۲۲، الديلمی، ص:۱۱

''کیا ہی عمدہ عطیہ اور کیا ہی بہتر ہدیہ ہے حکمت کا وہ کلمہ جسے تم سنتے ہو اور محفوظ رکھتے ہو، پھر اسے اپنے بھائی تک پہنچاتے ہو اور اسے سکھاتے ہو۔''

علم کی اشاعت یا دوسروں کو اس سے مستفید کرنے کی ترغیب ایک مؤثر انداز میں اس حدیث سے ملتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اچھی بات (خیر) کی جانب کسی کی رہنمائی کی یا اسے علم سکھایا «عَلَّمَ علمًا» تو اسے اس پر عمل کرنے والے کے برابر ثواب ملے گا اور عمل کرنے والے کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔ (۱)

خیر کی جانب رہنمائی پر اجر عظیم کے استحقاق کے علاوہ مذکورہ احادیث سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ابھرتا ہے کہ اشاعت علم یا دوسروں کو اپنے علم سے نفع پہنچانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لمبی چوڑی تقریر کی جائے یا مضامین و کتب کا انبار لگایا جائے بلکہ معمولی و عام بات بھی جس میں خیر و بھلائی کا پہلو ہو کوئی کسی کو بتائے تو وہ «دال علی الخیر» یا اپنے علم کے ذریعے نفع پہنچانے والا کہا جائے گا اور اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، یہ قطعاً ضروری نہیں کہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے یا ڈگریاں جمع کرنے کے بعد جو علمی خدمات انجام دی جائیں یا تحقیقات عالیہ پیش کی جائیں انھی پر اشاعت علم کا اطلاق کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے علم کا جو وسیع تصور پیش کیا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جو کچھ بھی علم کسی کو حاصل ہو یا حکمت و دانائی کی بات معلوم ہو سیدھے سادے انداز میں اسے دوسروں کو بتانا بھی اشاعت علم کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ علم کو نافع بنانے کے لیے اسلام اس کی اشاعت پر بہت زور دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اس بات کا بھی پرزور داعی ہے کہ جو کچھ دوسروں کو سکھایا یا بتایا جائے اس میں خیر و بھلائی کا پہلو مضمر ہو ایسا نہ ہو کہ جو بات کسی کو بتائی یا سکھائی جا رہی ہے وہ اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے ضرر رساں ثابت ہو، نبی کریم ﷺ نے ایک جانب خیر کی طرف رہنمائی کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ: اسے خیر پر عمل کرنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔''(۲)

تو دوسری جانب یہ تنبیہ بھی فرمائی:

---

(۱) مسلم، کتاب العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة ومن دعا إلى هدى وضلالة، الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء فی إن الدال علی الخير كفاعله۔

(۲) جامع الترمذي، أبواب العلم، باب ماجاء فی إن الدال علی الخير كفاعله، ابن ماجه، باب ثواب معلم الناس الخير۔

«ومن أشار على أخيه بأمر يعلم أن الرشد في غيره فقد خانه»(۱)

''جس نے اپنے کسی بھائی کو ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ بھلائی اس کے علاوہ (کسی دوسری بات میں) ہے تو اس نے اپنے بھائی سے خیانت کی۔''

اس حدیث سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جان بوجھ کر کسی کو غلط مشورہ دینا یا ایسی بات کی جانب رہنمائی کرنا جو اس کے مفاد کے خلاف ہو خیانت کے مترادف ہے، اس لیے علم کی اشاعت میں دیانت داری وخلوص کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

دوسرے اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ نشر واشاعت کے مختلف ذرائع سے وہی علوم و فنون منظر عام پر لائے جائیں جن میں دوسروں کے لیے افادیت کا پہلو ہو اور وہی افکار و خیالات مشتہر کیے جائیں جو لوگوں کے ذہن ودماغ کو صحیح رخ پر موڑ سکیں اور ان کی زندگی کی بہتر تعمیر کا ذریعہ بن سکیں۔

حدیث کے حوالے سے یہ بات اوپر واضح کی جا چکی ہے کہ علم کا بنیادی وصف خیر اور بھلائی کی راہ دکھاتا ہے، اگر کسی صاحب علم کی تعلیمی وتبلیغی مصروفیات اور تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں یا اس کے طرز عمل سے اس کے خلاف واقع ہوتا ہے تو وہ گویا کہ علم کی شان کو مجروح اور اس کے مقصد کو ملیا میٹ کر رہا ہے۔

علم کے باب میں حدیث سے یہ اہم نکتہ بھی اُبھرتا ہے کہ اس میں اضافے کی بدستور کوشش جاری رکھنی چاہیے اور قناعت کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، احادیث میں اشاعت علم کی جو خصوصی تاکید ملتی ہے اس پر عمل آوری نہ صرف دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے بلکہ صاحب علم کے لیے منفعت کا یہ پہلو بھی رکھتی ہے کہ یہ اس کے علم میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے، یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ علم ایک ایسی دولت ہے جو محفوظ رکھنے سے نہیں بلکہ خرچ کرنے سے بڑھتی ہے، اسلام کی نگاہ میں علم کی ترقی اور زیادتی کا مطلوب ومحمود ہونا اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا تلقین فرمائی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾(طٰہٰ:۲۰/۱۱۴)

''اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔''

علم میں ترقی واضافہ کے لیے کوشش کی ترغیب احادیث سے بھی ملتی ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب العلم، باب التوقي في الفتیا

’’یہ علم کا نقص ہے کہ اس میں اضافے کا خیال نہ پیدا ہو، زیادتی علم کی خواہش نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔‘‘(۱)

اس حدیث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ علم میں اضافہ کے لیے جدوجہد کرنا حاصل کردہ علم کو خود اپنے لیے مفید بنانا ہے، جو بہر صورت مستحسن ہے۔

مزید برآں ایک دوسری حدیث میں مومن کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اسے علم سے کبھی سیری نہیں ہوتی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’علم سے مومن کو کبھی سیری نہیں ہوتی، وہ اسے حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت میں پہنچ جائے‘‘(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی بھی مرحلہ میں اپنے علم پر قانع نہ ہو بلکہ اس میں اضافہ کے لیے مسلسل کوشش جاری رکھے، اس سے نہ صرف یہ کہ اسے علم میں ترقی نصیب ہوگی بلکہ حدیث کے مطابق وہ اپنے علم سے فائدہ اٹھانے والا بھی متصور ہوگا۔

---

۱) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ (اردو ترجمہ بعنوان ’’العلم والعلماء‘‘ از عبدالرزاق ملیح آبادی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص:۷۵۔

۲) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ (اردو ترجمہ بعنوان ’’العلم والعلماء‘‘ از عبدالرزاق ملیح آبادی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص:۷۹۔

موجودہ دور کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کی اہمیت

بدر عظیم آبادی، جامعہ نگر، نئی دہلی

الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ أجمعین

رسول رحمت ﷺ کا ظہور اس دور میں ہوا جب عالم انسانیت پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، یہ دنیا درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی، یہ جہاں رنگ و بو ظلم و ستم کا مسکن بن چکا تھا، پوری سوسائٹی پر نزع کا عالم طاری تھا۔

نبی رحمت ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی، جب دنیا پستی، بدحالی، گمراہی، بداخلاقی اور بدکرداری کے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

محسن انسانیت ﷺ نے اس ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں جب انسانیت مایوسی، محرومی، ناکامی اور نامرادی کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑی سسک رہی تھی۔

وہ زمانہ جور و استبداد کا تھا، معاشی استحصال اور حقوق کی پامالی کا زمانہ تھا۔

وہ دور شراب نوشی، قمار بازی اور عیش پرستی کا دور تھا۔

وہ وقت دنیا میں جابر حکومتوں، ظالمانہ نظاموں اور غیر منصفانہ قوانین کے پھلنے پھولنے کا وقت تھا۔

انسان کی خدا فراموشی نے اسے خود فراموشی کی سرحد میں داخل کر دیا تھا، وہ مقصد زندگی سے بے خبر اور اپنے انجام سے ناآشنا ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت ان بنجر دلوں میں قوت نمو سے محروم ہو

چکی تھی اور قلب وجگر کے بے آب وگیاہ میدانوں میں پھل پھول لانے سے قاصر تھی، جسم کی آرائش وزیبائش کا سارا سامان موجود تھا، مگر روح کی دنیا ویران پڑی تھی، بھری بہار میں خزاں کا منظر تھا، چراغ جل رہے تھے مگر روشنی کا پتہ نہ تھا، اس لیے تاریکی کو روشنی کا نام دے دیا گیا تھا۔

انسانیت کا جسم تروتازہ تھا، مگر دل نڈھال، دماغ تھکا ہوا اور ضمیر بے حس اور مردہ تھا، نبضیں ڈوب رہی تھیں اور آنکھیں پتھرا رہی تھیں، ایمان ویقین کی دولت سے عرصہ ہوا یہ انسانیت محروم ہو چکی تھی، ساری دنیا پر توھمات کا قبضہ تھا، ایک اللہ کے سوا سب کے سامنے جھکنا منظور تھا۔

مگر صرف ۲۳ برس میں دنیا کا رخ پلٹ گیا، انسان کا ضمیر جاگ اُٹھا، نیکی کا رجحان پیدا ہو گیا، بندگی کا راستہ کھل گیا، انسان کو انسان کے سامنے جھکنے میں شرم محسوس ہونے لگی، اونچ نیچ کی تفریق مٹی، قومی ونسلی غرور ٹوٹا، عورتوں کو حقوق ملے اور ہر نبوت نے اپنے دور میں یہ کارنامہ انجام دیا اور ایسے افراد تیار کیے جنھوں نے اس دنیا کو زندگی بخشی اور زندگی کو با معنی بنا دیا، مگر نبوت کے ان کارناموں میں سب سے زیادہ روشن، تاباں اور درخشاں کارنامہ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا کارنامہ ہے اور مردم سازی اور آدم گری کے اس کام میں اللہ تعالیٰ نے جو کامیابی آپ ﷺ کو عطا فرمائی وہ کبھی کسی انسان کے حصے میں نہیں آئی، آپ ﷺ کے تیار کیے ہوئے افراد میں سے ایک ایک فرد فیضان نبوت کا شاہکار ہے، ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان بے نفسی وخدا ترسی، ان کی پاکبازی و پاکیزگی، ان کا ذوق عبادت اور ان کا شوق شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم وزر سے بے پروائی اور ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور ان کا حسن انتظام، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ آپ ﷺ نے ایسے انسانی افراد تیار کئے کہ ان میں سے ایک ایک فرد ایسا تھا کہ اگر تاریخ شہادت پیش نہ کرتی اور دنیا اس کی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ کے الفاظ میں:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق، فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

(مسجد قرطبہ: بال جبریل)

نبوت کا یہ کارنامہ زمانہء بعثت اور پہلی صدی ہجری کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ ﷺ کی تعلیمات نے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زندگی کے جونمونے چھوڑے تھے وہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں اور وسیع عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ہر شعبۂ زندگی اور صنف کمال میں عظیم انسان پیدا کرتے رہے جن کی انسانی بلندی شک وشبہ اور اختلافات سے بالاتر ہے۔ ان نفوس پاک نے اسی لازوال ''مدرسۂ نبوت'' سے روحانی ترقی، نفس کی پاکیزگی، حوصلہ کی بلندی، انسانی ہمدردی، طبیعت کی فیاضی، ایثار وقربانی، دولت دنیا سے بے نیازی، سلاطین وقت سے بے خوفی، خدا شناسی و خدا دانی اور غیبی حقیقتوں پر ایمان ویقین کا سبق لیا تھا۔ ان کے یقین نے لاکھوں دلوں کو یقین سے بھر دیا تھا۔ ان کی محبت نے لاکھوں انسانوں کے سینوں کو محبت کی حرارت سے گرم وروشن کر دیا تھا۔

جب یہ افراد ایمان ویقین کی آگ میں تپ کر کندن بن گئے تو بندگی اور زندگی کے ہر محاذ پر اپنی اہلیت وصلاحیت اور اپنی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری اور اپنے ذوق عمل اور جذبہء خدمت کا ثبوت اس طرح دیتے چلے گئے کہ تاریخ عالم دنگ اور مؤرخ سکتے میں ہے۔

عالم کی حیثیت میں انھوں نے علم کا دریا اس انداز سے جاری کیا کہ زمین کا ایک بڑا خطہ سیراب ہو گیا۔ بحیثیت طالب علم وہ علم کو عبادت کا درجہ دیتے ہوئے معلوم دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پھیل گئے اور علم صحیح کا چراغ روشن کر آئے۔

عدالت کے قاضی مقرر ہوئے تو ان کے فیصلوں سے عدالت کے بام ودر میں زلزلہ آ گیا، وہ اگر حاکم ہوتے تو راتوں کو پہرہ دیتے اور دن کو زہد وفقر، ایثار وقربانی اور جفاکشی وسادگی کا ایسا نمونہ پیش کرتے کہ دنیا محو حیرت رہ جاتی، وہ اگر فوجوں کے قائد اور سپہ سالار ہوتے تو جنگی قابلیت، شجاعت اور مرحمت کا ثبوت دیتے اور جب اس منصب جلیلہ سے معزول کیے جاتے تو ان کی پیشانی پر ناراضگی کی ایک شکن بھی نظر نہ آتی۔

یہ دنیا کسی باغباں کا آراستہ باغ ہے، کوئی خودرو جنگل نہیں اور انسان اس حسین باغ کا سب سے

خوبصورت، سب سے زیادہ دلآویز اور سب سے اعلیٰ پھول ہے، یہ پھول باغبان کی آرزو اور ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے، اس لیے اس کی قدر و قیمت باغباں سے زیادہ کون جان سکتا ہے، لہٰذا وہ کب برداشت کرتا کہ اس نازش چمن کو مرجھانے کے لیے چھوڑ دیا جائے، اس کو ڈالیوں سے توڑ کر زمین پر ڈال دیا جائے، یا پیروں سے مسل دیا جائے وہ کب پسند کرتا کہ وہ خالق کے بجائے مخلوق کے سامنے سجدہ ریز ہو، کسی درخت، کسی پہاڑ اور پتھر، کسی دھات اور جمادات، کسی مال و دولت، کسی جاہ و منصب، کسی روحانیت وعظمت اور کسی مخفی وفرضی طاقت کے آگے سر جھکائے اور روز اول اس کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرا کے اور اس کو اللہ کے سوا ہر ایک کے سامنے سجدہ سے منع کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات کی ساری طاقتیں فرشتے جن کے امین ہیں، اس کے سامنے سر بہ سجود ہیں اور اس کے جواب میں اس کا سر اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

مگر وہ بار بار بھولتا رہا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور چھٹی صدی مسیحی تک تو اس کو بالکل یاد نہیں رہا کہ کہاں جانا ہے؟ اس کا اصل میدان کیا ہے؟ اس کی جستجو کا نشانہ کیا ہے؟ اس کی کوئی منزل تھی بھی تو بالکل موہوم، اس کی جدوجہد اور تگ و دو کے دائرے اتنے چھوٹے اور تنگ تھے کہ ساری محنتیں اور کاوشیں سعی رائیگاں سے زیادہ نہ تھیں اور انسانوں کی ذہانت اور قوت عمل ضائع ہو رہی تھی۔ انسان کی کامیابی اور بڑائی کا مطلب تھا دولت مند بن جانا، طاقت ور اور حاکم بن جانا، وسیع سے وسیع رقبۂ زمین پر فرماں روائی قائم کر لینا۔ ان کے تخیل کی پرواز نقش و نگار، رنگ و آہنگ، لذت و ذائقہ، گل وبلبل اور طاؤس ورباب سے بلند نہ تھی۔

جناب رسول اکرم ﷺ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نسل انسانی کی کھوئی ہوئی منزل ڈھونڈ نکالی اور اس کے سامنے لا کر کھڑی کر دی اور جب راہ گم کردہ راہی کو اس کی منزل مل گئی تو وہ یقین و اعتماد کے ساتھ اس منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا اور وہ منزل تھی خالق کائنات کی معرفت، ایمان و یقین کا حصول، اللہ کی محبت ومحبوبیت، اس کی رضا، کثرت میں وحدت کی تلاش، باطنی قوتوں کی ترقی، خدمت انسانی اور ایثار وقربانی۔ یہی انسان کی حقیقی سعادت ہے اور یہی کمال آدمیت ہے اور یہی انسان کی کوششوں کا حقیقی میدان ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت کے بعد دنیا کا رنگ بدل گیا، صبح وشام بدل گئے، انسانوں کا ذہن بدل گیا، نفع وضرر کا پیمانہ بدل گیا، دلوں میں محبت الٰہی کا شعلہ بھڑکا اور دور جاہلیت کا سارا خس وخاشاک جل کر راکھ ہو گیا۔ دنیا کے کروڑوں انسان حقیقی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ قلوب میں نئی حرارت لیے، دماغوں میں نیا جذبہ لیے، سروں میں نیا سودا لیے انسانیت صدیوں کی نیند سوتے

سوتے اچانک جاگ اٹھی اور صہبائے محبت کے متوالے اسی دھن میں عرب سے عجم تک پھیل گئے۔ پھر تھوڑی سی مدت میں مصر وشام، عراق وخراسان، ایران اور ترکستان، اور ہمارا ملک ہندوستان شمالی افریقہ اور اسپین اور جزائر شرق الہند صدائے حق سے گونج اُٹھے۔

ان میں سے کوئی بھی اپنی ذاتی راحت اور ترقی کے لیے فکر مند نہیں بلکہ نوع انسانی کی نجات کے لیے بے چین ہے، کوئی بھی اپنے لیے کوئی مصنوعی جنت بنانے کا خواہشمند نہیں بلکہ جنت سے نکالے ہوئے انسان کو حقیقی جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل کرنا چاہتا ہے، اپنے لیے مال و دولت اور تخت و تاج کا کوشاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کو انسانی غلامی سے نکال کر بادشاہ حقیقی کی غلامی میں داخل کرنا چاہتا ہے، یہ امت اسی بنیاد پر بنی اور یہی پیغام لے کر تمام دنیا میں پھیل گئی۔ اس کے سفیروں نے قیصر وکسریٰ کے بھرے دربار میں کہہ دیا کہ ہم کو اللہ نے اس کام کے لیے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں، دنیا کو تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے دامنِ انصاف میں داخل کریں۔

درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے تیار کئے جا رہے تھے جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا، اس کے لیے واقعی ایک نئی امت کی ضرورت تھی جو نبی آخر الزماں ﷺ کے بعد بھی نبوت کی ذمہ داریوں کو انجام دیتی رہی ہے۔ اس لیے اس امت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:۳/۱۱۰)

”(جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں) تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

بس یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اس امت نے بڑی سے بڑی قربانی دی، دنیا کی تمام کامیابیوں اور راحتوں کی جانب سے منہ موڑ لیا، گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہوئے، اپنی تجارتوں کو تباہ کیا، عمر بھر کی کمائی لٹادی، اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کیا اور اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔

اب اگر عام مسلمانوں کو انھی مقاصد اور مشاغل پر قانع ہو جانا تھا جن پر زمانہء بعثت کی تمام قومیں تھیں، اگر مسلمانوں کو اسی سطح پر آ جانا تھا جس پر دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی نظر آتی ہے، اگر

دولت وسرداری عیش وعشرت اور راحت وتن آسانی کے اسی سمندر میں کود پڑنا تھا جس میں اہل عرب اور رومی وایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انھی کامیابیوں کو منتہائے زندگی بنالینا تھا جن کو ان کے پیغمبر (ﷺ) بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو پھر بدر وحنین واحزاب اور قادسیہ ویرموک کے میدانوں میں بہایا ہوا خون رائیگاں گیا۔

رسول اکرم ﷺ کے دل میں مسلمانوں کے متعلق بھی یہی کھٹکا تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا مقصد نہ بھول بیٹھیں اور دنیا کی عام روش پر نہ چل پڑیں، چنانچہ اپنی وفات کے قریب مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

> ''مجھے تمھارے بارے میں فقر وافلاس کا کچھ خطرہ نہیں ہے، مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی، تو تم بھی اسی طرح اس میں حرص ومقابلہ کرنے لگو جیسے انھوں نے کیا، تو یہ تم کو بھی اسی طرح ہلاک کردے جیسے ان کو ہلاک کیا۔'' (بخاری ومسلم)

ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے، وہ خلائی گاڑی تیار کرسکتی ہے، انسان کو چاند تک پہنچا سکتی ہے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرسکتی ہے اور وہ علم وہنر کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کا دعویٰ بھی کرسکتی ہے، مگر وہ ایسے انسان پیدا کرنے میں شرمناک حد تک ناکام رہی ہے جو معاشرۂ انسانی میں صالح اور صحت مند انقلاب برپا کرسکیں، وہ ایسے افراد بنانے سے قطعاً عاجز ہے جو صاحب یقین ہوں۔ یہی اس دور کی اصل بدقسمتی ہے اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع ہو رہی ہیں اور ساری دنیا مایوسی، محرومی، انتشار اور اضطراب کا شکار ہے، اب اس کا اعتقاد علم اور سائنس سے بھی اٹھتا جارہا ہے، اس لیے کہ سائنس رحمت سے زیادہ لعنت بنتی جارہی ہے اور علم سے روشنی کے بجائے فکر وعمل کی دنیا میں اندھیرا بڑھتا جارہا ہے، فاسد افراد نے صالح ذرائع ووسائل کو بھی فاسد بنادیا ہے۔

نئی فکری قیادت نے جو افراد دنیا کو عطاء کئے ہیں وہ ایمان ویقین سے خالی، ضمیر انسانی سے عاری، محبت وخلوص کے مفہوم سے ناآشنا اور انسانیت کے شرف واحترام سے غافل ہیں۔ وہ تو صرف فلسفۂ لذت سے واقف ہیں یا صرف قوم پرستی اور وطن دوستی کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ اس نوعیت اور صلاحیت کے افراد خواہ جمہوری نظام کے سربراہ ہوں یا اشتراکی نظام کے ذمہ دار، کبھی کوئی صالح معاشرہ، پرامن ماحول اور خدا ترس وپاکباز سوسائٹی قائم نہیں کرسکتے اور ان پر اللہ کی مخلوق اور انسانی کنبے کی قسمت کے بارے میں کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

قلب کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور جمانے، گناہ اور بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال وزر، ملک وسلطنت، عزت ووجاہت اور ریاست وتفوق کی سحرانگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت صرف پیغمبر آخرالزماں ﷺ کے پیغام میں ہے۔ آپ ﷺ نے دنیا کو نہ سائنس دی نہ ایجادیں عطا کیں اور نہ یہ مقصد نبوت تھا، آپ ﷺ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دنیا کو ایسے افراد دیئے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں اور دنیا کو صحیح راستے پر چلا سکتے ہیں، ہر شئے سے خود نفع اُٹھا سکتے ہیں اور دوسروں کو پہنچا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہیں۔

تاریخ عالم کا سینہ کھول کر دیکھئے تو ہر دور میں شیریں مقال واعظ بھی نظر آتے ہیں اور آتش بیاں خطیب بھی، فلسفہ طراز ادیب بھی، جنگجو فاتحین بھی اور ایسی انقلابی طاقتیں بھی جنھوں نے نقشۂ حیات بدل کر رکھ دیا۔ یہاں ایسے بادشاہوں اور حکمرانوں کی کمی نہیں جنھوں نے دنیا کے وسیع تر علاقوں میں عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ ہمیں یہاں بڑی بڑی مضبوط ومستحکم جماعتیں بنا کر اسے پروان چڑھانے والے بھی ملتے ہیں، ایسے افراد بھی ملتے ہیں جنہوں نے تہذیب وتمدن کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ہمیں رنگا رنگ مذاہب کی بنیاد رکھنے والے بھی کثرت سے مل جاتے ہیں، اخلاقی معیار کے علمبردار بھی سامنے آتے ہیں، مگر ان تمام افراد اور طاقتوں میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے، وہ یہ کہ ان کے اثرات زندگی کے صرف ایک گوشے پر ابھرتے ہیں، ان کی تعلیمات اور کارناموں میں خیر وفلاح کا کوئی عنصر نظر بھی آتا ہے تو اس کی حیثیت جزوی ہے اور پھر اس خیر وفلاح کا اثر جتنا ظاہری سطح پر نظر آتا ہے اتنا باطن کی گہرائیوں میں دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں تاریخ انسانیت میں کوئی عنصر ایسا نظر نہیں آتا جس نے پورے کے پورے انسان کو اندر سے بدل کر رکھ دیا ہو، جس نے مجموعی طور پر انسانوں کے ظاہر وباطن کو ایک ساتھ تبدیل کر دیا ہو۔

المختصر پیغمبر آخرالزماں رسول اکرم ﷺ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت وہدایت نے پورے کے پورے اجتماع انسانی کو اندر سے بدل کر رکھ دیا اور اللہ کی مدد سے ایمان وعقیدہ کی ایسی روشنی ان کے سینوں میں اُتار دی کہ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب بن گیا، جس کی ضوفشانی آج بھی روشن آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

آپ ﷺ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پتھر کے پجاریوں کو ہی نہیں، پتھروں جیسے بے حس افراد کو بھی تراش کر جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔

سیرۃ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حقوق نسواں

مولانا کمال الدین اثری، استاذ سراج العلوم بونڈھیار، گونڈہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله محمد وآله وأصحابه وأتباعه إلى يوم الدين، إما بعد:

آفتاب رسالت کی ضوفشانی سے پہلے عورت کسی قطار و شمار میں نہ تھی، جور و ستم اور ظلم و تعدی کے بوجھ تلے رہ رہی تھی۔ یونان و روم میں عورت بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اہل یونان کا قول تھا:

"آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ہو سکتا ہے مگر عورت کے شر کا علاج محال ہے۔"

نیڈورا نامی ایک عورت کے بارے میں ان کا عام اعتقاد تھا کہ وہی تمام دنیاوی آلام و مصائب کی جڑ ہے۔

یورپ کے حکماء کا کہنا تھا کہ: عورت ایسا خوبصورت درخت ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا پھل نہایت کڑوا ہے، عورت فتنہ و فساد کی جڑ ہے، امن و شانتی کی دشمن ہے اور ایسا بچھو ہے جو ہر وقت ڈنگ مارتا رہتا ہے، ہم سانپ سے محبت کر سکتے ہیں لیکن عورت سے محبت کرنا گوارا نہیں کرتے۔ (۱)

یہودیت کی تعلیم سے پتہ چلتا ہے کہ مرد نیک سرشت و نیک کردار ہے اور عورت بدطینت و مکار ہے، مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی، اسی طرح عورت کو دوسری

(۱) ہسٹری آف دی ورلڈ از سینٹ ہیلر، بحوالہ مرآۃ النساء۔

شادی کرنے کا حق نہیں تھا۔ (۱)

عیسائیت کی تعلیم یہ تصور دیتی ہے کہ عورت انتہاء درجے کی پست اور ذلیل صنف ہے، عورت شیطان کا دروازہ ہے، عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سے سیکھنا چاہیے، اسے سکھانے کی اجازت نہیں۔

ہندومت کی تعلیم یہ پتہ دیتی ہے کہ عورت کو بچپن سے بڑھاپے تک غلامی ومحکومی کی زندگی گزارنا چاہیے، لڑکپن میں اپنے باپ کی غلامی کرے، جوانی میں اپنے شوہر کی اور بڑھاپے میں اپنے بیٹے کی، وہ گھر میں کبھی کوئی کام خودمختاری سے نہ کرے۔ عورت کے لیے قربانی کرنا اور برت رکھنا گناہ ہے، اسے چاہیے کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شوہر کا نام بھی نہ لے بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہو جائے، کم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔ جھوٹ بولنا، بغیر سوچے کام کرنا، فریب، حماقت، لالچ، ناپاکی، بے رحمی یہ عورت کے فطری عیوب ہیں۔ (۲)

سرزمین عرب میں اس پر ظلم وزیادتی کی حد ہو گئی تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد چند سانس لیتے ہی اسے زندہ درگور کر دیا جاتا۔ جو بچیاں کسی طرح زندہ بچ جاتیں تو والدین کی وراثت سے انھیں حصہ دینا سماج میں گناہ تصور کیا جاتا۔ سن بلوغت کے بعد حیض کے ایام میں اچھوتوں کی طرح ایک مخصوص جگہ میں رہنا پڑتا۔ گھر میں چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور برتن وغیرہ چھونے کی اجازت نہ ہوتی۔ بعض قبائل کے لوگ اپنی لونڈیوں کو ناچ گانا سکھا کر ان سے عصمت فروشی کراتے اور اس سے روزی روٹی حاصل کرتے۔ جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو اس کی بیوہ بھی اس کی متروکہ جائیداد کا ایک حصہ قرار پاتی اور کسی وارث کے حصے میں چلی جاتی۔ اس کا وارث چاہتا تو خود اس سے نکاح کر لیتا یا کسی اور سے اس کا نکاح کرا دیتا اور عورت کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہ ہوتا۔ عورت کی حیثیت ان کے نزدیک صرف اتنی تھی کہ وہ پوری زندگی مرد کی محکومی وغلامی میں گزارے۔ مرد جب چاہتا اس کو اپنے نکاح میں رکھتا اور جب چاہتا اس کو طلاق دے کر اپنے گھر سے نکال دیتا۔ طلاق کا طریقہ بھی بڑا ظالمانہ تھا۔ ایک مرد کئی بار طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع کر لیتا۔ سو بار طلاق دے اور سو بار رجوع کر لے اس کے لیے کوئی حد اور پابندی نہیں تھی۔

جاہل عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت امن وسکون کو ختم کر دینے والی ہے۔ مرد کی تباہی کا ذریعہ ہے۔ نحوست کا مجسمہ ہے اور ایک ایسی جوتی ہے جو جلد خراب ہو کر انسان کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ بعض بے غیرت لوگ خود آرام وراحت کی زندگی گزارتے، شراب وکباب کھاتے پیتے، جوا کھیلتے اور

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا بحوالہ عورت اسلامی معاشرہ میں۔

(۲) تفصیل ہندو دھرم کی کتاب منوسمرتی میں ملاحظہ کریں، بحوالہ عورت اسلامی معاشرہ میں۔

اپنی بیویوں سے دوسروں کے یہاں کمواتے۔ (۱)

ایران وعراق، طبرستان اور اسپین میں بھی عورت قعر مذلت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اہل اندلس کہا کرتے تھے کہ عورت انسان کے واسطے ذلت کا سبب ہے، اس کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلنا پڑا اور اولاد آدم عورت ہی کی وجہ سے بے پایاں آرام وراحت سے محروم ہوئی، اہل طبرستان کا کہنا تھا کہ عورت تمام درندوں سے زیادہ بھیانک ہے۔ درندوں کے ہجوم اور ان کے حملوں سے تو بچا جا سکتا ہے مگر عورت کے مکروفریب سے بچنا ناممکن اور محال ہے۔ (۲)

حاصل یہ کہ ساری دنیا کی ستائی ہوئی عورت اپنی بے آبروئی اور بے عزتی اور اپنی ذلت وپستی پر آنسو بہا رہی تھی، ہر طرح کے حقوق سے محروم اپنی قسمت پر رو رہی تھی، ظلم وستم سے تنگ آکر درد وکرب سے کراہ رہی تھی کہ رحمت الٰہی جوش میں آئی اور محسن انسانیت ورحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی ہمدردی اور پوری توجہ سے اس کی مصیبت کو سنا، اس کے آنسو پونچھے اور اس کے سر پر شفقت ومحبت کا ہاتھ پھیرا، اسے مرد کی طرح زندہ رہنے کا حق دیا، انسان کی تخلیق میں مرد کے برابر شریک بتایا۔ اس کو مرد کی طرح حقدار قرار دیا، عبادت میں مرد کے ساتھ شریک ٹھہرایا وراثت میں حق دلایا، کسب معاش سے سبکدوش کیا، مرد کے لیے سکون وراحت کا سبب ٹھہرایا، اسے بہترین متاع زیست قرار دیا اور فرمایا کہ صالح عورت دنیا کی سب سے بہترین متاع ہے، نکاح میں اس کی مرضی کا خیال رکھا، ظالم وبدخلق شوہر سے بذریعۂ خلع چھٹکارا حاصل کرنے کا حق دلایا، بیوہ ہو جانے پر دوسری شادی کرنے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ خود اپنی پہلی شادی ایک بیوہ عورت سے کی، مختلف حیثیت سے اسے مناسب مقام عطا کیا اور اسے پروانۂ جنت بھی دیا، سبحان اللہ:

رسولؐ آئے تو روشن ہوئی ہر ایک ظلمت
وگرنہ رات کا دامن ستارہ بار نہ تھا

اب ہم قدرے تفصیل کے ساتھ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں حقوق نسواں کا رخ زیبا دکھاتے ہیں تاکہ صنف نازک کا مقام صاف اور واضح طور پر سامنے آجائے۔

---

(۱) تاریخ طبری اور علامہ بلاذری کی فتوح البلدان وغیرہ میں عورت کی خستہ حالی کا تفصیلی بیان دیکھا جا سکتا ہے۔
(۲) تفصیلی معلومات کے لیے روضۃ المناظر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، بحوالہ مراۃ النساء از حکیم محمد صادق سیالکوٹی۔

عورت کو بھی جینے کا حق حاصل ہے

مذہب اسلام نے مرد کے ساتھ عورت کو بھی زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہونے کا حق عطا کیا ہے اور فقر و فاقہ کے خوف سے اولاد (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) کو مار ڈالنے کو جرم عظیم اور بڑا گناہ قرار دیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾(الاسراء:۱۷/۳۱)

''اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں اور تم کو روزی دیتے ہیں ان کو قتل کرنا یقیناً بڑا گناہ ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اس کے باوجود کہ اس نے پیدا کیا، پھر پوچھا اس کے بعد، فرمایا تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی۔ (۱)

لڑکی کے وجود کو رسوائی و ذلت کا ذریعہ قرار دے کر دنیا میں سانس لیتے ہی اسے زندہ درگور کر دینا یا درندوں اور زہریلے جانوروں کی طرح اسے خطرناک سمجھ کر زندگی سے محروم کر دینا، یہ ایسا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کے مجرموں سے کچھ پوچھنا بھی گوارا نہ کرے گا اور زندہ درگور کی گئی لڑکیوں سے صرف اتنا پوچھ کر کہ انھیں کس گناہ کی بنا پر زندہ درگور کر دیا گیا ان کے قاتلوں کو جہنم رسید کر دے گا، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾(التکویر:۸۱/۸۔۹)

''اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی وجہ سے قتل کی گئی۔''

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«إن اللّٰه حرم عليكم عقوق الأمهات ووأد البنات ....الخ» (۲)

''یقیناً اللہ نے ماؤں کی نافرمانی کرنے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کو حرام کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عورت کو رہتی دنیا تک زندہ رہنے کا حق دیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انسانی معاشرے میں اسے سانس لینے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

(۱) صحيح البخاری، كتاب الآداب، باب قتل الولد خشية ان يأكل معه، ج:۲

(۲) صحيح مسلم، كتاب الاقضيه، باب النهي عن كثرة المسائل من غير حاجة، ج:۲، وصحيح البخاری، كتاب الآداب، باب عقوق الوالدين من الكبائر، ج:۲

عورت انسان کی تخلیق میں مرد کے برابر شریک ہے

مذہب اسلام نے انسانی تخلیق و تزئین میں عورت کو مرد کے برابر شریک ٹھہرایا ہے، اللہ بزرگ و برتر نے خاتم الانبیاء ﷺ کی زبانی ساری دنیا کے انسانوں کو بتایا کہ ہم نے تمھاری تخلیق ایک مرد اور ایک عورت کے ذریعے کی ہے، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾(الحجرات:۴۹/۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے (والا) بنایا تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، بلا شبہ اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔"

اس حقیقت کی تصویر کشی علامہ اقبال رحمہ اللہ نے یوں کی ہے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

عورت عبادت میں مرد کے ساتھ شریک ہے

جس طرح مرد اپنے رب کی عبادت و بندگی کر کے نیک اور صالح بن سکتا ہے اسی طرح عورت بھی نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور قربانی وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قربت و نزدیکی حاصل کر سکتی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید میں اگر مردوں کو مسلمین کہا گیا ہے تو عورتوں کو بھی مسلمات فرمایا گیا ہے، اگر مردوں کو مومنین کہا گیا ہے تو عورتوں کو بھی مومنات فرمایا گیا ہے، اگر مردوں کو قانتین و صادقین اور صابرین جیسی صفات سے متصف کیا گیا ہے تو عورتوں کو بھی قانتات و صادقات اور صابرات کے القاب سے ملقب کیا گیا ہے، اگر مردوں کو خاشعین و متصدقین اور صائمین کے القاب سے ملقب کیا گیا ہے تو عورتوں کو بھی خاشعات و متصدقات اور صائمات کے القاب سے نوازا گیا ہے، اگر مرد ذاکرین ہیں تو عورتیں بھی ذاکرات ہیں، گویا مرد و عورت دونوں خالق کی عبادت میں برابر کے شریک ہیں اور دونوں سے بخشش و مغفرت، اجر عظیم اور خلد بریں کا وعدہ ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اے اللہ کے نبیؐ! میں مردوں کا ذکر قرآن میں سنتی ہوں اور عورتوں کا نہیں سنتی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:(۱)

(۱) مختصر تفسیر ابن کثیر لمحمد علی الصابونی:۳/۹۵

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾(الأحزاب:۳۳/۳۵)

''مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اللہ سے ڈرنے والے مرد اور اللہ سے ڈرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے دار مرد اور روزے دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب (مردوں اور عورتوں) کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔''

عورت سکون و راحت کا سبب ہے

عورت اگر فاحشہ و بے حیاء اور آوارہ و بدکار ہو جائے تو سور اور کتیا سے بھی بدتر ہے اور گھر و خاندان اور معاشرہ و سماج کے لیے زہریلے جانور سے بھی زیادہ خطرناک ہے، لیکن اگر عورت اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرے، گھر میں بچوں کی اچھی تربیت کرے اور مال و دولت کی دیکھ بھال کرے، نیک کاموں میں شوہر کی فرمانبرداری کرے، تو سکون و راحت کا ذریعہ اور دنیا کی بہترین متاع زیست ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾(الروم:۳۰/۲۱)

''اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھاری بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان سے سکون ملے اور اس نے تمھارے درمیان محبت و مہربانی پیدا کر دی۔''

نیک و پاکباز خاتون کے بارے میں رحمۃ للعالمین ﷺ کا فرمان ہے:

«الدنیا کلها متاع وخیر متاع الدنیا المرء ة الصالحة»[1]

''دنیا کی ہر شے فائدہ اُٹھانے والی چیز ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک اور پاکباز عورت ہے۔''

(۱) صحیح مسلم، مشکاۃ، کتاب النکاح، ج:۲

یہ مکانات، کوٹھیاں، بنگلے، زمینیں اور یہ باغات وغیرہ ان سب سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے اور یہ بہت جلد فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں، لیکن نیک اور صالحہ بیوی جو دینی معاملات میں اپنے شوہر سے تعاون کرتی ہے تو اس سے اس کی ابدی و سرمدی زندگی بنتی ہے، یہی پاکباز خاتون ہے کہ اس کے بطن سے انبیاء وصلحاء پیدا ہوئے، اسی کے بطن سے حافظ وقاری، عالم، محدث، فقیہ، غازی اور مجاہد پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہیں گے جو دین کے احیاء وفروغ کا کام انجام دیتے رہے اور دیتے رہیں گے، اسی صالح خاتون کے دم سے گھر اور خاندان میں رونق رہتی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحر وجود میں گرداب

عورت مرد کے لیے تکمیل ایمان کا ذریعہ ہے

اکثر انسان کے دین واخلاق کو دو چیزیں بگاڑتی ہیں، ایک شرم گاہ دوسرا پیٹ، اگر مرد عورت سے شادی کر لے تو عام طور پر اس کی شرم گاہ کی حفاظت ہو جاتی ہے اور وہ غیر کی ماؤں، بہنوں، بہو اور بیٹیوں سے ناجائز تعلق نہیں رکھتا۔ اور اگر پیٹ بھرنے کے لیے حلال ذرائع سے روزی حاصل کرے، غصب وخیانت اور سود ورشوت وغیرہ سے اجتناب کرے تو اس کے پیٹ کی حفاظت ہو جاتی ہے، اس طرح گویا اپنے دین واخلاق کو فساد و بگاڑ سے محفوظ کر لیتا ہے اور اس کا دین کامل ومکمل ہو جاتا ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين، فليتق الله في النصف الباقي» (۱)

''جب بندے نے شادی کر لی تو اس نے اپنے آدھے دین کو پورا کر لیا، لہٰذا اسے چاہیے کہ باقی آدھے کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔''

کسب معاش سے سبکدوشی

پیغمبر اسلام ﷺ نے عورت کی نزاکت وجسمانی ساخت کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے اسے کھانے کپڑے کی ذمہ داری سے آزاد کر دیا ہے اور اس کا دائرہ کار اندرون خانہ متعین کیا ہے کہ شمع انجمن بننے کے بجائے چراغ خانہ بن کر زندگی بسر کرے، گھر کا نظام سنبھالے، اچھے ڈھنگ سے بچوں کی تربیت کرے اور کسب معاش کی ذمہ داری شوہر کے سر ڈالی ہے۔ حضرت معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ!:

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان، مشكاة، ج:۲ كتاب النكاح وحسنه الألباني۔

«ما حق زوجة أحدنا عليه؟ قال: وأن تطعمها إذا طعمت، وتكسوها إذا اكتسيت، ولا تضرب الوجه ولا تقبح ، ولا تهجر إلا في البيت»[۱]

''ہم میں سے کسی کی بیوی کا حق اس پر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے پہناؤ اور چہرے پر نہ مارو اور نہ برا بھلا کہو اور گھر کے اندر ہی رکھو۔''

نکاح میں عورت کی مرضی

اسلام نے عورت کو نکاح کے سلسلے میں مجبور نہیں کیا ہے کہ اس کے والدین یا اقارب اس کے مشورے اور اس کی مرضی کے بغیر جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جس سے چاہیں اس کا نکاح کر دیں بلکہ اس کے بارے میں اسے پورا حق اور اختیار دیا گیا ہے، عورت کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لا تنكح الأيم حتى تستأمر، ولا تنكح البكر حتى تستأذن ، قالوا: يا رسول الله! وكيف إذنها ؟ قال: أن تسكت»[۲]

''بیوہ کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے اور نہ کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کیا جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! اس کی اجازت کی کیا صورت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ خاموش رہے۔''

عورت کے لیے نکاح ثانی کا حق

بعض مذاہب کے نزدیک جس مرد نے اپنی بیوی سے جماع کر لیا ہو اور وہ رنڈوا ہو جائے تو وہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتا اور جس عورت سے جماع ہو چکا ہو اور وہ بیوہ ہو جائے تو دوسری شادی کرنے کا حق نہیں رکھتی، حالانکہ شادی اور نکاح ایک فطری ضرورت ہے، جس طرح نکاح سے پہلے مرد کو عورت کی خواہش ہوتی ہے اور عورت کو مرد کی خواہش ہوتی ہے اسی طرح نکاح ہو جائے اور مجامعت کے بعد اگر مرد رنڈوا یا عورت بیوہ ہو جائے تب بھی فطری طور پر جماع اور نکاح کی خواہش باقی رہتی ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ عورت و مرد کو نکاح ثانی کا حق نہ دیا جائے، یہی وجہ ہے کہ مذہب اسلام جو ایک فطری دین ہے اور جو عقل سلیم کے عین مطابق ہے اس نے دونوں کو عقد ثانی کا پورا

(۱) رواہ أحمد و أبوداود و ابن ماجه، مشكاة، ج:۲ كتاب النكاح باب عشرة النساء ، وإسناده حسن۔

(۲) متفق عليه، مشكاة، ج:۲ كتاب النكاح باب الولي في النكاح واستيذان المرءة۔

پورا اختیار دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ذریعے اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ﴾(النور:۲۴/۳۲)

''اپنے میں سے بغیر جوڑے والے مرد و عورت اور اپنے نیک غلاموں اور صالحہ لونڈیوں کا نکاح کر دیا کرو۔''

عورت خلع کا حق رکھتی ہے

اگر مرد بیماری کی وجہ سے عورت کے حقوق پورے نہ کر سکے یا اس کے اندر قوت مردمی نہ پائی جائے، اسی طرح شوہر کے بدصورت وغیرہ ہونے کی وجہ سے عورت مرد کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو، یا مرد عورت پر ظلم و زیادتی کرے، اسے مارے پیٹے، اس کے کھانے کپڑے کا خیال نہ رکھے، بیمار ہو جائے تو اس کے علاج و معالجہ کا خیال نہ رکھے، اور برابر اسی روش پر قائم رہے، نباہ کی کوئی صورت نہ بن سکتی ہو تو مذہب اسلام نے ایسی عورت کو بذریعہ خلع شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا حق دیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾(البقرۃ:۲/۲۲۹)

''اگر تمھیں خوف ہو کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر اس فدیے کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جسے دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔''

رحمت عالم ﷺ ایک روز فجر کی نماز کے لیے نکلے، ابھی اندھیرا ہی تھا تو دیکھا کہ ایک عورت دروازے پر کھڑی ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا میں حبیبہؓ بنت سہل ہوں (ثابتؓ بن قیس بن شماس کی بیوی)، اللہ کے رسولؐ نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا نہ میں ثابت ابن قیس کے ساتھ ہوں اور نہ وہ میرے ساتھ ہے (یعنی ہم دونوں میں نباہ کی صورت نہیں ہے، میں جدائی چاہتی ہوں) جب ثابتؓ بن قیس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا (ثابت بن قیس) یہ حبیبہؓ بنت سہل ہے، خدا کو جو منظور تھا اس نے اپنا حال کہہ سنایا، حبیبہؓ نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ) آپ نے جو کچھ مجھے (مہر) میں دیا تھا وہ میرے پاس موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے ثابتؓ بن قیس سے کہا کہ اپنا مہر واپس لے لو، انھوں نے مہر واپس لے لیا اور حبیبہؓ اپنے میکے بیٹھ گئیں۔ (۱)

ثابتؓ بن قیس کی دوسری بیوی جمیلہؓ کا واقعہ ہے: یہ بڑی خوبصورت تھیں اور ثابتؓ بن قیس

(۱) موطأ الامام مالك، باب ماجاء في الخلع

بدصورت و پست قد اور تیز مزاج تھے، یہ اپنے شوہر ثابت کو نہیں چاہتی تھیں، جمیلہؓ نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

«یارسول الله! ثابت بن قیس ما اعتب علیه فی خلق ولا دین، ولکننی أکره الکفر فی الأسلام»

اے اللہ کے رسول ﷺ! میں ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین پر کوئی عیب نہیں لگاتی لیکن میں اسلام میں ناشکری کو ناپسند کرتی ہوں (یعنی میرا نباہ ثابت کے ساتھ نہیں ہو سکتا) رسول اللہ ﷺ نے جمیلہؓ سے کہا کیا ثابتؓ بن قیس کا باغ (جو تمھیں مہر میں ملا ہے) واپس کر دو گی، انھوں نے کہا ہاں، آپؐ نے ثابتؓ سے فرمایا:

«أقبل الحديقة وطلقها تطليقة واحدة»(۱)

''ثابتؓ باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔''

معلوم ہوا خلع عورت کا حق ہے، وہ اس کے ذریعے اضطراری صورت میں شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔

عورت کی مختلف حیثیتیں

عورت مختلف حیثیتیں رکھتی ہے، عورت ماں ہو سکتی ہے اور خالہ و پھوپھی بھی، عورت بہن ہو سکتی ہے اور بیٹی و پوتی بھی، عورت بیوی ہو سکتی ہے اور دادی و نانی وغیرہ بھی، حسب مراتب مذہب اسلام نے ہر ایک کو کیا حقوق عطاء کیے ہیں؟ اس کا رخ زیبا سیرت نبوی علیہ السلام کے آئینے میں دیکھیں:

ماں کے حقوق

خدا و رسولؐ کے احسان کے بعد انسان پر سب سے زیادہ احسان ماں کا ہے۔ ماں حمل کی شکل میں اس کو اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور اس کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے، جننے کی مشقت اور تکلیف برداشت کرتی ہے، پیدا ہونے کے بعد دودھ کی شکل میں اپنا خون پلاتی ہے، اس کو پیشاب و پاخانہ وغیرہ سے صاف ستھرا رکھنے کے لیے طرح طرح کی پریشانی اٹھاتی ہے اور سن شعور کو پہنچنے تک ہر طریقے سے اس کی تربیت و پرورش اور دیکھ بھال کرتی ہے، اسی بنا پر مذہب اسلام نے ماں کو سب سے اونچا مقام عطا کیا ہے، اللہ پاک بزرگ و برتر نے قرآن مجید میں اپنی عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

(۱) صحیح البخاری، ج:۲، کتاب الطلاق باب الخلع وکیف الطلاق فیه۔

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىْ صَغِيْرًا﴾

(الاسراء:۱۷/۲۳۔۲۴)

''اور تمھارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو انھیں اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، ان سے شریفانہ طریقے سے بات کرو اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے بچھادو اور ان کے حق میں یہ دعا کرو کہ اے میرے پروردگار ان پر ایسا ہی رحم و کرم فرما، جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾(النساء:٤/٣٦)

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔''

پیغمبر اسلام ﷺ کا فرمان ہے:

«إن اللّٰه حرم عليكم عقوق الأمهات»(۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ایک شخص نے عرض کیا

«يا رسول اللّٰه! من أحق بحسن صحابتي؟ قال: أمك، قال: ثم من؟ قال: أمك، قال: ثم من؟قال: أمك، قال: ثم من؟ قال: أبوك»(۲)

اے اللہ کے رسولؐ! میرے حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کیا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس شخص نے عرض کیا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے کہا اس کے بعد کون؟ آپؐ نے فرمایا تیرا باپ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کا درجہ باپ سے بھی تین گنا بڑھا ہوا ہے اور باپ کا مرتبہ ماں کے

(۱) البخاري، ج:۱ كتاب الآداب باب عقوق الوالدين من الكبائر، وصحيح مسلم، ج:۱ كتاب الايمان۔

(۱) البخاري، ج:۱، كتاب الآداب باب من أحق بحسن الصحبة، ومسلم، ج:۲ كتاب البر والصلة باب بر الوالدين۔

ایک چوتھائی درجہ کے برابر ہے۔

ماں اپنی اولاد کے مال و جائیداد میں بھی حق رکھتی ہے، اگر کوئی شخص انتقال کر جائے اور اس کی ماں بہ حیات موجود ہو تو ماں کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔

① میت کی اولاد (یعنی بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی وغیرہ) ہوں اس حالت میں ماں کو بطور وراثت چھٹا حصہ ملے گا۔

② میت کے دو یا دو سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں، خواہ سگے ہوں یا سوتیلے تو اس حالت میں بھی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

③ نہ میت کی اولاد ہو اور نہ دو یا دو سے زیادہ اس کے بھائی بہن ہوں تو ماں کو کل متروک کا ایک تہائی حصہ ملے گا، یہ اس حالت میں ہے جبکہ میت کے ماں باپ کے ساتھ زوجین میں سے کوئی موجود نہ ہو، اور اگر زوجین میں سے کوئی موجود ہو تو اس کا حق دینے کے بعد جو باقی بچے گا ماں کو اس کا تہائی حصہ ملے گا (وراثت میں دادی اور نانی کا بھی حق ہے، اس کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

قرآن مجید میں ماں کا حصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾(النساء :٤/١١)

''اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے اولاد کے مال متروکہ کا چھٹا حصہ ہے جبکہ میت کی اولاد ہو اور اگر میت کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کے وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملے گا (اور باقی سب باپ کو) اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔''

خالہ کا حق

مذہب اسلام نے خالہ کو وہ مقام عطا کیا جس کی مثال دیگر مذاہب میں ناپید ہے، حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کے اعتبار سے خالہ ماں کے درجے میں ہے، رحمت ﷺ نے فرمایا:

«الخالة بمنزلة الأم»[1]

''خالہ ماں کے درجے میں ہے۔''

(۱) صحیح البخاری ج۲ کتاب الصلح ، جامع الترمذی ج۲ ابواب البر والصلة

خالہ کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے انسان خدا کا مقرب ہو جاتا ہے، گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو جاتا ہے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ! مجھ سے ایک بڑا گناہ ہو گیا ہے، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کیا تیری ماں موجود ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں، آپؐ نے فرمایا: کیا تیری خالہ موجود ہے؟ اس نے کہا ہاں موجود ہے، آپؐ نے فرمایا: تو اس کے ساتھ نیک برتاؤ کر۔(۱)

بہن کا حق

باپ کی غیر موجودگی میں بھائی پر بہنوں کا حق واجب ہو جاتا ہے اور اس کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ ان کے نان ونفقہ کا خیال رکھے، ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرے اور بالغ ہو جانے پر اچھے گھرانے میں صالح اور دیندار لڑکے سے شادی کر دے، رحمۃ للعالمین ﷺ نے بہنوں کے ساتھ احسان کرنے والوں کو جنت کا مستحق قرار دیا ہے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

«قال رسول اللّٰه ﷺ:من كانت له ثلاث بنات أو ثلاث أخوات أو ابنتان أو أختان فأحسن صحبتهن واتقى اللّٰه فيهن فله الجنة»(۲)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اللہ سے ڈرے تو اس کے لیے جنات ہے۔“

بہن کو وراثت میں دنیا کے کسی اور مذہب نے کوئی حق نہیں دیا ہے لیکن دین اسلام نے بھائی کے مال متروکہ میں بہن کو بھی وارث قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾(النساء:۴/۱۲)

”اگر کوئی مرد یا عورت جس کی میراث ہو اس کے ماں باپ اور بیٹی بیٹا نہ ہوں اور اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر ایک سے زائد ہوں تو ایک تہائی حصے میں سب شریک ہوں گے، وصیت پوری کرنے اور ادائیگی قرض کے بعد جس سے کسی کا نقصان نہ کیا ہو اللہ کا یہی تاکیدی حکم ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا

(۱) جامع الترمذی، ج:۲ ابواب البر والصلة، باب فی بر الخالة۔

(۲) جامع الترمذی، ج:۲ أبواب البر والصلة، باب ماجاء فی النفقات علی البنات والاخوات۔

بڑا حلم والا ہے۔"

بھائی بہن تین طرح کے ہوتے ہیں:

① حقیقی: یعنی ایک ماں باپ سے ہوں۔

② علاتی: یعنی ایک باپ دو ماں سے ہوں۔

③ اخیافی: یعنی ایک ماں دو باپ سے ہوں۔

یہاں اخیافی بھائی بہن مراد ہیں [۱]۔ اور ان کی تین حالتیں ہیں:

① ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

② ایک بھائی یا ایک بہن سے زیادہ ہوں تو ایسی حالت میں ایک تہائی حصہ میں سب برابر شریک ہوں گے۔

③ میت کے بیٹا، بیٹی یا پوتا، پوتی ہوں تو ایسی صورت میں بھائی بہن سب محروم ہوں گے۔ [۲]

حقیقی اور علاتی بھائی بہن کے حصے قرآن میں دوسری جگہ کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"تم سے لوگ کلالہ [۳] کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں: تو کہہ دو کہ اللہ خود تم کو کلالہ کا حکم سناتا ہے، اگر کوئی ایسا شخص مرے جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن اس کی متروکہ جائیداد میں سے نصف کی مالک ہوگی اور بھائی بہن کے سب مال متروکہ کا وارث ہوگا، اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو متروکہ جائیداد کا دو تہائی حصہ ملے گا اور اگر (اس کلالہ کے کئی) بہن، بھائی مرد و عورت وارث ہوں تو مرد کو عورت کا دو گنا حصہ ملے گا اللہ تعالیٰ تمھارے واسطے احکام بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔" (النساء:۴/۷۷)

بہنوں کے مختلف حالات اور ان کے حصے کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

بیٹی کا حق

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بیٹی جینے کا بھی حق نہیں رکھتی تھی، پیدا ہوتے ہی اسے زندہ دفن کر دیا جاتا، اس کے دنیا میں سانس لیتے ہی اس کا باپ ذلت و رسوائی کی وجہ سے پریشان ہو جاتا، ادھر ادھر منہ چھپائے پھرتا اس سفاہت و جہالت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

(۱) مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۳۶۴۔

(۲) مزید تفصیل میراث کی کتابوں میں ملاحظہ کریں۔

(۳) کلالہ وہ میت ہے جس کی نہ اولاد ہو نہ باپ، مختصر تفسیر ابن کثیر، ج:۱۔

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾

(النحل:١٦/٥٨-٥٩)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے، اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے (سوچتا ہے) کیا اس ذلت کو روکے رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے، سنو یہ لوگ بڑا برا فیصلہ کر رہے ہیں۔''

نبیٔ رحمت ﷺ نے اس مظلوم بیٹی کو زندہ رہنے کا حق دیا، اسے زندہ درگور ہونے سے بچایا اور لڑکے کی طرح اس کی پرورش کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«قال رسول الله ﷺ: من كانت له أنثى فلم يئدها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها يعني الذكور أدخله الله الجنة»(۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس کی ایک بیٹی ہو اور اس کو زندہ درگور نہ کیا ہو اور نہ اس کو ذلیل بنا رکھا ہو اور نہ لڑکوں کو اس پر ترجیح دی تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«قال رسول الله ﷺ من عال جاريتين حتى تبلغا جاء يوم القيامة أنا وهو هكذا وضم اصابعه»(۲)

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دو بیٹیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو وہ قیامت کے دن آئے گا تو میں اور وہ اس طرح ایک ساتھ ہوں گے جیسے انگلیاں ایک ساتھ ملی ہوتی ہیں۔''

پیغمبر اسلام ﷺ کی چہیتی بیوی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ سوال کرنے کی غرض سے میرے پاس آئی، اس وقت میرے پاس سوائے ایک کھجور

---

(۱) أبوداؤد، مشكاة، ج:۲۔

(۲) مشكاة، ج:۲، باب الرحمة والشفقة على الخلق۔

کے کچھ نہ تھا، میں نے وہی کھجور اس کو دے دی، اس نے اس کھجور کو اپنی دونوں بیٹیوں کو آدھا آدھا کرکے دے دیا اور خودنہیں کھایا پھر اٹھی اور چلی گئی، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے یہ واقعہ آپؐ سے بیان کیا، تو آپؐ نے فرمایا:

«ومن ابتلی من هذه البنات بشیء فأحسن إلیهن کن له سترا من النار» (۱)

''جوان لڑکیوں کی وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا ہو پھر بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ اور روک کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔''

مذہب اسلام نے لڑکیوں کو بھی وراثت میں حق دار ٹھہرایا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾(النساء:۱۱/٤)

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں یہ تاکیدی حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے اور اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے متروکہ جائیداد کا دو تہائی حصہ ہوگا اور اگر ایک لڑکی ہو تو اسے کل مال متروکہ کا آدھا حصہ ملے گا۔''

آیت مذکورہ بالا میں بیٹیوں کے حق وراثت کا ذکر صراحتاً اور پوتیوں کے حقوق کا ذکر ضمناً آیا ہے، بیٹیوں کے مختلف حالات میں ان کے حصے کی وضاحت کتب فرائض میں بالتفصیل مل سکتی ہے۔

بیوی کا حق

مذہب اسلام نے مرد وعورت دونوں کو عادلانہ اور مساویانہ حق عطا کیا ہے اور کسی کی ذرہ برابر حق تلفی نہیں کی ہے، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾

(البقرة:۲۲۸/۲)

''اور جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ہے اسی طرح دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر بھی ہے اور مردوں کا حق عورتوں پر ایک درجہ زیادہ ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

پیغمبر اسلام ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے بارے میں فرمایا ہے:

«لا یفرك مؤمن مؤمنة إن کره منها خلقا رضی منها آخر» (۲)

---

(۱) متفق علیه، مشکاة، ج:۲ باب الرحمة والشفقة علی الخلق۔

(۲) صحیح مسلم، مشکاة، ج:۲ باب عشرة النساء۔

''کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے اگر مرد کو عورت کی کوئی عادت ناپسند ہے تو اس میں کوئی عادت ایسی ہوگی جو اسے پسند ہوگی۔''

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عورتوں کے حق میں خاص طور سے مردوں کو وصیت فرمائی ہے:

«استوصوا بالنساء خيرا فإنهن خلقن من ضلع، وإن أعوج شيء في الضلع أعلاه، فإن ذهبت تقيمه كسرته، وإن تركته لم يزل أعوج، فاستوصوا بالنساء خيرا»(۱)

''میں تمھیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں، تم اس وصیت کو قبول کرو، یقیناً عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور اوپر والی پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، بس عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت قبول کرلو۔''

گویا عورت کے اندر فطری طور پر ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے اور وہ ناقص العقل بھی ہے، لہٰذا اسے بالکل سیدھی اور درست رکھنے کی کوشش کرنا بے فائدہ ہے، مرد کو ہمیشہ یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ اس کے اندر جو خوبی پائی جاتی ہو اس سے فائدہ اٹھالے اور جو تھوڑی بہت کمی پائی جاتی ہو اسے انگیز کرے اور اس کے ساتھ ہمیشہ خیر و بھلائی کا معاملہ کرے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي»(۲)

''تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل و عیال کے حق میں بہتر ہو اور میں اپنے اہل و عیال کے حق میں تم میں سب سے زیادہ اچھا ہوں۔''

مذہب اسلام نے وراثت میں بھی بیوی کو حق دیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ (النساء:٤/١٢)

''اور تمھاری بیویوں کی متروکہ جائیداد میں تمھارا آدھا حصہ ہے، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمھارے لیے ایک چوتھائی ہے، (یہ تقسیم) ان کی وصیت پوری کرنے اور ادائیگی قرض کے بعد ہوگی اور تمھارے ترکہ میں تمھاری بیویوں کا ایک چوتھائی

---

(۱) بخاری و مسلم بحوالہ مذکور۔

(۲) رواه الترمذي والدارمي واسناده صحيح، مشكاة ج۲ باب عشرة النساء۔

حصہ ہے ،اگر تمھاری اولاد ہو تو تمھارے مال متروک میں سے ان کا آ ٹھواں حصہ ہے، وصیت پوری کرنے اور قرض ادائیگی کے بعد۔“

مذکورہ آیت میں شوہر کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں:

① بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو تو اس کی متروکہ جائیداد میں سے شوہر کو آدھا ملے گا۔

② بیوی کی کوئی اولاد ہو تو ایسی حالت میں بیوی کے مال متروکہ میں سے اُسے چوتھائی حصہ ملے گا۔

اسی طرح بیوی کی بھی دو حالتیں ہیں:

① شوہر کی کوئی اولاد نہ ہو تو ایسی حالت میں بیوی کو شوہر کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے چوتھائی حصہ ملے گا۔

② شوہر کی کوئی اولاد ہو تو ایسی حالت میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

عورت کے لیے پروانۂ جنت

مذہب اسلام میں ایمان لانے کے بعد عمل صالح کرنے والے مرد اور نیک کام کرنے والی عورتوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اور انجام کے اعتبار سے عورت کا مقام مرد سے کم نہیں بتایا گیا ہے،قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾(النساء:١٢٤/٤)

”جو بھی ایمان دار مرد یا عورت نیک کام کرے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور کھجور کی گٹھلی کے برابر بھی ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾(النحل:٩٧/١٦)

”جو مرد یا عورت ایمان داری کے ساتھ نیک کام کرے تو ہم اس کو اچھی زندگی دیں گے اور ان کے کاموں کا اچھا بدلہ عطا کریں گے۔“

تیسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(الغافر:٤٠/٤٠)

''اور جو کوئی مرد یا عورت اچھا کام کرے ایمان کے ساتھ تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں بے حساب روزی پائیں گے۔''

خاتم الانبیاء، سید المرسلین، شافع المذنبین، رحمۃ للعالمین ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«المرأة إذا صلت خمسها، وصامت شهرها، وأحصنت فرجها، وأطاعت بعلها، فلتدخل من أى أبواب الجنة شاء ت»[1]

''جب عورت پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے مہینے کے روزہ رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔''

ترا پسینہ ہے عطر آگیں، ترا تکلم نشاط افزا
ترے شگوفوں پہ ہو رہی ہے نثار مشکِ ختن کی خوشبو

حرف آخر

یہ ہیں مختلف حیثیتوں سے عورتوں کے حقوق سیرت نبوی (ﷺ) کی روشنی میں، اس مختصر بحث سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سیرت نبویؐ اور تعلیمات رسول ﷺ میں عورت کی طبیعت، نفسیات، مزاج اور اس کے کمزور پہلوؤں کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے، اس کی صلاحیت کے اعتبار سے اسے ذمہ داریاں دی گئی ہیں اور انسانی حقوق میں اسے برابر شریک کیا گیا ہے، یقیناً یہی موقف عادلانہ اور منصفانہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب انسانوں کو صحیح طور پر حقوق نسواں کو سمجھنے اور قرآن کریم و سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین، تقبل یارب العالمین!

(۱) رواه أبو نعيم فى الحلية وإسناده حسن أو صحيح، مشكاة، ج:۲ باب عشرة النساء۔

سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں اولاد کی تربیت

مولانا حافظ عین الباری عالیاوی، پروفیسر مدرسہ عالیہ، کلکتہ

محسن انسانیت ﷺ نے اپنے تعارف میں فرمایا:

«إنما أنا لكم مثل الوالد لولده أعلمكم .... الحديث»(۱)

''یعنی میں تم لوگوں کے حق میں ایسا ہوں جیسے ایک باپ اپنی اولاد کے حق میں ہوتا ہے، میں تمھیں تعلیم دیتا ہوں۔''

اس فرمان نبوی ﷺ سے پتہ چلا کہ پیارے نبی ﷺ اپنی امت کے حق میں باپ کی طرح ہیں، ایک باپ جس طرح اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے ویسے ہی نبی کریم ﷺ نے اپنی روحانی اولاد کی تربیت کی تھی، جس کی چند جھلکیاں درج ذیل ہیں:

امت محمدیؐ کے ہر فرد و بشر کی ولادت سے موت تک کی رہنمائی سیرت نبوی ﷺ میں ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بچہ رحم مادر سے اس عالم آب و گل میں قدم رکھتا ہے تو فوراً نبوی رہنمائی یوں ہوتی ہے:

«ما من بني آدم مولود إلا يمسه الشيطان حين يولد فيستهل صارخا من مس الشيطان غير مريم وابنها»(۲)

''یعنی آدمؑ کی اولاد میں سے جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ولادت کے وقت

(۱) سنن ابن ماجه، دارمي، مشكاة، ص:۴۲

(۲) البخاري، مسلم، مشكاة ص:۱۸۔

شیطان اس کو چھوتا ہے، اس لیے وہ چیخ اٹھتا ہے، شیطان کے چھونے کی وجہ سے، سوائے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ہر بچے کی پیدائش کے وقت شیطان ملعون اس کے پاس آتا ہے اور اس معصوم بچے کو اپنا مرید بنانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے، ایسی حالت میں شیطان کی شرارت سے بچنے کے لیے مشفق امت ﷺ فرماتے ہیں:

«من ولد له مولود فأذن في أذنه اليمنى وأقام في أذنه اليسرى لم يضره أم الصبيان»(1)

"یعنی جس شخص کا کوئی بچہ پیدا ہو، پھر وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت دے تو "ام الصبیان" (ایک بیماری) اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

اسی بنا پر رسول اکرم ﷺ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے کان میں نماز کی اذان کی طرح اذان دی تھی جس وقت وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے۔(۲)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حسن وحسین رضی اللہ عنہما دونوں کے کان میں اذان دی تھی۔(۳)

مذکورہ بالا تربیت نبویؐ سے پتہ چلا کہ بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو پاک وصاف کر کے سب سے پہلے اس کے کان میں اذان واقامت دی جائے خواہ وہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

بعض مسانید میں ہے کہ: "نبی کریم ﷺ نے بعض بچوں کے کان میں سورہ اخلاص پڑھی تھی۔"(۴)

کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کے وقت اذان کیوں دی جاتی ہے، تو اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان پیش کیا جا سکتا ہے:

«ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه ...... الحديث»(5)

"یعنی ہر بچہ فطرت اسلام ہی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا آگ پرست بنا دیتے ہیں۔"

---

(1) عمل اليوم والليلة لابن سنی، ص:١٦٨، ابويعلى، مجمع الزوائد:٥٩/٤، بيهقی:٣٠٥/٩، الجامع الصغير للسيوطی:١٨٣/٢۔

(2) الترمذی، ابوداؤد، مشكاة ص:٣٦٣۔

(3) طبرانی، ابو نعيم، التلخيص الحبير، ص:٣٨٨۔

(4) فتح العلام:٣٠١/٢۔

(5) البخاری، مسلم، مشكاة، ص:٢١

پس جب کوئی بچہ اہل اسلام کے گھر پیدا ہو تو اس کی ولادت کے وقت سب سے پہلے اس کے کان میں اسلام کا نعرہ پہنچا دیا جائے اور وہ نعرہ ہے اذان و اقامت کے دل نواز کلمات، تاکہ اس بچے کی روح کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی ولادت ایک اہل توحید کے گھر میں ہوئی نہ کہ اہل شرک کے گھر میں اذان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شیطان بھاگ جاتا ہے، جیسا کہ رسول رحمت ﷺ نے فرمایا:

«إذا نودي للصلاة أدبر الشيطان له ضراط حتى لا يسمع التأذين»[1]

''یعنی جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان گوز مارتے ہوئے اتنی دور بھاگ جاتا ہے کہ وہ اذان نہ سن سکے۔''

نوزائیدہ بچے کے لیے برکت کی دعا لینا

نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان و اقامت کے بعد تربیت نبویؐ کے لحاظ سے کسی متقی و پرہیزگار آدمی کے ذریعے کھجور چبا کر بچہ کے منہ میں ڈالنا اور برکت کی دعا لینا چاہیے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«إن رسول الله ﷺ كان يؤتى بالصبيان فيبرك عليهم ويحنكهم»[2]

''یعنی نومولود بچوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا جاتا تھا پھر آپ ﷺ ان کے لیے برکت کی دعا کرتے تھے اور کھجور چبا کر ان کے منہ کے اندر تالو میں لگا دیتے تھے۔''

سنت نبویؐ کی اصطلاح میں اس کام کا نام تحنیک ہے، اس تحنیک کے سلسلے میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی بچے کی ولادت کے بعد تحنیک کرنا مستحب ہے، اگر کھجور ملنا مشکل ہو تو اس جیسی کسی اور میٹھی چیز سے تحنیک کی جائے اور جس شخص کے ذریعے تحنیک کی جائے وہ آدمی نیک اور پرہیزگار ہو، وہ آدمی خواہ مرد ہو یا عورت اس میں کوئی حرج نہیں۔[3]

پیدائش کے ساتویں دن کا عمل

نومولود بچہ ساتویں دن میں قدم رکھے تو اس کی تربیت کے متعلق مربی امت ﷺ فرماتے ہیں:

«الغلام مرتهن بعقيقته تذبح عنه يوم السابع ويسمى ويحلق رأسه»[4]

---

(۱) البخاري، ومسلم، مشكاة، ص:٦٤

(۲) مسلم، مشكاة، ص:٣٦٢

(۳) نيل الأوطار ٤/٣٧٣۔

(٤) الترمذي:١/١٨٣، أبوداؤد:٢/٣٦، نسائي:٢/١٦٧، أحمد، مشكاة ص:٣٦٢، بيهقي:٩/٢٩٩، حاكم: ٤/٢٣٧، ابن ماجه، ص:٢٣٥

''یعنی ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ساتھ گرو ہے، ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے۔''

اس فرمان نبوی ﷺ سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

① عقیقہ کرنا ② نام رکھنا ③ اس کا سر مونڈنا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساتویں دن نومولود کی طرف سے کیا ذبح کیا جائے؟ اس کے جواب میں فرمان نبویؐ ہے:

«عن الغلام شأتان وعن الجارية شأة ولا يضركم ذكرانا أو اناثا»(۱)

''یعنی بچے کی طرف سے دو بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری اور تمھیں کوئی نقصان نہیں کرے گا وہ جانور خواہ نر ہو یا مادہ۔''

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ عقیقے کے ساتھ کیا چیز گرو ہے؟ اس کے جواب میں دس لاکھ احادیث کے حافظ امام احمد بن حنبل ؒ فرماتے ہیں: کہ سفارش یعنی جس بچے کی طرف سے عقیقہ نہیں کیا گیا وہ بچہ اگر نابالغ حالت میں مر گیا تو وہ حشر کے میدان میں اپنے ماں باپ کے لیے کوئی سفارش نہیں کر سکے گا۔(۲)

حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو عقیقہ پر پیش کیا جائے گا جس طرح ان کو پانچ وقت نماز پر پیش کیا جائے گا۔(۳)

لہٰذا بچہ پیدا ہونے کے بعد ساتویں دن عقیقہ کرنا چاہیے، بعض لوگ بچے کی طرف سے عقیقہ کرتے ہیں، مگر بچی کی طرف سے عقیقہ نہیں دیتے، لہٰذا تم بچے کی طرف سے دو بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری عقیقہ کرو۔(۴)

بچوں کا نام رکھنا

بچے کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کے ساتھ دوسرا کام نام رکھنا ہے، ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اولاد کا حق کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا اچھا نام رکھنا اور اس

(۱) أبو داؤد:۲/۳۶، ترمذی ۱/۱۸۳، مشكاة ص۳٦۲۔

(۲) فتح الباري: ۹/۵۹٤، نيل الأوتار ٤/۳۷٦۔

(۳) محلی لا بن حزم:۷/۵۲۵، تحفة المودود ۲۹، المغنی لابن قدامة ۸/٦٤٤، فتح الباري:۹/۵۹٤، فتح العلام:۲/۳۰۰، اوجز المسالك: ۳/۲۷۳۔

(٤) بیهقی: ۹/۳۰۲، بزار، مجمع الزوائد ٤/۵۸۔

کو اچھی تربیت دینا۔ (۱)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تم کو تمھارے نام اور تمھارے باپ دادا کا نام لے کر پکارا جائے گا، لہٰذا تم اچھے اچھے نام رکھا کرو۔ (۲)

اچھے نام کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہے۔ (۳)

ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم نام رکھو تو لفظ ''عبد'' کے ساتھ نام رکھو۔ (۴)

یعنی اللہ کے نام کے ساتھ لفظ ''عبد'' ملا کر نام رکھو، جیسے عبدالرحیم وعبدالمالک وغیرہ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ (۵)

وہ اسماء ترمذی اور بیہقی کی دعوات الکبیر میں موجود ہیں۔ (۶)

ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: تم نبیوں کے نام رکھا کرو۔ (۷)

''مگر فرشتوں کے نام مت رکھو۔'' (۸)

ناپسندیدہ نام بدل دینا چاہیے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ برے نام بدل دیا کرتے تھے۔ (۹)

مثال کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے لڑکے حسنؓ کی ولادت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تم نے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ میں نے کہا: حرب (جنگ) آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ حسنؓ۔ اس کے بعد حسینؓ کی ولادت کے وقت پھر میں نے اس کا نام حرب رکھا، پھر آپؐ نے پوچھا اس کا نام کیا رکھا؟ میں نے کہا حرب، تو آپؐ نے فرمایا نہیں، بلکہ حسینؓ۔ پھر جب تیسرا لڑکا

---

(۱) بیہقی، تحفة المودود ص:۱۳٤۔

(۲) أبو داؤد:۲/۳۲۰، احمد، مشکاة، ص٤۰۸۔

(۳) مسلم، مشکاة ص٤۰۹۔

(٤) الکنی للحاکم، طبرانی، مرقاة ٤/٥۹۹، مجمع الزوائد: ٤/٥۸۔

(٥) البخاری ومسلم، مشکاة ص۱۹۹،

(٦) مشکاة، ص:۱۹۹

(۷) أبو داؤد، مشکاة ٤۰۹،

(۸) تاریخ بخاری، تحفة المودود ص۷۰

(۹) ترمذی، مشکاة، ص٤۰۸۔

پیدا ہوا تو میں اس کا نام بھی رکھا حرب، تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس کا نام محسنؓ۔ (۱)

بچوں کا نام کب رکھا جائے؟

ترمذی وابوداؤد اور نسائی وغیرہ کے روایت کردہ فرمان نبویؐ میں ہے کہ نوزائیدہ بچے کی ولادت کے ساتویں دن اس کا نام رکھا جائے۔ (۲) مگر دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے دوسرے دن بھی نام رکھا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گذشتہ رات میرا ایک لڑکا پیدا ہوا میں نے اس کا نام اپنے (خاندانی) باپ کے نام پر ابراہیم رکھا۔ (۳)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد (ساتویں دن سے پہلے) ہی اس کا نام رکھا جاسکتا ہے، سات دن تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۴)

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جنم کے بعد (ساتویں دن سے پہلے) ہی بچوں کے نام رکھنے کے متعلق روایات بہ نسبت ساتویں دن نام رکھنے کی احادیث سے زیادہ صحیح ہیں۔ (۵)

لہٰذا ولادت کے بعد سے ساتویں دن تک جب سہولت ہو نوزائیدہ بچے کا نام منتخب کرلیا جائے۔

بچے کا سر منڈوانے کا طریقہ

بچے کا نام رکھنے اور عقیقہ کرنے کے بعد تیسرا کام اس کا سر منڈوانا ہے۔ اب یہ سر کس طرح منڈوانا ہے؟ اس سلسلے میں ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا کہ اس کے سر کے آدھے بال (مونڈے ہوئے ہیں) اور آدھے بال (چھوڑے ہوئے ہیں) پس آپ ﷺ نے صحابہ کو اس سے منع فرمایا کہ اس کا پورے بال منڈوا دو یا پورے چھوڑ دو۔ (۶)

عقیقہ کے دن پورا سر منڈوانا سنت ہے۔ آدھا یا بعض حصہ نہیں۔ ایسے ہی کاٹ چھانٹ بھی جائز نہیں۔ کیونکہ حجاج بن حسان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ مشہور صحابی انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، میری بہن مغیرہ بیان کرتی ہیں اس وقت تم بچے تھے اور تمھارے سر کے بالوں پر دو چوٹیاں یا

(۱) احمد، بزار، مجمع الزوائد ۵۲/۸۔
(۲) مشکاۃ، ص:۳۶۲
(۳) مسلم، فتح الباری :۵۸۹/۹
(٤) مسلم، فتح الباری:۵۸۹/۹
(٥) مسلم، فتح الباری ۵۸۹/۹
(٦) مسلم، مشکاۃ ص۳۸۰۔

پیشانی کے بالوں کے دو حصے لٹک رہے تھے، اس وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے تمھارے سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا کی پھر فرمایا ان دونوں کو منڈوا دو یا کاٹ دو اس لیے کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے۔(۱)

مونڈے ہوئے بال کے وزن برابر صدقہ کرنا

نوزائیدہ بچے کے بال منڈوانے کے بعد ان بالوں کے برابر صدقہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کر کے فاطمہؓ کو فرمایا اس کا سر منڈوا دو اور اس کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو، پھر ہم لوگوں نے ان کو وزن کیا تو ان کا وزن ایک درہم یا بعض درہم کے برابر تھا۔(۲) یہ روایت ضعیف ہے۔

بچے کا ختنہ کرانا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں دن حسن وحسینؓ کا عقیقہ کیا تھا اور ان دونوں کا ختنہ بھی کرایا تھا۔(۳)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی اپنی اولاد کی طرف سے ساتویں دن عقیقہ کرتیں، نام رکھتیں، ختنہ کراتیں، سر منڈواتیں اور بالوں کے وزن برابر چاندی صدقہ کرتی تھیں۔(۴)

بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسحاق علیہ السلام کا ختنہ ساتویں دن اور اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ بالغ ہونے سے پہلے کرائے تھے، پھر اس کے بعد اسحاق علیہ السلام کا ختنہ ان کے خاندان میں اور اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ ان کے خاندان میں رواج پا گیا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے شہر (مدینہ) میں ہم نے دیکھا کہ عموماً بچوں کے دانت ٹوٹنے کے وقت (۶، ۷ سال کی عمر میں) ختنہ کرایا جاتا تھا۔(۵)

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ بچوں کا ختنہ ساتویں دن سے لے کر سات سال کی عمر تک کرایا جاسکتا ہے۔

(۱) ابو داؤد، مشکاۃ: ۳۸٤

(۲) ترمذی، مشکاۃ ص۳٦۲، حاکم ٤/۲۳۷، بیهقی ٤/٥۹

(۳) معجم صغیر، معجم کبیر، مجمع الزوائد: ٤/٥۹۔

(٤) مصنف ابن ابی شیبہ ۸/۲٤۰۔

(٥) تحفۃ المودود ص۱۰۸۔۱۰۹۔

بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ

یہ بات ظاہر ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کی غذا ماں کا دودھ ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(البقرہ:۲/۲۳۳)

"یعنی بچہ جننے والی عورت اپنی اولاد کو دو سال دودھ پلائے گی، اس شخص کی خاطر جو دودھ پلانے کی کامل میعاد پورا کرنا چاہے اور بچے کے باپ پر دودھ پلانے والیوں کے خورد و پوش کا ذمہ رہے گا۔"

علامہ ضحاک فرماتے ہیں: جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور اس بیوی سے اس کا دودھ پیتا ہوا بچہ بھی موجود ہو پھر وہ مطلقہ بیوی اس بچے کو دودھ پلاتی رہی تو اس شخص پر اس مطلقہ بیوی کو دودھ پلانے کی وجہ سے خورد و پوش دینا واجب ہے۔ (۱)

چلنا سیکھنے والے بچوں کی حفاظت

بچہ جب دودھ پیتے پیتے ڈیڑھ دو سال کا ہو جاتا ہے تو چلنا بھی سیکھ لیتا ہے اور چلنا سیکھنے کے بعد بچہ عموماً گھر سے باہر نکل آتا ہے، ایسی حالت میں کبھی وہ بدکردار جن کا شکار ہو جاتا ہے یا نظر بد میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب شام ہو جائے تو تم اپنے بچوں کو روک رکھو کیونکہ شیطان اس وقت زمین میں پھیل جاتا ہے، پھر جب رات کی ایک گھڑی چلی جائے تو تم اپنے بچے کو چھوڑ دو، بخاری کی روایت میں ہے کہ شام کے وقت شیطان کا پھیلاؤ اور اچک لینا شروع ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت تم اپنے بچوں کو روک رکھو (۲) تاکہ وہ شیطان کی شرارت سے محفوظ رہ سکیں۔

حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں: اے اللہ کے رسول ﷺ جعفر کے بچوں کو بہت جلد نظر بد لگ جاتی ہے تو کیا ہم اس کے لیے جھاڑ پھونک کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھتی تو نظر بد ہی آگے بڑھتی۔ (۳)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جھاڑ پھونک کی کیا صورت ہوگی؟ تو اس کا جواب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں کہ: رسول اکرم ﷺ جن اور نظر بد سے بچنے کے لیے جھاڑ پھونک

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۸٤۔

(۲) بخاری و مسلم، مشکاۃ ۳۷۲۔

(۳) أحمد، ترمذی، ابن ماجه، مشکاۃ ص۳۹۰

کرتے تھے، یہاں تک کہ سورہ ناس اور فلق نازل ہوگئیں، جب یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو اختیار کرلیا اور ان دونوں کے علاوہ دیگر کلمات کو چھوڑ دیا۔ (۱)

بچوں کے بول چال کی تربیت

بچہ دو تین سال کی عمر میں بولنا شروع کر دیتا ہے، ان کی زبان سے سب سے پہلے کون سا لفظ کہلوایا جائے؟ اس سلسلے میں فرمان نبویؐ ہے:

«افتحوا على صبيانكم أول كلمة لا إله إلا الله ، ولقنوهم عند الموت لا إله إلا الله»(۲)

''یعنی اپنے بچوں کو سب سے پہلے لا الہ الا اللہ سکھاؤ اور موت کے وقت لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔''

پھر جب بچہ چار پانچ سال کا ہو جاتا ہے اور اچھی طرح بولنا سیکھ جاتا ہے اس وقت اس کی تعلیم کے متعلق معلم انسانیت ﷺ فرماتے ہیں:

«إذا إفصح أولادكم فعلموهم لا إله إلا الله »(۳)

''یعنی تمھارے بچے جب اچھی طرح بولنے لگ جائیں تو تم ان کو لا الہ الا اللہ کی تعلیم دو۔''

بچوں پر گھنٹی باندھنا منع ہے

حضرت عبدالرحمٰن بن حبان انصاری کی لونڈی بنانہ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھی، اسی اثنا میں ایک بچی آئی جس پر گھنٹی تھی جو آواز دے رہی تھی اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اس بچی کو میرے پاس آنے مت دو، جب تک تم اس کی گھنٹی کو کاٹ نہ ڈالو، میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس گھر میں فرشتہ داخل نہیں ہوتا جس گھر میں گھنٹی ہو۔ (۴)

بچوں کو چاندی کا کنگن پہنانا منع ہے

حضرت ثوبان نے کہا رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کہیں سفر کرتے تو سب سے اخیر میں اپنے اہل وعیال میں فاطمہ سے ملتے اور لوٹتے وقت سب سے پہلے فاطمہؓ ہی کے پاس تشریف لاتے، پس ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی جنگ سے لوٹے دراں حالے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے دروازے

---

(۱) جامع الترمذی، سنن ابن ماجہ، ص:۳۹۰۔

(۲) حاکم، تحفۃ المودود ص۱۳۳۔

(۳) عمل الیوم واللیلۃ ص۱۱۳۔

(۴) ابوداؤد، مشکاۃ، ص:۳۷۹

پر ایک ٹاٹ یا چادر لٹکا دی تھی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو چاندی کے دو کنگن پہنا دیئے تھے، پھر آپ ﷺ تشریف لائے اور فاطمہؓ کے پاس داخل نہیں ہوئے، اس لیے فاطمہؓ نے سمجھا کہ آپؐ نے جو کچھ دیکھا اس چیز نے آپؐ کو اندر آنے سے روک دیا، چنانچہ فاطمہؓ نے چادر کو پھاڑ دیا اور دونوں بچوں سے دونوں کنگن اتار کر کاٹ ڈالے، پھر دونوں بچے روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس چلے آئے، آپ ﷺ نے ان دونوں سے وہ چیز لے لی، پھر ثوبانؓ سے فرمایا کہ اس کو فلاں خاندان میں لے جاؤ اور فاطمہؓ کے لیے کسی جانور کے دانت کا ایک ہار اور کچھوے کی ہڈی کے دو کنگن خرید لو۔ (۱) اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چاندی کا کنگن پہنانا منع ہے۔

بچوں کے ساتھ وعدہ خلافی نہ کرنا

عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا ایک مرتبہ میری ماں مجھے بلانے لگی، اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف فرما تھے، میری ماں نے کہا یہاں آؤ تم کو میں دوں گی، اس وقت اللہ کے رسولؐ نے ان سے کہا تم نے اس کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے کہا میں نے اسے کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس کو کوئی چیز نہیں دیتی تو تم پر جھوٹ (کا گناہ) لکھ دیا جاتا۔ (۲)

لہٰذا بچوں کا دل بہلانے کے لیے کبھی ان سے جھوٹا وعدہ نہ کیا جائے۔

بچوں کو پیار کرنا

تین چار سال کی عمر میں بچہ جب چلنا پھرنا سیکھ جاتا ہے اور میٹھی میٹھی بولی بولنے لگتا ہے تو وہ ہر ایک کے دل کو موہ لیتا ہے، ایسی حالت میں سب کو ان سے پیار ہو جاتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا، آپ ﷺ نے اس کو بوسہ دیا، پھر فرمایا یہ بچہ بخالت اور بزدلی کا باعث ہے اور اللہ کے پھولوں میں سے ایک پھول ہے۔ (۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا، اس وقت آپ ﷺ کے پاس اقرع بنؓ حابس (نامی ایک صحابی) موجود تھے، انھوں نے کہا کہ میرے پاس دس بچے ہیں، مگر ان میں کسی کو میں نے بوسہ نہیں دیا ہے، اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: جو

---

(۱) احمد، ابو داؤد، مشکاۃ ص۳۸۳۔

(۲) ابو داؤد، شعب الایمان للبیہقی، مشکاۃ ص۴۱۶۔

(۳) شرح السنہ، مشکاۃ ص۴۰۲۔

شخص کسی پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ (۱)

بچوں پر شفقت کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے پاس ایک خاتون آئی، اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں تھیں، وہ مجھ سے کچھ مانگ رہی تھی، مگر میرے پاس سوائے ایک کھجور کے اور کچھ نہیں تھا، اس لیے میں نے اس کو وہ کھجور اس کو دے دی، پھر اس نے اس کو دو حصے کر کے دونوں بچیوں کو دے دیا اور خود نہیں کھائی، پھر وہ کھڑی ہوگئی اور نکل گئی، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے ان کو یہ واقعہ سنایا، تو آپ نے فرمایا: جو شخص ان بچیوں کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہو پھر بھی وہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرے تو یہ بچیاں ان کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ بنیں گی۔ (۲)

بچیوں پر بچوں کو ترجیح نہ دینا

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی بچی ہو، پھر اس کو اس نے زندہ نہیں گاڑا اور نہ اس کی توہین کی اور نہ اس پر اپنے بچے کو ترجیح دی، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (۳)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دو بچیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ دونوں بالغ ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ملا دیا۔ (۴)

سات سالہ اولاد کی تربیت

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ و دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اپنی اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوں اور وہ جب دس سال کے ہوں تو ان کو مارو اور ان کے سونے کی جگہ کو الگ کر دو۔ (۵)

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے بچوں کو روزہ رکھواتے تھے اور ان کے کھیلنے کے لیے کھلونے بھی رکھتے تھے، اُن میں سے جب کوئی بچہ کھانے کے لیے روتا تھا تو ہم ان کو

---

(۱) بخاری و مسلم، مشکاۃ ص۴۰۱

(۲) بخاری و مسلم، مشکاۃ ص۴۲۱۔

(۳) أبو داؤد، مشکاۃ، ص:۴۲۳۔

(۴) مسلم، مشکاۃ ۴۲۱۔

(۵) ابو داؤد [illegible]

کھلونا دیتے تھے یہاں تک کہ افطار کا وقت آ جاتا تھا۔(۱)

یہ بات ظاہر ہے کہ کھلونے سے بہلنے والے بچے کی عمر ۷،۸ سال سے کم ہی ہوگی، لہٰذا سات سال کی عمر میں بچوں کو نماز اور روزے کی تعلیم دینا چاہیے۔

اولاد کو ادب سکھانا

معلم انسانیت ﷺ نے فرمایا:

«ما نحل والد ولده من نحل أفضل من ادب حسن»(۲)

''یعنی کوئی باپ اپنے بچے کو اچھے ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا۔''

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں اگر کوئی شخص ہر روز آدھا صاع (سوا کیلوگرام) گیہوں خیرات کرے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ شخص اپنی اولاد کو حسن ادب سکھائے۔ (۳)

ان کو ادب سکھانے کے لیے اگر کبھی مارنے کی ضرورت پڑ جائے تو مارا بھی جاسکتا ہے، جیسے رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دس وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ بھی کی تھی:

«وانفق علی عيالك من طولك ولا ترفع عنهم عصاك أدبا، وأخفهم في الله»(٤)

''یعنی اپنے اہل وعیال پر مقدور بھر خرچ کرو اور ان سے ادب کی لاٹھی مت اٹھاؤ اور ان کو اللہ کے بارے میں ڈراؤ۔''

حسن ادب کے دو نمونے

عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بچپن میں رسول اللہ ﷺ کی پرورش میں تھا، ایک مرتبہ میرا ہاتھ برتن کے چاروں طرف گھوم رہا تھا اس وقت رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا کہ: بسم اللہ کہو اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔''(۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ چند بچوں پر گزرے تو آپ ﷺ نے ان پر سلام کیا۔(٦)

---

(١) البخاری ص٢٦٣

(٢) الترمذی، مشكاة ص٤٢٣۔

(٣) حاكم ٤/٢٦٣

(٤) أحمد، مشكاة ص١٨۔

(٥) بخاری و مسلم، مشكاة ص٣٦٣۔

(٦) بخاری و مسلم، مشكاة ص٣٩٧

ادب کے سلسلے میں دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: کہ چھوٹے بڑے کو سلام کریں۔ (۱)

اپنے بال بچوں پر خرچ کی اہمیت

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو اللہ مال ودولت دے تو چاہیے کہ وہ اپنے اور اپنے بال بچے سے شروع کرے۔ (۲)

حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل دینار وہ دینار ہے جس کو آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرے۔ (۳)

بال بچوں پر خرچ اپنے مقدور بھر کرنا چاہیے، جیسا کہ مشفق امت ﷺ نے فرمایا:

«وأنفق على عيالك من طولك» (٤)

''یعنی اپنے بال بچوں پر اپنے مقدور بھر خرچ کرو۔''

اس خرچ میں کنجوسی نہیں کرنی چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص کنجوسی سے کام لے تو اس کی بیوی کفایت بھر مال شوہر کے مال سے لے سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ہندؓ بنت عتبہ نے ایک مرتبہ کہا اے اللہ کے رسولؐ! میرے شوہر ابوسفیانؓ ایک بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے اتنا مال نہیں دیتے جو میرے اور میری اولاد کے لیے کافی ہو، مگر میں اس سے کچھ لے لیتی ہوں جسے وہ نہیں جانتے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دستور کے مطابق جو تم کو اور تمھاری اولاد کو کافی ہو اتنا مال تم لے سکتی ہو۔ (۵)

اولاد کی شادی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فی التوراة مكتوب من بلغت ابنته اثنتى عشرة سنة ولم يزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك عليه»(٦)

---

(١) البخاري، مشكاة ص٣٩٧۔
(٢) مسلم، مشكاة ص٢٩٠۔
(٣) الترمذى ٢/١٨۔
(٤) أحمد، مشكاة ص١٨۔
(٥) البخاري، مسلم، مشكاة ص٢٩٠۔
(٦) البيهقي۔

''یعنی تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص کی بیٹی بارہ سال کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ اس کی شادی نہیں کرتا، پھر وہ لڑکی کسی گناہ میں مبتلا ہوگئی تو اس گناہ کی ذمہ داری اس شخص پر ہوگی۔''

حضرت ابوسعید خاری اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فإذا بلغ فليزوجه، فإن بلغ ولم يزوجه، فأصاب إثما، فإنما إثمه على أبيه»(۱)

''یعنی بچہ جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کردے، پس وہ اگر بالغ ہوگیا اور اس کے باپ نے اس کی شادی نہیں کرا دی، پھر وہ بچہ کسی گناہ کا مرتکب ہوگیا تو اس گناہ کی ذمہ داری صرف اس کے باپ پر ہوگی۔''

مذکورہ بالا تمام ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پتہ چلا کہ بچہ جب بالغ ہو جائے تو اس شادی کردی جائے۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے شادی کرنا ممکن نہ ہو اور بچے یا بچی کے بدچلن ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کے اندر اللہ کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کو روزہ رکھنے کی ترغیب دی جائے، کیونکہ نبض شناسِ امت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو جوان شادی کرنے کی طاقت نہ رکھے وہ روزہ رکھے۔(۲)

وصلى الله على نبينا ومربينا محمد وسلم تسليما كثيراً!

❁......❁......❁

(۱) البیهقی۔

(۲) البخاری و مسلم، مشکاۃ ص ۲۶۷۔

پیغمبر اسلام ﷺ دانشوران مغرب کی نظر میں (۱)

مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری، ناظم مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ، نیپال

رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے تمام گوشوں میں جامعیت، صالحیت، اعتدال وانطباق وغیرہ کا پہلو نمایاں نظر آئے گا اور بلا تفریق امیر وغریب، شاہ و گدا، عربی وعجمی پوری دنیائے انسانیت کے لیے آپ ﷺ کی ذات مشعل راہ اور قابل اتباع ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ ہادیِ عالم اور رحمۃ للعالمین ہیں اور آپ کی ذات سارے بنی نوع انسان کے لیے بہترین اسوہ ونمونہ ہے۔

آپ ﷺ کی سیرت میں اتنی دل کشی اور دلآویزی ہے کہ اپنے تو اپنے پرائے بھی آپؐ کی تعریف وتحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نظریاتی اختلاف کے باوجود نہایت عقیدت ومحبت سے آپ کا ذکر جمیل کرتے ہیں، غیروں کی زبان وقلم سے نبی کریم ﷺ کا ذکر جمیل آپؐ کا ایک زبردست معجزہ، آپؐ کی صداقت وحقانیت کی روشن دلیل اور «ورفعنا لك ذكرك» کی زندہ تصویر ہے۔

دانشوران مغرب اور مفکرین یورپ جو اس وقت علم وتحقیق کے میدان میں دوسری اقوام سے ممتاز ہیں، انھوں نے آپؐ کی سیرت کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان میں جو غیر متعصب اور منصف مزاج ہیں، انھوں نے نبی کریم ﷺ کے سلسلے میں اپنے عقیدت مندانہ تأثرات کا اظہار اور نہایت والہانہ انداز

(۱) اس مقالے کی ترتیب میں شیخ احمد بن حجر آل بوطامی ﷾ قاضی المحکمۃ الشرعیۃ قطر کی کتاب «الاسلام والرسول فی نظر منصفی الشرق والغرب» خاص طور پر پیش نظر رہی ہے۔

میں آپ کا ذکر خیر کیا ہے:

والفضل ما شهدت به الأعداء

ایسے مصنفین و مفکرین کی فہرست اگرچہ بہت طویل اور سیکڑوں سے متجاوز ہے مگر مقالہ ہذا میں صرف چند مغربی مفکرین کے تاثرات اختصار کے ساتھ قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

① مشہور مفکر ''برناڈ شا'' حضرت محمد ﷺ کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''میرے خیال میں اگر محمد ﷺ جیسا شخص پوری دنیا کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لے لے تو وہ ہر کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور پیچیدہ مسائل حل کر کے دنیا کو خیر و برکت کا منبع اور امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دے گا۔''(۱)

② ''اکلیدوس'' نے مذہب اسلام کی حقانیت اور نبی کریم ﷺ کی آفاقیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''درحقیقت لوگ محمد ﷺ اور ان کے مذہب کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور محمد ﷺ کو مسیح علیہ السلام کا حریف تصور کرتے تھے، مگر میں نے آپ کی سیرت کا مطالعہ کیا تو انھیں مسیح علیہ السلام کی مخاصمت سے بالاتر پایا۔ درحقیقت انھیں تو انسانیت کا نجات دہندہ کہنا چاہیے۔ میرے خیال میں اگر محمد ﷺ جیسا شخص دور جدید کی زمام اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تو وہ دنیا کے مسائل نہایت آسانی سے حل کر سکتا ہے اور دنیا کو امن و سلامتی اور سعادت و بخت کی بیش بہا نعمتوں سے مالا مال کر سکتا ہے جس کی اس وقت دنیا کو سخت ضرورت ہے۔''(۲)

③ مشہور انگریزی مصنف اور مفکر ''ٹامس کارلائل'' نے پیغمبر اسلام ﷺ کی عظمت کا اعتراف بڑے خلوص کے ساتھ کیا ہے:

''حضرت محمد ﷺ میرے خیال میں یقیناً پیغمبر صادق ہیں اور میں آپؐ کے وہ اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ بیان کر دینا ضروری ہیں، حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ہم عیسائیوں کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ آپؐ دغا باز اور کذب مجسم تھے اور آپؐ کا مذہب دجل و فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے، کذب و افتراء کا وہ انبار عظیم ہے جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے، خود ہمارے لیے شرمناک ہے اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو (۱۲۰۰) برس سے اسی کروڑ (۸۰۰۰۰۰۰۰۰) انسانوں

(۱) الاسلام والرسول فی نظر منصفی الشرق والغرب، ص:۱۳۱۔
(۲) الاسلام والمستشرقون لزکریا ہاشم بحوالہ الاسلام والرسول، ص:۱۳۱۔

کے حق میں شمع ہدایت کا کام کر رہے ہیں۔"

کیا ایک جھوٹا آدمی کسی مذہب کا بانی ہوسکتا ہے؟ جھوٹا آدمی تو اینٹ اور گارے کا ایک مکان تک نہیں بنا سکتا، اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور اشیاءِ تعمیر کے خواص کا صحیح علم نہ ہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے جو مکان کی تعمیر میں ضروری ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان، مکان نہ کہلائے گا، بلکہ وہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا، ایسا مکان بارہ صدیوں تک قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں اسی (۸۰) کروڑ انسان سما سکتے ہیں، جبکہ اسلام کی شاندار عمارت پوری پختگی کے ساتھ اب بھی قائم ہے۔ (۱)

کارلائل مزید لکھتا ہے:

"ہم کسی طرح محمد ﷺ کو حریص اور منصوبہ باز اور ان کی تعلیمات کو جہل اور نادانی نہیں سمجھ سکتے، وہ پیغام جو آپؐ لے کر آئے تھے بالکل سچا تھا، وہ ایک آواز تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی، اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال، اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا، وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا، جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔" (۲)

④ انگریز مستشرق ایچ۔ جی ویلز لکھتا ہے:

"محمد ﷺ کی صداقت کی سب سے ٹھوس دلیل آپؐ کے خاندان اور قریبی لوگوں کا آپؐ پر ایمان لانا ہے، یہ لوگ آپ ﷺ سے اچھی طرح واقف تھے، اگر انھیں محمد ﷺ کی سچائی پر شبہ ہوتا تو یہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔" (۳)

⑤ فرانسیسی مفکر "بلانج" نبی کریم ﷺ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"نوجوان محمد ﷺ کا شمار تاریخ کے اہم اور مشہور ترین لوگوں میں ہوتا ہے انھوں نے تین قابل ذکر کام انجام دیے: اول یہ کہ قوم کو نئی زندگی عطا کی دوم یہ کہ جمہوریت کو رواج دیا۔ سوم یہ کہ ایک مذہب کی بنیاد ڈالی۔" (۴)

⑥ مشہور فرانسیسی شاعر "الفانس لامارٹن" جو اہل مشرق سے ہمدردی رکھنے والا ہے اور اسلامی و مشرقی علوم کا بے لاگ مطالعہ کرنے میں عالمگیر شہرت کا مالک ہے، لکھتا ہے:

---

(۱) الرسول القائد لشميم طارق، ص٤٧٨-٤٧٩، الاسلام والرسول ص١٣٢۔

(۲) الرسول القائد لشميم طارق، ص:٤٧٩۔

(۳) الاسلام والرسول في نظر منصفي الشرق والغرب ص١٣٢۔

(٤) الاسلام والرسول ص١٣٢۔

"اگر نصب العین کی عظمت، وسائل کی کمی اور اس کے باوجود زبردست نتائج حاصل کرنے کو کسی انسان کی عقل و دانش کا پیمانہ بنالیا جائے تو دنیا کی وہ کون سی عظیم ہستی ہے جن کو محمد ﷺ کے مقابلہ میں کھڑا کیا جاسکتا ہے؟......اس عظیم ہستی نے نہ صرف افواج کی سپہ سالاری کے قانون بنائے بلکہ سلطنتوں اور عوام پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے، کروڑوں افراد (جن کی تعداد اس وقت کل آبادی کا ایک تہائی تھی) ان سے متاثر ہوئے، یہی نہیں بلکہ انھوں نے مذہبوں اور ان کے خود ساختہ خداؤں کو باطل قرار دیا، روحوں کو بالیدگی عطا کی اور ذہنوں کو نئی فکر سے نوازا۔"

قرآن کریم کی اساس پر جس کا ہر حرف قانون بن چکا ہے، حضور ﷺ نے ایک ایسی روحانی قومیت کی بنیاد ڈالی جس سے ہر نسل و زبان کے لوگ منسلک ہوگئے، محمد ﷺ نے تمام باطل خداؤں اور بتوں کو مسمار کرکے خدا کی وحدانیت اور اس کی بزرگی اور روحانیت (غیر مادی ہونے) کا سکہ جمادیا۔ (۱)

نبی کریم ﷺ ایک فلسفی (۲)، خطیب، رسول، قانون ساز، فاتح قلوب، مقبول نظریات کے مؤسس اور ایک ایسے مذہب کے بانی تھے جس میں بت پرستی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اس کے علاوہ انھوں نے ۲۰ ارضی سلطنتیں قائم کیں اور سب سے بڑھ کر خود محمد ﷺ کی ذات فاتح عالم ثابت ہوئی، انسانوں کی عظمت کو ناپنے کے جتنے پیمانے ہیں سب کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم پھر استفسار کرتے ہیں کہ ہے کوئی جو آپ ﷺ کے عظیم مقام کو پاسکے اور ہے کوئی جسے محمد ﷺ سے عظیم تر ثابت کیا جاسکے۔ (۳)

⑦ امریکی مصنف ڈاکٹر "مائیکل ہارٹ" نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (The Hundred) میں ان سو (۱۰۰) انتہائی اہم، تاریخ ساز اور عبقری شخصیتوں کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے بنی نوع انسان پر دور رس اثرات چھوڑے ہیں، پھر "مائیکل ہارٹ" نے ان شخصیات کے مناقب اور فضائل کا لحاظ کرکے ان کے درجات کا تعین کیا ہے، اور دنیا کی سو انتہائی اہم شخصیتوں کی ترتیب میں حضرت محمد ﷺ کا تذکرہ پہلے نمبر پر کیا ہے اور اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو

---

(۱) الرسول القائد، ص:٤٨١۔

(۲) "فیلسوف" کا معنی محبّ علم وحکمت ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ "فیلا" اور "سوف" دو کلمات سے مرکب ہے، "فیلا" کا معنی محبّ اور "سوف" کا معنی حکمت ہوتا ہے، یہاں یہی مفہوم مراد ہے ورنہ فلسفی کا مروجہ مفہوم انبیاء پر صادق نہیں آسکتا کیونکہ فلاسفہ کے نظریات نبوت، حشر ونشر وغیرہ کے سلسلے میں باطل وگمراہ کن ہیں جبکہ دوسرے فلاسفہ سرے سے خالق ہی کا انکار کرتے ہیں۔

(۳) الاسلام والرسول ص١٣٤، الرسول القائد ص٤٨٢۔

تیسرے نمبر پر رکھا ہے جبکہ دوسرے نمبر پر ایک سائنسدان ''اسحاق نیوٹن'' کا ذکر ہے، اُس نے نبی کریم ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے اس انتخاب پر کہ محمد ﷺ دنیا کی سب سے زیادہ ذی اثر شخصیت میں بہت سے لوگوں کو تعجب ہوا ہے، لیکن محمد ﷺ تاریخ کی ایک ایسی بے مثل شخصیت ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں سطح پر شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔''(۱)

⑧ انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا کا مصنف گیارہویں اشاعت میں لکھتا ہے:

''عظیم مذہبی شخصیات میں محمد ﷺ سب سے قد آور، کامیاب اور خوش قسمت تھے، عرب میں آپ کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جبکہ اہل عرب جہالت اور گمنامی کے عمیق غار میں گر چکے تھے، ان کے یہاں نہ تو کوئی قابل احترام دینی نظریہ تھا اور نہ ہی ثقافتی، سیاسی اور اجتماعی اصول و ضابطہ اور نہ ہی ان کے پاس کوئی قابل فخر علم وفن تھا، دنیا سے ان کا رابطہ کٹ چکا تھا وہ خود باہم منتشر اور مختلف اکائیوں میں بٹے ہوئے تھے اور آپس میں برسر پیکار رہا کرتے تھے، یہودیت نے ان کی رہنمائی کرنا چاہی مگر وہ کامیاب نہ ہوئی، اسی طرح عیسائیت کی اصلاحی کوشش بھی بارآور نہ ہوئی، لیکن نبی محمد ﷺ کا جب ظہور ہوا تو انھوں نے چند سالوں میں عرب کی کایا پلٹ دی اور تمام باطل اعتقادات اور بے بنیاد رسوم ورواج کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے اور عرب قوم کو بت پرستی کی دلدل سے نکال کر توحید کی سیدھی شاہراہ پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہوگئے، چنانچہ اب وہ لوگ حق کے داعی ومناد بن گئے جو پہلے بت پرستی اور فتنہ وفساد کے علمبردار تھے، یہ لوگ رُوئے زمین پر پھیل گئے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے، اللہ کی عبادت میں اس دلچسپی اور انہماک کا مظاہرہ کیا کہ بڑے بڑے عباد وزھاد سے بازی لے گئے اور روحانی بلندی اور معاشی خوشحالی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور ان اسلامی علوم سے آراستہ ہوئے جن سے پوری دنیا فیض یاب ہورہی تھی اور جن کی کرنوں نے ہر جگہ کی جہالت اور تاریکی کو کافور کیا اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنا زبردست انقلاب صرف بیس (۲۰) سال کی قلیل مدت میں برپا ہوا، اسلامی تعلیمات بے حد آسان ہیں جن پر عمل پیرا ہونا بڑا سہل ہے''۔

کسی مصلح کا یہ دعویٰ کہ وہ مصلح اول ہے اس کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے، دراصل کامیاب ریفارمر تو وہ ہے جو پوری دنیا کی اصلاح کا بیڑا اُٹھائے اور اس کو صراط مستقیم پر گامزن کردے، یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اہل علم اور مفکرین کی نگاہ میں بمقابلہ دیگر مصلحین ومرشدین، نبی

(۱) الرسول القائد ص۳۱۔

محمد ﷺ کے مقام کو بلند کردیا ہے۔

پھر انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا کے مصنف نے محمد ﷺ کی تین اہم خصوصیات ذکر کی ہیں جن کی وجہ سے آپؐ دیگر انبیاء سے ممتاز ہو جاتے ہیں:

① آپؐ پوری دنیا کے لیے مبعوث کیے گئے تھے جبکہ دیگر انبیاء ورسل کسی خاص قوم کی اصلاح کے لیے آئے تھے، اسی طرح ان انبیاء پر نازل شدہ کتابیں بھی مخصوص قوم اور محدود وقت کے لیے ہوتی تھیں، جبکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات آفاقی اور عالمگیر ہیں۔

② دیگر انبیاء کسی ایک خصوصیت سے آراستہ ہوتے تھے جبکہ محمد ﷺ تمام اعلیٰ صفات اور اہم خصوصیات کا پیکر تھے۔ تمام لوگوں کے مقابلے میں آپ کا اخلاق بے حد بلند تھا اور درحقیقت وہ ''انسان کامل'' کا سچا نمونہ تھے۔

③ نبی ﷺ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عالمی امن وامان کی بنیاد ڈالی اور صرف انفرادی معاشرت کے اصول بتانے پر اکتفاء نہ کیا بلکہ خاندان اور قبائل کو باہم مربوط اور متحد رہنے کا گر بھی سکھایا۔

کیا اب بھی اس امر میں کسی شبے کی گنجائش ہے کہ آپ روئے زمین کے انسانوں میں سب سے افضل تھے؟ ان تمام فضائل وخصوصیات کے باوجود آپ حد درجہ متواضع اور خاکسار تھے اور تمام لوگوں کی طرح خود کو ایک عام انسان تصور کرتے تھے اور معاشرے کا ایک فرد گردانتے جو حقوق ومراعات عوام کو حاصل تھے خود کو بھی انھی کا مستحق سمجھتے اور جو فرائض وذمہ داریاں دوسروں پر ہوتی تھیں انھیں خود بھی انجام دیتے، گویا آپؐ کے نزدیک بلا تفریق سب کے حقوق اور ذمہ داریاں برابر تھیں، چھوٹے بڑے، مرد وعورت، عربی وعجمی میں کوئی تفریق نہ کرتے تھے، یہی اسلام کا مبنی بر انصاف قانون ہے۔ (۱)

⑨ روسی فلاسفر ''کاؤنٹ ٹالسٹائی'' نے دین محمدی (ﷺ) کی تعلیمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہی وہ مذہب ہے جس نے روح اور مادہ (جسم) دونوں کے احترام کی تعلیم دی ہے اور اس کے نبیؐ نے خود اپنی نبوت کے ساتھ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی تصدیق کی ہے، اپنی دعوت کے ابتدائی دور میں قدیم مذاہب کے ماننے والوں سے اس نے جو مصائب ومشکلات برداشت کی ہیں اور جس ثابت قدمی ویقین کامل اور اعتماد کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔'' (۲)

(۱) الاسلام والمستشرقون لزکریا هاشم بحواله الاسلام والرسول، ص: ۱۳۷۔

(۲) الاسلام والمستشرقون لزکریا هاشم بحواله الاسلام والرسول ص ٤٣٧۔

اس کے بعد ٹالسٹائی مزید لکھتا ہے:

''بلاشبہ نبی محمد ﷺ ان عظیم مصلحین میں سے ہیں جنھوں نے انسانی معاشرے کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ان کے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے کروڑوں انسانوں کونورِحق سے آگاہ کیا اور امن وسلامتی کی جانب ان کی رہنمائی فرمائی، یہ عظیم کارنامے وہی انجام دے سکتا ہے جسے آسمان سے نصرت وتائید حاصل ہواور اللہ کی جانب سے الہام کیا گیا ہو۔''(۱)

⑩ انگریز سیرت نگار ''سر ولیم میور'' اپنی کتاب Life of Mohammad میں لکھتا ہے:

''رحم دلی اور احترام آپؐ کی قابل قدر صفات میں سے ہے، آپؐ اپنے ماننے والوں کا احترام اور ان کے ساتھ رحمدلی کا مظاہرہ فرماتے تھے، خاکساری، انسانی ہمدردی، اور مساوات و بھائی چارگی نے آپؐ کے متبعین کی محبت کو پائیدار بنادیا، آپؐ کسی کی دعوت کو رد یا کسی کے ہدیے کو واپس نہ کرتے خواہ وہ کوئی بھی ہو یا معمولی ہی کیوں نہ ہو، اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے کہ ہر ایک کو یہی گمان ہوتا کہ آپؐ کی نگاہ میں وہی سب سے افضل اور پسندیدہ ہے، غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کا حد درجہ خیال رکھنا، بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا، تنگی کے وقت بھی اپنے کھانے میں دوسروں کو شریک کرلینا اور اپنے پیروکاروں کی آسائش و راحت کے اسباب فراہم کرنے کی کوشش کرنا آپؐ کا شیوہ تھا، اس کے ساتھ ہی آپؐ بڑے سچے اور وفادار بھی تھے، فیصلہ کرتے وقت انصاف اور ہمدردی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی رحمدلی سے پیش آتے، یہ بلند اخلاق اور اعلیٰ انسانی فضائل اس بات کی پختہ دلیل ہیں کہ آپؐ ایک آسمانی مذہب کے بانی تھے نہ کہ دنیوی حکومت وسیادت کے خواہشمند۔''(۲)

⑪ پروفیسر ''کارڈی فور'' رقمطراز ہے:

''بیشک نبی محمد (ﷺ) صاحب الہام اور مذہب اسلام کے بانی ہیں، آپؐ کے بلند مقام کو کوئی نہ پہنچ سکا، اس کے باوجود انھوں نے خود کو دوسرے عنصر کی مخلوق نہیں سمجھا اور خود کو مسلمانوں کے طبقے کا ایک فرد تصور کیا، مساوات اور بھائی چارے کا جو شعور انھوں نے اسلامی جماعت کے ارکان میں بیدار کیا تھا وہ عملی شکل میں رائج تھا۔''(۳)

(۱) الاسلام والمستشرقون لزکریا هاشم بحواله الاسلام ص۱۳۸، الرسول القائد ص۴۹۶۔

(۲) الاسلام والمستشرقون لزکریا هاشم بحواله الاسلام والرسول ص۱۳۹۔

(۳) الاسلام والرسول ص:۱۴۱

⑫ پروفیسر ''گارسین دی تاسی'' لکھتا ہے:

''محمد (ﷺ) نے بت پرست ماحول میں آنکھیں کھولیں مگر ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنی عبقریت ثابت کردی، ہمیشہ بری عادات سے دور اور اخلاق حمیدہ سے آراستہ رہے اور اس درجہ اخلاص اور نیک نیتی کا مظاہرہ کیا کہ آپ کے ہم وطنوں نے آپ کو 'الامین' کا لقب دیا۔''(۱)

⑬ ''ڈی، جی ھوگارتھ'' نبی کریم ﷺ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

''ان کی روز مرہ عادتیں اور کام چاہے وہ عام رہے ہوں یا خاص کروڑوں لوگوں کے لیے شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام مسلمان ان پر خلوص دل سے عمل کرتے ہیں، دنیا کی کوئی بھی قوم ایسی نہیں (مسلمانوں کے علاوہ) جو اس طرح کسی کو مکمل انسان تسلیم کرتے ہوئے اس کی معمولی سے معمولی حرکت کی بھی تقلید کرتی ہو، کسی بھی نبیؑ کو وہ طرۂ امتیاز نصیب نہیں ہوا جو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کو حاصل ہے۔''(۲)

⑭ لندن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے لیکچرر پروفیسر ''فریڈ غلیوم'' نے نبی کریم ﷺ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمد ﷺ تاریخ کے عظیم لوگوں میں سے تھے، آپ کا ایمان تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اتحاد کے داعی اور علمبردار تھے، مشکل سے مشکل مسائل جدال وقتال کے بغیر محض اپنے حسن تدبیر سے حل کردیتے تھے، فوج، پولیس اور انتظامیہ کے بغیر جس طرح انھوں نے اپنی قوم کو متحد کیا عرب کی سرزمین پر ایسا کوئی شخص پیدا نہ ہوسکا۔''(۳)

⑮ فرانسیسی مؤرخ ''موسیوسیدیو'' نے نبی کریم ﷺ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمد نبی ﷺ کے ظہور کے بعد قبائل عرب متحد ہو کر ایک بہت بڑی قوم کی شکل میں ظاہر ہوئے جن کی حکومت اسپین کے دریائے تاج سے لے کر ہندوستان کے دریائے گنگا تک (بقول دیگر مشرق کے آخری چھور سے مغرب کے کنارے تک) پھیلی ہوئی تھی، اس قوم نے ایسے وقت میں تہذیب وتمدن کا علم سنبھالا جبکہ پورا یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔''(۴)

⑯ ''اکانٹ ہنری دی کاستری'' جو فرانس کا وزیر اور الجزائر کا سابق حکمران ہے اس نے اپنی

---

(۱) الاسلام والرسول ص:۱۴۲
(۲) الرسول القائد ص۴۸۷۔
(۳) الاسلام والرسول ص۱۴۳۔
(٤) الاسلام روح المدینة بحواله الاسلام والرسول ص۱۴۹۔

تصنیف میں اسلام کے ظہور سے قبل کے ادیان و مذاہب کا جائزہ لیتے ہوئے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور توحید خالص پر آپ ﷺ کی تعلیمات کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد اپنا تبصرہ قلمبند کرتا ہے:

''عقیدۂ توحید مسلمانوں کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتا ہے اور یہی عقیدہ محمد ﷺ کے رسول برحق اور نبی امین ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔''(۱)

⑰ اطالوی خاتون صحافی اور ادیب ''لورا ویتھ ویلیری'' اپنی کتاب ''محاسن اسلام'' میں نبی کریم ﷺ کی بعثت اور بے مثال کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''انسانی تہذیب وتمدن سے کوسوں دور بے آب وگیاہ اور چٹیل میدان والے شہر میں سرکش و شریر، ظالم و جابر، بدخلق وسخت دل اور اصول وضوابط سے عاری اکھڑ قوم کے درمیان سے ایک میٹھے اور فرحت بخش پانی کا چشمہ پھوٹا اور زمین پر بہنے لگا، پھر اس نے نہر کی شکل اختیار کرلی اور دیکھتے دیکھتے وہ بڑے دریا کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور جلد ہی اس سے مختلف نالیاں اور نہریں جاری ہوگئیں جس سے پوری دنیا سیراب ہوئی، لوگوں نے اس فرحت بخش شراب سے اپنی پیاس بجھائی اور بے شمار معاشرتی امراض سے شفایاب ہوگئے، باہم لڑنے جھگڑنے والے لوگ شیر وشکر ہوگئے۔ ان کے دلوں میں بغض وعداوت اور کینہ وحسد کی شعلہ زن آگ بجھ گئی اور نفرت وتعصب اور اختلاف وانتشار کے اسباب و وسائل کا خاتمہ ہوگیا، اس قسم کے حیرت انگیز انقلاب کی مثال تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔''

اس کے بعد اس خاتون صحافی نے اسلامی تعلیمات اور محمد ﷺ کی ذات گرامی کو دنیا کے لیے باعث رحمت قرار دیتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے:

''مذہب اسلام کے علاوہ کسی بھی دوسرے مذہب میں یہ خصوصیات اس اعلیٰ اور کامل ترین شکل میں ہرگز نہیں ہیں۔''(۲)

⑱ ''پروفیسر'' اپنی کتاب ''اسلام سائنسی دور میں'' میں رقمطراز ہے:

''محمد ﷺ کا ظہور مسیح سے پانچ سوستر (۵۷۰) سال بعد ہوا انھوں نے انسانیت کو اخلاق کے اعلیٰ اصول سے مزین اور توحید وحشر ونشر کے اعتقاد سے آراستہ کر کے اس کے فکر کی بلندی کا راستہ ہموار کیا۔''(۳)

---

(۱) الاسلام خواطر وسوانح ملخصا، ص:۱۰۔۱۸ بحوالہ الاسلام والرسول ص۱۵۱۔

(۲) الاسلام فی نظر اعلام الغرب، بحوالہ الاسلام والمسلمون، ص۱۵٤۔

(۳) الاسلام فی نظر اعلام الغرب، بحوالہ الاسلام والمسلمون ص۱۵٤۔

⑲ مغربی مؤرخ پروفیسر ''ڈبلیز'' نے دین محمدیؐ کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی ذات کو ہر علم کا سرچشمہ قرار دیا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''جو مذہب مکمل طور پر تمدن کا ساتھ نہ دے سکے اسے بلاچون وچرا دیوار پر ماردو، اور اس حقیقت سے انکار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ صرف مذہب اسلام ہی مدنیت کا ساتھ دے سکا ہے، جسے ثبوت درکار ہے، اس کو قرآن کے علمی نظریات اور معاشرے کو متحد کرنے والے قوانین کا مطالعہ کرنا چاہیے اس لیے کہ قرآن دینی، علمی، اجتماعی، اخلاقی، تاریخی اور ثقافتی علوم و معارف کا غنچہ ہے۔''

پروفیسر ''ڈبلیز'' نبی کریم ﷺ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''محمد ﷺ بیک وقت بہترین کا شتکار، حاذق طبیب، ماہر قانون ساز اور بے مثال جنرل تھے، میرے اس دعوے کی تصدیق آپ کی احادیث کا مطالعہ کرنے والے پر مخفی نہیں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ آپؐ کی صرف ایک حدیث میرے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے، آپؐ نے فرمایا:

«نحن قوم لا نأكل حتى نجوع وإذا أكلنا لا نشبع»

''ہم ایسے لوگ ہیں جو بغیر بھوک کے کھاتے ہی نہیں اور جب کھاتے ہیں تو خوب آسودہ نہیں ہوتے۔''

آپؐ کی اسی حدیث پر علم طب اور حفظان صحت کی پوری بنیاد قائم ہے اور آج تک اطباء بے مثال ترقی، مہارت اور کثرت کے باوجود صحت کے باب میں اس سے قیمتی فارمولا نہ پیش کر سکے، خلاصہ یہ کہ حضرت محمد ﷺ خوبصورتی، مہارت اور سعادت وظفر کا مجموعہ تھے۔''(۱)

⑳ مشہور عیسائی مورخ ''ریونڈر با سورتھ وسمتھ'' نبی کریم ﷺ کو پوپ اور قیصر سے زیادہ طاقتور ثابت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مذہب اور حکومت کے رہنما کی حیثیت سے پوپ اور قیصر کی دو شخصیتیں حضرت محمد ﷺ کے ایک وجود میں جمع تھیں، آپؐ پوپ تھے مگر پوپ کی ظاہر داری سے پاک، آپؐ قیصر تھے مگر قیصر کے جاہ وحشم سے بے نیاز، اگر دنیا میں کسی شخص کو یہ کہنے کا حق ہے کہ اس نے باقاعدہ فوج، شاہی محل اور لگان کی وصولی کے بغیر، صرف خدا کے نام پر دنیا میں امن وانتظام قائم رکھا تو وہ صرف حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپؐ کو ظاہری ساز وسامان واسباب کے بغیر سب کی سب طاقتیں حاصل تھیں۔''(۲)

---

(۱) الحدیقه ج۷ از محب الدین خطیب بحواله الاسلام والرسول ص۱۶۱۔

(۲) الرسول القائد ص۴۸۵۔

(۲۱) ''مارکس ماریہوف'' نبی کریم ﷺ کے خلعت نبوت سے سرفراز کیے جانے کے وقت کے واقعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بعض لوگ محمد ﷺ کو تعصب یا نفسانیت کا مریض سمجھتے ہیں مگر آپ ؐ کی پوری سیرت اور آپ ؐ کی تعلیمات اس کی تردید کرتی ہیں۔''(۱)

(۲۲) ''آرتھر روز'' اپنی کتاب ''شہود تاریخ یسوع'' میں رقمطراز ہے:

''اسلام ہی وہ منفرد دین ہے جس کے بانی ؐ کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ ان کا حقیقی اور تاریخی وجود تھا۔''(۲)

(۲۳) ''ویل ڈیورانٹ'' (Will Durant) اپنی کتاب Story of Culture میں حضرت محمد ﷺ کو تاریخ کا سب سے عظیم انسان قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''اگر کسی ایسے شخص کی عظمت کے بارے میں فیصلہ کیا جائے جس کی قدر و منزلت تمام لوگوں میں مسلم رہی ہو تو ہم بلاشبہ محمد ؐ کا نام لیں گے، اس لیے کہ وہ تاریخ عالم میں سب سے عظیم المرتبت انسان ہیں، انھوں نے اصلاحی میدان میں وہ نمایاں کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ کا دوسرا مصلح ان کی ہمسری نہ کر سکا۔''(۳)

(۲۴) مغربی مفکر ''بارٹلی سانٹ ہیلر'' نے محمد ﷺ کی کامیابی کو ان کے اعلیٰ اخلاق کا کرشمہ بتایا ہے:

محمد ﷺ عربوں میں سب سے ذہین، سب سے متدین اور بڑے رحمدل تھے، انھوں نے اتنی عظیم الشان کامیابی صرف اپنے اعلیٰ اخلاق کے ذریعے حاصل کی۔''(۴)

(۲۵) فرانسیسی ادیب اور انصاف پسند محقق ''جان بر'' نے فتح مکہ کے واقعات قلمبند کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کی رحمدلی اور اعلیٰ اخلاق کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''محمد ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے مگر آپ ؐ کا سر جھکا ہوا تھا، وہ اپنے رب کی عطا کردہ کامیابی پر مسرور ضرور تھے مگر سراپا عجز و انکسار بنے ہوئے تھے، کبر و نخوت کا نام و نشان تک نہ تھا، ان کا ایمان تھا کہ یہ فتح اللہ کے فضل سے حاصل ہوئی ہے، مسجد حرام میں داخلے کے وقت قریش نے آپ ؐ کو گھیرے میں لے لیا، وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اب ان کے خلاف کس قسم کا فیصلہ کیا جانے والا ہے، باوجودیکہ قریش اور مشرکین نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ؐ کے ماننے

(۱) الاسلام والرسول ص ۱۶۳۔
(۲) الاسلام والرسول ص ۱۶۵۔
(۳) الاسلام والرسول ص ۱۶۵۔
(٤) نظرات فی الشرائع از زید بن عبدالعزیز بن فیاض بحوالہ الاسلام والرسول، ص ۱۶۹۔

والوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے تھے، عداوت و دشمنی کی حد کر دی تھی انھیں سخت اذیتیں پہنچائی تھیں اور ان کے ٹڈی دل لشکر نے متعدد بار مسلمانوں پر حملہ کر کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی تھی، آپؐ نے بڑی شفقت کے ساتھ ان کی جانب نظر اٹھائی اور پوچھا: ''تمھارے خیال میں اب تمھارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، لوگوں نے جواب دیا کہ آپؐ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا:

«فاذهبوا أنتم الطلقاء لا تثريب عليكم اليوم»

''پس چلے جاؤ تم سب آزاد ہو، آج کے دن کسی سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا۔''

یہ واقعہ لکھنے کے بعد ''جان برٗ'' اپنا تبصرہ قلمبند کرتا ہے:

''آپؐ دنیا میں کسی کمانڈر کو اپنے دشمنوں سے اس انداز میں گفتگو کرتا ہوا ہرگز نہ پائیں گے خواہ وہ انسانیت کی تکریم میں بے حد بلند ہی کیوں نہ ہو یا وہ علم واخلاق کے اعلیٰ مقام پر ہی کیوں نہ فائز ہو خصوصاً ایسے دشمنوں سے جنھوں نے اس کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو، یہی سبب تھا کہ پورا قبیلہ قریش مشرف با اسلام ہو گیا اور مسجد حرام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر جگہ ''لا الٰہ الا اللہ کی صدا گونجنے لگی۔''(۱)

۲۶ ڈاکٹر ''گلوڈیا'' نے نبی کریم ﷺ کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ ﷺ ہر شخص سے ہر وقت ملنے کے لیے تیار رہتے تھے، آپ کی فیاضی وسیر چشمی غیر محدود تھی، اصلاح قوم کی فکر میں ہمیشہ مصروف ومنہمک رہتے تھے، مزاج میں تمکنت ونخوت نام کو بھی نہ تھی یہاں تک آپ ﷺ صحابہ کرام کو تعظیم وتکریم کے رسمی آداب سے منع فرما دیتے تھے۔''(۲)

۲۷ ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام مصنفوں اور فاتحوں میں ایک بھی انسان ایسا نہیں جس کی سوانح حیات محمد ﷺ کی سوانح سے زیادہ مفصل اور سچی ہو۔''(۳)

مندرجہ بالا حقیقت کا اعتراف ''اپالوجی'' نے کیا ہے۔

۲۸ فیلیا یونیورسٹی کے کلیہ الحقوق کے ڈین پروفیسر ''شیرل'' نے ۱۹۲۷ء کی حقوق کانفرنس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ:

(۱) تفسیر عبدالفتاح الامام بحوالہ الاسلام والرسول ص ۱۷۲۔

(۲) الرسول القائد ص ۴۹۴۔

(۳) الرسول القائد ص ۴۹۴۔

''انسانیت کے لیے یہ امر باعث افتخار ہے کہ محمد ﷺ جیسی شخصیت اس کی جانب منسوب ہے اس لیے کہ اَن پڑھ (امی) ہونے کے باوجود انھوں نے ۱۳ صدی قبل ایسے قوانین وضع کیے کہ اگر ہم اہل یورپ ۲ ہزار سال بعد بھی ان کی بلندی کو پالیں تو یہ ہماری خوش قسمتی ہی ہوگی۔''(۱)

(۲۹) مشہور فرانسیسی مورخ اور صاحب قلم ''فرنسیکو ایزولدد، لکھتا ہے:

''محمد ﷺ نے عرب ممالک کو نئی زندگی عطا کی اور انھیں ترقی کی معراج پر پہنچایا، ایک صدی سے بھی کم کی مدت میں پوری دنیا میں انوار محمدیؐ کی کرنیں جگمگا اٹھیں اور لوگوں نے مسلمانوں کی عظمت و صلاحیت کا لوہا مان لیا، تاریخ عربوں کے اس مؤثر انقلاب اور حیرت انگیز تحریک کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس کی کامیابی کا سہرا محمد ﷺ کے سر جاتا ہے، اس لیے متمدن قوموں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی خوبیوں کا اعتراف کریں اور ان کی یاد کو زندہ رکھیں۔''(۲)

(۳۰) مشہور مفکر ''برناڈ شا'' نے دین محمدیؐ کو عالمگیر اور فطرت انسانی کے مطابق تسلیم کرتے ہوئے اس کی حقانیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں نے دین محمدی ﷺ کو ہمیشہ برحق جانا ہے، اس لیے وہ حیرت انگیز حد تک زندہ مذہب ہے اور میرے اپنے خیال میں وہ تنہا ایسا مذہب ہے، جو زندگی کے مختلف مسائل حل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور ہر طبقہء انسانی اور نسل کے لیے باعث کشش ہے، ویسے اس کی مقبولیت آج بھی کم نہیں ہے، مگر میری پیش گوئی ہے کہ اسلام عنقریب یورپ کا سب سے مقبول ترین مذہب ہوگا۔''(۳)

(۳۱) جریدہ ''الکرمل'' کے عیسائی ایڈیٹر پروفیسر ''نجیب نصار'' نے لکھا ہے:

''محمد ﷺ دنیا کے سب سے قابل قدر، بالغ نظر اور صائب الرائے رہنما تھے، انھوں نے انسانیت کو ایسی اعلیٰ تعلیم دی ہے کہ اگر اہل مشرق و مغرب سب ان پر عمل پیرا ہو جائیں تو اپنے دشمنوں سے محفوظ رہیں گے۔''(۴)

(۳۲) ''مجلہ الصفاء'' (شام) کے عیسائی ایڈیٹر ''عبداللہ یوری حلاق'' نے «إنی مسیحی اجل محمدا» کے عنوان سے نبی کریم ﷺ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپؐ کو نذرانہء عقیدت پیش کیا ہے، جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:(۵)

---

(۱) الاسلام والرسول ص۱۷۳۔
(۲) الاسلام والرسول ص۱۷۵۔
(۳) الاسلام والرسول ص۱۳۱۔
(٤) الاسلام والرسول ص۱۷۹۔
(۵) الاسلام والرسول ص۱۸۰۔

قبس من الصحراء شعشع نوره   فجلا ظلام الجهل عن دنيانا
ومشى وفى ادرانه عبق الهدى   واريج فضل عطر الاكوانا
بعث الشريعة من عميق ضريحها   فرعى الحقوق وفتح الاذهانا
امحمد والمجد نسج يمينه   مجدت فى تعليمك الاديانا
ونشرت ذكر اللّٰه فى امية   وثنية ونفحتها الايمانا
بث الجهاد لدن بعثت وجردت   اسياف صحبك تقمع الطغيانا
وتساعد الضعفا وتصفع من بغى   صفعات صدق تزهق البهتانا
انى مسيحى اجل محمدا   واراه فى سفر العلا عنوانا
واطاطئ الراس الرفيع لذكر من   صاغ الحديث وعلم القرآنا
إنى اباهى بالرسول لأنه   صقل النفوس وهذب الوجدانا

سیرت نبویؐ اور غیر اسلامی افکار

مولانا ابو العاص وحیدی، استاذ جامعہ سراج العلوم بونڈیہار، گونڈہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على نبيه محمد خاتم الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى من تبع مسلكهم واقتدى بهديهم إلى يوم الدين، أما بعد!

مذہب اسلام کی تعلیمات بہت واضح اور حقیقت پسندانہ ہیں، سیدھی فطرت اور صحیح دانش و بینش والوں کے لیے جن میں کوئی غموض اور پیچیدگی نہیں اور واقعیت پسند لوگوں کے لیے جن میں توہمات کا کوئی شائبہ نہیں، اسلامی تعلیمات پر سرسری طور پر ہی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام واضح ایمان اور حقیقت پسندانہ طریقۂ عمل کا داعی ہے۔

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے سنجیدہ و دیانت دارانہ مطالعے سے ایک بہت بڑی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات و شخصیت اور اس کے اوصاف و خصوصیات بالکل واضح اور متعین ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام مافوق البشر نہیں ہوتے، وہ اپنے سارے فضائل و کمالات کے باوجود انسان ہی ہوتے ہیں، ان کی ساری صلاحیتیں اور ضروریات دوسرے انسانوں کی طرح ہوتی ہیں اور یہی عقل و دانش کا تقاضا بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اوصاف و خصوصیات میں انسان ہوں ورنہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان رابطہ کیسے بن سکتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان ہونے کے باوجود انبیاء کرام علیہم السلام تمام انسانوں

سے افضل واشرف ہوتے ہیں۔

اللہ اور رسول میں فرق وامتیاز

گذشتہ مذہبی قومیں اپنے انبیاء کرام کی سیرت وشخصیت کے بارے میں گمراہی کا شکار ہوئیں، یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور انتہائی سرکشی کے باوجود اللہ کے چہیتے بن کر اپنے آپ کو جنت کے ٹھیکیدار سمجھ بیٹھے، عیسائیوں نے خدا کا ایسا مثلث تصور پیش کیا جس کا ایک جزو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے، ہندوؤں نے اپنے رشیوں ومنیوں میں ایشور کے حلول کا نظریہ اختیار کیا اور مجوسیوں نے آگ کو مظہر خدا سمجھ کر اس کی پرستش شروع کردی، ان حالات میں جب اسلام کا کامل ومکمل ایڈیشن قرآن وحدیث کی شکل میں دنیا میں آیا تو اس نے اللہ اور رسولؐ کے درمیان فرق وامتیاز کے خطوط کھینچے اور واضح حدود قائم کیں تاکہ منصۂ شہود پر وجود میں آنے والی نئی امت گذشتہ گمراہیوں کا شکار نہ ہو اور اپنے نبی ورسولؐ کے بارے میں کسی قسم کے غلو کا ارتکاب نہ کرے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اللہ اور رسول میں فرق وامتیاز کی حدود کچھ اس طرح ہیں:

① ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہی سارے عالم کا مالک ومختار ہے، جسے چاہے عزت سے نوازے اور جسے چاہے ذلت سے دوچار کرے اور رسولؐ کی ذات اللہ کے سامنے مجبور ہے، اسے مافوق الفطری ملکیت واختیار حاصل نہیں اور وہ کسی کے نفع ونقصان کا مالک ومختار نہیں۔

② اللہ ہی کی ذات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اسی کے پاس حیات سرمدی کی دولت ہے، اور اس پر کبھی موت وفنا طاری نہیں ہوگی اور رسول کی ذات پہلے نہیں تھی، بعد میں اس کی پیدائش ہوئی، ایک متعین مدت تک زندہ رہنے کے بعد اس پر موت طاری ہوگئی۔

③ اللہ تعالیٰ ہی کو ''ما کان وما یکون'' کا علم ہے، وہی پس پردہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور رسول کو ''ماکان وما یکون'' کا علم نہیں ہوتا، اس کے پاس علم غیب کی کنجی نہیں ہوتی۔

④ اللہ تعالیٰ کی ذات انوار وتجلیات کا بحر بیکراں ہے، نگاہیں جس کا ادراک نہیں کرسکتیں، اس کے جلوؤں کا اگر ہلکا سا عکس بھی اس کائنات پر پڑ جائے تو کائنات جل کر خاکستر ہوجائے اور رسول کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مادی جسم رکھتا ہے، اس کا جسم نوری نہیں ہوتا، اس کا سایہ ہوتا ہے اور اس پر سارے بشری عوارض ظاہر ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ تمام انسانوں سے افضل واشرف ہوتا ہے۔

⑤ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک عرش پر ہے اور اس کا علم وقدرت ہر جگہ جلوہ فگن ہے، اس طرح وہ

باعتبار علم وقدرت ہر جگہ ہے، ہر چیز اس کی نظر میں ہے اور بیک وقت وہ تمام کائنات کی نگہداشت کرتا ہے اور رسول اپنی ذات یا اپنے علم وقدرت کے اعتبار سے نہ ہر جگہ حاضر ہے اور نہ ناظر، جس طرح اس کی ذات محدود، اسی طرح اس کی صلاحیتیں بھی محدود ہیں اور مرنے کے بعد جس طرح اس کی ذات فنا ہوگئی اسی طرح اس کی زندگی کی محدود صلاحیتیں بھی فنا ہوگئیں۔

⑥ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم وقدرت وسیع وعریض ہے، جو پوری کائنات پر محیط ہے، اس لیے وہ ہر ایک کی حالت دیکھتا، ہر ایک کی فریاد اور پکار سنتا ہے، ہر ایک کی مشکل کشائی کرتا اور دشواری و پریشانی میں ہر ایک کے کام آتا ہے اور رسول کی ذات زندگی میں محدود انداز میں حسب صلاحیت لوگوں کی مدد کرتی ہے، جیسا کہ عام انسان ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد رسول نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے نہ کسی کی فریاد رسی کر سکتا ہے نہ کسی پریشان حال کی پکار سن کر اس کی مشکل کشائی کر سکتا ہے۔

یہ ہیں اللہ اور رسولؐ کے درمیان فرق و امتیاز کے نمایاں خطوط اور واضح حدود جن پر قرآن وسنت کی واضح تعلیمات دلالت کرتی ہیں۔ ضروری ہے کہ امت مسلمہ ان فروق و امتیازات کا لحاظ رکھے تاکہ ''احد'' اور ''احمد'' کی یکسانیت کی افسانہ طرازی نہ جنم لے اور فضائے عالم میں یہ شیطانی آواز نہ سنائی دے کہ جو ذات مستوی عرش تھی وہی مدینہ میں مصطفیٰؐ کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پلے میں کیا رکھا ہے، ہمیں جو کچھ لینا ہے اپنے نبی محمد ﷺ سے لے لیں گے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے باطل تصورات وخیالات سے اللہ و رسول کے درمیان متعین ومقرر حدود ٹوٹ جاتی ہیں اور توحید کا آبگینۂ مصفا چکنا چور ہو جاتا ہے۔

سیرت نبویؐ اور غیر اسلامی افکار

اللہ تعالیٰ اور رسول کے درمیان فرق و امتیاز کی جو حدود اسلام نے قائم کی گئی ہیں افسوس! کہ امت مسلمہ کے بعض طبقات ان کا قطعاً لحاظ نہ رکھ سکے، کچھ ایسے داخلی وخارجی اسباب پیش آئے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں حد درجہ غلو کا شکار ہوگیا اور اس کے اندر وہ ساری گمراہیاں پیدا ہوگئیں جو گزشتہ قوموں کے یہاں اپنے انبیاء ورسولوں کے بارے میں پیدا ہوئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت نبویؐ غیر اسلامی افکار کی زد میں آگئی اور نبیؐ کی ذات خدائی صفات سے متصف نظر آنے لگی۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے درمیان فرق و امتیاز کے دلائل تفصیل کے ساتھ آئندہ مباحث میں آرہے ہیں۔

احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی ایک پیش گوئی یہ بھی ملتی ہے کہ ہماری امت کے اندر بھی گذشتہ قوموں خصوصاً بنواسرائیل کی بے اعتدالیاں پیدا ہوں گی اور من وعن یہ امت ان کی نقل کرے گی، حدیث ملاحظہ ہو!

عن عبداللّٰہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ: لیأتین علی أمتی کما أتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی إن کان منھم من أتی أمه علانیة لکان فی أمتی من یصنع ذلك، وإن بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة، وتفترق أمتی علی ثلاث وسبعین ملة، کلھم فی النار إلا ملة واحدة، قالوا: من ھی یا رسول اللّٰہ؟ قال: ما أنا علیه وأصحابی، رواہ الترمذی وحسنه»[1]

''عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ'' میری امت من و عن اسی طرح کے حالات سے دوچار ہوگی جو حالات بنواسرائیل پر آئے تھے حتیٰ کہ اگر بنواسرائیل میں سے کسی نے کھلم کھلا اپنی ماں سے زنا کیا تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والے ہوں گے اور امتِ بنواسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک جماعت کے علاوہ سب جہنمی ہوں گے، لوگوں نے پوچھا وہ کون سی جماعت ہوگی؟ آپ (ﷺ) نے کہا: جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی، چنانچہ دوسری گمراہیوں کے ساتھ جس طرح بنواسرائیل کے اندر انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات وسیرت کے بارے میں انحرافات پیدا ہوئے اسی طرح امت مسلمہ کے اندر بھی سیرت نبویؐ کے بارے میں بہت سے انحرافات اور بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں۔

سیرت نبویؐ کے بارے میں کیا انحرافات اس امت میں پیدا ہوئے اور اس امت کے بعض طبقات سیرت نبویؐ کے نام پر کون سے غیر اسلامی افکار کی اشاعت کر رہے ہیں اس کا ذکر ہم آگے تفصیل سے کریں گے، پہلے ہم اختصار سے ان داخلی وخارجی اسباب وعوامل کا جائزہ لے رہے ہیں جن کے نتیجے میں سیرت نبوی پر غیر اسلامی افکار کے خطرناک اثرات پڑے اور بڑی جرأت وڈھٹائی کے ساتھ امت کے بعض طبقات جن پر اڑے ہوئے ہیں۔

(۱) مشکاۃ المصابیح مع مرعاۃ المفاتیح ۱/۲۶۹، مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس۔

① یونانی علوم وفنون خصوصاً فلسفہ کے اثرات جس طرح عقائد وفقہیات پر پڑے اسی طرح سیرت نبویؐ پر بھی پڑے، چنانچہ حقیقت محمدیؐ کے سلسلے میں ازلی نور ہونے، مبدء کائنات ہونے، بشریت سے الگ ہونے اور مستوی عرش ہونے کے بیہودہ خیالات فلسفہ ہی کی دین ہیں، جیسا کہ آگے تفصیل سے ذکر آ رہا ہے۔

② عجمیت اور مختلف ادیان و مذاہب جیسے یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کے اثرات بھی سیرت نبویؐ پر پڑے ہیں، چنانچہ رسولؐ کے مافوق الفطرت ہونے، فریادرس اور مشکل کشا ہونے، ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے، وسیع علم وقدرت والا ہونے اور مالک ومختار ہونے کے باطل تصورات انھی ادیان و مذاہب سے متاثر ہونے کے نتائج ہیں۔

③ زنادقہ، ملحدین، سادہ لوح زھاد اور گمراہ صوفیاء کی گھڑی ہوئی احادیث وروایات کے نتیجے میں بھی سیرت نبویؐ غیر اسلامی افکار سے دوچار ہوئی، مثلاً رسولؐ کے نور ہونے، آپؐ کا سایہ نہ ہونے، وجہ تخلیق کائنات ہونے اور آپؐ کے پیشاب وپاخانہ کے پاک ہونے کے لغو نظریات ضعیف وموضوع احادیث کی وجہ سے وجود میں آئے۔

④ سیرت نبویؐ کا تذکرہ اور حب نبویؐ کا جو مظاہرہ جشن میلاد النبیؐ کے نام پر ہندوستان میں کیا جاتا ہے، جس سے دین وملت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ زبردست نقصان ہوتا ہے، یہ عیسائیت اور ہندومت کے اثرات کا نتیجہ ہے، ہر صاحب عقل ودانش پر یہ حقیقت واضح ہے کہ جشن میلاد النبیؐ جنم اشٹمی اور کرسمس ڈے کی نقل ہے۔

اس مختصر اشارتی جائزے کے بعد اب ہم کسی قدر تفصیل سے ان غیر اسلامی افکار و خیالات کا تنقیدی جائزے لے رہے ہیں، جنھیں ہند و بیرون ہند سیرت نبویؐ کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے، اس پوری بحث میں ہمارا اسلوب سنجیدہ، معروضی اور استدلالی ہوگا، إن شاء الله، والله هو الموفق وهو المعين!

① رسولؐ کا مالک ومختار ہونا

اسلام کا تصور توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا مالک ورازق اور مدبر ومنتظم ہے، وہی ساری مخلوق کی حاجت روائی ومشکل کشائی کرتا ہے، اسی کے ہاتھ میں ساری نعمتیں ہیں اور وہی اکیلا عزت وذلت کا مالک ہے، لیکن بریلوی مکتب فکر کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ملکیت اور

تدبیر امور کے اختیارات وتصرفات اپنے رسولؐ اور دوسرے نیک بندوں کو عطا کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ مخلوق کی حاجت روائی ومشکل کشائی کر سکتے ہیں، اس عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کائنات کا سارا نظام اپنے مقرب بندوں کے سپرد کر دیا ہے اور خود اللہ تعالیٰ کی ذات (العیاذ باللہ) معطل ومعزول ہو کر رہ گئی ہے، لہٰذا اب مشکل حالات میں انھی مقرب بندگانِ خدا سے استغاثہ کیا جائے، انھی سے شفا طلب کی جائے، وہ اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں، زمین وآسمان کے مالک ہیں، موت ورزق انھی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہیں عطا کریں اور جسے چاہیں محروم رکھیں۔

قرآنی آیات

بریلوی مکتبۂ فکر کے عقائد کے اقتباسات کے تذکرے سے پہلے ہم قرآن مجید کی آیات ذکر کر رہے ہیں پھر بریلوی عقائد سے ان کا موازنہ کریں گے تاکہ یہ بات اظہر من الشمس ہو کر سامنے آ جائے کہ سیرت نبویؐ کے سلسلے میں مذکورہ بریلوی عقائد بالکل غیر اسلامی ہیں، اس بارے میں قرآن میں بے شمار آیات ہیں، مگر ہم چند آیات ہی پر اکتفا کریں گے۔ آیات مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾(آل عمران:۳/۲٦)

''اے ملکوں کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے، تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾(یسین:۳٦/۸۳)

''اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔''

﴿بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾(الملک:٦۷/۱)

''اسی کے ہاتھ میں ساری حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾(الدخان:٤٤/۷)

''اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔''

﴿مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾(ہود:۱۱/٦)

''زمین کے ہر جاندار کو رزق دینا اللہ ہی کے ذمے ہے۔''

مذکورہ آیات کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو ہر طرح کی ملکیت و اختیار اور تصرف و قدرت حاصل ہے، قرآن میں ایسی بھی آیات ہیں جن میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ: کسی نبی و رسول کو کسی طرح زمین کی ملکیت و اختیار حاصل نہیں ہے اور وہ کسی کے نفع ونقصان کا مالک نہیں حتیٰ کہ اپنے نفع ونقصان کا بھی مالک نہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں!

﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾(الجن:۷۲/۲۱)

''آپؐ کہہ دیجیے بیشک میں تمھارے نفع ونقصان کا مالک نہیں۔''

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ﴾(یونس:۱۰/۴۹)

''آپؐ کہہ دیجیے میں خود اپنے لیے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔''

بریلوی عقائد

اب بریلوی مکتب فکر کے عقائد ان کی کتابوں کے اقتباسات کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیرت نبویؐ کے سلسلے میں بریلوی نقطۂ نظر اسلام سے کتنا دور ہے، جناب احمد رضا خاں بریلوی رسول اللہ ﷺ کی شان میں غلو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قادر کل کے نائب اکبر — کن کا رنگ دکھاتے ہیں یہ
ان کے ہاتھ میں ہر کنجی ہے — مالک کل کہلاتے ہیں یہ

احمد رضا بریلوی کے صاحبزادے مذکورہ اشعار کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو نعمت تمام عالم میں کہیں ظاہر ہوتی ہے وہ حضرت محمد ﷺ ہی عطا فرماتے ہیں، انھی کے ہاتھ میں سب کنجیاں ہیں، اللہ تعالیٰ کے خزانے سے کوئی چیز نہیں نکلتی مگر محمد ﷺ کے ہاتھوں سے، حضور ﷺ جو بات چاہتے ہیں وہی ہوتی ہے، اس کے خلاف نہیں ہوتی، حضور ﷺ کی چاہت کو جہاں میں کوئی پھیرنے والا نہیں۔''(۱)

جناب احمد رضا خاں بریلوی اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

''ہر چیز، ہر نعمت، ہر امداد، ہر دولت، دین میں، دنیا میں، آخرت میں، روز اول سے آج تک اور آج سے ابد الآباد تک، جسے ملی یا ملتی ہے حضور اقدس سید عالم ﷺ کے دست اقدس سے ملی اور ملتی ہے۔''(۲)

(۱) الاستمداد علی اجیال الارتداد ص۳۲-۳۳۔

(۲) الفتاویٰ الرضویہ ۱/۵۷۷۔

ایک اور جگہ جناب احمد رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ خلیفہء اعظم اور زمین و آسمان میں تصرف فرماتے ہیں۔''(۱)

بریلوی فرقے کے ایک دوسرے رہنما جناب نعیم الدین مراد آبادی لکھتے ہیں:

''آقائے دو جہاں سخی داتا ہیں اور ہم ان کے محتاج ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان سے استمداد نہ کیا جائے۔''(۲)

بریلوی مکتب کی مشہور کتاب 'بہار شریعت' کے مصنف امجد علی صاحب لکھتے ہیں:

''تمام زمین ان کی ملک ہے، تمام جنت ان کی جاگیر ہے، ملکوت السماوات والارض حضور ﷺ کے زیر فرمان، جنت و نار کی کنجیاں دست اقدس میں دے دی گئیں، رزق، خوراک اور ہر قسم کی عطائیں حضور ﷺ ہی کے دربار سے تقسیم ہوتی ہیں، دنیا و آخرت حضور ﷺ کی عطا کا ایک حصہ ہے۔''(۳)

اسی طرح کی کفریات بریلوی فرقے کے دوسرے رہنماؤں نے بھی اپنی کتابوں میں لکھی ہیں: جیسے جناب دیدار علی صاحب، جناب حشمت علی صاحب اور جناب احمد یار گجراتی وغیرہ، کیا یہ عقائد اسلامی شریعت سے استہزا کے مترادف نہیں ہیں، کیا ان میں اور کتاب وسنت میں کوئی مطابقت ہے؟ کیا ان عقائد کو پڑھ کر یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ان حضرات کا مقصد مشرکانہ عقائد اور دور جاہلیت کے نظریات کی ترویج واشاعت ہے، کیا مشرکین مکہ کے عقائد بھی یہی نہیں تھے۔

مشرکین مکہ کا عقیدہ

قرآن مجید کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کے کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالک اور روزی رساں مانتے تھے، اس سلسلے کی چند آیات ملاحظہ کیجئے!

﴿قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ﴾(المؤمنون:۲۳/۸۸_۸۹)

''آپؐ ان سے کہیے وہ کون ہے، جس کے ہاتھ میں تمھاری تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اگر تم کو کچھ خبر ہے وہ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے، آپؐ کہیے پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے۔''

(۱) الفتاویٰ رضویہ: ۱۵۵/۲۔

(۲) مواعظ نعیمیہ، ص۲۷۔

(۳) بہار شریعت: ۱۵/۱۔

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (العنکبوت:۲۹/۶۱)

''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔''

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (العنکبوت:۲۹/۶۳)

''اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان سے بارش کس نے نازل کی اور ویران ہو جانے کے بعد زمین کو بارش سے ہرا بھرا کر دیا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے۔''

ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مشرکین مکہ کم از کم توحید ربوبیت کے قائل تھے، اور اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کا خالق و مالک اور مختار و متصرف مانتے تھے مگر بریلوی مسلمان اپنے عقائد میں ان سے بھی بدتر ہیں۔

علامہ ابن ابی العز حنفی شارح عقیدۂ طحاویہ توحید ربوبیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«فان المشركين من العرب كانوا يقرون بتوحيد الربوبية وأن خالق السماوات والأرض واحد كما أخبر الله عنهم»[1]

''عرب کے مشرکین توحید ربوبیت کے معترف تھے اور اس بات کے معترف تھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق ایک ہے جیسا کہ اللہ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے۔''

مشرکین عرب کے توحید ربوبیت کے قائل ہونے کا تذکرہ توحید و عقائد کی بہت سی کتابوں میں ملتا ہے، جیسے «تيسير العزيز الحميد شرح كتاب التوحيد» اور «شرح الفقه الأكبر» وغیرہ۔

② رسول سے فریاد رسی

رسول اللہ ﷺ اور دوسرے اولیاء (کرام) کو مشکلات میں آواز دینا اور انھیں پکارنا بھی غیر اسلامی طرز فکر ہے اور صحیح تصور توحید کے منافی ہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ علامہ ابن تیمیہ و علامہ ابن القیم وغیرہ نے توحید کے وسیع مضامین و مفاہیم کے پیش نظر توحید کی تین قسمیں کی ہیں:

① توحید ربوبیت ② توحید اسماء و صفات ③ توحید الوہیت

---

(۱) شرح العقيدة الطحاوية ص:۷۹ مطبوعه بيروت ۱۳۹۹ھ۔

پہلی قسم یعنی توحید ربوبیت کا مطلب ہے اللہ کے رب ہونے، خالق و مالک ہونے، رازق اور نافع وضار وغیرہ ہونے پر ایمان لانا۔

دوسری قسم یعنی توحید اسماء وصفات کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے ان تمام اسماء وصفات پر ایمان لانا جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔

تیسری قسم توحید الوہیت کا مفہوم ہے: ہر طرح کی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر دینا۔ (۱)

توحید الوہیت اور عبادت میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، جیسے محبت، توکل، خوف، امید، نماز، رکوع، سجود، دعا، ذبح، نذر، طواف، توبہ، استعاذہ اور استغاثہ وغیرہ، چونکہ مشرکین عرب اور اکثر قومیں توحید کی پہلی دونوں قسمیں مانتی تھیں، صرف توحید الوہیت کی منکر تھیں اس لیے انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کا اصل محور اور نصب العین توحید الوہیت وعبادت تھا اور عبادت کی سب سے اہم چیز بلکہ روح دعا ہے، اسی لیے بعض احادیث میں دعا کو عبادت یا مغز عبادت کہا گیا ہے، لہٰذا توحید کا تقاضا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا جائے، اسی سے فریادرسی کی جائے اور مشکلات میں اسی کو آواز دی جائے۔

آیات واحادیث

اس سلسلے کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (الغافر:۴۰/۱۴)

''اللہ تعالیٰ کو پکارو، اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے۔''

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (یونس:۱۰/۱۰۶)

''اللہ کے علاوہ کسی کو نہ پکارو جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان، اگر تم نے ایسا کیا تو بیشک تم ظالموں میں سے ہو گے۔''

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النمل:۲۷/۶۲)

''کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے اور تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بناتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے، تم کم سوچتے ہو۔''

(۱) تیسیر العزیز الحمید شرح کتاب التوحید، ص:۳۳۔

آیات بالا کے معنی و مفہوم کی ایک حدیث بھی ملاحظہ ہو!

«كان في زمن النبي ﷺ منافق يؤذي المؤمنين ، فقال بعضهم : قوموا بنا نستغيث برسول الله ﷺ من هذا المنافق، فقال النبي ﷺ: إنه لا يستغاث بي وإنما يستغاث بالله» (رواه الطبراني)(۱)

''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو ایذا دیتا تھا، کچھ لوگوں نے کہا چلو رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کی جائے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: دیکھو مجھ سے استغاثہ نہیں کیا جاتا، استغاثہ تو صرف اللہ سے کیا جاتا ہے۔''

بریلوی عقائد

مذکورہ حدیث اور آیات کا تقاضا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہیے، اسی سے فریاد رسی کرنی چاہیے اور اسی کو اپنا مشکل کشا سمجھنا چاہیے، مگر بریلوی مکتب فکر کا عقیدہ اس باب میں بھی بالکل اسلام کے منافی ہے، بریلوی حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء و اولیاء حاجت روا، مشکل کشا، فریاد رس اور داتا ہیں، اس لیے انھیں پکارنے، ان سے استغاثہ کرنے اور ان سے فریاد رسی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مستحب اور پسندیدہ ہے، اس لیے کہ وہ مالک و مختار اور کائنات میں متصرف ہیں۔ جناب احمد رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ ہی ہر مصیبت میں کام کرتے ہیں، حضور ﷺ بہتر ہی عطا کرنے والے ہیں، عاجزی و تذلل کے ساتھ حضورؐ کو ندا کرے، حضورؐ ہی ہر بلا سے پناہ ہیں۔''(۲)

دوسرے انبیاء و اولیاء کے بارے میں احمد رضا خاں بریلوی کا عقیدہ ملاحظہ ہو:

''انبیاء و مرسلین اور اولیاء و علماء صالحین سے ان کے وصال کے بعد بھی استعانت و استمداد جائز ہے، اولیاء بعد انتقال بھی دنیا میں تصرف کرتے ہیں۔''(۳)

بریلوی علماء یہ کا عقیدہ اس لیے ہے کہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی حاجت روائی کے لیے کچھ بندوں کو خاص کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں احمد رضا خاں بریلوی کی وضاحت ملاحظہ ہو:

''اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حاجت روائی خلق کے لیے

---

(۱) كتاب التوحيد لمحمد بن عبدالوهاب النجدي، باب من الشرك أن يستغيث بغير الله أو يدعو غيره

(۲) الأمن والعلى از احمد رضا بریلوی ص ۱۰

(۳) رسالہ حیاۃ الموات درج در فتاویٰ رضویہ ۳۱۰/۴۔

خاص فرمایا ہے کہ لوگ گھبرائے ہوئے ان کے پاس اپنی حاجتیں لاتے ہیں۔''(۱)

بریلوی مکتبۂ فکر کی دوسری کتابوں میں بھی یہی عقیدہ رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء و اولیاء کے بارے میں موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ بالکل اسلام کے خلاف ہے اور بعینہ اسی طرح کا شرک ہے جس کے مرتکب مشرکین عرب تھے۔

مشرکین عرب کا حال

بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بجا ہوگا کہ نبی مکرم ﷺ اور دوسرے بندگان خدا کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ مشرکین عرب کے عقیدے سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ بریلوی حضرات ہر حالت میں غیر اللہ ہی کو پکارتے ہیں چاہے خوشگوار حالت ہو یا مشکل حالت، جیسا کہ ہم ہندوستان میں مشاہدہ کر رہے ہیں، مگر مشرکین مکہ کا حال یہ تھا کہ عام حالات زندگی میں غیر اللہ سے استغاثہ کرتے تھے، مگر جب سمندری سفر کے وقت کسی بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے تو صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے، قرآن مجید میں ان کی اس روش کا تذکرہ مختلف مقامات پر بڑے بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، اس سلسلے کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾(العنكبوت:۲۹/۶۵)

''جب وہ لوگ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اور جب اللہ تعالیٰ انھیں خشکی پر لا کر نجات دے دیتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔''

مذکورہ آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کے کٹر مشرکین میں بھی مشکل میں پھنسنے کے وقت ایک اللہ کو پکارنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا، مگر موجودہ دور کے بریلوی مسلمان مشکل میں بھی «یارسول اللّٰه انظر حالنا واسمع قالنا» اور «یا عبدالقادر الجیلانی شیئًا للّٰه» وغیرہ پکارتے ہیں، اگر یہی اسلام ہے تو پھر کفر کیا ہے؟

---

(۱) الأمن والعلی از احمد رضا بریلوی ص۲۹ مطبوعه لاهور

③ حیات رسولؐ کا عقیدہ

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا بھی غیر اسلامی فکر ہے کہ آپؐ اپنی قبر میں بالکل اسی طرح زندہ ہیں جس طرح دنیا میں زندہ تھے اور لوگوں کی دعا و پکار سنتے ہیں، جیسا کہ بریلوی حضرات کا عقیدہ ہے، دراصل رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء و اولیاء کے بارے میں ان کا جو یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ کائنات میں ملکیت و اختیار اور تصرف رکھتے ہیں اور لوگوں کی فریاد رسی کرتے ہیں، اس عقیدہ کا لازمی تقاضا ہے کہ انھیں زندہ اور پکار سننے والا مانا جائے، چنانچہ جناب احمد رضا خاں بریلوی کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و اولیاء پر موت طاری نہیں ہوتی بلکہ انھیں زندہ ہی دفن کر دیا جاتا ہے اور ان کی قبر کی زندگی دنیا کی زندگی سے زیادہ قوی اور افضل ہوتی ہے، چنانچہ احمد رضا خاں بریلوی انبیاء کرام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات حقیقی، حسی دنیاوی ہے، ان پر تصدیق وعدۂ الٰہی کے لیے محض ایک آن کی آن کو موت طاری ہوتی ہے پھر فوراً ان کو ویسے ہی حیات عطا فرما دی جاتی ہے، اس حیات پر وہی احکام دنیویہ ہیں، ان کا ترکہ بانٹا نہ جائے گا، ان کی ازواج کا نکاح حرام، نیز ازواج مطہرات پر عدت نہیں، وہ اپنی قبور میں کھاتے پیتے نماز پڑھتے ہیں۔''(۱)

ایک بریلوی مصنف لکھتے ہیں:

''انبیاء کرام اپنی قبر میں زندہ ہیں، وہ چلتے پھرتے ہیں، نمازیں پڑھتے اور کلام کرتے ہیں اور مخلوقات کے معاملات میں تصرف فرماتے ہیں۔''(۲)

بریلویوں کے عقیدے کے مطابق جب صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو دفن کیا تو آپؐ زندہ تھے، جناب احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں:

''قبر شریف میں اتارتے وقت حضور ﷺ ''امتی، امتی'' فرما رہے تھے۔''(۳)

احمد رضا بریلوی کے ایک پیروکار جناب احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں:

''جس وقت حضور ﷺ کی روح اقدس قبض ہو رہی تھی اس وقت بھی جسم میں حیات موجود تھی۔''(۴)

---

(۱) ملفوظات احمد رضا بریلوی ۳/۲۷۶۔

(۲) حیات النبی للکاظمی ص۳۰ مطبوعة ملتان۔

(۳) رسالہ «نفی الفی عمن انار بنورہ کل شی» مشمولہ مجموعة رسائل رضویة ص۱۷

(٤) حیات النبی للکاظمی ص۱۰٤۔

ایک دوسرے بریلوی جناب احمد یار گجراتی لکھتے ہیں:

''ہمارے علماء نے فرمایا کہ حضور ﷺ کی زندگی اور وفات میں کوئی فرق نہیں آپؐ اپنی امت کو دیکھتے ہیں اور ان کے حالات و نیات اور ارادے اور دل کی باتوں کو جانتے ہیں، یہ آپؐ کو بالکل ظاہر ہیں، ان میں کوئی پوشیدگی نہیں۔''(۱)

رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء واولیاء کے بارے میں یہی عقیدہ تمام بریلوی علماء کا ہے جو ان کی تصنیفات وملفوظات میں واضح طور پر نظر آتا ہے، ظاہر ہے یہ عقیدہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کے بالکل خلاف اور قطعی طور پر غیر اسلامی ہے۔

آیات واحادیث

سارے انبیاء کرام چونکہ انسان تھے، اس لیے ان پر وہ تمام بشری عوارض طاری ہوئے جو عام انسانوں پر طاری ہوتے ہیں، انھی عوارض میں سے موت کا عارضہ بھی ہے، جس سے تمام انبیاء و رسول دو چار ہوئے، قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کی کتابوں میں انبیاء ورسول کی موت اور ان کے قتل کیے جانے کے واقعات ملتے ہیں، تمام انبیاء ورسول بشمول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی موت کے بارے میں ایک جامع آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

(آل عمران:۳/۱۴۴)

''اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہی ہیں ان کے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں، سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس چلا جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔''

سورۂ زمر جو ہجرت حبشہ سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس کے نزول کے وقت کے حالات یہ تھے کہ کفار ومشرکین رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہے تھے اور آخرت سے غافل بڑی سرکشی کی زندگی گزار رہے تھے، اس سورہ میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ آخر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اے نبی آپ بھی وفات پا جائیں گے اور یہ لوگ بھی، پھر قیامت کے روز معاملہ

(۱) جاء الحق از احمد یار گجراتی ۱۵۔

اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا، وہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ﴾

(الزمر:۳۹/۳۰۔۳۱)

''آپؐ کو بھی وفات پانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے، پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔''

یہ دونوں آیتیں رسول اللہ ﷺ اور تمام انبیاء کرام کی موت پر دلالت کرتی ہیں، اس سلسلے میں آغاز عہد صدیقی کا ایک اہم اور سبق آموز واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو موت لاحق ہوئی اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام ''سنح'' میں تھے اور ادھر لوگوں کا حال یہ تھا کہ غموں سے انتہائی نڈھال تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اپنا صبر و ضبط اس درجہ کھو بیٹھے اور بدحواس ہو گئے کہ انھیں خیال ہو چلا کہ آپؐ پر موت نہیں طاری ہوئی لہٰذا انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو شخص کہے گا کہ آپؐ کی وفات ہو گئی ہے میں اس کی گردن مار دوں گا، اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے، رسول اللہ ﷺ کو بوسہ دیا اور حمد و صلاۃ کے بعد ایک بلیغ خطبہ دیا اور موت رسولؐ کے بارے میں مذکورہ قرآنی آیات پڑھیں اور بڑے مومنانہ عزم و استقلال سے کہا:

«ألا من كان يعبد محمدا فإن محمدا ﷺ قدمات ، ومن كان يعبد الله فإن الله حي لا يموت»(۱)

''لوگو سنو! جو لوگ محمد ﷺ کی عبادت کرتے تھے تو یقیناً آپؐ پر موت طاری ہوگئی اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے تو (وہ جان لیں کہ) اللہ تعالیٰ زندہ و جاوید ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔''

اس کے بعد تمام صحابہ کرام مطمئن ہو گئے اور متفقہ طور پر سب لوگوں نے آپؐ کی موت کا یقین کر لیا، اس کے علاوہ حدیث و سیرت کی تمام کتابوں میں مختلف انداز میں اشارتاً اور صراحتاً آپؐ کی موت کا ذکر ہے جس سے یہ بات بدیہی حقیقت بن کر سامنے آتی ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح آپؐ پر بھی موت طاری ہوئی ہے۔

---

(۱) الجامع الصحيح للبخاري ۵۱۷/۱، باب مناقب أبي بكر، مطبوع هند۔

ایک لغو استدلال

جناب احمد رضا خاں بریلوی نے جو یہ استدلال کیا ہے کہ آپؐ پر موت طاری نہ ہونے کی وجہ سے آپؐ کا ترکہ نہیں تقسیم کیا گیا اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے نکاح حرام ہے تو یہ استدلال نہایت لغو ہے، اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا و حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے آپؐ کے ترکہ سے میراث کا مطالبہ خلیفہ وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا تھا، اگر وہ دونوں جانتے کہ آپؐ کی وفات ہی نہیں ہوئی ہے تو وراثت کا مطالبہ کیوں کرتے، بہرحال ان دونوں نے مطالبہ کیا، اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ﷺ کا ترکہ میراث میں تقسیم نہ ہوگا، بلکہ وہ صدقہ ہے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ذکر کیا:

«سمعت رسول اللّٰه ﷺ ، يقول: لا نورث ما تركنا صدقة»(۱)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہم انبیاء کے ترکہ میں وراثت نہیں جاری ہوتی، ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔''

اور آپؐ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے نکاح اس لیے حرام تھا کہ وہ امہات المؤمنین کی حیثیت رکھتی تھیں اور اس وجہ سے انھیں عدت گزارنے کی ضرورت نہ تھی، یہ بات تو بہت مشہور، مسلّم اور بدیہی ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں، «فاعتبروا يا أولي الأبصار»

④ رسول اللہ ﷺ کا عالم الغیب ہونا

رسول اللہ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کا عقیدہ بھی بالکل غیر اسلامی اور کھلا ہوا شرک ہے، مگر افسوس بریلوی حضرات سیرت نبوی ﷺ کے نام پر اس غیر اسلامی فکر کی اشاعت بھی بڑی شد و مد سے کرتے ہیں، اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح اسلامی تصور کی وضاحت کریں گے، پھر بریلوی مکتب فکر کے نظریات ان کی کتابوں کی روشنی میں پیش کریں گے، تاکہ بالکل دوٹوک انداز میں اس طرز فکر کی غیر اسلامیت اظہر من الشمس ہو جائے۔

(۱) الجامع الصحيح للبخاري ۹۹۵/۲، كتاب الفرائض مطبوع هند، یہ حدیث بخاری میں مختلف مقامات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ سے بھی مروی ہے۔

آیات واحادیث

اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات بہت ہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں:

﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾(النمل:٢٧/٦٥)

"آپؐ کہہ دیجیے کوئی شخص آسمانوں وزمین میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ غیب نہیں جانتا۔"

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الانعام:٦/٥٩)

"اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، وہ خشکی وتری کی تمام چیزیں جانتا ہے، گرنے والے ہر پتے کو بھی جانتا ہے، زمین کی تہوں میں پڑا ہوا دانہ اور ہر خشک وتر چیز کتاب مبین میں درج ہے۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ (لقمان:٣١/٣٤)

"بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ رحم میں کیا ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

ان آیات میں مطلق طور پر حصر کے انداز میں غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اس کے بعد علم غیب ذاتی وعطائی کی افسانہ طرازی کی گنجائش نہیں رہ جاتی اور آخری آیت میں غیب کی جن پانچ باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے بارے میں بخاری، مسلم، مسند احمد اور دوسری کتب حدیث میں بہت سی روایات بھی ہیں کہ میں ان پانچوں چیزوں سے واقف نہیں ہوں اور مطلق علم غیب کے بارے میں بھی بہت سی احادیث ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کا علم نہیں تھا، آپؐ غیب کی وہی باتیں جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ آپؐ کو بذریعہ وحی بتا دیتا تھا۔

بخاری ومسلم کی مشہور حدیث ہے، جو حدیث جبریل کے نام سے معروف ہے کہ ایک بار حضرت جبریل علیہ السلام ایک اجنبی کی شکل میں آئے، صحابہ کرام بھی موجود تھے، انھوں نے آپؐ سے مختلف سوالات کیے، اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے، آپؐ نے جوابات دیئے، پھر انھوں نے

پوچھا: «أخبرني عن الساعة» اے نبی مجھے قیامت کے بارے میں بتاؤ، تو آپؐ نے فرمایا: «ما المسئول عنها بأعلم من السائل» یعنی میں آپؐ سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوں، پھر علامات قیامت دریافت کرنے پر آپؐ نے بہت سی علامتوں کا ذکر کیا، صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے علم قیامت کے بارے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

«في خمس لا يعلمهن إلا اللّٰه ثم قرأ (إن اللّٰه عنده علم الساعة وينزل الغيث الآية) رواه البخاري و مسلم»(۱)

"علم قیامت ان پانچ چیزوں میں شامل ہے جنھیں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، پھر آپ نے آیت تلاوت کی کہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس علم قیامت ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے وغیرہ۔"

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک لمبی حدیث ہے، انھوں نے کہا کہ جو شخص تین باتیں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہے اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا، پہلی بات یہ کہ کوئی کہے کہ معراج کے موقع پر رسول نے اللہ کو دیکھا ہے، دوسری بات یہ کہ کوئی کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دین کی کوئی بات چھپائی، اور تیسری بات یہ ہے کہ:

«من زعم أنه يخبر بما يكون في غد فقد أعظم على اللّٰه الفرية واللّٰه يقول: قل لا يعلم من في السماوات والأرض الغيب إلا اللّٰه»(۲)

"جس نے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کل کی باتوں کی خبر دیتے ہیں تو اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔"

بریلوی عقائد

قرآن وحدیث کی ان واضح تعلیمات کے برعکس بریلوی حضرات کے عقائد ملاحظہ ہوں!

وہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اول سے روز آخر تک کے تمام ما كان وما يكون کو جانتے بلکہ دیکھ رہے ہیں اور مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ (۳)

(۱) مشکاة المصابیح کتاب الایمان، پہلی حدیث۔
(۲) صحیح مسلم ۹۸/۱، باب معنی قول اللّٰه عزوجل ولقد رآه نزلة أخرى الخ۔
(۳) الدولة المكية بالمادة الغيبية ص۵۸ مطبوعہ لاہور۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں امام بریلویت احمد رضا خاں رقمطراز ہیں:

''نبی ﷺ کو تمام جزئی وکلی علم حاصل ہو گئے اور سب کا احاطہ فرمالیا۔''(۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''لوح وقلم کا علم جس میں تمام ماکان وما یکون ہے، حضور ﷺ کے علوم سے ایک ٹکڑا ہے۔''(۲)

ایک دوسرے بریلوی عالم احمد سعید کاظمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ اللہ کو جانتے ہیں اور تمام موجودات، مخلوقات ان کے جمیع احوال کو بتمام وکمال جانتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل میں کوئی شئے کسی حال میں ہو حضور ﷺ سے مخفی نہیں۔''(۳)

قرآن وحدیث کی صریح مخالفت کرتے ہوئے بریلوی مکتب فکر کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان پانچ مخفی امور کا علم بھی حاصل تھا، جنھیں ''مغیبات خمسہ'' کہا جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی یاوہ گوئیاں اور افسانہ طرازیاں ملاحظہ ہوں!

جناب احمد رضا خاں بریلوی صاحب لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ دنیا سے تشریف نہ لے گئے مگر بعد اس کے اللہ تعالیٰ نے ان کو پانچ غیبوں کا علم دے دیا۔''(۴)

مزید لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کو پانچوں غیبوں کا علم تھا، مگر آپؐ کو اس سب کو مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔''(۵)

ایک دوسرے بریلوی عالم احمد یار گجراتی لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کو تمام گذشتہ اور آئندہ واقعات جو لوح محفوظ میں ہیں، ان کا بلکہ ان سے بھی زیادہ کا علم ہو گیا، آپؐ کو قیامت کا بھی علم ملا کہ کب ہوگی۔''(۶)

بریلوی حضرات علم غیب اور غیوب خمسہ کے علم کو صرف رسول اللہ ﷺ اور انبیاء کرام تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ امت کے دوسرے اولیاء وصالحین کے بارے میں بھی اسی طرح کے بیہودہ نظریات رکھتے

---

(۱) الدولة المكية بالمادة الغيبية ص۲۳۰

(۲) خالص الاعتقاد ص۳۸۔

(۳) تسكين الخاطر فى مسئلة الحاضر والناظر، ص۶۵۔

(٤) خالص الاعتقاد، احمد رضا بريلوى، ص۵۳۔

(۵) خالص الاعتقاد، احمد رضا بريلوى، ص۵۶

(٦) الدولة المكية، ص۱٤۲

ہیں، کتاب وسنت کے خلاف اور عقل ودانش سے دور اس طرح کے عقائد ونظریات سے بریلوی مکتب فکر کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، اختصار کے پیش نظر ہم نے تو صرف چند اقتباسات دیئے ہیں۔ (۱)

واقعات سیرت

کتاب وسنت کی تصریحات اور عقل ودانش کے تقاضوں سے قطع نظر انبیاء ورسل کی زندگی کے سارے واقعات وحوادث بھی اس حقیقت کے روشن دلائل ہیں کہ انھیں علم غیب نہیں تھا اور خود سیرت نبویؐ کے واقعات بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً ستر (۷۰) افراد کی شہادت کا واقعہ، بیعت رضوان، واقعہ افک، کھجور کی پیوند کاری کا واقعہ اور حادثہ عرنیین وغیرہ، ان تمام واقعات وجزئیات پر ذرا سا بھی غور کرلیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ علم غیب فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات تک محدود ہے اور اس کی اس صفت میں کوئی رسول، نبی اور ولی شریک نہیں۔

لیکن بریلوی حضرات بڑے اصرار کے ساتھ سیرت نبوی کے نام پر غیر اسلامی فکر کی اشاعت کر رہے ہیں اور جو ان کے اس عقیدہ اور دوسرے غلو آمیز افکار سے اختلاف کرے اسے گستاخ رسول کہتے ہیں، سچ ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

میدان قیامت کا واقعہ

اب ہم میدان قیامت میں پیش آنے والے ایک واقعے پر نظر ڈالتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ دنیا کے بعض اہم حوادث وواقعات سے لاعلم نظر آتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: میری امت میدان قیامت میں حوض کوثر پر میرے پاس آئے گی اور میں دوسرے لوگوں کو حوض سے ہٹاؤں گا جیسے کوئی شخص دوسروں کے اونٹ بھگا دیتا ہے، لمبی حدیث ہے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«وليصدن عني طائفة منكم فلا يصلون، فأقول: يا رب! هؤلاء من أصحابي، ويجيئني ملك، فيقول: وهل تدري ما أحدثوا بعدك»(۲)

---

(۱) تفصیل کے لیے مراجعہ کیا جائے علامہ احسان الٰہی ظہیر کی کتاب "البريلوية" عربی یا اردو ایڈیشن کی بحث "سماع موتی"۔

(۲) صحيح مسلم مع شرح النووي، ج:۱، باب استحباب اطالة الغرة والتحجيل في الوضوء۔

''ایک گروہ کو میرے حوض پر آنے سے روکا جائے گا تو میں کہوں گا اے رب! یہ لوگ میرے ماننے والے ہیں تو ایک فرشتہ کہے گا آپ کو کیا معلوم کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟''

دوسری روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہو جائے گا کہ میرے بعد ان لوگوں نے دین میں تبدیلی کر دی تھی تو میں انھیں دھتکارتے ہوئے کہوں گا: «سحقًا سحقًا» اللہ تمھیں دور کرے۔ یہ کون لوگ ہوں گے جنھیں آپؐ حوض کوثر سے ہٹائیں گے؟ علامہ نووی لکھتے ہیں: اس سے تین طرح کے لوگ مراد ہو سکتے ہیں: ① منافقین ② وہ لوگ جو آپؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے، ③ بدعت کرنے والے جنھوں نے اپنی بدعت سے توبہ نہیں کی تھی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میدان قیامت میں جہاں آپؐ تشنہ لبانِ امت کو جام کوثر عطا کر رہے ہوں گے، بعض ایسے لوگوں کو بھی پلانا چاہیں گے جو مستحق نہ ہوں گے، بالآخر معلوم ہونے پر آپ ﷺ خود انھیں دھتکار دیں گے۔

اصحاب دانش غور فرمائیں کیا دنیا سے لے کر آخرت تک آپ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کی کوئی گنجائش ہے۔

⑤ رسول اللہ ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا

رسول اللہ ﷺ کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ بھی کتاب و سنت، عقل و دانش اور فہم و تدبر کے خلاف ہے، مگر بریلوی حضرات اس غیر اسلامی عقیدے کو سیرت نبویؐ کے نام پر پھیلا رہے ہیں، اس سلسلے میں ان کی کتابوں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں!

جناب احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں:

''کوئی مقام اور کوئی وقت حضور ﷺ سے خالی نہیں۔''(۱)

مزید رقمطراز ہیں:

''سید عالم ﷺ کی قوت قدسیہ اور نور نبوت سے یہ امر بعید نہیں کہ آن واحد میں مشرق و مغرب، جنوب و شمال، تحت و فوق، تمام جہات و امکنہ بعیدہ متعددہ میں سرکارؐ اپنے وجود مقدس بعینہ یا جسم اقدس مثالی کے ساتھ تشریف فرما ہو کر اپنے مقربین کو اپنے جمال کی زیارت اور نگاہ کرم کی رحمت و برکت سے سرفراز فرمائیں۔''(۲)

(۱) تسکین الخواطر فی مسئلة الحاضر والناظر ص۸۵۔

(۲) تسکین الخواطر فی مسئلة الحاضر والناظر ص۱۸۔

بریلوی مکتبہ فکر کے ایک دوسرے علمبردار احمد یار گجراتی لکھتے ہیں:

''حضور علیہ السلام کو دنیا میں سیر فرمانے کا اپنے صحابہ کرام کی روحوں کے ساتھ حق حاصل ہے، آپ ﷺ کو بہت سے اولیاء اللہ نے دیکھا ہے۔''(۱)

وہی مصنف مزید رقمطراز ہیں:

''اپنی امت کے اعمال میں نگاہ رکھنا، ان کے لیے گناہوں سے استغفار کرنا، ان سے دفع بلا کی دعا کرنا، اطراف زمین میں آنا جانا، اس میں برکت دینا اور اپنی امت میں کوئی صالح آدمی مر جائے تو اس کے جنازے میں جانا، یہ حضور علیہ السلام کا مشغلہ ہے۔''(۲)

جناب احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ کی روح کریم تمام جہان میں ہر مسلمان کے گھر میں تشریف فرما ہے۔''(۳)

وہ مزید رقمطراز ہیں:

''حضور علیہ السلام کی نگاہ پاک ہر وقت عالم کے ذرہ ذرہ پر ہے اور نماز، تلاوت قرآن، محفل میلاد شریف اور نعت خوانی کی مجالس میں اسی طرح صالحین کی نماز جنازہ میں خاص طور پر آپؐ اپنے جسم پاک سے تشریف فرما ہوتے ہیں۔''(۴)

جناب احمد یار گجراتی کی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''حضور علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کا پیدا ہونا، ان کی تعظیم ہونا اور خطا پر جنت سے علیحدہ ہونا اور پھر توبہ قبول ہونا، آخر تک ان کے سارے معاملات جو ان پر گزرے سب کو دیکھا اور ابلیس کی پیدائش اور جو کچھ ان پر گزرا اس کو بھی دیکھا اور جس وقت روح محمدیؐ کی توجہ دائمی حضرت سے ہٹ گئی تب ان سے نسیان اور اس کے نتائج ظاہر ہوئے''(۵)

ہر جگہ، ہر وقت حاضر وناظر ہونے کا بریلوی عقیدہ صرف رسول اللہ ﷺ تک محدود نہیں، بلکہ بریلوی حضرات یہی عقیدہ اولیاء کرام اور بزرگان امت کے بارے میں بھی رکھتے ہیں۔(۶)

---

(۱) جاء الحق، ص۱۵۴۔

(۲) حوالہ مذکور

(۳) خالص الاعتقاد ص۴۰

(۴) خالص الاعتقاد ص۱۵۶

(۵) جاء الحق ص۱۵۵

(۶) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی کتاب ''البریلویة'' کی بحث مسئلة الحاضر والناظر

آیات واحادیث اور واقعات

یہ عقیدہ اتنا لغو اور بیہودہ ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں، تاہم حسب ذیل آیات سے اس عقیدے کا موازنہ کیجیے تو اس کی نامعقولیت اظہر من الشمس ہو جائے گی:

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾

(القصص:۲۸/٤٤)

''اور آپؐ مغربی جانب موجود نہ تھے، جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو احکام دیے تھے اور آپؐ موجود رہنے والوں میں سے نہ تھے۔''

﴿وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيٓ أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ﴾

(القصص:۲۸/٤٥)

''اور آپؐ اہل مدین میں قیام پذیر نہ تھے کہ انھیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنا رہے ہوں، لیکن ہم آپؐ کو رسول بنانے والے تھے۔''

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۳/٤٤)

''اور آپؐ اس وقت ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے مریمؑ کی کفالت کون کرے گا اور نہ آپؐ ان کے پاس اس وقت تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

قرآن مجید میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں، جن میں گذشتہ انبیاء کرام کے واقعات بیان کیے گئے اور دوران بیان آپ سے کہا گیا ہے کہ آپؐ اس وقت نہ تھے، اسی طرح قرآن مجید میں معراج، ہجرت، غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور بیعت رضواں وغیرہ بہت سے واقعات کا ذکر ہے، جن میں یہ وضاحت ہے کہ آپؐ اگر ایک جگہ ہیں تو دوسری جگہوں میں نہیں ہیں۔

ان قرآنی تصریحات کے علاوہ سیرت کے تمام واقعات بھی عقیدۂ حاضر و ناظر کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ حجرۂ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد میں آپؐ کا انتظار فرمایا کرتے تھے، اگر رسول اللہ ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر تھے تو صحابہ کرام کا مسجد میں انتظار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے باری

مقرر فرمائی تھی، ایک بیوی کے یہاں ہوتے تو دوسری ازواج ﷺ کے یہاں موجود نہ ہوتے، اگر آپ ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر تھے تو پھر باری مقرر کیا معنی رکھتا ہے۔

اور اسی طرح جب آپؐ مدینہ میں ہوتے تو مکہ یا حنین وغیرہ میں آپ کا وجود نہ ہوتا، جب آپؐ مقام تبوک میں تھے تو آپؐ مدینہ میں موجود نہ تھے اور جب عرفات میں تھے تو نہ مکہ میں آپ کا وجود تھا نہ مدینہ منورہ میں، وغیرہ وغیرہ۔

بریلویت اور ہندومت

دراصل بریلوی مکتب فکر کا یہ عقیدہ بودھ مت اور ہندومت کے اثرات کا نتیجہ ہے، چنانچہ جناب احمد رضا خاں بریلوی رسول اللہ ﷺ کے ہر جگہ حاضر و ناظر رہنے کا تذکرہ کرنے کے بعد بزرگان امت اور اولیاء کرام کے ہر جگہ موجود رہنے پر کرشن کنہیا کے افسانوی ہندوانہ واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کرشن کنہیا کافر تھا اور ایک وقت میں کئی سو جگہ موجود ہوگیا، فتح محمد (ایک بزرگ کا نام) اگر چند جگہ ایک وقت میں ہوگیا، تو تعجب ہے! کیا گمان کرتے ہو کہ شیخ ایک جگہ تھے باقی جگہ مثالیں؟ حاشا! بلکہ شیخ بذات خود ہر جگہ موجود تھے، اسرار باطن فہم ظاہر وراء، خوض و فکر بے جا ہے''(۱)

دعوے کی دلیل میں نہ آیت، نہ حدیث، دلیل یہ ہے کہ کرشن کنہیا اگر کافر ہونے کے باوجود کئی سو جگہ موجود ہو سکتا ہے تو کیا انبیاء و اولیاء چند جگہ موجود نہیں ہو سکتے، کاش احمد رضا صاحب تحقیق کر لیتے کہ ہندوؤں کا مذہب تو بالکل افسانوی ہے، اس سے مذہب اسلام کا کیا تعلق، مگر افسوس بریلویوں نے سیرت نبویؐ اور پورے دین کو افسانوی بنا کر رکھ دیا۔

⑥ رسولؐ کا بشر نہ ہونا، نوری مخلوق ہونا

رسول اللہ ﷺ کا بشر نہ ہونا، بلکہ نوری مخلوق ہونا، یہ عقیدہ بھی سراسر مذہب اسلام اور عقل و دانش کے خلاف ہے، مگر بریلوی حضرات اس گمراہ عقیدے کو بھی سیرت نبویؐ کے نام پر اپنائے ہوئے ہیں، چنانچہ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے نور کا حصہ ہیں، یہ لوگ آپؐ کو دائرۂ انسانیت سے خارج کر کے نوری مخلوق میں داخل کر دیتے ہیں۔

(۱) فتاویٰ رضویہ ۱۴۲/۶، نیز ملفوظات امام احمد رضا ص ۱۱۴۔

بانی بریلویت جناب احمد رضا خاں بریلوی نے بشریت رسول کے انکار میں کئی رسالے تحریر کئے ہیں ان کے دو مشہور رسالوں کے نام اس طرح ہیں:

① صلاة الصفا فی نور المصطفیٰ

② نفی الفیء عمن أنار بنوره کل شیء

ان دونوں رسالوں کے خطبوں ہی میں انھوں نے اپنے بیہودہ عقیدے کا اظہار کر دیا ہے، ہم دوسری کتاب کے خطبے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں:

''تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے تمام اشیاء سے قبل ہمارے نبیؐ کا نور پیدا فرمایا، پھر مقام انوار آپؐ کے ظہور کی کرنوں سے پیدا فرمایا، آپ ﷺ نوروں کے نور ہیں، تمام سورج اور چاند آپؐ سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اسی لیے رب کریم نے آپؐ کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے، اگر آپؐ نہ ہوتے تو سورج روشن نہ ہوتا، دن رات کی تمیز نہ ہوتی اور نہ ہی نمازوں کے اوقات کا پتہ چلتا۔''(۱)

احمد رضا کی پہلی کتاب کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''فرشتے آپؐ ہی کے نور سے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اللہ نے ہر چیز میرے ہی نور سے پیدا فرمائی۔''(۲)

جناب احمد یار گجراتی بریلوی اپنی کتاب: ''مواعظ نعیمیہ'' میں لکھتے ہیں:

''رسولؐ، اللہ کے نور سے ہیں اور ساری مخلوق آپ ﷺ کے نور سے ہے۔''(۳)

بریلویت اور باطنیت

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ بریلویوں کے اس عقیدے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل بریلویت مجموعہ جہالت ہونے کے ساتھ ساتھ اس عقیدے میں تشیع اور باطنی مذاہب سے متاثر نظر آتی ہے، عجیب وغریب تاویلات اور حلول وتناسخ کے عقائد یہودیت اور یونانی فلسفہ سے باطنی مذاہب اور پھر وہاں سے تصوف اور بریلویت کی طرف منتقل ہوئے ہیں''(۴)

جناب احمد رضا خاں بریلوی کی ایک عبارت ملاحظہ ہو، جس کا ایک ایک لفظ بول رہا ہے کہ یہ عقیدہ

---

(۱) نفی الفی عمن انار بنوره کل شیء، مندرجہ مجموعہ رسائل ص۱۹۹۔

(۲) صلاة الصفا فی نور المصطفیٰ مندرجہ مجموعہ رسائل ص۳۷۔

(۳) مواعظ نعیمیہ از احمد یار گجراتی ص۱۴۔

(۴) البریلویۃ اردو ایڈیشن ص۱۸۵، مطبوع ہند۔

یونانی فلسفہ اور باطنیت سے ماخوذ ہے اور وحدۃ الوجود کی ایک صورت ہے، اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ عبارت یہ ہے:

''مرتبۂ ایجاد میں صرف ایک ذات مصطفیٰ ؐ ہے، باقی سب پر اس کے عکس کا فیض، وجود مرتبۂ کون و مکان میں نور احمدؐ آفتاب ہے اور تمام عالم اس کے آئینے اور مرتبۂ تکوین میں نور احمدی آفتاب اور سارا جہاں اس کے آبگینے۔''(۱)

آیات قرآنی

رسول اللہ ﷺ کے بشر نہ ہونے اور نوری مخلوق ہونے کا عقیدہ قرآن و حدیث اور واقعات سیرت کے بالکل خلاف ہے، بشریت رسول کے بارے میں چند قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾(الکہف:۱۸/۱۱۰)

''آپ کہہ دیجئے میں تو تمھارے ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾(بنی اسرائیل:۱۷/۹۳)

''آپ کہہ دیجئے پاک ہے اللہ تعالیٰ، میں فقط ایک انسان اور رسول ہوں۔''

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾(آل عمران:۳/۱٦٤)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔''

اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں، ہم بس انھی چند آیات پر اکتفا کر رہے ہیں۔

احادیث نبویؐ

اور اس سلسلے میں بہت سی احادیث و اقوال صحابہ بھی ہیں، ان میں سے چند احادیث و اقوال ملاحظہ ہوں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نماز میں کچھ بھول گئے، توجہ دلانے پر آپؐ نے سجدۂ سہو کیا اور سلام پھیرا، اس کے بعد مخاطب ہو کر صحابۂ کرام سے کہا:

«لوحدث في الصلاة شيء أنبأتكم به ولكن أنا بشر أنسى كما تنسون فإذا نسيت فذكروني»(۱)

(۱) صلاۃ الصفا فی نور المصطفیٰ، مندرجہ مجموعہ رسائل ص ۳۷۔

(۲) صحیح مسلم: ۲۱۲/۱، باب السهو في الصلاة، مطبوع ہند۔

''اگر نماز میں کوئی تغیر ہوگا تو میں تم لوگوں کو مطلع کر دوں گا، لیکن میں انسان ہی ہوں، جیسے تم لوگ بھولتے ہو، میں بھی بھولتا ہوں، تو جب میں بھول جاؤں مجھے یاد دلا دو۔''

دوسری روایت میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پانچ رکعات پڑھا دی، توجہ دلانے پر سجدۂ سہو کیا اور سلام پھیرا، پھر صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«إنما أنا بشر مثلكم أنسى كما تنسون»(۱)

''میں تمھاری ہی طرح انسان ہوں، بھولتا ہوں جیسے تم لوگ بھولتے ہو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو آپ ﷺ کی ذات و صفات سے بہت زیادہ واقف تھیں، وہ آپؐ کے بارے میں بیان کرتی ہیں:

«كان بشرا من البشر يفلي ثوبه ويحلب شأته ويخدم نفسه»(۲)

''رسول اللہ ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے، اپنے کپڑے میں سے جوئیں نکالتے، اپنی بکری دوہتے اور اپنا کام خود کرتے۔''

ان آیات و احادیث کے برخلاف رسول اللہ ﷺ کو بشر نہ ماننا، بلکہ نوری مخلوق ماننا کتنا افسوسناک اور مضحکہ خیز عقیدہ ہے، اگر رسول اللہ ﷺ نور تھے اور آپؐ ہی کے نور سے سورج و چاند روشن ہیں، تو کم از کم آپؐ کو اپنے گھر، اپنی مسجد میں اور جہاں آپؐ ہوں وہاں چراغ وغیرہ کی ضرورت نہ ہونا چاہیے، مگر آپؐ کے یہاں چراغ ہوتا، مسجد میں چراغ ہوتا اور اگر اتفاق سے چراغ نہ ہوتا تو گھر میں اندھیرا رہتا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ملاحظہ ہو، وہ چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے حجرہ کے تاریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں:

«كنت أنام بين يدي رسول الله ﷺ، ورجلاي في قبلته، فإذا سجد غمزني، فقبضت رجلي، وإذا قام بسطتهما قالت: والبيوت يومئذ ليس فيها مصابيح»(۳)

''میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی رہتی اور میرے پاؤں آپؐ کے سامنے ہوتے، جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پاؤں کو دبا دیتے تو میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب آپؐ کھڑے ہو جاتے تو میں پاؤں پھیلا لیتی، انھوں نے کہا اور ان دنوں گھروں میں چراغ نہ ہوتے۔''

---

(۱) حوالہ مذکور: ۱/۲۱۳۔

(۲) شمائل الترمذی ص۲۵، مطبوع ہند، باب ماجاء فی تواضع رسول اللّٰہ۔

(۳) صحیح مسلم: ۱/۱۹۸، مطبوع ہند، باب سترۃ المصلی والنہی عن المرور بین یدی المصلی الخ

بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نور تھے جیسے «اول ما خلق اللہ نوری» وغیرہ تو جاننا چاہیے کہ وہ روایات بے اصل اور موضوع ہیں۔

واقعات سیرت

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے سارے واقعات، حوادث اور عوارض بھی دلالت کرتے ہیں کہ آپؐ مادی جسم رکھنے والے انسان تھے، کوئی نوری مخلوق نہ تھے، چنانچہ ایک خاندان میں آپؐ کی پیدائش ہوئی، آپؐ کے والدین تھے اور دوسرے اعزاء و اقارب بھی، آپؐ خوش ہوتے، غمگین، ناراض، بیمار اور زخمی ہوتے، آپؐ کے دانت ٹوٹے، آپؐ کے جسم سے خون نکلتا، آپؐ کو بھوک لگتی، پیاس لگتی اور تکان ہوتی اور آرام کی ضرورت آپؐ کو ہوتی، آپؐ کے اندر جنسی خواہش تھی، بیویوں سے جماع کرتے، آپؐ کے یہاں بچے اور بچیاں پیدا ہوئیں، اس طرح سے سارے بشری عوارض آپؐ پر طاری ہوتے حتیٰ کہ آپؐ کی وفات ہوئی اور آپؐ کو دفن کردیا گیا، ہر عقلمند آدمی اندازہ کرسکتا ہے کہ اگر آپؐ نور ہوتے تو کیا یہ عوارض بشریہ آپؐ پر طاری ہوتے۔

بشریت انبیاء اور گذشتہ اقوام

انبیاء و رسل کا بشر ہونا اس طرح واضح اور بدیہی ہے کہ دور قدیم کی مشرک و کافر قوموں کو بھی اس کا اعتراف تھا، بلکہ وہ انبیاء کرام کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ تو ہماری ہی طرح انسان ہیں، کھاتے، پیتے اور بازاروں میں آتے جاتے ہیں، ہم ان پر کیسے ایمان لائیں، اس سلسلے میں قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں ایک آیت ملاحظہ ہو:

﴿مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴾(المؤمنون:۲۳/۳۳۔۳۴)

''یہ تو بس تمھاری ہی طرح انسان ہے، کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جو تم پیتے ہو، اگر تم نے اپنے ہی جیسے انسان کی پیروی کی تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔''

بعض آیات میں ذکر ہے کہ قدیم مشرکین نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ فرشتہ رسول و نبی بنا کر بھیجتا تو ہم ایمان لاتے، معلوم ہوا کہ دور قدیم کے مشرکین کا تصور یہ تھا کہ جو انسان ہے وہ رسول کیسے ہوسکتا ہے اور موجودہ دور کے بریلوی حضرات کا خیال ہے کہ جو رسول ہے وہ انسان کیسے ہوسکتا ہے، غور سے دیکھئے تو دونوں تصور یکساں ہے بس تھوڑا سا تعبیری فرق ہے۔

⑦ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونا

رسول اللہ ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا تصور بھی ایک غیر اسلامی فکر ہے، یہ تصور آپؐ کے بشر نہ ہونے اور نور ہونے کا لازمی نتیجہ ہے، مگر اس کج فکری میں بریلوی علماء کے علاوہ بعض دیوبندی علماء بھی مبتلا ہیں، اس لیے ہم اس کو الگ عنوان سے ذکر کر رہے ہیں ورنہ گذشتہ بحث میں اس کو شامل کرنا زیادہ موزوں تھا اور اس لیے بھی ہم نے اس کو الگ ذکر کیا ہے تاکہ بعض مستند مصنفین کی کتابوں میں جو اس طرح کی موضوع روایات شامل ہوگئیں جن سے سایہ ہونے کی نفی ہوتی ہے ان کی مستقل تردید ہو جائے۔

بریلوی عقائد

اس سلسلے میں ہم نے جناب احمد رضا خاں بریلوی کا ایک رسالہ ذکر کیا ہے «نفی الفی عمن انار بنوره کل شیء» ''اس ذات سے سایہ کی نفی جس نے اپنے نور سے ہر شئے کو روشن کیا'' اس کتاب کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ بشر نہیں تھے نور تھے اور آپؐ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا، اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آپؐ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا اور آپؐ نور محض تھے، جب آپؐ دھوپ یا چاندنی میں چلتے آپ کا سایہ نظر نہ آتا۔''(۱)

اس سلسلے میں ان کے چند اشعار اس طرح ہیں:

تو ہے سایہ نور کا، ہر عضو ٹکڑا نور کا
سایہ کا سایہ نہ ہوتا ہے نہ سایہ نور کا
تیری نسل پاک میں، ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور، تیرا سب گھرانا نور کا(۲)

سبحان اللہ! احمد رضا خاں بریلوی نے نہ صرف آپؐ کی بشریت اور سائے کا انکار کیا، بلکہ آپؐ کی ساری اولاد کو نوری مخلوق قرار دے دیا، واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے باطنی عقائد کی وجہ سے ہی بریلویوں کے اندر عقیدۂ حلول پیدا ہو گیا اور اسی بنا پر ان لوگوں نے یہود و نصاریٰ کے عقائد کو اسلامی عقائد میں

---

(۱) نفی الفی عمن انار بنوره کل شیء، مندرجہ مجموعہ رسائل ص۲۰۲

(۲) نفی الفی عمن انار بنوره کل شیء، مندرجہ مجموعہ رسائل ص۱۲٤۔

شامل کر کے دین کو ایک مضحکہ بنا دیا۔ چنانچہ بریلویوں کا بہت مشہور شعر ہے جس کا کوئی بریلوی انکار نہیں کر سکتا:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

غیر مستند روایات

رسول اللہ ﷺ کے نور ہونے کا رد ہم پہلے کر چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ آپ ؐ مادی جسم رکھنے والے بشر تھے اور سارے بشری عوارض آپ کے ساتھ تھے، اس کا لازمی تقاضہ ہے کہ آپ ؐ کے سایہ بھی تھا، لیکن ہم ایسی بعض صحیح روایات کا تذکرہ بھی کریں گے، جن میں آپ ؐ کے سایہ ہونے کی صراحت موجود ہے، مگر پہلے ہم ان بعض موضوع و غیر مستند روایات کا ذکر کر رہے ہیں جن سے آپ ؐ کے سایہ ہونے کی نفی ہوتی ہے، وہ روایات اس طرح ہیں:[1]

① حکیم ترمذی کی کتاب ''نوادر الاصول'' میں ذکوان کی روایت:

«أن رسول اللّٰه ﷺ لم یکن یری له ظل فی شمس ولا قمر»

''سورج یا چاند کی روشنی میں آپ ؐ کا سایہ نظر نہیں آتا تھا۔''

② ابن سبع کا قول: «من خصائصه ﷺ أن ظله کان لا یقع علی الارض»[2]

رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں یہ بات بھی تھی کہ آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔

③ روی ابن المبارك وابن الجوزی عن ابن عباس انه لم یکن للنبی ﷺ ظل[3]

ابن مبارک اور ابن جوزی رحمہما اللہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔

صحیح احادیث

یہ تین روایات ہیں، جنھیں رسول اللہ ﷺ کے سایہ کے منکرین پیش کرتے ہیں، پہلے ہم صحیح احادیث پیش کرتے ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کے سایہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

(۱) ملحوظ رہے کہ آگے کی پوری بحث علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہے جس کا عنوان ہے: ''کیا آنحضرت ﷺ کا سایہ نہیں تھا، یہ مضمون پہلے ''رحیق'' میں شائع ہوا تھا، بعد میں ''الاعتصام'' کے شمارہ ۶ر جمادی الاول ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوا۔

(۲) الخصائص الکبری للسیوطی: ۶۸/۱

(۳) شرح المواهب للزرقانی ۲۲/٤۔

① مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان نقل کیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«إذا أنا بظل رسول الله ﷺ مقبل»[1]

"یعنی میں رسول اللہ ﷺ کے سایہ میں آ رہی تھی۔"

② علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے جامع ابن وہب کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اور صحابہ کے لیے «ظلي وظلكم» استعمال کیا ہے۔[2]
ان صحیح روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ویسا ہی سایہ تھا جو زمین پر پڑتا ہے۔

روایات کا تنقیدی جائزہ

اب ہم بالترتیب ان روایات کا تنقیدی جائزہ پیش کر رہے ہیں جو سایۂ رسول ﷺ کی نفی کرتی ہیں:

① نوادرالاصول میں ذکوان کی جو روایت پیش کی گئی ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ "نوادر الاصول" کوئی مستند کتاب نہیں ہے، حکیم ترمذی، جامع ترمذی کے مصنف کے علاوہ کوئی دوسرے شخص ہیں اور ناقابل اعتبار ہیں اور وہ خود اپنی کتاب "نوادر الاصول" کے بارے میں لکھتے ہیں:

«ما صنفت حرفا عن تدبير ولا ينسب إلى شيء منه ولكن كان إذا اشتد على وقتي أتسلى به»[3]

"میں نے اس کتاب کا ایک حرف سوچ سمجھ کر نہیں لکھا، اس کی کوئی بات میری جانب منسوب نہ کی جائے؛ بس جب کوئی وقت میرے لیے مشکل پڑتا تو میں اس کے ذریعے تسلی حاصل کرتا۔"

"نوادر الاصول" کے بارے میں شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ کے تبصرے ملاحظہ ہوں! وہ لکھتے ہیں:
"نوادرالاصول اکثر احادیث غیر معتبر دارد" یعنی "نوادرالاصول" کی اکثر احادیث غیر معتبر ہیں۔ حکیم ترمذی کا قول مذکور نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

«باید دانست در تصانیف ایشان احادیث غیر معتبره وموضوعات بسیار مندرج است»[4]

"یعنی ان لوگوں کی تصانیف میں بہت سی غیر معتبر اور موضوع احادیث شامل ہیں۔"

(۱) مسند أحمد: ٦/١٣٢، ٢٦١، ٣٣٨، مجمع الزوائد ٤/٢٢٣، میں قدرے اختلاف کے ساتھ۔
(۲) حاوی الأرواح إلى بلاد الافراح ص٢٤، مطبوعه مصر۔
(۳) رسالہ قشیریہ ص٢٤۔
(۴) بستان المحدثین ص٦٣

② ذکوان کی مذکورہ روایت مرسل ہے اس لیے کہ ذکوان تابعی ہیں، رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہیں ہے اور مرسل حدیث حجت نہیں ہوتی، خصوصاً جبکہ اس کے مقابلہ میں متصل اور ثابت شدہ احادیث موجود ہیں۔

③ مرسل ہونے کے علاوہ وہ روایت باعتبار سند سخت مخدوش ہے، علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی ہے عبدالرحمٰن ابن قیس جو وضاع اور کذاب ہے، دوسرا راوی ہے عبدالملک بن عبداللہ ابن الولید جو مجہول ہے۔(۱)

ملا علی قاری نے بھی اسی روایت کو مخدوش قرار دیا ہے۔(۲)

④ خصائص کبریٰ والی روایت بھی مخدوش ہے، خود ''خصائص کبریٰ'' کے اندر بہت سی منکر، ضعیف اور موضوع روایات ہیں اور ابن سبع کے متعلق معلوم نہیں کہ کون ہیں، ''کشف الظنون'' میں ایک ابن سبع کا ذکر ہے جن کی کتاب ''شفاء الصدور'' ہے، ان کا مکمل نام ابن سبع الامام الخطیب سلیمان السبتی ہے اگر وہ یہی ہیں تو علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فضائل النبی ﷺ میں دو کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان کے اور دیلمی کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا تبصرہ یہ ہے:

«وأمثال هؤلاء ممن في كتابه من الكذب ما لا يحصيه إلا الله»(۳)

''ان جیسے لوگوں کی کتابوں میں اتنا کذب ہے جسے بس اللہ تعالیٰ ہی شمار کر سکتا ہے۔''

علاوہ ازیں ابن سبع نے کوئی سند بھی نہیں ذکر کی ہے تاکہ اس کا حال معلوم ہو سکے، ظن غالب ہے کہ اس کی بنیاد حکیم ترمذی کی روایت پر ہے کیونکہ ابن سبع، حکیم ترمذی سے متأخر ہیں۔

⑤ ابن المبارک اور ابن الجوزی کی روایت بھی لاپتہ ہے، نہ اس کی کوئی سند ہے نہ باقاعدہ حوالہ، ظاہر ہے ایسی روایت جس کا نہ سر ہو نہ پیر، کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔

یہ ہے ان روایات کا حال جن پر اعتماد کرتے ہوئے اچھے خاصے لوگ رسول اللہ ﷺ کے سائے کی نفی کرتے ہیں اور سیرت نبویؐ کے نام پر اس فکر کو پھیلاتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کی فضیلت وعظمت کے لیے قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ کافی ہیں اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے کے ناطے ان کے تمام عوارض بشریہ میں سے سایہ ہونا بھی ہے، جس کی نفی کے لیے صحیح دلیل کی

---

(۱) مناهل الصفا في تخريج احاديث الشفا للسيوطي، ص۷

(۲) شرح الشفا ۷۵۳/۱

(۳) الرد على البكري ص۲۰-۲۱

ضرورت ہے، اس لیے کہ آپؐ کا سایہ نہ ہونا ایک معجزے ہوگا اور معجزہ کا تعلق عقیدہ سے ہے جس کے لیے متفقہ طور پر بالکل صحیح، بے داغ اور غیر مخدوش روایات کی ضرورت ہے۔

⑧ حقیقت محمدیؐ کا صوفیانہ تصور

سابقہ مباحث سے محمد رسول اللہ ﷺ کی صحیح حقیقت کتاب وسنت اور واقعات سیرت کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے، اس کے برخلاف حقیقت محمدیؐ کے سلسلے میں صوفیانہ تصور یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے حقیقت محمدی کو پیدا کیا، پھر نور محمدیؐ سے ساری کائنات بنائی اور وہی حقیقت محمدیؐ مستوی علی العرش بھی تھی وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ تصور بھی غیر اسلامی ہے، جسے خواہ مخواہ سیرت نبویؐ کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے۔

دراصل صوفیاء نے اپنے بہت سے نظریات فلاسفہ سے اخذ کر کے انھیں اسلامی نظریات بنا کر پیش کیا ہے، جیسے نظریہ حلول، نظریہ وحدۃ الوجود وغیرہ، اسی طرح آغاز خلق کے سلسلے میں صوفیاء نے تھوڑی ترمیم کے ساتھ فلاسفہ ہی کا نظریہ اپنایا ہے، آغاز خلق کے بارے میں متقدمین فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے:

«إن أول شيء بدء في الخلق هو الهباء (الذرات) وإن أول موجود هو العقل الأول وسموه العقل الفعال وأنه عن هذا العقل الأول نشاء العالم العلوی السماوات والكواكب ثم العالم السفلي»[1]

آغاز خلق میں ذرات تھے، سب سے پہلا موجود عقل اول ہے، جس کو فلاسفہ عقل فعال کہتے ہیں، اسی سے عالم بالا یعنی آسمان اور ستارے وجود میں آئے پھر عالم زیریں یعنی زمین وغیرہ کی تخلیق ہوئی۔

صوفیاء نے اس گمراہ فکر کو کیسے اپنایا اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق حفظہ اللہ، محی الدین ابن عربی کی کتاب الفتوحات المكية (۱/۱۵۴، ۱۵۵) کی روشنی میں لکھتے ہیں، یہاں ہم اس کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

ابن عربی نے اسی فلسفیانہ نظریے کو اختیار کیا اور اسے صوفیانہ فکر کی اساس قرار دیا، لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اور وہ ترمیم یہ کہ فلاسفہ نے جس چیز کو عقل اول سے تعبیر کیا ہے اسی کو ابن عربی نے حقیقت محمدی کہا ہے، یعنی ذرات کے بعد سب سے پہلے جو چیز وجود میں آئی وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات

---

(۱) الفكر الصوفي في ضوء الكتاب والسنة، تأليف عبدالرحمن عبدالخالق ص۱۰۶، مطبوعه كويت۔

تھی، پھر اسی سے عالم بالا و عالم زیریں کی تمام مخلوق پیدا کی گئی۔

ابن عربی نے اس فکر میں مزید اضافے یہ کئے کہ اس نے کہا کہ حقیقت محمدیؐ ہی عرش پر مستوی تھی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہی تمام چیزوں کا خالق ہے اور مستوی علی العرش ہے، لیکن ابن عربی نے قرآن مجید میں تحریف وتلبیس کرتے ہوئے اور فلاسفہ کے ملحدانہ نظریے کو اختیار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ محمد ﷺ کی ذات ہی سب سے پہلے ذرات سے وجود میں آئی اور وہی عرش پر مستوی ہوگئی، پھر ذات محمدیؐ کے نور سے اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، فرشتوں اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور یہ ذات محمدیؐ وہی ہے جسے فلاسفہ عقل اول کہتے ہیں۔ (۱)

بریلویت اور تصوف

بریلوی مکتب فکر کا جو یہ نظریہ ہے کہ رسول بشر نہیں تھے، نور تھے، آپ کا سایہ نہیں تھا اور آپ کا وجود سب سے پہلے ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ سارے بریلوی عقیدے اسی صوفیانہ تصور سے ماخوذ ہیں، لہٰذا حقیقت محمدیؐ کی صوفیانہ وملحدانہ افسانوی تشریح کرکے آپؐ کو نور ثابت کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ آپؐ کی تخلیق نور کی شکل میں سب سے پہلے ہوئی، پھر آپؐ ہی کے نور سے ساری کائنات پیدا ہوئی، انتہائی لغو اور احمقانہ نظریہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مبدء کائنات ہونے کے سلسلے میں بعض احادیث کا بھی سہارا لیا جاتا ہے جیسے: «لولاك لما خلقت الأفلاك» یعنی اگر آپؐ نہ ہوتے تو ہم آسمان نہ پیدا کرتے، تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے۔ (۲)

اسی طرح ایک اور حدیث پیش کی جاتی ہے: «ولولا محمد ما خلقت الجنة والنار» یعنی اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں جنت وجہنم نہ پیدا کرتا، تو یہ حدیث بھی بے اصل اور غیر مستند ہے۔ (۳)

مگر افسوس ہماری عربی اور اردو نعت نگاری میں انھی صوفیانہ، ملحدانہ اور غیر اسلامی باتوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا جاتا ہے اور بڑی جرأت اور بیباکی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو صاحب لولاک وغیرہ کہا جاتا ہے، العیاذ باللہ۔

---

(۱) الفكر الصوفي في ضوء الكتاب والسنة، تأليف عبدالرحمن عبدالخالق ص۱۰۶، مطبوعہ کویت۔

(۲) سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة ۲۹۹/۱، حديث ۲۸۲۔

(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان، ص ۲۷۶، ۲۷۷، تالیف علامہ محمد بشیر سہسوانیؒ

⑨ جشن ولادت رسول ﷺ

یوم ولادت رسول اللہ ﷺ کو جشن منانا، چراغاں کرنا، جلوس نکالنا، مظاہرہ کرنا، نعرہ بازی کرنا اور اسے اسلام کی سطوت وعظمت اور شان وشوکت کی رمز وعلامت تصور کرنا بھی غیر اسلامی طریقۂ عمل اور غیر دینی فکر ہے، جسے سیرت نبویؐ کے نام پر بڑے کروفر اور تزک واحتشام کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسی خوشنما بدعت ہے جس نے بہت سے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جسے ہر سال نام نہاد مسلمان نئی آن بان، نئی زیبائش وآرائش اور مختلف نئے طریقوں سے مناتے ہیں۔

اس بدعت کا آغاز کب ہوا؟ قرون اولیٰ میں اس کا وجود تھا یا نہیں، اس سلسلے میں جناب مولانا حکیم عبدالشکور مرزاپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مروجہ مجلس مولود کی نسبت میں نے قرآن پاک کا ایک ایک حرف دیکھا، تفاسیر کا مطالعہ کیا، کتب واحادیث وفقہ اور سیر وتواریخ میں بھی کافی حد تک تلاش کیا مگر قرون ثلاثہ یعنی عہد رسالت، دور صحابہ وزمانہ تابعین وتبع تابعین میں کہیں اس کا وجود نہ ملنا تھا نہ ملا، بلکہ آغاز اسلام سے چھ سو (۶۰۰) برس تک اس محفل کا پتہ نہیں چلتا دراصل چھٹی صدی کے آخر میں اس کی ابتداء ہوئی۔''[۱]

اس کا موجد کون ہے، اس سلسلے میں کتب تاریخ میں دو نام ملتے ہیں، شیخ عمر بن ملا محمد موصلی اور مظفر الدین شاہ اربل، بظاہر یہ دونوں قول متعارض ہیں، مگر اس کی صحیح تطبیق یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شیخ عمر موصلی نے اس کی ایجاد کی اور شاہ مظفر الدین نے اسے ۶۰۴ھ میں رواج دیا، گویا ایجاد واختراع کی اولیت عمر بن ملا محمد موصلی کو حاصل ہے اور ترویج واشتہار کی اولیت مظفر الدین شاہ اربل کو حاصل ہے، چنانچہ مولانا عبدالحق مہاجر مکی رحمہ اللہ یہ تطبیق ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«اول کسیکه ابتدائش ساخته شیخ عمر بن ملا محمد موصلی است، واول کسیکه از ملوك باشتهارش پرداخته ملك مظفر الدین ابوسعید کوکبوری بن زین العابدین بادشاه اربل است»[۲]

''سب سے پہلے جس نے اس کی ابتداء کی وہ شیخ عمر بن ملا محمد موصلی تھے اور بادشاہوں میں جس نے اس کی ترویج کی وہ ملک مظفر الدین ابوسعید کوکب پوری بن زین العابدین شاہ اربل ہے۔''

(۱) تاریخ میلاد ص۱۲۔۱۳، مطبوعہ مکتبہ الفرقان لکھنؤ۔

(۲) الدر المنظم فی حکم مولد النبی الأعظم، ص۹۲، بحوالہ تاریخ میلاد، ص۲۰

یہ تو جشن میلاد النبی ﷺ کے آغاز و ایجاد کی بحث تھی، جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اس کی ایجاد تکمیل دین کے بہت بعد ہوئی، لہٰذا وہ دین میں ایک اضافہ ہے۔

اب ہم اختصار سے اس کے غیر اسلامی ہونے کے اسباب و وجوہ کا جائزہ لے رہے ہیں:

① جشن میلاد النبیؐ ایک بدعت ہے، اس لیے کہ بدعت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جس کو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے بعد ایجاد کیا گیا ہو، اسے نہ آپؐ نے کیا ہو نہ اس کے کرنے کا حکم دیا ہو اور نہ اسے صحابہؓ نے کیا ہو، ظاہر ہے کہ جشن میلاد بھی اسی طرح بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے، یا گمراہی کا سبب بنتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وإياكم ومحدثات الأمور وإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة»(۱)

''لوگو! دین میں ایجاد کی گئی نئی چیزوں سے بچو! اس لیے کہ ہر نئی ایجاد کردہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

غور کیجیے شروع شروع میں جشن میلاد کا آغاز محفل میلاد کی شکل میں ہوا جس میں سادگی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کا تذکرہ ہوتا تھا، اسی لیے بعض علماء نے اسے انگیز کر کے جائز قرار دیا ہے، مگر بدعت کا مزاج اپنے ساتھ گمراہیاں لاتا ہے، چنانچہ آج محفل میلاد نے ایسے طوفان انگیز جشن میلاد کی شکل اختیار کر لی ہے کہ: ''الامان والحفیظ''۔

② مروجہ جشن میلاد النبیؐ میں رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ بھی کارفرما ہوتا ہے، اسی لیے محبت رسولؐ کے دعویدار قیام تعظیمی بھی کرتے ہیں، اس جشن میلاد کی قباحت کی یہ بھی ایک وجہ ہے اور بہت بڑی وجہ ہے۔

③ جشن میلاد النبیؐ منانا، ہندوؤں اور عیسائیوں کی نقالی و مشابہت ہے، ہندو لوگ شری کرشن اور رام چندر کے یوم ولادت کے موقع پر ''جنم اشٹمی'' اور ''رام نومی'' مناتے ہیں، عیسائی ولادت عیسیٰؑ کے روز کرسمس ڈے مناتے ہیں اور مسلمان لوگ جشن میلاد النبیؐ مناتے ہیں، مشہور و معروف حدیث رسول ہے کہ: «من تشبه بقوم فهو منهم»(۲)

جو کسی قوم اور مذہب کی مشابہت اختیار کرے وہ انھی لوگوں میں سے ہے۔

---

(۱) رواہ احمد و أبوداؤد والترمذی وابن ماجه، مشكاة المصابيح، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الثانی

(۲) رواہ ابو داؤد عن ابن عمر واسناده جيد، بحواله «اقتضاء الصراط المستقيم» لشيخ الاسلام ابن تيميه ص۸۲۔

④ جشن میلاد النبیؐ سے مذہب اسلام کی غلط نمائندگی ہوتی ہے، اس لیے کہ مذہب اسلام سنجیدگی، وقار اور تہذیب و شائستگی سکھاتا ہے، جلوس و مظاہرہ کے نام پر ہلڑ بازی، ہنگامہ آرائی اور شور و شر کی اجازت نہیں دیتا۔

⑤ جشن میلاد کی تزئین و آرائش اور اسے دل کش بنانے میں ہر سال اربوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں، یقیناً یہ اسراف اور فضول خرچی ہے جو شیطانوں کا کام ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

یہ ہیں جشن میلاد النبیؐ کے غیر اسلامی ہونے کے اسباب و وجوہ، اللہ تعالیٰ امت کو ذہنی توازن اور فکری اعتدال کے ساتھ سیرت نبویؐ کے نام پر اس طرح کی غیر اسلامی روش سے محفوظ رکھے (آمین)

لمحۂ فکریہ

یہ ہیں چند غیر اسلامی افکار و نظریات جو سیرت نبویؐ کے نام پر پھیلائے جا رہے ہیں، اس طرح اور بھی بہت سے افکار و نظریات ہیں جنھیں اس مقالے میں شامل کیا جا سکتا تھا، جیسے سیرت نبویؐ کی سیاسی تشریح، صلح حدیبیہ کے بعض پہلوؤں کے پیش نظر صبر رسولؐ کی عیسائی تفسیر اور رسول اللہ ﷺ کو عرب قومیت کے داعی کی حیثیت سے پیش کرنا وغیرہ، مگر ہم نے اختصار کے پیش نظر صرف ان عقائد و خیالات تک بحث کو محدود رکھا ہے جن کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ بریلوی مکتب فکر سے ہے، جن کی ہندوستان میں اکثریت ہے، جنھوں نے صحافت و خطابت کو عجیب غیر دینی رخ دے رکھا ہے اور جو ہر موقع پر کتاب و سنت اور عقل و دانش کے تقاضوں سے دور ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے ملکی و عالمی مفاد کے خلاف شور و ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔

بریلوی حضرات کے بارے میں ذہن و دماغ میں ایک چبھتا ہوا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں سا لباس پہنتے ہیں، ان میں بہت سے لوگ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، صدقہ و خیرات کرتے ہیں، اسلام کے فروغ و ارتقاء کے لیے دینی مدارس چلاتے ہیں اور جلسے منعقد کرتے ہیں اور مسلمانوں ہی کے نام پر وہ لوگ بہت سے فسادات میں مارے جاتے ہیں، ان کے گھر جلائے جاتے ہیں اور بھی مختلف قسم کے نقصانات سے دوچار ہوتے ہیں، ان تمام ظاہری اسلامی اعمال کے باوجود سیرت نبویؐ کے سلسلے میں ان کے اندر اس طرح کے کھلے انحرافات کیوں ہیں کہ ان کے افکار و عقائد سے عقیدۂ توحید کا جنازہ نکل جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات سسکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں، آخر اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ لیجیے ہم انھی اسباب و

عوامل کی نشاندہی پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں، وہ اسباب و وجوہ کچھ اس طرح ہیں:

ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بریلوی علماء میں اکثر پڑھے لکھے جاہل ہوتے ہیں، انھیں کتاب و سنت اور عربی زبان و ادب کے علوم سے واقفیت نہیں ہوتی، اگر کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ وہ لوگ قرآن و حدیث اور عربی زبان کا گہرا علم حاصل کریں تو توقع ہے کہ وہ صحیح حقائق سمجھیں اور ان کی زندگی ان گمراہیوں سے دور ہو جائے، جیسا کہ کچھ حق پسند بریلوی علماء اب بعض بریلوی عقائد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مولویوں کے اندر دنیا پرستی اور مادیت پسندی کا رجحان غالب ہے، وہ دنیا کی فانی لذت و دولت کے لیے دین کی سودا بازی کر رہے ہیں اور قرآن و حدیث میں تحریف و تلبیس سے بھی باز نہیں آتے، تاریخ میں یہی روش یہودیوں نے اپنائی تھی اور دین کے رخ زیبا کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر ہندوؤں اور دوسرے مذاہب والوں کی طرح شخصیت پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے، یہ لوگ شخصیات و رجال کے آستانوں پر ایمان وعقیدہ اور عقل و دانش سب کچھ قربان کر دیتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کے یہاں ہندوؤں کی طرح توہم پرستی بھی بہت زیادہ ہے، توہمات کی ظلمتوں میں ان کی ایمانی روشنی غائب ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ فکری گمراہیوں کی ظلمتوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بریلوی حضرات عیسائی اور یہودی سازش کا شکار ہو گئے ہیں، برصغیر ہند و پاک میں انگریزوں نے دو شخصوں کو نمایاں طور پر اپنا آلۂ کار بنایا ہے، ایک تو مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے ہیں احمد رضا خاں بریلوی، ان دونوں نے اسلام کی صحیح شکل مسخ کر دی، مسلمانوں میں تکفیری فتووں کے ذریعے قیامت تک کے لیے اختلاف و انتشار کی بنیاد ڈال دی، جہاد کی مخالفت کی اور انگریزی سامراجیت کی حمایت کی، نیز تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے بھی مخالف رہے، ان کے بعد دین فروشی اور اسلام دشمنی میں ان کے متبعین انھی کی روش پر چلتے رہے اور اب بھی اسی راہ پر گامزن ہیں۔ (۱)

---

(۱) احمد رضا خاں بریلوی اور اس کے متبعین کے اس موقف کی جانکاری کے لیے ملاحظہ ہو: ''البریلویۃ'' کے اردو ایڈیشن کی بحث ''جہاد کی مخالفت اور استعمار کی حمایت'' اور مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی دوسری کتاب ''القادیانیۃ'' ملاحظہ ہو۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ بریلوی حضرات امت مسلمہ کے ملکی و عالمی مسائل و مشکلات اور ان کے تقاضوں سے بالکل ناواقف نظر آتے ہیں، حالات کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے مذہب والوں کی طرح مسلمان بھی اپنے صحیح دین اور دین کے بنیادی سرچشموں کی طرف لوٹیں، ملکی و بین الاقوامی سطح پر دین اسلام کی صحیح نمائندگی کریں اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ مخالفین کا مقابلہ کریں، اب زمانہ باہمی رسہ کشی، چپقلش، تکفیر بازی اور مناظرہ بازی کا نہیں ہے، اگر ان کی نظر زمانے کے سلگتے ہوئے حالات پر ہوتی تو یقیناً وہ یہ منافقانہ روش چھوڑ کر صحیح راہ پر گامزن ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد سے رہنے، صحیح راہ اپنانے، صحیح بات قبول کرنے اور ایمان و اخلاص کے ساتھ صحیح اسلام پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے آمین، تقبل یا رب العالمین!

اللّٰهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه (آمین)

نوٹ: ادارے نے یہ مضمون من وعن شائع کیا ہے اس حوالے سے کسی شخص کی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں۔ اگر کسی شخص یا گروہ کی دل آزاری ہوئی ہو ادارہ اس پر معذرت خواہ ہے۔

❁.....❁.....❁

علامہ ابنِ الجوزی اوران کی کتاب
« الوفا بأحوال المصطفیٰ » ایک تعارف!

عبدالمالک ندوی، ریسرچ فیلو، شعبۂ عربی، علی گڑھ

چھٹی صدی ہجری میں ایسی شخصیات کا سراغ ملتا ہے، جو تمام عالم اسلام میں کثرت تالیف اور سرعت تالیف میں فوقیت لے گئیں، ان میں ہر فرد اپنی جگہ ایک فعال علمی اکیڈمی کی حیثیت رکھتا تھا، ان میں بعض نے انفرادی طور پر ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کو بسا اوقات ایک علمی اکیڈمی انجام نہیں دے سکتی، ان میں ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی کا نام بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

میرے لیے یہ پہلو بہت خوش آئند ہے کہ اس طرح کی علمی شخصیات میں سے ایک اہم ترین شخصیت علامہ ابن الجوزی اور ان کی علمی کاوشوں میں سے ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' کا جائزہ اپنی ایک ادنیٰ کوشش کے ساتھ پیش کرسکوں۔

علامہ ابن الجوزی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے بڑے مفکروں، مورخوں، فقیہوں اور سیرت نگاروں میں ہوتا ہے۔

ابن الجوزی بغداد کے علاقے درب حبیب میں پیدا ہوئے، آپ کے سن ولادت سے متعلق علماء کی آراء مختلف ہیں، راجح قول یہ ہے کہ وہ ۵۱۱ھ یا ۵۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابن الجوزی خود اپنی تاریخ ولادت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«لا أحقق مولدی، غیر أنه مات والدی فی سنة أربع عشرة، وقالت الوالدة، کان

لك من العمر نحو ثلاث سنين»(۱)

''میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ میرے والد کا انتقال ۵۱۴ھ میں ہوا اور اس وقت میری عمر تین سال تھی۔''

عالم طفولیت ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور تربیت کی ذمہ داری پھوپھی پر عائد ہوئی، ابن الجوزی کہتے ہیں:

«فإن أبي مات وأنا لا أعقل ، والأم لم تلتفت إلي»

''پھوپھی نے خاص طور پر تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کی۔''

جب ابن الجوزی سن رشد کو پہنچے تو ان کی پھوپھی ان کو ابوالفضل ابن ناصر کی مسجد میں لے گئیں جو رشتے میں ان کے ماموں بھی ہوتے تھے، انھوں نے خاص طور پر ان کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے، انھوں نے وہاں قرآن حفظ کیا، حدیث کی سماعت کی اور پھر قرآن شریف ائمہ قرآن کی ایک جماعت سے پڑھا، وہ لکھتے ہیں:

«فإني أذكر نفسي، ولي همة عالية ، وأنا في المكتب ابن ست سنين، وأنا قرين الصبيان الكبار، قد رزقت عقلا وافرا في الصغر، فما أذكر أني لعبت في طريق مع الصبيان قط ، ولا ضحكت ضحكا خارجًا، حتى إني كنت إلى سبع سنين أو نحوها، أحضر رحبة الجامع، فلا أتخير حلقة مشعبذ، بل أطلب المحدث، فيتحدث بالسير فأحفظ جميع ما أسمعه، واذهب إلى البيت فأكتبه»(۲)

''مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستے میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں، یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقے میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث وسیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا۔''

(۱) ذیل طبقات الحنابلة ۳۹۹/۱۔

(۲) لفتة الكبد إلى نصيحة الولد لا بن الجوزی ص۸۱۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

«فركز في طبعي حب العلم، وما زال يوقعني علم المهم فالمهم، ويحملني إلى من يحملني على الأصوب حتى قوّم أمري»

ابن الجوزی بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کے دلدادہ تھے، جب ان کو کوئی کتاب مل جاتی تو ایسا لگتا کہ کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا، "صيد الخاطر" میں رقمطراز ہیں:

«ما أشبع من مطالعة الكتب، وإذا رأيت كتابا لم أره ، فكأني وقفت علي كنز، ولو قلت: إني طالعت عشرين ألف مجلدة كان أكثر، وأنا بعد في الطلب»[1]

میری طبیعت کتابوں کے مطالعے سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی تھی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا، اگر میں کہوں کہ میں نے بیس ہزار (۲۰۰۰۰) کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے۔

ابن الجوزی کو وعظ گوئی میں ایک خاص قسم کا ملکہ حاصل تھا، اس فن میں انھوں نے وہ مقام حاصل کیا جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، ان مجالس وعظ میں عوام وخواص کی کوئی تمیز نہیں تھی، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ابن کثیر کے بقول کم از کم آپ کی مجلس وعظ میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) کا مجمع ہوتا تھا اور وہ فی البدیہہ نظم ونثر میں وعظ کہا کرتے تھے، حاصل کلام وہ وعظ گوئی میں استاد کامل تھے۔[2]

وعظ میں ان کی تقریر شستہ اور مؤثر، اشارات عمدہ، معنی لطیف، اشارات نفیس اور نکات باریک ہوتے تھے[3]، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے تھے، ابن الجوزی کے بیان کے مطابق دو لاکھ آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور دو سو (۲۰۰) آدمی مسلمان ہوئے:

«ولقد تاب على يدي في مجالس الذكر أكثر من مائتي ألف، وأسلم على يدي اكثر من مائتي نفس»

ابن الجوزی نے علم حدیث کی طرف خاص توجہ دی اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذۂ فن سے کسب فیض کیا، انھوں نے خود بیان کیا ہے:

---

(۱) صيد الخاطر: ۶۰۸/۳، ۶۰۷، فهرس الفهارس: ۲۲۷/۱۔

(۲) مرآة الجنان: ۴۸۹/۲۔

(۳) شذرات الذهب: ۳۳۱/۴۔

«ولقد كنت أدور على المشائخ لسماع الحديث، وينقطع نفسي من العدو لئلا أسبق»[1]

''میں حدیث سننے کے لیے اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تاکہ میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔''

ان کو اس فن پر اس قدر عبور تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ:

«لا يكاد يذكر لي حديث إلا ويمكنني أن اقول صحيح أو حسن أو محال»

جو حدیث بھی ذکر کی جائے اس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ صحیح ہے یا حسن ہے یا محال ہے، اس بیان میں کسی طرح کا مبالغہ نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کا بیان ہے جس کو اس فن پر اپنی صلاحیت اور علوم وفنون میں دسترس پر پورا اعتماد تھا، یہ تو خود ابن الجوزی کی اپنے متعلق شہادت تھی، حافظ ابن دبیثی لکھتے ہیں کہ حدیث اور علم حدیث کی معرفت صحیح اور ضعیف حدیث کی واقفیت آپ پر ختم ہوگئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن الجوزی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علم حدیث کی تحصیل پر خرچ کیا، وہ اس علم کی طرف شروع ہی سے مائل تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

''علم حدیث کی تحصیل کے لیے میں ابتداء نوعمری میں خشک روٹی لے کر نہر عیسی کی طرف نکل جاتا، لیکن اس کو کھانے کی نوبت شام ہی کو آتی، جب بھی کوئی لقمہ لیتا تو اس نہر سے (خشک روٹی ہونے کی وجہ سے) پانی پینا پڑتا، میرا اصل مطمح نظر تو تحصیل علم تھا، چنانچہ میں نے آپ ﷺ کی حدیث اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہ وتابعین کے احوال و آداب سے واقفیت کو ترجیح دی۔''

حدیث کی سماعت و کتابت سے اس قدر اشتغال رہا کہ ابن خلکان کے بیان کے مطابق انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور برادہ سے گرم کیا جائے جو حدیث لکھنے کے لیے قلم بنانے میں جمع ہوگیا تھا، چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہوگیا اور وہ بچ رہا۔

ابن الجوزی کو علم حدیث ہی کی طرح فن تفسیر سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا، چنانچہ انھوں نے تفسیر اور علوم تفسیر میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں اکیاسی (۸۱) جلدوں میں ''المغنی فی تفسیر القرآن'' اور ''زاد المسیر فی علم التفسیر'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابن الجوزی مسجد کے منبر پر قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے، جس کو انھوں نے ۵۷۰ھ میں مکمل کیا، وہ خود بیان کرتے ہیں:

(۱) لفتة الكبد إلى نصيحة الولد ص۸۲۔

«وفی هذه السنة انتهی تفسیری فی القرآن، فی المجلس علی المنبر إلی أن تم، فسجدت علی المنبر سجدة الشکر، وقلت ما عرفت وأن واعظا فسر القرآن کله فی مجلس الوعظ منذ نزل القرآن»(۱)

''اس سال میری قرآن کی تفسیر مجلس میں منبر پر ختم ہوئی تو میں نے منبر پر سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا میں نہیں جانتا کہ جب سے قرآن نازل ہوا، کسی واعظ نے پورے قرآن شریف کی تفسیر وعظ کی مجلس میں ختم کی ہو۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ ابن الجوزی نے علوم وفنون میں کوئی ایسا فن نہیں چھوڑا جس میں کوئی کتاب تصنیف نہ کی ہو، حدیث، تاریخ، ادب، فقہ، طب اور تفسیر میں عجیب وغریب استعداد کے مالک تھے۔

اگر چہ وہ مسلک و مذہب کے اعتبار سے حنبلی تھے، مگر ان کی رائے میں جمود کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، بلکہ علوم وفنون پر عالمانہ و ناقدانہ نظر رکھنے کی وجہ سے ان کے اندر لچک پائی جاتی تھی، وہ مسلمانوں کے ہر طبقہ و جماعت کو سنت وشریعت کے معیار سے دیکھتے تھے، خواہ ان کے ہم مسلک علماء ہی کیوں نہ ہوں وہ ان کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ خود حنابلہ ابن الجوزی کی بہت سی آراء سے متفق نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات انھوں نے ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے، ابن رجب ''طبقات الحنابلہ'' میں رقمطراز ہیں:

ہمارے بعض علماء نے ابن الجوزی کے تاویل (۲) کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے ان پر سخت قسم کی نکیر کی ہے۔

ابن الجوزی نے ''تلبیس ابلیس'' میں ایک بڑا حصہ صوفیاء اور مدعیان تدین کی کمزوریوں، غلط رسوم وعادات اور بے اعتدالیوں کے لیے خاص کیا ہے، وہ کسی خاص مسلک سے جڑ کر اس کو حق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں ان کی عقل جس چیز کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اس کو بیان کرنے میں کسی کی پروا نہیں کرتے، اگر اس ناحیہ سے دیکھیں تو ہم انھیں سلفی بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۱) لفتة الکبد إلی نصیحة الولد ص۸۹

(۲) (یعنی اللہ تعالی کے اسماء وصفات کی تاویل، اس سلسلے میں علماء سلف کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے اسماء و صفات جس طرح کتاب وسنت صحیحہ میں وارد ہوئے ہیں انھیں بالکل اسی طرح اللہ تعالی کے لیے ثابت مانا جائے اور کسی طرح کی تاویل، تشبیہ اور تعطیل سے اجتناب کیا جائے۔ یہ ایک معتبر مکتب فکر ہے اور اس کا ہر فرد تاویل کے خلاف ہے (م)

علامہ ابن الجوزی کثیر التصانیف علماء میں سے ہیں، مختلف علوم وفنون مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، سیر، مناقب، مواعظ، تاریخ، جغرافیہ اور لغت میں آپ کی تصانیف ہیں، ابن العماد حنبلی کے بقول جب ابن الجوزی سے تصانیف کی تعداد کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے ان کی تعداد تین سو چالیس (۳۴۰) سے زیادہ بتائی، علامہ ذھبی لکھتے ہیں کہ: ابن الجوزی نے جتنی کتابیں تصنیف کیں کسی عالم نے نہیں کیں، ابن خلکان ان کی تعداد بیشمار بتاتے ہیں، لیکن امتداد زمانہ نے ان دُرہائے بیش بہا میں سے بیشتر کو پردۂ نسیان میں ڈال دیا ہے۔ ان ہی کتابوں میں ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' بھی تھی جو آٹھ صدیوں تک پردۂ اخفا میں رہنے کے بعد ۱۳۸۶ھ میں مصطفیٰ عبدالواحد کی کوششوں سے منظر عام پر آئی۔

الوفا بأحوال المصطفیٰ

اس کتاب کا شمار ابن الجوزی کی ان کتابوں میں ہوتا ہے، جو ان کے علمی رجحانات اور فکری و ثقافتی رنگ کی پوری عکاسی کرتی ہیں، یوں تو وہ ابتداء تا انتہا اپنے موضوع کے اعتبار سے رسول اقدس ﷺ کی سیرت پر ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ابن الجوزی رسول اقدس ﷺ کی نبوت کے دلائل اور آپؐ کے اپنی دعوت میں سچے ہونے پر براہین بھی قائم کرتے جاتے ہیں، اسی طرح آپؐ کی زندگی، نظام معیشت، کردار، اخلاق اور خصائص کی وضاحت کرتے ہیں۔

ابن الجوزی نے کتاب کے مقدمہ میں ان عوامل کا ذکر کیا ہے، جو اس کتاب کی تالیف میں کارفرما تھے، چنانچہ لکھتے ہیں: ہماری امت میں ایک بڑی تعداد آپ ﷺ کی فضیلت سے ناآشنا ہے، لہٰذا میں نے ایک ایسی کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا، جس میں آپ کا مقام، حالات زندگی، آپؐ کی رسالت پر براہین وحجج اور آپ ﷺ کی تمام انبیاء پر افضلیت ثابت کرسکوں۔ ۵

ابن الجوزی نے ابتداء کتاب میں ہی مقصد تالیف واضح کردیا کہ انھوں نے معاشرے اور سماج کی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابن الجوزی سے پہلے کسی نے اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا، بالفاظ دیگر کیا ابن الجوزی کی کتاب ''الوفا بأحوال المصطفیٰ'' کوئی ایسی نئی پیشکش ہے جو اس سے پہلے پیش نہیں کی گئی، اس کے لیے ہمیں پوری کتاب پر ایک مجموعی نظر ڈالنی ہوگی، تاکہ اس کا نیا رنگ، مصنف کے کام کی اصل قدر و قیمت اور پیش رؤوں میں اس کا صحیح مقام متعین ہوسکے، چنانچہ اس کتاب میں ہمیں چار بنیادی عناصر نظر آتے ہیں:

① رسول اقدس ﷺ کی سیرت: جس میں آپؐ کے پورے حالات زندگی سے بشمول غزوات و

سراپا بحث کی گئی ہے۔

۲ رسول اکرم ﷺ کے شمائل: یعنی آپ کے اخلاق کیسے تھے، خلوت وجلوت میں آپؐ کی زندگی کا رخ کیا تھا، اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۳ رسول اکرم ﷺ کی امتیازی خصوصیات: یعنی آپؐ کے فضائل اور دوسرے انبیاء کرام میں جو آپؐ کو مقام حاصل تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔

۴ آپؐ کی نبوت پر دلائل: رسول اقدس ﷺ کے ظاہری ومعنوی معجزات سے بحث کی گئی ہے اور اس کے حق ہونے پر ایسے دلائل قائم کیے ہیں جس سے ان کے موقف کی وضاحت ہوتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا بنیادی عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کا جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے قبل بھی بہت سے علماء نے اس طرز پر کتابیں لکھی ہیں اور اسلام کی علمی تحریک کے آغاز سے ہی اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے، لیکن ابن الجوزی نے اپنی اس کتاب میں جو نیا رخ دیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا ہے۔

اب ہم ابن الجوزی کی کتاب کے ان چاروں بنیادی عناصر کا جائزہ لیتے ہیں، ان میں سے سب سے پہلا عنصر رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا ہے، یوں تو سیرت نگاری کی ابتداء حضرت عروہ بن زبیر کی کاوشوں سے ہو جاتی ہے مگر باضابطہ شکلوں میں اس کا سراغ امام المغازی موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) کی کاوشوں سے ہوتا ہے، پھر ابن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ) کا نام آتا ہے جن کی مشہور زمانہ کتاب کا ابن ہشام نے اختصار پیش کیا، پھر واقدی (متوفی ۲۰۷ھ) اور ابن سعد (متوفی ۲۳۰ھ) کا نام آتا ہے، علامہ ابن الجوزی نے اس کتاب کی ترتیب میں ابن اسحاق اور ابن سعد سے کسب فیض کیا ہے، اسی طرح کتب حدیث بھی ان کے سامنے تھیں، یہ بات ذہن میں رہے کہ خود مصنف بھی محدث تھے، اس لیے انھوں نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت کے واقعات کتب حدیث سے لیے ہیں، جن میں بخاری ومسلم اور مسند امام احمد قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح شمائل نبی اکرم ﷺ بھی ایسا موضوع ہے جس کی طرف ابن الجوزی سے پہلے علماء نے خاص توجہ دی۔ سنن، مسانید اور صحیح حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی صفات، عبادات، معاملات، اخلاق وآداب کے ابواب کثرت سے ملتے ہیں، ابن الجوزی نے جہاں شمائل سے بحث کی ہے، وہاں حدیث کی کتابوں کے ابواب ان کے اولین ماخذ ہیں۔

شمائل نبویؐ پر الگ سے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس باب میں سب سے مشہور نام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب ''الشمائل النبویة'' کا آتا ہے جس میں انھوں نے آپؐ کی فطرت، اخلاق وعادات،

سامان معیشت، وسائل زندگی اور آپ ﷺ کے طریقۂ عبادات وزہد سے بحث کی ہے۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن الجوزی نے ابوعیسیٰ ترمذی کی اس کتاب کو شمائل نبویؐ کے ابواب مرتب کرتے وقت سامنے رکھا ہے اور اس سے بہت سی حدیثیں لی ہیں۔
نبی اکرم ﷺ کی نبوت پر دلائل کے سلسلے میں ابن الجوزی سے پہلے تین اہم کتابوں کا پتہ چلتا ہے، ان میں پہلی کتاب صاحب ''حلية الأولياء'' ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) کی ''دلائل النبوة'' ہے، جو دوبارہ دائرہ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے چھپ کر ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آئی۔
دوسری کتاب ''اعلام النبوة'' ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی ہے جو مطبعہ بہیہ سے ۱۳۱۹ھ میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔
تیسری کتاب امام بیہقی (۴۵۸ھ) نے ''دلائل النبوة'' کے نام سے تحریر کی ہے۔
علامہ ابن الجوزی اپنے پیش رو مصنفین سیرت کے دائرے سے الگ نہیں ہو سکے، انھوں نے انھی کتابوں کو بنیاد بنا کر اپنی کتاب مرتب کی ہے، اسی طرح انھوں نے ابوالوفا بن عقیل سے بھی استفادہ کیا ہے، جو ایجاز واختصار کے باوجود اصابت رائے اور دلائل قوی کے لیے ممتاز ہیں۔
جہاں تک سوال ہے خصائص کے باب کا تو اس میں علامہ ابن جوزیؒ نے قرآن وحدیث اور خاص طور پر ابونعیم اصبہانی کی کتاب ''دلائل النبوة'' کو بنیاد بنایا ہے۔
علامہ نے ابن قتیبہ کی کتاب ''السيرة النبوية'' سے بھی استفادہ کیا ہے، جو اب مفقود ہے، ابن الجوزی نے اس کتاب سے ان روایات کو لیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تورات وانجیل میں ملتی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ کو عبرانی وسریانی زبانوں پر دسترس حاصل تھی، ابن الجوزی نے جو روایات ابن قتیبہ کی کتاب سے لی ہیں وہ موجودہ تورات وانجیل کے ترجموں سے مطابقت رکھتی ہیں۔
مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ''الوفا بأحوال المصطفى'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کر دیا ہے، چنانچہ اگر کوئی آپ ﷺ کی سیرت، اخلاق وعادات سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔

کتاب کی امتیازی خصوصیات

① ابن الجوزی نے کتاب کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ پہلے ایک جامع عنوان ہو پھر

اس کے تحت مختلف چھوٹے چھوٹے ابواب ہوں، چنانچہ جامع عناوین کی تعداد چونتیس (۳۴) ہے جبکہ ذیلی عناوین کی تعداد پانچ سو (۵۰۰) سے بھی زیادہ ہے۔

② مولف نے اختصار کے پیش نظر اپنی کتاب سے اسانید کو حذف کر دیا ہے، جیسا کہ انھوں نے مقدمہ میں "ولا أطرق الأحاديث خوفا على السامع من ملامته" کہہ کر اشارہ کیا ہے اگر وہ اسانید بھی ذکر کرتے تو کتاب ضخیم ہو جاتی، اس لیے کہ بعض احادیث کی سندیں اصل نص سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

③ ابن الجوزی نے اپنی اس کتاب میں اشعار کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، انھوں نے نہ تو کتاب المغازی کے اشعار لیے ہیں اور نہ کتب سیرت میں مذکور مناظر اسلام سے متعلق ہی اشعار لیے ہیں، میرے خیال میں اس میں ابن الجوزی کے پیش نظر اختصار تھا اس لیے کہ وہ بغیر طوالت کے اصل موضوع کو بیان کرنا چاہتے تھے۔

④ صحت وثبوت کے پہلو سے دیکھا جائے تو مؤلف کتاب کے مقدمہ میں صحیح روایات کی چھان بین اور جھوٹی روایات سے احتراز کا عہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

«لا أخلط الصحيح بالكذب كما يفعل من يقصد تكثير روايته»

لیکن ابن الجوزی (باوجودیکہ ان کی کتاب زیادہ تر صحیح مواد پر مشتمل ہے) اس سے بچ نہیں سکے، اس لیے کہ بعض روایات جن کو انھوں نے "کتاب الموضوعات" میں موضوع قرار دیا ہے، اس میں موجود ہیں، جیسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث «أين كنت وآدم في الجنة ، قطف العنب» کی حدیث وغیرہ۔

دراصل صحیح مواد کے درمیان ان روایات کی تعداد بہت ہی کم ہے، اس لیے بے جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ابن الجوزی اپنے اس عہد میں کامیاب رہے۔

⑤ پوری کتاب صرف اثر ونقل پر مبنی ہے، اس میں نہ تو تحلیل وتجزیہ ہے اور نہ ہی استدلال ہے مگر شاذ ونادر۔

ابن الجوزی کا تحلیل وتجزیہ یا اپنی رائے قائم کرنے سے احتراز کا اصل مقصد یہ تھا کہ کہیں وہ اثر ونقل خلط ملط نہ ہو جائیں، اس لیے کہ ابن الجوزی جب کسی مسئلے کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرتے ہیں، جیسا کہ "صيد الخاطر" اور "تلبيس ابليس" سے پتہ چلتا ہے جو ان کی ناقدانہ طبیعت کا بہترین نمونہ ہیں۔

❁......❁......❁

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ سیرت نگار کی حیثیت سے

مسعود الرحمٰن خاں ندوی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ـ۱۲۰۶ھ) کی کتاب سیرت ''مختصر سیرۃ الرسول ﷺ'' ان کی داعیانہ، مجددانہ اور موحدانہ شخصیت وفکر کو پوری طرح اجاگر کرتی ہے۔ کتاب کے ناشر کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ سیرت نبویؐ تاریخ وقصص کی خوبصورت ترین اور حسین ترین بلکہ مبارک ترین صنف ہے کہ وہ وحی ونبوت کی برکات بیکراں کی جامع وحامل ہوتی ہے، اس میں جاں نثاری اور شہامت کے تابندہ نقوش ہوتے ہیں اور اس میں اتنے برکات وفوائد ہوتے ہیں کہ ظاہر بین نگاہیں ان کے حد وشمار سے قاصر رہ جاتی ہیں، اسی بنا پر اسلاف کرام اور متقدمین عظام سیرت نبویؐ کے ساتھ نہ صرف اعتناء کرتے تھے، بلکہ اپنی اولاد واخلاف کو بھی قرآن کریم کی پاک سورتوں کی مانند اس کی تعلیم دیتے تھے، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے اپنے اس مختصر سیرت میں صاحب دعوت وعزیمت کا مسلک اختیار کیا ہے اور ہر اہم مقام سیرت اور ہر قابل ذکر مرحلۂ حیات طیبہ پر وہ مسلمانوں اور امتیوں کو عبرت دلاتے اور سیرت نبویؐ کو درس اخلاق بناتے اور وجہ موعظت بناتے چلے جاتے ہیں، اسی بنا پر انھوں نے اپنی اس سیرت میں تاریخ اسلام کے مزید پچاس سالوں کے اہم ترین واقعات عبرت ونصیحت شامل کر لیے ہیں، دعوت وعبرت کے علاوہ اس مختصر سیرت کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال کرتے ہوئے چلتے ہیں، انھیں جہاں موقع ملتا ہے وہ اپنے عہد کے مسلمانوں اور ان کے علماء واہل علم کے عقائد واعمال کی اصلاح کا فریضہ

انجام دیتے ہیں، ان کی داعیانہ اور مجددانہ حیثیت ہی کا فیضان ہے کہ وہ سیرت نبویؐ کے باب میں در آنے والے غلط خیالات اور خام روایات پر تنقید اور صحیح آراء اور حقیقی واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں، انھوں نے کسی ایک کتاب یا ماخذ پر تکیہ نہیں کیا، وہ اپنی خاص بحثوں میں مختلف مآخذ سیرت و تاریخ سے صحیح تر مواد لیتے ہیں خاص کر قرآن مجید اور صحیح احادیث سے فیض اٹھاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر سیرتی مآخذ کے مواد پر قرآن مجید اور احادیث کے مواد کو ترجیح دیتے ہیں اور سیرتی مواد کو تائید میں پیش کرتے ہیں اور جسے صحیح سمجھتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں، اسی بنا پر انھوں نے بعض ضعیف روایات پر بھی نقد کر کے صحیح صورت حال پیش کی ہے، دوران بحث اگر کوئی اہم موضوع آ جاتا ہے تو وہ اس پر جامع و مفصل بحث کر کے پھر سیرت نبویؐ کے سلسلے کو وہیں سے پکڑ لیتے ہیں جہاں اسے اپنی بحثِ خاص سے قبل چھوڑا تھا، ایک اور اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ مختلف روایتوں کے درمیان محاکمہ کر کے اپنا تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے صورت واقعہ پوری طرح واضح ہو جائے۔ ان کی کتاب مختصر میں اور بھی اہم خصوصیات و امتیازات ہیں جن کا بیان اس مختصر مقالے میں مشکل ہے، ہم اس میں انھی پر اکتفا کریں گے اور تجزیاتی بحث میں موقع بموقع بعض اور خصوصیات کی طرف اشارہ بھی کرتے رہیں گے۔

شیخ الاسلام کی کتاب سیرت کے دو حصے ہیں: اول حصہ حمد و صلاۃ سے نسب نبویؐ تک تقریباً پچاس صفحات (۴۹-۵۰) پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے ابن اسحاق و ابن ہشام کی سیرت نبویؐ کا اختصار پیش کیا ہے اور اسی میں انھوں نے دعوت و اصلاح، تجدید و تفہیم، توحید و تائید اور عبرت و نصیحت پر زیادہ زور دیا ہے اور ان کی مثالیں تاریخ اور سیرت سے دی ہیں اور قرآن و حدیث سے استشہاد کیا ہے۔ مسلمانوں اور علماء پر نقد بھی کیا ہے اور ان کو صحیح دین کی راہ بھی بجھائی ہے۔

دوسرے حصے میں جو ان کی اپنی اصل کتاب ہے، خالص سیرت نبویؐ کے مواد پر مشتمل ہونے کے علاوہ عہد عباسی تک کے بعض تاریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں وہ تین سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے جن میں سے سیرت نبویؐ کے لیے دو سو سے کچھ زیادہ صفحات وقف کئے گئے ہیں، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام دونوں کا بیان زمانی ترتیب کے مطابق ہے اور سن وار واقعات بیان کرنے کا طریق طبری و ابن ہشام سے اختیار کیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام نے اس حصہ میں کلام عرب سے خاص کر سیرت ابن اسحاق میں موجود شعری مواد سے پوری طرح استفادہ کیا اور اکثر و بیشتر پورے پورے قصیدے، مرثیے اور دوسرے منظوم حصے نقل کئے ہیں جو ان کی کتاب کی ادبی خصوصیت اجاگر کرنے کے علاوہ ان کی شعری شخصیت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ کتاب کے تجزیے سے یہ خصوصیات

زیادہ واضح اور مدلل ہوں گی۔

شیخ الاسلام نے پہلے حصے میں حمد وصلاۃ کے بعد دین کی معرفت اور اس پر عمل کو جنت میں داخلہ کا اور اس کی جہالت و اضاعت کو جہنم میں داخلے کا سبب قرار دیا ہے اور عقل و شعور والوں کے لیے اولین و آخرین کے قصص و تاریخ میں صحیح طریق کار کا فہم مستور بتایا ہے، ان کے نزدیک تاریخ و سیرت خاص کر قصص قرآنی عبرت و موعظت کے مقامات ہیں، چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام و ابلیس کے قصے کو بیان کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؓ کے اصحاب کا موازنہ و مقارنہ اسلام دشمنوں سے کر کے بتایا ہے کہ یہ اسلام و کفر کو واضح کرنے کا طریقہ ہے، اکثر لوگ اسلام اور کفر کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ظاہر ہے کہ یہ ایسی ہلاکت ہے جس کے ساتھ کسی فلاح کی توقع نہیں کی جا سکتی، انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے قرآنی قصے کے بعد تاریخ و روایات سے تفصیل بیان کی ہے، پھر حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے اور ان دونوں واقعات کا موازنہ سیرت نبویؐ سے کیا ہے، یہی سلسلہ تمام انبیاء کرام کے واقعات میں جاری رہا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ دوسری روایات کی بنا پر بیان کرنے کے علاوہ احادیث صحیحہ اور قرآن مجید کی آیات سے بھی بیان کیا ہے اور پھر اس کا سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت مکہ سے جوڑ دیا ہے۔ مکی زندگی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا مختصراً ذکر کر کے عمرو بن لحی کا قصہ نقل کیا ہے اور جاہلیت میں دین ابراہیمی کے باقیات صالحات بیان کئے ہیں، عرب میں بت پرستی کی بدعت پر بحث کرتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کر کے عبرت دلاتے ہیں کہ جس نے توحید خالص سے انحراف کیا اس نے بت پرستی کو دعوت دی، اسلام و کفر کے فرق کے فہم کو انھوں نے فقہ اور تفقہ کے مترادف قرار دیا ہے۔

کعبہ کی تعمیر ابراہیمی، بنو جرہم کی تولیت کعبہ، بنو خزاعہ اور بنو جرہم کے درمیان اختلاف اور جنگ، تولیت کعبہ پر خزاعہ کی گرفت، بنو خزاعہ سے قصی بن کلاب کو مکہ مکرمہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت کی منتقلی، قصی اور ان کے خاندان کے مکہ میں عروج وغیرہ کی تفصیلات ابن ہشام کی سیرت کا اختصار پیش کرتی ہیں۔ حلف الفضول، ہاشم وعبد شمس کا مکہ مکرمہ کی سیاست میں مقام، زمزم کی کھدائی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے آیات و مبشرات، کفالت والدہ و جدامجد، بحیرا راہب کا قصہ، حضرت خدیجہؓ کی تجارت میں شرکت اور ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی، حرب حمس کی روایات و بدعات، وحی و اسلام کی آمد، حضرت سلمانؓ فارسی کے قبول اسلام وغیرہ کے مباحث ابن ہشام کو اختصار کے ساتھ لفظ ''ذکر'' کے ذریعے بیان کیا ہے، انھوں نے تمام مباحث میں کوئی خاص بات نہیں کہی ہے، لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مشکلات اور دعوت اسلام کی ایک قلیل جماعت کے ذریعے قبولیت میں

انھوں نے یہ اصول تلاش کیا ہے کہ اسلام اپنے مخالفین، دشمنوں اور دین پر نکتہ چینی کرنے والوں کی دشمنی کے بغیر استقامت نہیں پاتا، اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام کی راہ میں عذاب کی آگ میں تپنے والوں کو رخصت مل جاتی اور وہ ابتلاء وآزمائش سے بچ جاتے۔

شیخ الاسلام نے آپؐ کے عم مکرم ابو طالب کی حمایت، جان و مال کی قربانی، مصائب برداشت کرنے وغیرہ کو بیان کر کے کہا ہے کہ اپنی تمام جاں نثاریوں اور رسول اکرم ﷺ کی حمایت میں تمام کارگزاریوں کے باوجود انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا، رسول اکرم ﷺ نے ان کی وفات پر جب استغفار کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل کی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾(التوبۃ:۹/۱۱۳)

''نبیؐ اور مومنین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔''

شیخ الاسلام اس پر فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کیا عبرت ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ بلیغ کون سی موعظت ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ واضح اور کیا بیان ہو سکتا ہے کہ حق کا اتباع کرنے والے غیر حق کی پیروی نہ کریں اور معمولی دنیاوی اغراض کے لیے حق سے روگردانی نہ کریں۔

شیخ الاسلام نے ''الغرانیق العلی(۱)'' کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو لوگ اس قصے کو جانتے ہیں اور آج کے مشرکوں کے دین وطریقہ کو اور جو لوگ رسول اکرم ﷺ کے فرمان کو اور آج کے علماء کے طریقہ کو جانتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے شرک کو ذرا دیر کے لیے برداشت نہیں کیا جبکہ آج کل کے علماء آپؐ کے لائے ہوئے دین اور شرک اکبر کا فرق نہیں جانتے۔

یہ واقعہ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے علماء اس سے عبرت نہیں پکڑتے، انھوں نے اسی طرح جنگ بدر میں ایسے مسلمانوں کے قتل کیے جانے کا واقعہ بیان کیا ہے جو زبردستی لائے گئے تھے اور ان کے قتل پر صحابہ کرام کے اظہار تاسف کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس قصے میں اور اس سے متعلق آیات قرآنی میں نصیحت حاصل کرنے والے کے لیے یہ سبق ہے کہ کلام کفر کا نہ تو زبان سے اظہار کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنی قوم کو خوش کرنے کے لیے کفر صریح کا

(۱) اگرچہ امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے قصہ ''الغرانیق العلی'' سے بعض نتائج اخذ کیے ہیں لیکن ائمہ حدیث نے سنداً اس واقعہ کے عدم ثبوت کی صراحت کی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: نصب المجانیق فی نسف قصة الغرانیق، تالیف: شیخ محمد ناصر الدین الالبانی۔

اظہار کرنا چاہیے، اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ انسان طلب علم سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا، مزید یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایمان وہ نہیں جیسا اکثر لوگ اس کو سمجھتے ہیں، بلکہ ایمان کا مطلب حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ایمان خواہش وتمنا کے ذریعے نہیں حاصل ہوتا، بلکہ وہ ہوتا ہے جو دلوں میں متمکن ہو جاتا ہے اور جس کی تصدیق اعمال بھی کرتے ہیں، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ سے علم نافع مانگتے ہیں اور ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو نفع بخش نہ ہو۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اس کے بعد مختصراً ایک جگہ تمام غزوات کا ذکر کر کے دین اسلام کے عرب میں کامیاب وفاتح ہونے اور پورے عرب میں اس کی توسیع واشاعت کا ذکر کر کے آپ ﷺ کی وفات کا مختصراً ذکر کیا ہے، پھر اہل ردہ سے قتال پر بحث کر کے یہ درس عبرت نکالا ہے کہ دین حق کی حقانیت ثابت ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو جنگ کرنی اور دشمنوں کی سرکوبی کرنی ضروری ہے، موجودہ دور کے ردہ کے بارے میں علماء کے طریق کار پر تنقید کی ہے اور کئی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ کفر واسلام کے راستے مختلف اور واضح ہیں اور اسلام پر کسی طرح کا سمجھوتا نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام مثالوں کا تعلق ردہ اور بعد کے زمانے سے ہے اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

نسب نبویؐ کے عنوان کے تحت شیخ الاسلام نے آپ ﷺ کے نسب سے لے کر بعثت تک واقعات اور ان سے متعلق افراد وشخصیات کا ذکر کیا ہے۔ آپؐ کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ثابت کر کے فرماتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح بتانے والا قول باطل ہے، پھر کہتے ہیں کہ آپؐ کے عام الفیل میں پیدا ہونے پر علماء کا کوئی اختلاف نہیں واقعۂ فیل کو ظہور نبویؐ کا مقدمہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اصحاب فیل اہل کتاب ونصاریٰ تھے اور ان کا دین اہل مکہ کے دین سے بہتر تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کی ایسی مدد کی جس میں کوئی بشری کاریگری نہ تھی اور یہ صرف تمہید تھی اس نبیؐ کی آمد کے لیے جس کو قریش نے مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس سے بلد حرام کی تعظیم بھی مقصود تھی، پھر واقعۂ فیل ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اور نہ صرف عبدالمطلب کے کردار کو واضح کیا ہے بلکہ وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو سیرت ابن اسحاق میں موجود ہیں۔

اس کے بعد وہ پھر سیرت نبویؐ کی طرف رجوع کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ ﷺ کے والد کی ولادت نبویؐ سے قبل وفات، دادا کی کفالت ووفات، ابو طالب کو آپؐ کی کفالت کی وصیت پدری اور اس سے متعلق اشعار بیان کیے ہیں، جد رسول عبدالمطلب کی ذیلی سرخی کے تحت انھوں نے عبدالمطلب کے حسن کردار کے بارے میں ابن اسحاق کا بیان نقل کر کے تمام اولاد عبدالمطلب کا اور

ان کے اسلام لانے کا مفصل بیان پیش کیا ہے جو دوسرے ماخذ پر بھی مبنی ہے۔ اگر چہ ان کا ذکر نہیں، پھر عبدالمطلب کی ابتدائی زندگی، مکہ کی سیاست میں ان کے عروج، زمزم کی بازیافت، دس فرزندوں کی عطائے الٰہی پر ایک فرزند کی قربانی کی نذر، عبداللہ کی بجائے اونٹوں کی قربانی کا ذکر کر کے حدیث نبویؐ بیان کی ہے کہ ''میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں''، اس سے آپؐ کی مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اپنے والد عبداللہ سے تھی۔

ابوطالب کی کفالت نبوی کے ضمن میں شیخ الاسلام نے واقدی، ابن قدامہ، ابن اسحاق کے بیانات سے نقل کر کے یہ تجزیہ کیا ہے کہ ابوطالب نے آپؐ کی آٹھویں سال سے دس (۱۰) نبوی تک پورے تینتالیس (۴۳) سال حمایت و نصرت کی تھی، ابوطالب کے مرض الموت میں آپؐ کے دعوت اسلام دینے، ابو طالب کے کفر پر مرنے کا ذکر کر کے وہ آیات قرآنی کو نقل کرتے ہیں اور ان کی موت پر حضرت علیؓ کا مرثیہ بھی جو ابن اسحاق میں ہے، اس کے بعد مختصراً اولاد ابوطالب کا ذکر کر کے آپؐ کے سفر شام کا ذکر کیا ہے، انھوں نے اس ضمن میں ترمذی کی اس روایت کو غلط بتایا ہے کہ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے کیونکہ غالباً حضرت بلالؓ اس وقت موجود نہ تھے اس لیے یہ غلطی واضح ہے، تجارت کے آپ کے سفر شام، حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی شادی، غار حراء میں آپؐ کے تحنث اور کعبہ کی قریشی تعمیر نو اور بعض جاہلی روایات کا ذکر ابن اسحاق کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ کی بنا پر کیا ہے۔ ان میں احادیث، آثار تابعین، روایات اہل سیر اہم ہیں۔ عرب میں بت پرستی کے آغاز اور اس میں عمرو بن لحی کے کردار اور عرب کے قومی بتوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے جو دوسرے مآخذ پر زیادہ مبنی ہے۔ اس کے بعد وہ سیرت نبویؐ کی طرف رجوع کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔

''بدء الوحی'' کی سرخی کے تحت بخاری کی حدیث عائشہؓ پوری کی پوری نقل کی ہے۔ حضرت ورقہ بن نوفلؓ کو واضح طور سے مسلم بتانے والے وہ غالباً پہلے سیرت نگار ہیں، اس ضمن میں وہ جامع ترمذی کی روایت کے علاوہ حضرت ورقہؓ کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں جو انھوں نے آپؐ کی حمایت کا وعدہ کرنے کے متعلق کہے تھے، پھر حضرت ورقہ کی وفات، فترتِ وحی، آپؐ کے اندوہ اور اپنے آپ کو ختم کرنے کی روایت، حضرت جبریلؑ کی نمود اور تسلی اور آسمان سے آپؐ کی رسالت کی تصدیق اور سورہ مدثر کے نزول کا ذکر کیا ہے اور وہ زیادہ تر ابن اسحاق کی روایت پر مبنی ہے۔

ان کی ایک اہم آزاد و مستقل بحث ''انواع الوحی'' ہے جس میں انھوں نے چھ اقسام بیان کر کے امام ابن القیم کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ سورہ اقراء کے نزول سے آپؐ کی نبوت کا آغاز ہوا تھا اور اس میں تبلیغ کرنے کی حکم نہیں تھا، وہ سورہ مدثر کے نزول سے ہوا۔

شیخ الاسلام نے دس سال سے زیادہ آپ ؐ کی بلا قتال و بلا جزیہ تبلیغ کا ذکر کیا ہے، پھر پہلے ایمان لانے والوں کی سرخی کے تحت وہ فرماتے ہیں کہ اولین مسلم صدیق امت حضرت ابوبکرؓ تھے جنھوں نے دین اللہ کی نصرت وحمایت کی اور حضرات عثمان وطلحہ وسعد رضی اللہ عنہم کو اسلام میں داخل کیا، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو صدیقۃ النساء بتاتے ہوئے ان کے اسلام لانے کا ذکر کیا، پھر اسی ضمن میں حضرت علیؓ کے آٹھ سال کی عمر میں اسلام لانے کا ذکر کیا جبکہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے اسلام لانے کا ذکر ایک خاص فصل میں انکی ابتدائی زندگی کے پس منظر میں مفصل کیا ہے۔

حضرت سمیہؓ کو اول شہیدہ بتاتے ہوئے شیخ الاسلام نے ''ابتداء الدعوۃ'' کی سرخی کے تحت رسول اکرم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کا بیان امام زہری اور امام ترمذی کی روایات کی بنا پر کیا ہے، اس میں خاص کر مکہ کے بازاروں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز اور لوگوں کے مقامات ومنازل میں جا جا کر دعوت دینے کے علاوہ، خفیہ وعلانیہ دعوت کے ادوار، دعوت کی راہ میں ابولہب کی رکاوٹیں اٹکانے کا ذکر کیا ہے اور مختصراً کوہ صفا کے خطبہ نبوی کا ذکر کیا ہے، پھر ابن القیم کا قول نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے تین سال تک خفیہ دعوت دی۔ آیت کریمہ: ''فاصدع بما تؤمر وأعرض عن الجاهلين'' (الحجر ۹۴:۱۵) کے نزول کے بعد دعوت علانیہ دی۔

اسلام کی راہ میں پہلے خون کے بعد مشرکین کے استہزاء میں صحیح مسلم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے کہ کس طرح ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز میں ستانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے کیسے آپ ؐ کی حفاظت کی۔

اس کے بعد پہلی ہجرت حبشہ کا سن، مہاجروں کے چند نام اور اس کا سبب بیان کیا ہے، پھر دوسری ہجرت حبشہ کا بیان ہے، اسی ضمن میں حضرت ام حبیبہؓ سے آپ ﷺ کی شادی کا ذکر بھی کر دیا ہے جو ابن اسحاق اور دوسرے سیرت نگاروں سے مستعار ہے۔

شیخ الاسلام نے مہاجرین حبشہ کو واپس لانے والے قریشی وفد کا زمانہ غزوۂ بدر قرار دیا ہے اور اس میں انھوں نے حضرت جعفرؓ کی دربار نجاشی میں تقریر بھی بیان کی ہے، یہ بیان نجاشی کی موت پر ختم ہوتا ہے۔

دوسری سرخی حضرت حمزہؓ کے اسلام کے متعلق ہے جو ابن اسحاق کی روایت پر مبنی ہے جبکہ حضرت عمر کے اسلام کا بیان حضرت ابن عمر حضرت ابن عباس کی روایات پر منحصر ہے، اگلی سرخی «حماية أبي طالب لرسول الله» ہے جو ابوطالب کے پاس قریشی وفد کے آنے، ابوطالب سے رسول اکرم ﷺ کے کلام اور ابوطالب کے حمایت نبویؐ جاری رکھنے سے متعلق ہے، اس میں ابوطالب کے اشعار نقل

کئے ہیں جو ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں، پھر شعب میں بنو ہاشم کے محاصرہ کا ذکر کر کے ابو طالب کے مشہور قصیدہ لامیہ کو کئی صفحات میں نقل کیا ہے اور نقض صحیفہ کا بیان بہت مفصل دیا ہے۔

ایک سرخی کے تحت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے واقعات بیان کئے ہیں جس میں کئی احادیث سے مدد لی ہے، امام زہری کی ایک روایت بھی دی ہے۔

شیخ الاسلام نے اس کے بعد ابن اسحاق سے وہ پوری روایت لی ہے جو انھوں نے روح اور اہل کہف کے بارے میں سوالات سے متعلق بیان کی ہے، ایک روایت ابن عباسؓ کا بھی اس میں ذکر ہے اور قرآن مجید کے آیات کریمہ کا بھی، حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت کی بنا پر ولید بن مغیرہ کے سحر قرآن سے مسحور ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے، پھر انشقاق القمر کا معجزہ بیان کیا ہے، قریش کے مطالبہء معجزات کا بیان، آیات قرآنی اور تفسیری روایات وغیرہ کی بنا پر بیان کر کے معجزات کی حکمت و ضرورت پر پورا مقالہ تحریر کیا ہے جو کافی وقیع ہے، اس میں حدیثی اور تفسیری روایات کے علاوہ بحث و تجزیہ بھی موجود ہے۔

اس کے بعد وہ پھر سیرت نبویؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے سفر طائف، اسراء و معراج، ہجرت مدینہ کی تیاری، بیعت عقبہ اولیٰ، اسلام سعد بن معاذ و اسید بن حضیر، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم کی مدینہ روانگی، بیعت عقبہ ثانیہ کا ذکر کیا ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے مؤخر الذکر کے بارے میں اشعار بھی نقل کئے ہیں، پھر ہجرت مدینہ کا ذکر مع اس کے متعلقات کے کیا ہے، ام معبد کے ہاں قیام نبویؐ کے بارے میں کافی اشعار نقل کرنے کے بعد مدینہ میں داخلہء نبویؐ کا ذکر مع اشعار کے کیا ہے، مسجد نبویؐ کی تعمیر، حضرت عائشہؓ کی رخصتی، انصار و مہاجرین کے درمیان مواخاۃ کا ذکر کافی مفصل اور تجزیہ و بحث سمیت ہے، شیخ الاسلام نے ان تمام مباحث میں سیرتی روایات بالخصوص ابن اسحاق کی روایات کے علاوہ دوسرے رواۃ سے بھی استفادہ کیا ہے اور حدیث کی روایات سے بھی، مثلاً: مسجد میں قدوم نبوی کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت مع اشعار نقل کی ہے۔

شیخ الاسلام کی کتاب سیرت اس کے بعد سن وار تاریخ اسلام بن جاتی ہے کہ وہ ہر سال کے واقعات وحوادث زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور یہ طبری کے طریق روایت و بیان کے تتبع میں کیا گیا ہے۔

سال اول کے حوادث میں نماز حضر میں دو رکعتوں کے اضافے، مسجد میں اہل صفہ کے قیام، بعض اکابر کی وفات، یہود مدینہ سے معاہدہ اور اسلام عبداللہ بن سلام کا ذکر کیا ہے، جبکہ دوسرے سال ہجری کے ضمن میں اذان کی ابتداء، روزہ رمضان کی فرضیت، حضرت فاطمہؓ کی شادی اور تحویل قبلہ کا

ذکر مختصراً کیا ہے، پھر تحویل قبلہ کی سرخی کے تحت پوری تفصیل تحویل قبلہ کی دی ہے، اس کے بعد کی فصل میں جہاد کی اجازتِ الٰہی کا ذکر کر کے رسول اللہ ﷺ کے بعض خصائص کا ذکر کیا ہے، یہ فصل سنت اور اسلامی طریقۂ حیات کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے اور شیخ الاسلام کے فلسفۂ تجدید دین اور احیاء سنت کو واضح طور سے پیش کرتی ہے۔

اس کے بعد وہ ابن اسحاق کے طریقے کی پیروی میں ابتدائی سرایا کا ذکر کر کے ان کا سلسلہ غزوۂ بدر سے جوڑ دیتے ہیں جس کا بیان بعد میں کافی مفصل ہے، بدر کے بعد کے تمام غزوات و سرایا کا ذکر کیا ہے، فتنہ کے معنی کی تشریح میں وہ اپنی داعیانہ حیثیت کا ایک بار پھر اظہار کرتے ہیں اور اس کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے ایک معنی معصیت کے لیتے ہیں اور اللہ کی طرف اس کی نسبت کی صورت میں ابتلاء و امتحان کے بیان کرتے ہیں اور اس کی تائید میں قرآنی آیات سے استشہاد کرتے ہیں، بدر کے واقعہ کا مفصل ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد بالترتیب غزوۂ بنی قینقاع کا مختصر ذکر کر کے غزوۂ احد کو مفصل بیان کرتے ہیں، اس میں قرآن و حدیث سے خوب استشہاد کرتے ہیں، اس کے بعد دوسرے غزوات و سرایا کا بیان ترتیب زمانی کے مطابق ہے، ان میں بئر معونہ، غزوۂ مریسیع، احزاب، بنو قریظہ، صلح حدیبیہ، خیبر، وادی القری، جہینہ، عمرۃ القضیہ، موتہ، فتح مکہ، اصنام عرب کے منہدم کرنے کی مہمات، غزوۂ حنین، غزوۂ طائف، تبوک وغیرہ کا ذکر ہے، اہم غزوات کا بیان کافی مفصل ہے، ان غزوات کے متعلق بعض واقعات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں، جیسے غزوۂ مریسیع کے دوران واقعۂ افک کا بیان، یا فتح مکہ کے دوران اسلام اہل مکہ کا بیان یا غزوۂ حنین کے دوران تقسیم اموال غنیمت کا بیان۔

دراصل ان تمام بیانات میں وہ ابن اسحاق کی اصلاً اور طبری کی ثانیاً پیروی کرتے ہیں، ہر غزوہ کا بیان متعلقہ سن کے ضمن میں کرتے ہیں، البتہ متعلقہ مباحث میں وہ احادیث اور بعض دوسری سیرتی روایات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

ان کی ایک اہم بحث جو ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے یہ ہے کہ وہ غزوۂ طائف سے فقہی احکام کا استنباط کرتے ہیں اور اس پر مکمل بحث کرتے ہیں جو ان کی داعیانہ اور مجددانہ خصوصیت کو اجاگر کرتی ہے، (ص ۹-۲۳۸)

اس کے بعد ۹ھ کے واقعات بالترتیب بیان کرتے ہیں، اس حصے میں اشعار کافی ہیں، آخری فصل تبوک کے غزوہ سے متعلق ہے جس میں ابن اسحاق کے علاوہ صحیح مسلم، صحیح ابن حبان، اور حضرت ابن عباس کی تفسیری روایات کا ذکر کیا ہے۔

وفود عرب کے بیان میں خاص طور سے بنو تمیم کے وفد کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے متعلق اشعار بھی دیتے ہیں۔ طے، عبدالقیس، بنو حنیفہ کے وفود کا بطور خاص ذکر کر کے حضرت ابوبکرؓ کی امارت میں حج کی ادائیگی کا مختصر بیان دیتے ہیں اور پھر حجۃ الوداع کا بیان مفصل دیتے ہیں۔

بعثت اسامہؓ، مرض رسولؐ اور وفاتِ رسول ﷺ ان کے آخری مباحث سیرت ہیں، ان میں ابن اسحاق کے علاوہ امام زہری وغیرہ کی بعض روایات بھی دی ہیں، اسی پر شیخ الاسلام کی سیرت نبوی ختم ہوتی ہے۔ (ص۲۷۲)

اس کے بعد حدیث السقیفہ سے تاریخ اسلام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس سے ہمیں سر دست بحث نہیں (ص۲۶۰-۲۷۲)۔

اس طرح یہ مختصر سیرت رسول ﷺ صرف سیرت نبویؐ کی اہم کتاب ہی نہیں ہے، بلکہ شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کی تحریکی زندگی کے داعیانہ مشن کے اہم ترین عقائدی مؤقف اثبات توحید، رد شرک اور ابطال بدعات و خرافات کی کامیاب کوشش ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی "السیرۃ النبویۃ: دروس وعبر" ایک جائزہ

محمد سمیع اختر، لیکچرر، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دور جدید میں احیاء اسلام کے پیش نظر مصر اور شام کے صحیح اسلامی فکر اور تحریکی ذہن رکھنے والے علماء و مصنفین نے سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے اور دور جدید کے تقاضوں کے مطابق سیرت کے مخصوص موضوعات پر گراں قدر کتابیں بھی لکھیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے عرب سیرت نگاروں میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی (۱۹۶۷۔ ۱۹۱۵ء) کو نمایاں مقام حاصل ہے، موصوف کی تحریکی شخصیت اسلام دوستی، سیاسی کارنامے اور علمی وتحقیقی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے والا شخص یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر تحریک اسلامی کا رنگ پوری طرح غالب ہے، انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک داعی اور قائد تحریک کی طرح گزاردی اور کسی بھی لمحے اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے، انھوں نے تحریکی مقاصد کے پیش نظر ہی مختلف سیاسی، دینی، فکری اور تحقیقی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں اور یہ حقیقت ہے کہ تحریک اسلامی کا کام سیرت نبوی ﷺ کے صاف وشفاف سوتوں سے سیرابی حاصل کئے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا، انھوں نے اپنی متعدد تصانیف میں سیرت سے متعلق کئی اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، میں یہاں اس طرح کی تمام کاوشوں کا جائزہ نہ لیتے ہوئے صرف سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر ان کی مشہور تصنیف "السیرۃ النبویہ دروس و عبر" کی خصوصیات پر مختصر روشنی ڈالوں گا۔

ان کی سیرت نگاری کا انداز فقہاء، مورخین، محققین اور متکلمین سے یکسر مختلف ہے، انھوں نے سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ تحریک اسلامی کے ایک کارکن کی حیثیت سے کیا ہے، انھوں نے سیرت نبویؐ سے متعلق ملنے والے تاریخی واقعات کی جمع و تدوین یا ان کی روایات کی چھان بین کو موضوع بحث نہ بناتے ہوئے دعوت دین کا فریضہ انجام دیا ہے اور سیرت نبویؐ کے مستند تاریخی واقعات سے ملنے والی ہدایات اور نصائح کی نشاندہی کو اپنا مقصد تحریر قرار دیا ہے، غرضیکہ انھوں نے ایک مخصوص انداز پر سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہم کسی حد تک تربیتی پہلو سے تعبیر کر سکتے ہیں، وہ سیرت کے واقعات میں تذکیر وعبرت کا پہلو تلاش کرنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

یہ کتاب دراصل سیرت نبوی ﷺ پر چند ایسے تابناک صفحات کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر سباعی نے شریعت کالج کے طلبہ و طالبات کی اسلامی خطوط پر تربیت اور ان کو تحریک اسلامی کی خدمت کے لیے تیار کرنے کی غرض سے تحریر کرائے تھے تاکہ وہ اصلاح معاشرہ کے لیے حضور اکرم ﷺ کی سیرت کو کامل اسوہ ونمونہ کی حیثیت سے اختیار کریں اور اپنی زندگیوں کو سیرت طیبہ کے سانچوں میں ڈھالیں، یہ نکتہ انھوں نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب کے پیش لفظ میں بیان کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ سیرت نبوی ﷺ میں وہ ساری ہدایات موجود ہیں جن کو اختیار کر کے ہماری نئی نسل بہت حد تک ذہنی انتشار، تخریب پسند نظریات اور باطل نواز قوتوں کے چنگل سے محفوظ رہ سکتی ہے، سیرت نبوی ﷺ کی تعلیمات و ہدایات کو اپنی عملی زندگیوں سے خارج کر دینا ہی امت مسلمہ کے زوال اور پستی کا اصل سبب ہے۔

یہ کتاب تقریباً دوسو (۲۰۰) صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، یہ ایک مقدمے اور چھ (۶) فصلوں پر مشتمل ہے، گوکہ مصنف نے اس مقدمے میں دس فصلوں کا ذکر کیا ہے، یہ ان کے آخری دور کی کتابوں میں سے ہے جبکہ ان پر فالج کا شدید حملہ ہو چکا تھا، انھوں نے یہ کتاب مرض کی حالت ہی میں املا کروائی، غالب گمان یہی ہے کہ فاضل مصنف کو چھ فصلوں کی تکمیل کا ہی موقع مل سکا۔

مقدمہ دو بحثوں پر مشتمل ہے:

ا : سیرت نبوی ﷺ کی خصوصیات اور اس کے مطالعے کی افادیت۔

ب : سیرت نبوی ﷺ کے صحیح مآخذ ومصادر۔

سیرت نبوی ﷺ کا فہم وادراک دس فصلوں پر مشتمل ہے:

① پہلی فصل بعثت سے قبل آپ ﷺ کی زندگی کے حالات اور ان سے ملنے والی نصیحتوں پر مشتمل

ہے۔

② دوسری فصل بعثت سے لے کر ہجرت حبشہ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

③ تیسری فصل ہجرت حبشہ سے ہجرت مدینہ تک کے واقعات اور عبرت آمیز پہلوؤں پر مبنی ہے۔

④ چوتھی فصل ہجرت مدینہ اور مدینہ میں آپ ﷺ کے قیام سے متعلق واقعات اور نصیحتوں پر حاوی ہے۔

⑤ پانچویں فصل غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک کے تمام غزوات اور ان سے ملنے والی ہدایات پر موقوف ہے۔

⑥ چھٹی فصل میں فتح مکہ کے بعد جزیرۂ عرب اور دیگر ممالک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور بعض غزوات کا ذکر ہے۔

⑦ ساتویں فصل فتح مکہ کے بعد سے آپ ﷺ کی وفات تک کے احوال اور ان سے ماخوذ نتائج پر مبنی ہے۔

⑧ آٹھویں فصل میں مدینہ کے اندر قائم شدہ اسلامی حکومت کی خصوصیات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

⑨ نویں فصل آپ ﷺ کے مکارم اخلاق، مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کی افتراء پردازیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

⑩ دسویں فصل میں آپ ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے پیغام کے عالمگیر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔(1)

مقدمہ

مقدمے میں فاضل مصنف نے سیرت نبوی ﷺ کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی انبیاء و رسل یا دیگر جلیل القدر ہستیوں کے حالات زندگی کے متعلق جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں، ان کی صداقت و ثقاہت میں کسی نہ کسی پہلو سے شک و شبہے کی گنجائش نظر آتی ہے، لیکن نبی اکرم ﷺ کی سیرت وہ واحد ایسی سیرت ہے جو صداقت و ثقاہت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر بھی پوری اُترتی ہے، موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کے لیے توریت پر اور نہ عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کے سلسلے میں انجیل پر ہی اعتماد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں ہی محرف ہیں۔

آپ ﷺ کی سیرت پاک کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی ولادت سے لے کر

(1) السیرۃ النبویۃ دروس و عبر ص۱۱

بعثت اور پھر وفات تک کے پیش آنے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات اور حالات کی تفصیل ہمارے سامنے ہے۔

تیسری اہم خصوصیت آپ ﷺ کی سیرت کی جامعیت اور ہمہ گیریت ہے، آپؐ کی سیرت پاک میں ایک داعی، ایک قائد، ایک سیاست داں، ایک تاجر، ایک حاکم، ایک دوست، پڑوسی، بھائی، شوہر غرضیکہ ہر فرد کے لیے اسوہ موجود ہے۔

آپ ﷺ کی سیرت کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپؐ نے خوارق و معجزات کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالصتاً فطری انداز پر عوام کی عقل وفکر کو مخاطب کر کے دعوت اسلامی کو پیش کیا ہے، حسی معجزات دیکھنے والوں کے لیے تو حجت بن سکتے ہیں لیکن جن لوگوں نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا وہ محض عقلی و فطری دلائل کی بدولت ہی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن کریم آپ ﷺ کی رسالت کی صداقت کا سب سے بڑا عقلی معجزہ ہے جو ہر انصاف پسند اور صاحب عقل فرد کو محمد ﷺ کی صداقت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جب کہ عیسائیت کی بنیاد خوارق و معجزات پر ہے وہاں عقلی دلائل یا ذہنی اطمینان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر سباعی نے سیرت نبوی ﷺ کے بعض مستند بنیادی مآخذ کا جائزہ لیا ہے، سب سے پہلے انھوں نے ایسی قرآنی آیات کا ذکر کیا ہے جو سیرت رسول ﷺ کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔

دوسرا بڑا مآخذ احادیث کی صحیح کتب (بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) کو قرار دیا ہے، اسی طرح جاہلی دور کے اشعار سے بھی آپ ﷺ کے دور کے ماحول اور حالات کو سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے، اس کے بعد انھوں نے سیرت کے موضوع پر لکھی گئی بعض قدیم بنیادی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

پہلی فصل

اس تمہیدی بحث کے بعد فاضل مصنف نے اس فصل میں نبوت سے قبل آپ ﷺ کی مکی زندگی کے مستند تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے عبرت و موعظت کے ایسے نکات کو ترتیب وار بیان کیا ہے جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے فکری اور روحانی غذا فراہم کرتے ہیں، ڈاکٹر سباعی نے اس دور کے واقعات سے حسب ذیل ہدایات اخذ کیے ہیں:

(۱) دروس و عبر ۱۳۔۲۹۔

① داعی کے لیے حسب ونسب کے اعتبار سے برتر ہونا دعوت کے حق میں مفید ہے کیونکہ عوام خاندانی اعتبار سے کمتر درجے کے داعیان دین یا مصلحین کی باتوں کا اثر قبول نہیں کرتے ، یہی وجہ ہے کہ ہرقل نے جب ابوسفیان سے آپ ﷺ کے بارے میں یہ سوال کیا کہ تمھارے درمیان آپؐ کا حسب ونسب کیسا ہے؟ تو ابوسفیان (جو اس وقت اپنے شرک پر قائم تھے) نے جواب دیا کہ ''وہ ہمارے درمیان بلند و پاکیزہ نسب کے حامل ہیں۔'' ہرقل نے آخر میں یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نبی کا انتخاب قوم کے معزز لوگوں میں سے ہی کرتا ہے۔

اسی طرح صحیح حدیث ہے کہ ''تم میں سے جو دور جاہلیت میں اچھے تھے، وہ دور اسلام میں بھی بہتر ہوں گے، بشرطیکہ ان کے اندر سوجھ بوجھ ہو۔''

② ہر داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق وانسانی قدروں کا حامل ہو اور اس کی بہترین شکل یہ ہو سکتی ہے کہ داعی اپنی زندگی میں خود ان آلام ومصائب کو جھیلے جس سے یتیموں، مسکینوں اور دیگر پریشان حال اور مجبور لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کے بعد اس کا دل انسانی قدروں کے تئیں حد درجہ حساس ہو جاتا ہے، اس کا درس رسول اکرم ﷺ کی مکی زندگی کے حالات سے ملتا ہے۔

③ دعوت دین کے لیے فطری ماحول، سادہ زندگی اور محنت ومشقت کو برداشت کرنے کی طاقت ہونا نہایت ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے لیے عربوں کو منتخب کیا، کیونکہ ان کے اندر دیگر قوموں کے مقابلے میں فطری سادگی، جفاکشی اور دعوت کے راستے میں آنے والے شدائد ومشکلات کو برداشت کرنے کی طاقت زیادہ تھی اور رسول اکرم ﷺ اپنی حدیث مبارک کے مطابق اپنے معاصروں سے دوگنی قوت برداشت رکھتے تھے۔

④ مکی زندگی کے واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دعوت دین کے کام کے لیے ذہانت، فراست، حکمت اور دانائی کی سخت ضرورت پڑتی ہے، کند ذہن اور فکری اضطراب کے شکار افراد کبھی کسی قوم کی قیادت نہیں کر سکتے۔

⑤ داعی دین کو سیرت نبوی ﷺ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ وہ اپنے لیے روزی کمانے کا کوئی شریفانہ ذریعہ معاش منتخب کرلے اور عوام کے صدقات وعطیات کو قبول کرنے سے پرہیز کرے کیونکہ عطیات قبول کرنے کے بعد انسان خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہے تو پھر وہ عوام الناس کے اندر شرافت وخودداری اور بلندی وخودی کی روح کیوں کر پھونک سکتا ہے۔

⑥ آپ ﷺ کی زندگی بتاتی ہے کہ داعی کا ماضی بے داغ اور جوانی پاکیزہ ہو کیونکہ بسا اوقات

دعوت وتحریک سے اعراض کی بہت بڑی وجہ داعی کے ماضی کا کردار بن جاتی ہے، اگر وہ کردار کے اعتبار سے بلند و پاک ہے تو وہ علانیہ مکارم اخلاق کی دعوت دے سکے گا۔

⑦ عوام سے ربط و ضبط، اپنے رفقاء کے حالات و مشکلات سے واقفیت اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں دلچسپی لینے سے بھی دعوت کی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اصلاح و دعوت کے کام کے لیے عوام کے درمیان رہنا، ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ضروری ہے۔

⑧ داعی کے لیے خلوت کے چند لمحات بھی ضروری ہیں تاکہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ اور تزکیہ کر سکے، اسی لیے تہجد اور قیام لیل نبی ﷺ کے حق میں تو فرض تھا اور دوسروں کے لیے مستحب ہے اور اس کی سب سے زیادہ ضرورت داعیان دین کو پڑتی ہے، مشہور حدیث ہے کہ آپ ﷺ اس قدر عبادت فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے تھے۔ (۱)

دوسری فصل

دوسری فصل میں فاضل مصنف نے بعثت سے لے کر ہجرت حبشہ تک کے تاریخی واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کے بعد ایک داعی دین کے لیے ان سے نکلنے والے مواعظ کو اس طرح بیان کیا ہے:

① جب کبھی اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے معاشرے کی اصلاح اور دعوت دین کا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے دل میں معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ضلالت و گمراہی اور دیگر اخلاق سوز بیماریوں کے خلاف نفرت پیدا کر دیتا ہے۔

② اصلاح کی دعوت سے جب عوام کے دیرینہ مذہبی عقائد اور مانوس فکر و شعور پر براہ راست ضرب پڑ رہی ہو تو اس صورت میں داعی کو اس وقت تک خفیہ طور پر کام کرنا چاہیے جب تک کہ ایسی تعداد فراہم نہ ہو جائے جو ان اصولوں پر ایمان لانے کے بعد ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہو، جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنی خفیہ دعوت کے دوران کیا۔

③ دعوت کا راستہ مشکلات وخطرات سے پُر ہے، لہٰذا داعیانِ دین پر مادیت کے بجائے روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے، ان کی نظر دنیا کے بجائے آخرت پر ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس

---

(۱) دروس وعبر، ص:۳۰۔۳۶۔

راستے میں ثروت و دولت کے انبار اور جاہ و منصب کی بڑی سے بڑی پیش کش کو ٹھکرا کر ہر حال میں رضائے الٰہی کے حصول اور دعوت دین کو ترجیح دی۔

④ قائد تحریک کے لیے مناسب ہے کہ وہ روزانہ یا ہفتے میں ایک بار اپنے اعوان و انصار کو جمع کر کے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لے اور اسے زیادہ کارگر طریقے پر چلانے کی تدابیر پر غور کرے، یہ سبق ہم کو مکہ مکرمہ کی زندگی میں خاص کر دار ارقم اور خانہ کعبہ کی مجالس نبویؐ سے ملتا ہے۔

⑤ داعی اپنے اقرباء سے اپنے کام کا آغاز کرے، سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دے اور ان پر حجت تمام کرنے کے بعد ہی آگے بڑھے، جیسا کہ حکم الٰہی کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی علانیہ دعوت کا آغاز اپنے عزیز ترین رشتے داروں 'بنو عبد مناف' سے کیا۔

⑥ جب قائد یہ محسوس کرے کہ اس کی اور اس کے احباب کی زندگی خطرے میں ہے تو یہ اس کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے رفقاء کے لیے کوئی ایسا محفوظ مقام فراہم کرے جہاں وہ باطل کے مظالم سے بچ کر دعوت کے کام کو جاری رکھ سکیں، ہجرت حبشہ اس کی ایک مثال ہے۔

⑦ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا جہاں کا بادشاہ عیسائی تھا، اس سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں اور ملحدوں کے مقابلے میں آسمانی صحیفوں کو ماننے والوں سے دوستی کم نقصان دہ ہوتی ہے، حق و باطل کی کشمکش آسانی سے ختم نہیں ہوتی بلکہ آخر وقت تک جاری رہتی ہے۔(۱)

تیسری فصل

تیسری فصل میں فاضل مصنف نے ہجرت حبشہ کے بعد سے ہجرت مدینہ تک کے اہم تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے اور پھر ان سے ملنے والی نصیحتوں کو یوں بیان کیا ہے:

① دعوت جب ابتدائی مرحلے میں کمزور اور بے سہارا ہو تو داعی اپنے قبیلے کی عصبیت، جاہ اور رتبے سے دعوت کی حمایت اور حفاظت کا کام لے سکتا ہے، بشرطیکہ دعوت اس کے منفی اثرات سے محفوظ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت قریش سے معلوم ہوتا ہے، طائف کے سفر کے بعد بنو نوفل کی حمایت حاصل کرنے کا اسوۂ نبیؐ اسی حکمتِ عملی کا مظہر ہے۔

② اہل مکہ کی سرد مہری اور بے نیازی کے بعد آپ ﷺ طائف کا رخ کرتے ہیں، یہ اس امر کی

(۱) دروس و عبر ص ۴۳۔۵۳۔

دلیل ہے کہ داعی کو عوام کی عدم دلچسپی اور بے رغبتی سے آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی کوششوں کو جاری رکھنا چاہئے خواہ اس راہ میں کتنے ہی شدائد اور مظالم کا مقابلہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

③ واقعہ معراج کے پس پردہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے کہہ رہا ہے کہ اگر رسولؐ اپنے جسم و روح کے ساتھ معراج کا سفر طے کرسکتا ہے تو تمھیں بھی روزانہ پانچ وقت کی نمازوں میں روحانی معراج حاصل کرنی چاہیے، یہی بات آپ ﷺ کی متعدد احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

④ حضور ﷺ کا موسم حج میں دیگر قبائل کے لوگوں کو دعوت دینا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ داعی دین کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ہر اس مقام تک پہنچنا چاہیے جہاں لوگ جمع ہوں یا جمع ہونے کا امکان ہو، بسا اوقات اللہ تعالیٰ ایسی ہی جگہوں سے دعوت کو ایسے انصار و اعوان فراہم کر دیتا ہے جو اس دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کافی مفید ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ حج کے موقع پر مدینہ کے چھ انصار کا آپ ﷺ سے ملاقات کرنا مدینہ میں اشاعت اسلام اور پھر غلبہ اسلام کا سبب بنا۔ (۱)

چوتھی فصل

یہ فصل نبی ﷺ کی ہجرت اور مدینہ میں آپ ﷺ کے قیام کے درمیان رونما ہونے والے واقعات اور ان سے نکلنے والے عبرت و موعظت کے پہلوؤں پر مشتمل ہے:

① عزم و ہمت کا موقف ہمیشہ دشمنان اسلام کو مرعوب کرتا ہے، جیسا کہ ہجرت کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جس کی یہ خواہش ہو کہ اس کی ماں اسے کھو دے تو کل فلاں وادی میں مجھ سے ملے، ممکن تھا کہ اہل مکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں کامیاب ہو جاتے، لیکن حضرت عمرؓ کے پُر حوصلہ اور باہمت موقف نے دشمنوں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا، لہٰذا ایک داعی کے اندر خود اعتمادی، عزم و جرأت کا ہونا ضروری ہے۔

② جب باطل قوتیں دعوت حق کو دبانے میں ناکام ہو جاتی ہیں اور حق ان کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ آخری چارۂ کار کے طور پر قائد کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کرتے

---

(۱) دروس و عبر ص ۵۴۔ ۶۳

ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی تائید ونصرت سے اس آخری چال کو ناکام کر دیتا ہے، چنانچہ مشرکین مکہ غار ثور تک پہنچ کر بھی آپ ﷺ کو اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھنے سے قاصر رہے۔

③ مخلص داعی وقت آنے پر قائد کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے کیونکہ قائد کی سلامتی تحریک کی سلامتی کے لیے ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ ہجرت کی راہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے بستر پر سونے کے لیے راضی ہو گئے۔

④ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کردار ظاہر کرتا ہے کہ دعوت کی کامیابی میں نوجوانوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے، انھی کی بدولت تحریکیں کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہیں، مومنین سابقین کی اکثریت نوجوان تھی، لہٰذا داعی کے لیے نوجوانوں کو اپنا اولین مخاطب بنانا زیادہ مفید ہے۔

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ہجرت کے موقع پر جو کارنامہ انجام دیا اس سے عورتوں کے درمیان دعوت دین کے کام کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، کوئی بھی اسلامی تحریک عورتوں کے اشتراک کے بغیر ادھوری رہے گی۔

⑥ رسول اکرم ﷺ نے غار ثور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر جو فرمایا کہ ''خوف مت کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' آپ ﷺ کا یہ قول خدا کی ذات پر حد درجہ اعتماد اور اس کی نصرت وتائید پر کامل یقین کی مثال ہے۔

⑦ ہجرت کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں مساجد کی بڑی اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے جہاں کہیں بھی راستے میں قیام کیا خاص کر وہاں سب سے پہلے مسجد تعمیر کی، یہ مسلمانوں کی روحانی اور اجتماعی تربیت کا اہم مرکز ہے۔

⑧ مہاجرین وانصار کے درمیان باہمی اخوت والفت اسلام کی اعلیٰ انسانی اقدار کا بہترین مظہر ہے، مخلص اور جاں نثار انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کا بوجھ اٹھایا، اپنی دولت، اپنی اراضی یہاں تک کہ اپنے گھروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، اجتماعی عدل کی ایسی مثال تاریخ انسانی پیش نہیں کر سکتی۔ (۱)

(۱) دروس و عبر ص۶۳۔۸۲۔

پانچویں فصل

اس فصل میں ڈاکٹر سباعی نے فتح مکہ تک کے تمام غزوات کے اسباب ومحرکات، نیز ان کی تاریخی تفصیلات سے بحث کی ہے، فاضل مصنف نے غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ بنی نضیر، غزوۂ احزاب، غزوۂ بنی قریظہ، صلح حدیبیہ، غزوۂ خیبر، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک جیسے دور رسالت کے اہم معرکوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، ان غزوات سے ملنے والی ہدایات اور نصیحتوں کا ذکر کرنے سے قبل، اسلام میں جنگ کے تصور اور اس کے جواز کی شکلوں پر جامع بحث کی ہے:

① غزوۂ بدر کفر واسلام کے مابین پہلی جنگ تھی، اس کا مقصد مال چھیننا یا ڈاکہ ڈالنا نہیں بلکہ اس کا مقصد ومحرک قریش سے انتقام لینا تھا کیونکہ ہجرت کے وقت انھوں نے مہاجرین کے اسباب و اموال پر قبضہ کرلیا تھا۔

② اسلامی معرکوں میں فوجوں کی شرکت یا اسلحوں کی فراوانی کی اتنی خاص اہمیت نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے بلکہ یہ جنگیں روحانی قوت، شوق شہادت، جنت کی رغبت اور رضائے الٰہی کے حصول کے جذبے کے تحت لڑی جانی چاہئیں، ہر معرکے میں مشرکین کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ رہی، لیکن فتح مسلمانوں کو ہی نصیب ہوئی، یہاں تک کہ احد وحنین کے معرکوں میں بھی آخرکار میدان مسلمانوں کے ہاتھ لگا، یہ دراصل نصرت الٰہی پر مسلمانوں کے بھروسے کی مثال ہے۔

③ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی حفاظت غیبی نصرت سے کرتا ہے، جیسا کہ جنگ بدر میں فرشتے بھیجے گئے، جنگ احزاب میں سخت آندھی چلادی، اس سے معلوم ہوا کہ جب کبھی مسلمان اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کی خاطر جہاد کریں گے وہ ان کو یکہ وتنہا نہیں چھوڑے گا، یہ وعدۂ الٰہی ہے جو سیرت نبویؐ سے ثابت ہے۔

④ دوران جنگ کمانڈر کی نافرمانی نقصان کا پیش خیمہ ہوتی ہے، جیسا کہ جنگ احد میں ہوا، اگر وہ تیرانداز آخری وقت تک ثابت قدم رہتے تو مشرکین کو پلٹ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

⑤ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کا زخموں سے چور ہونا اس امر کا اعلان ہے کہ دعوت دین کا راستہ سنگ ریزوں اور پرخار وادیوں سے ہوکر گزرتا ہے جہاں داعی کو قید وبند، دار ورسن اور شہادت تک سے سابقہ پیش آتا ہے۔

⑥ جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ تبدیل کرنے کی بابت حباب ابن منذر کا مشورہ قبول

کیا، اسی طرح جنگ خیبر میں آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کے مشوروں کو اہمیت دی، اس سے معلوم ہوا کہ شوریٰ اسلام کا اہم اصول ہے۔

⑦ فوج کے سپاہیوں اور تحریک کے کارکنوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے قائد سے کسی ایسے معاملہ میں اختلاف نہ کریں جس کے بارے میں وہ قطعی فیصلہ کر چکا ہو، جیسا کہ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ نے صلح کی شرطیں طے کرلیں حالانکہ صحابہؓ کو بعض شقیں ناگوار گزاری تھیں، لیکن بعد میں واضح ہو گیا کہ یہ دعوت کے حق میں تھیں۔

⑧ غزوۂ احزاب میں حضور اکرم ﷺ نے عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذریعے دشمنوں کی صفوں میں پھوٹ ڈلوادی، اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی اور کم خون ریزی کے امکانات ہوں تو اس طرح کی جنگی چالیں جائز ہیں۔

⑨ دوسری قوموں کے مفید تجربات سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب آپ ﷺ نے خطوط کے ذریعے امراء و سلاطین کو دعوت دینا چاہی تو کہا گیا کہ بادشاہ مہر بند خط ہی قبول کرتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فوراً اپنے لیے مہر بنانے کا حکم دیا، فتح مکہ کے بعد جب وفود کی آمد کا سلسلہ جاری ہوا تو آپ ﷺ سے کہا گیا کہ سرداران قبائل کی عادت ہے کہ وہ قیمتی کپڑوں میں وفود کا استقبال کرتے ہیں، چنانچہ روایتوں میں ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان وفود کے استقبال کی غرض سے چار سو (۴۰۰) درہم کی ایک چادر خریدی، لہٰذا تحریک کے افراد ہر دور میں دیگر قوموں کی اچھائیوں کو اختیار کر سکتے ہیں۔

⑩ ان غزوات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہودیوں پر کسی صورت میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ان لوگوں نے ہر موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ مکر و فریب کا رویہ اختیار کیا۔

⑪ اکیس (۲۱) سال کی مسلسل مخالفتوں اور مزاحمتوں کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح مکہ سے نوازا تو آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کی تمام آزادیوں کو برقرار رکھا اور ان کے ساتھ بھائی کا سلوک کیا، اس طرح کی مثال نہ صرف یہ کہ پوری تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی، بلکہ دل میں گھر کر جانے والی یہ حکمت عملی ہی تھی جس نے دعوت اسلام اور رسول اکرم ﷺ کو سرخرو اور کامیاب بنایا۔ (۱)

---

(۱) دروس و عبر ص ۸۳-۱۳۶

چھٹی فصل

اس فصل میں ڈاکٹر سباعی نے فتح مکہ کے بعد جزیرۂ عرب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک، حجۃ الوداع، لشکر اسامہؓ کی تیاری اور پھر آپ ﷺ کی وفات جیسے سیرت کے اہم تاریخی واقعات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے:

① معرکۂ حنین کے آغاز میں اگر شکست ہوئی تو کوئی تعجب نہیں کیوں فوج کی صفوں میں کچھ ایسے مسلمان بھی شامل تھے جو ابھی ابھی اسلام لائے تھے اور وہ ایمان و یقین کی دولت سے پوری طرح سرشار نہیں تھے، لہٰذا دینی معرکوں کے لیے افراد کے اندر ایمان و یقین اور اخلاق و قربانی کے جذبے کا ہونا ناگزیر ہے۔

② آپ ﷺ نے جنگ حنین میں انتشار کے بعد اپنی صفوں کو متحد کیا اور ان کو جنگ پر آمادہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ مشکلات و مصائب میں قائد اگر ثابت قدمی دکھائے، جرات و ہمت کا ثبوت دے تو ہاری ہوئی بازی بھی جیتی جا سکتی ہے۔

③ آپ ﷺ نے دوران جنگ کسی بچے، عورت، مزدور یا مجبور کو قتل کرنے سے سختی سے منع کیا، جنگوں کی تاریخ میں اسلام کا یہ منفرد کارنامہ ہے، اسلام سے قبل اور اس کے بعد آج تک اتنا عادلانہ اور انسانیت نواز قانون نظر نہیں آیا، بیشتر اقوام کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ دوران جنگ دشمن کے تمام افراد بلا استثناء قتل کیے جا سکتے ہیں۔

④ فتح مکہ کے چند روز بعد ہی پورے جزیرۂ عرب کے تمام مشہور بت لات، منات، عزیٰ وغیرہ اوندھے منہ گرا دیے گئے اور خانہ کعبہ سے تمام شبیہوں کو کھرچ پھینکا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام شرک و بت پرستی کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا اور توحید کے معاملے میں کسی سمجھوتے کو قبول نہیں کر سکتا۔

⑤ غزوۂ تبوک سے معلوم ہوا کہ مصائب اور سختیوں کے وقت منافق اور مخلص چھٹ جاتے تھے اور آزمائش کے وقت منافقوں کا پول کھل جاتا ہے، کوئی بھی تحریک اس وقت آگے بڑھتی ہے جب منافقوں سے اس کی صفیں پاک ہو جائیں، بعض اوقات مذبذب یقین والے افراد بھی دعوت کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں۔

⑥ آپ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایسے لشکر کا کمانڈر بنایا جس

کے پرچم تلے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ موجود تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک جاہ ورتبہ، سن وسال کے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور صالحیت وصلاحیت ہی اصل معیار قرار پاتی ہے۔ (۱)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سباعی نے دور جدید میں سیرت نگاری کے فن کو ایک نیا رخ دینے اور اس موضوع پر لکھنے والے مصنفین کو ایک نئی جہت دکھانے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود اپنے موضوع پر نہایت اہم اور مفید علمی وتحقیقی کاوش ہے، بالخصوص دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱) دروس وعبر، ص: ۱۳۷۔۱۸۹۔

اردو میں سیرت کے چار جواہر پارے

ڈاکٹر عزیز الرحمٰن جونپوری، استاذ جامعہ رحمانیہ، بنارس

اردو زبان میں سیرت نبویؐ کی تالیف اور اشاعت وترویج کا کام بہت محنت، جانفشانی اور توجہ کے ساتھ ہوا ہے، اس مبارک ومسعود کام کی ابتداء جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل ہو چکی تھی، لیکن باقاعدہ اور منظم سیرت نگاری کا کام مختلف محرکات کے تحت جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا اور اس کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے، بہرحال جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، مختلف اسالیب میں مختلف نواحیٔ سیرت پر برابر مساعی مشکور وجود میں آتی جارہی ہیں۔

جس طرح اردو کی کچھ اصناف کسی نہ کسی تحریک کی رہین منت رہی ہیں اسی طرح باقاعدہ سیرت نگاری کے لیے بھی ایک تحریک وجود میں آئی تھی، جو اہل علم کے حلقے میں تحریک سیرت کے نام سے معروف ہے، جس کے بانی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمہ اللہ تھے، انھوں نے ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۲ھ میں پھلواری میں جو عہد قدیم سے علمی گہوارہ چلا آ رہا تھا، اس تحریک کی بنیاد رکھی، برصغیر میں سیرت کا ذوق پیدا کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی، اس سے قدیم کسی اور محفل سیرت کا پتہ نہیں چلتا، پھلواری کی تحریک سیرت کا چرچا ملک کے طول وعرض میں پھیل گیا اور یہ تحریک سیرت کی مختلف کمیٹیوں اور باقاعدہ تصانیف کی محرک ہوئی۔

یوں تو ۱۸۸۵ء سے لے کر اب تک اس تحریک کی روح مسلسل اپنا کام کر رہی ہے اور ارباب علم ونظر اس جانب متوجہ ہیں، لیکن اس سلسلے میں تین سلیمان (سلامۂ ثلاثہ) خصوصیت سے قابل ذکر

ہیں جنھوں نے سیرت کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہیں، وہ یہ ہیں:

① مولانا شاہ سلیمان رحمہ اللہ پھلواروی متوفی ۱۹۳۴ء

② قاضی محمد سلیمان سلمان رحمہ اللہ منصور پوری متوفی ۱۹۳۰ء

③ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ متوفی ۱۹۵۴ء

یہاں پر میرا مقصد خاص طور پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب "رحمۃ للعالمین" کا ایک جائزہ پیش کرنا ہے، لیکن تسلسل کے طور پر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور ان کی تحریک سیرت کا ایک مختصر ترین تعارف بھی بے محل نہ ہوگا۔

سلیمان بن داؤد بن وعظ اللہ پھلواروی ۱۰/محرم ۱۲۷۶ھ میں پھلواری میں پیدا ہوئے، کچھ دنوں تک اپنے شہر کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر علامہ عبدالحئیؒ لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اس کے بعد دہلی جا کر سید نذیر حسین محدث دہلویؒ سے علم حدیث حاصل کیا، الغرض علوم عقلیہ اور نقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد حج اور زیارت کے ارادے سے حجاز مقدس کا سفر کیا اور وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

علامہ پھلواروی ایک بے مثال مقرر اور واعظ تھے، سیرت کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ان کی تحقیق وجستجو اور بیانات کو ان کے لڑکے حسن میاں پھلواروی نے اکٹھا کر کے سیرت کے نام پر مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔(۱)

مولانا سلیمان پھلواروی کے بیان سیرت کی خصوصیات یہ ہیں:(۲)

① رسول اللہ ﷺ کی زندگی، نبوت، نزول وحی، تبلیغ، غزوات اور سیرت کے دوسرے اہم واقعات کا زبانی بیان تسلسل اور تفصیل کے ساتھ ہوتا تھا۔

② تمام انساب، اسماء، مقامات، جغرافیے اور سنین کی پوری تعیین ہوتی تھی۔

③ تاریخی روایات کے محض حوالوں پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ جابجا ان پر قرآن سے، عقل و درایت سے، رجال سے، اصول جرح و تعدیل سے اور معیار سیرت کے نقطۂ نظر سے تبصرہ و تنقید بھی کی جاتی تھی۔

④ جہاں سیرت کی تفصیل پیش کی جاتی تھی وہیں قدم قدم پر اپنی سیرتوں کو سیرت طیبہ کے آئینے میں دیکھ کر سنبھالنے اور سنوارنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

(۱) ماخوذ نزہۃ الخواطر، ج:۸۔

(۲) ماخوذ پیغمبر انسانیت، از جعفر شاہ پھلواروی

⑤ بیان محض علمی تحقیق اور خشک لیکچر پر مبنی نہیں ہوتا تھا، بلکہ محققانہ اور متکلمانہ انداز کے ساتھ شیفتگی، سوز و گداز اور برمحل اشعار وغیرہ سے روحانی تاثیر کا ایک مرقع بن جاتا تھا۔

سیرت نبویؐ کی خدمات کے سلسلے میں جو نام بے حد اہمیت کا حامل ہے وہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ کا ہے، ریاست پٹیالہ کے ایک غیر معروف گاؤں منصور پور سے علمی دنیا کا کوئی فرد بھی واقف نہ ہوتا، اگر اس دور افتادہ سرزمین کی گود میں قاضی محمد سلیمان جیسے مؤرخ نے جنم نہ لیا ہوتا۔

متناسب الاعضاء، بلند و بالا قد، گورا رنگ، نورانی داڑھی جو دور آخر میں سفید ہو کر اور بھی خوب صورت ہو گئی تھی، یہ تھا پیکر علم و فضل جس نے یوں تو متعدد دینی موضوعات پر علم و دانش کے موتی لٹائے، لیکن حضور رسالت مآب ﷺ کی مفصل سوانح حیات ''رحمۃ للعالمین'' ان کا ایک بیش بہا علمی کارنامہ تھا، جس کی پہلی جلد ۱۹۱۲ء میں منظر عام پر آئی اور جسے اس دور کے علم و فضل کے ہر سنجیدہ طبقے میں بے انتہاء شرف قبولیت حاصل ہوا، سیرت رسولؐ پر بحیثیت سیرت ''رحمۃ للعالمین'' اردو زبان میں پہلی اور انتہائی جامع کتاب تھی۔

ہم یہاں ''رحمۃ للعالمین'' پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ موقع اور وقت ہی اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ مختصر طور پر اس کتاب کا تعارف پیش خدمت ہے۔

تین جلدوں پر مشتمل سیرت کی یہ لاجواب تصنیف جس نے مصنف کو حیات جاوید بخشی ایک ایسی کتاب ہے، جس کو سیرت نبویؐ کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، اس کے ہر صفحے پر محبت و عقیدت اور بہت حد تک صحت و استناد کے مظاہر مختلف انداز میں جس طرح باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں، ان کی نظیر اردو زبان میں شائع شدہ سیرت کی دوسری کتابوں میں کم ہی نظر آتی ہے۔

رحمۃ للعالمین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے برصغیر کا ہر پڑھا لکھا مسلمان بخوبی واقف ہے، اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کی رائے پیش کرنا بے محل نہ ہوگا، علامہ ندوی رحمۃ للعالمین، ج:۳ کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

> ''رحمۃ للعالمین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے ذوق کے مطابق سوانح و واقعات کے ساتھ غیر مذاہب کے اعتراضات کے جوابات اور دوسرے صحف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود و نصاریٰ کے دعاوی کا ابطال بھی اس میں جابجا ہے، مصنف مرحوم کو توراۃ وانجیل پر کمال عبور حاصل تھا اور عیسائیوں کے مناظرانہ پہلوؤں سے ان کو پوری واقفیت حاصل تھی، اس بنا پر ان کی یہ کتاب ان معلومات کا پورا خزانہ ہے''۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں کہ:

''مناظرانہ طریق تصنیف میں سنجیدگی اور متانت کا برقرار رکھنا سخت مشکل کام ہے، مگر جس طرح خود مصنف اس وصف میں ممتاز تھے اسی طرح ان کی یہ تصنیف بھی اس وصف میں امتیاز خاص رکھتی ہے، پوری کتاب مناظرہ اور احقاق حق کی رودادوں سے لبریز ہے، تاہم کہیں بھی تہذیب اور مذاق سلیم کو حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا۔'' ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء!

① رحمۃ للعالمین ...... جلد اول تا سوم

تین سو (۳۰۰) صفحات پر پھیلی ہوئی پہلی جلد ایک مقدمے اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے، مقدمے میں مصنف نے تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح سے اقوام عرب کا تذکرہ شروع کیا ہے کہ ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس طرح حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو شام اور عرب میں آباد کیا اور کس طرح ان دونوں بزرگوں کی اولاد ان ممالک میں آباد ہوئی اور پھیلی اور ان کے درمیان جسمانی بُعد کو بعد کے انبیاء علیہم السلام کی روحانی تعلیمات کے ذریعے قریب تر لایا جاتا رہا۔

اس کے بعد مختصر طور پر عرب کا حدود اربعہ بیان کرنے کے بعد یہ بتایا کہ اس ملک کی خود مختاری نے اس کو کس طرح مطلق العنان بنادیا تھا، یہاں کوئی قانون تھا تو صرف وحشت و بربریت کا، مذہب تھا تو بت پرستی اور اوہام پرستی کا، شجاعت تھی تو ظلم و بربریت کے بل بوتے پر، فصاحت و بلاغت تھی تو خود ستائی اور دوسروں کی تحقیر اور فحش کارناموں کی تشہیر کے سلسلے میں، غرض کہ عرب قوم مکمل طور پر قابل رحم تھی اور جب خدائے غفور الرحیم نے دنیا کی اصلاح کا ارادہ فرمایا تو اس کا نقطہء آغاز عرب اور خصوصاً مکہ کو متعین فرمایا، اس کے بعد چند مثالیں دے کر یہ بتایا کہ حضرت محمد ﷺ نے انتہائی پستی کی حدود تک گرے ہوئے لوگوں کی کس طرح کایا پلٹ کی کہ وہ مس خام سے کندن نہیں بلکہ پارس بن گئے۔

پیدائش کے سلسلے میں داد تحقیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے نبی ﷺ موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول ۱؍عام الفیل مطابق ۲۲؍ اپریل ۵۷۱ھ مطابق یکم جیٹھ ۶۲۸ بکری کو مکہ معظمہ میں بعد از صبح صادق و قبل از طلوع نیر عالم تاب پیدا ہوئے، حضورؐ اپنے والدین کے اکلوتے بچے تھے۔''

اور اس وقت تحقیق کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں جب حاشیے میں یہ لکھتے ہیں:

''یوم ولادت باسعادت کو مکہ معظمہ میں صبح صادق کا طلوع ۴ بج کر ۲۰ منٹ (دھوپ گھڑی

کے گھنٹوں کے حساب سے) یا ۹ بج کر ۵۷ منٹ (حساب مروجہ سال عرب سے) ہوا تھا اور آفتاب اس وقت برج حمل سے ۳۱ درجہ ۲۰ دقیقے پر تھا اور تاریخ یکم جیٹھ کے شروع ہونے پر ۱۳ گھنٹے ۱۶ منٹ گزر چکے تھے۔"

باب اول: اس مبسوط مقدمے کے بعد مصنف نے حضرت محمد ﷺ کی مدنی زندگی کے آغاز کو نئے باب سے شروع کیا ہے، یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اس کتاب کا نام رحمۃ للعالمین ہے اور مصنف نے سیرت نبویؐ کے انھی پہلوؤں کو اس کتاب میں جگہ دی ہے جو عالم کے لیے رحمت ثابت ہوئے ہیں، یعنی مدینہ پہنچنے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال استحکام امن کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدہ کیا ہے۔

چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ نے مدینہ پہنچ کر ہجرت کے پہلے ہی سال یہ مناسب خیال فرمایا کہ جملہ اقوام سے ایک معاہدہ بین الاقوامی اصول پر کرلیا جائے تاکہ نسل اور مذہب کے اختلاف میں بھی قومیت کی وحدت قائم رہے اور سب کو تمدن وتہذیب میں ایک دوسرے سے مدد و اعانت ملتی رہے۔"

مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی متعدد لڑائیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، فتح مکہ کے اسباب اور اس پر غلبے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے، اس باب میں تین فصلیں قائم کرکے پہلی فصل میں کفار عرب کی مہمات، دوسری فصل میں عیسائیوں سے جنگوں کا ایک جامع تعارف پیش کیا ہے، اس باب کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کا اسیران جنگ کے ساتھ سلوک اور آپؐ کے اس رویے کی تائید عقلی اور نقلی دلائل سے کی ہے، اور یہ بات پوری طرح ثابت کی ہے کہ آپؐ کا وجود عالم کے لیے رحمت ہی رحمت تھا۔

باب دوم: اس باب میں مصنف نے آپؐ کے دعوتی مشن کی نشان دہی کی ہے جس کے تحت آپؐ نے اپنی تبلیغ کا دائرہ کار عرب سے باہر پھیلایا، اس باب میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی ان خصوصیات کی نشان دہی کی جو دیگر انبیاء کی نبوت و رسالت میں نہیں پائی جاتیں، ان میں نمایاں تر خصوصیت یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اسلام کو کل دنیا کا مذہب واحد کہہ کر پیش کیا ہے، اس سلسلے میں اپنی بات کے استشہاد کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات کو پیش کیا ہے۔

باب سوم: اس باب میں رسول اللہ ﷺ کے دعوتی پروگرام کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس میں عرب کے متعدد قبائل کے وفود آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام کی تعلیمات کو خوب جانچ

پرکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور اپنے قبائل کے لیے نشان راہ بن کر واپس جاتے تھے۔ مصنف نے وفود کے سلسلے میں ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو ان وفود کے سوال و جواب کی وجہ سے منظر عام پر آئے، مثلاً حرمت خمر، حرمت زنا، حرمت سود وغیرہ۔

باب چہارم: اس باب میں مصنف نے آنحضور ﷺ کی دس سالہ مدنی زندگی کے اہم واقعات اور وفات حسرت آیات کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً مسجد نبویؐ کی تعمیر، قصر کے سلسلے میں نماز کی کیفیت میں تبدیلی اور آخر میں مرض الموت اور اس کی مکمل کیفیت تشریح کے ساتھ بیان کر کے باب کو ختم کیا ہے۔

پانچواں باب: اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے اخلاق و عادات کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً سکوت وکلام، ہنسنا اور رونا، کھانا پینا، عبادت اور تیمار داری، بچوں پر شفقت، بوڑھوں پر عنایت، ارباب فضل کی قدر و منزلت، ادب و احترام، خاطر تواضع، شفقت وحمیت، عدل و انصاف، جود و کرم، صبر و حلم، صدق و امانت، حقوق اللہ اور حقوق العباد غرض کہ اخلاق کے تمام گوشوں کو پیش کیا ہے۔

۵۰۴ صفحات پر مشتمل ''رحمۃ للعالمین'' کا دوسرا حصہ دراصل حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ کا ایک ایسا منفرد خاکہ ہے جس سے حیات طیبہ کے نئے نئے گوشے وا ہوتے ہیں، سیرت طیبہ کے وہ گوشے جو بالعموم سیرت نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں اس جلد میں بڑی خوبی، کاوش اور جانفشانی سے پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کا آغاز حضرت محمد ﷺ کے آباء و اجداد کے ذکر سے کیا ہے، آباء و اجداد کے بعد نبی ﷺ کی اولاد کی جانب توجہ کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اہل بیت نبوی کمالات محمدؐیہ کا کتنا دل پذیر اور مکمل عکس تھے اور حق تو یہ ہے کہ آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ملت اسلامیہ کی ناخدائی اہل بیت نبویؐ ہی کا کام ہے، اس کے بعد امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا تفصیلی تعارف پیش کیا، امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے سلسلے میں اہل مغرب اور مستشرقین نے جس معاندانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ کتنا بے بنیاد اور کس قدر بددیانتی کا مظہر ہے، اس کا صحیح اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے، نیز ہمیں اس بات کی بھی تعلیم ملتی ہے کہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے سلسلے میں ہمارے خیالات کس طرح کے ہونے چاہئیں۔

اگلا باب رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ایک ایسا رخ پیش کرتا ہے جو آپؐ کی شان رحمت اور آپؐ کے کمالات کا ایک بلند ترین معیار ہے اور وہ ہے میدان جنگ یعنی غزوات و سرایا کا باب، اس کے

مطالعہ سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ میدان جنگ جہاں آ کر کچھ دیر کے لیے انسان انسان نہیں رہ جاتا، لیکن جناب رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے سلسلے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس جگہ بھی انسانیت کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ایک اہم موضوع یعنی قرآن اور دیگر الہامی کتب کے واقعات کا تعارض و تصدیق پیش کیا ہے، اس کے بعد آپؐ کے کمالات، معجزات اور خصائص کا تذکرہ کیا ہے، آخر میں مصنف نے بتایا ہے کہ زندگی کا سرچشمہ آپؐ کی محبت ہے اور ایمان کی روشنی آپؐ کی محبت، غرض یہ کہ اگر کوئی قابل محبت شخصیت ہے تو وہ آپؐ کی ذات اقدس ہے، جس دل میں آپؐ کی محبت نہ ہو وہ دل دل نہیں بلکہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔

۴۸۷ صفحات پر مشتمل ''رحمۃ للعالمین'' کا یہ تیسرا حصہ دراصل آنحضور ﷺ، قرآن مجید اور اسلام کے ان خصائص اور خوبیوں کا ایک نادر مرقع ہے جس کی مثال اردو سیرت نگاری میں کم ہی ملتی ہے، یوں تو اس حصہ میں خصائص محمدی ﷺ اور خصائص اسلام کا بیان ہے، مگر درحقیقت ان امتیازات اور خصوصیات کا خاکہ ہے جن کی بنا پر آپؐ خاتم النبیین ہیں اور اسلام دین فطرت اور دین کامل ہے۔

رحمۃ للعالمینؐ کے اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم یہ کہنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ بلاشبہ یہ کتاب سیرت نگاری کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور بلاشبہ استناد کے درجے پر فائز ہے، اور سیرت کا کوئی بھی طالب علم اس کتاب سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

② سیرۃ النبی ﷺ

سیرت کے سلسلے میں زبان و علم کی دو گراں قدر خدمات یعنی شاہ سلیمان پھلواروی ؒ کی تقریریں اور قاضی سلیمان منصور پوری ؒ کی ''رحمۃ للعالمین'' کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کسی کمی کا احساس نہیں ہوگا اور ان پر کوئی اضافہ ممکن اور آسان نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی، زبان و قلم کی جولان گاہیں مسلسل دعوتِ جولانی دیتی رہتی ہیں، چنانچہ جس زمانے میں قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کی جلد اول منظر عام پر آئی اور جلد دوم کا مسودہ تکمیل کے مراحل سے گزر رہا تھا، اسی زمانے میں علامہ شبلی نعمانی ؒ ''سیرۃ النبی'' جلد اول کی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اپنے شاگردوں اور معاونین کے ساتھ اس اہم کارنامے کی انجام دہی

میں مصروف و مشغول تھے، اس اہم کارنامے کے بارے میں اظہار خیال کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''سیرۃ النبی'' کی تصنیف کے دواعی و محرکات پر انتہائی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔

سیرۃ النبیﷺ کی تصنیف کے محرکات

۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہندی مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش کا زمانہ تھا، سب سے بڑھ کر باعث تشویش بات یہ تھی کہ مغربی مفکرین اور مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر نہ صرف یہ کہ اعتراضات کر رہے تھے بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سوانح اقدس کو طرح طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کر رہے تھے۔ وہ زہر دے رہے تھے مگر تریاق کے نام پر، جسے پڑھ کر نوجوان طبقہ شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنستا جا رہا تھا، چونکہ سیرۃ النبیؐ پر اردو میں کوئی مستند اور جامع و مانع کتاب نہیں تھی اس لیے چار و ناچار تشنگان سیرت انھی مسخ شدہ کتابوں کی طرف رجوع کر رہے تھے، جو ولیم میور، مارگولیوتھ، ولہازن اور فان کریمر جیسے مستشرقین نے خاص طور پر ان کے لیے تیار کی تھیں۔

مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ ''سیرۃ النبی'' کو پانچ جلدوں میں لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک سیرت انسائیکلو پیڈیا دینا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اس کی ایک جلد مکمل اور دوسری جلد ناتمام چھوڑ کر راہی دار بقا ہوئے، إنا لله وإنا إليه راجعون۔

علامہ شبلی کی لازوال تصنیف سیرۃ النبیؐ جلد اول چھ سو سے زائد صفحات کی ایک جامع اور مانع سیرت کا مجموعہ ہے۔ اسے انھوں نے دو مقدمات اور چند ابواب میں تقسیم کیا ہے، کتاب کے شروع میں مقدمے سے پہلے ایک جملے اور ایک مصرعے کا ایک سرنامہ لکھا ہے، جو اپنے اختصار کے باوجود انتہائی مؤثر ہے، ہر سنجیدہ آدمی اسے پڑھ کر ایک خاص اثر قبول کرتا ہے، سرنامہ کے الفاظ یہ ہیں:

''ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے'':

(زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشہ کن (شبلی، شوال ۱۳۳۰ھ)

مقدمۂ اول: یہ مقدمہ ۱۰۳ صفحات پر مشتمل ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے، اس میں مصنف نے فن روایت اور فن سیرت پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے، جس میں علمی اور علم کلام کی حیثیت سے تالیف سیرت کی ضرورت واضح کرتے ہوئے سیرت اور حدیث کا فرق واضح کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ سیرت کی تالیف کب اور کیوں عمل میں آئی؟ اس سلسلے میں عربی کی اولین اساطین

سیرت کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے اور متقدمین اور متاخرین علمائے سیرت کی مختصر مگر جامع فہرست پیش کی ہے۔

آگے چل کر یورپین تصنیفات سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ علماء یورپ کی پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ابتدائی واقفیت کتنی محدود تھی اور اسی محدود واقفیت کو انھوں نے اپنے دجل وفریب اور اسلام دشمنی کی اساس بنا کر سیرت کے نام پر نوجوان طبقے کو توہمات اور تشکیک کے دلدل میں غرق کرنے کی کوششیں کیں، غرض یہ کہ یہ مقدمہ اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے سیرت کے محقق کے لیے نشان راہ متعین کرتا ہے۔

ہجرت کے باب میں مصنف نے اس کے ایک ایک جز کی تفصیل پیش کی ہے اور اس کے بعد واقعات کی ترتیب کے لیے ہجری سن کی ترتیب قائم کی ہے، مثلاً:

سن ۱ھ میں ہجرت کے عظیم واقعہ کے علاوہ اور دیگر کون کون سے واقعات وقوع پذیر ہوئے، سن ۲ھ میں مصنف نے دو اہم واقعات یعنی تحویل قبلہ اور غزوات کے سلسلے کا بیان کیا ہے، تحویل کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر گروہ، ہر قوم، ہر مذہب کے لیے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہوسکتی، اسلام نے یہ شعار قبلہ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے۔

دوسری جلد میں نبوت کے تیئیس (۲۳) سالہ دور میں سے آخری تین برسوں کی پر امن زندگی کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے جس میں اسلام کی پر امن زندگی، حکومت الٰہی کی تاسیس اور شریعت کی تکمیل سے متعلق بحث کی گئی ہے، اس سلسلے میں مصنف نے چند ابواب قائم کئے ہیں جن کا تعارف اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے:

جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے محرکات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ شکوک وشبہات کا شکار تھا جن کو دور کرنے میں سیرۃ النبیؐ کو واضح کامیابی ملی، بیسویں صدی کے اوائل میں سیرت نبویؐ پر یہ ایسی کتاب ہے جس نے مستشرقین کے اعتراضات کے تار و پود بکھیرنے کی کوشش کی۔

مولانا شبلی رحمہ اللہ قلم کے بادشاہ تھے، آپؒ کے قلم کا جادو پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے، سیرۃ النبیؐ کے مطالعہ سے ایک طرف اگر رسول مقبول ﷺ کے حالات زندگی سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسری طرف ادبی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے، علامہ شبلی وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے تاریخ سیرت نگاری

کی ایک ایسی فہرست مرتب کر دی جو اگرچہ ناقص ہے لیکن سیرت کا طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا، درحقیقت یہ کتاب اردو سیرت نگاری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

③ اصح السیر فی ھدی خیر البشر

حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری ؒ سیرت نگاری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جسے جوابی سیرت نگاری کا دور کہا جا سکتا ہے، اس دور میں اسلام پر ہر چہار جانب سے جو حملے ہو رہے تھے ان حملوں کے دفاع کے سلسلے میں جن اکابرین نے بھرپور حصہ لیا ان میں اگر ایک طرف سر سید احمد خاں، مولانا چراغ علی، مرزا حیرت دہلوی وغیرہم نے مصالحتی انداز اختیار کیا تو شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور علامہ شبلی وغیرہم نے تحقیقی انداز میں ان کا جواب دیا، یہ سلسلہ نامکمل رہ جاتا ہے اگر ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری کی کتاب ''اصح السیر فی ھدی خیر البشر'' کا ذکر نہ کیا جاتا، یہ کتاب مولانا کے نام کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہے، اس کے جائزے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا نے اس شاہ کار تصنیف میں جس جاں سوزی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس عبارت سے ہوتا ہے:

> ''یہ کتاب میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور میری محنت کا سب سے بڑا اندوختہ ہے اور خداوند عالم اگر قبول فرمائے تو میری نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس تصنیف میں کتنی مدت صرف ہوئی اس لیے کہ حدیث دوستی کے سوا دنیا میں میرا مشغلہ ہی کیا تھا؟ نہ جانے کتنی راتیں جاگی گئیں، کتنے دفتر چھانے گئے اور کتنے اوراق الٹے گئے۔''(۱)

مولانا سیرت نبویؐ کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کی نزاکتوں کا انھیں پورا احساس تھا، چنانچہ اس کے لکھتے وقت بہت محتاط انداز میں قلم اٹھایا ہے اور دوسروں کو بھی اس صنف میں قلم اٹھاتے وقت بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت کی تلقین کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''روایات کے الفاظ اور مفاہیم کے ادنیٰ تغیر سے مذاہب بن گئے ہیں، اس لیے ہر ہر سطر، ہر ہر لفظ اور ہر ہر روایت کو بڑی جانچ اور بڑی احتیاط سے لکھنے کی ضرورت ہے۔''(۲)

اس کتاب کا اصل اور مفید ترین حصہ ہجرت کے بعد مغازی کے بیان سے شروع ہوتا ہے، غزوات وسرایا کے بیان سے پہلے اسلام میں جہاد کے احکام اور اس کی ابتدا کے سلسلے میں ایک مختصر

---

(۱) اصح السیر، ص:۵

(۲) اصح السیر، ص:۵

سے تعارف اور قرآنی آیات سے استدلال کر کے یہ بتایا کہ جب ہجرت کے بعد کے حالات نسبتاً مسلمانوں کے حق میں ہوئے تو جہاد کس حیثیت سے مسلمانوں پر فرض ہوا، اس کے بعد غزوات و سرایا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہجرت کے بعد کا تقریباً کل زمانہ آپؐ کا مغازی و سرایا کی تہذیب میں صرف ہوا، اس واسطے یہ آپؐ کی سیرت کا بہت مہتم بالشان حصہ ہے۔''(۱)

غرض کہ مغازی و سرایا کے سلسلے میں چھوٹے بڑے جتنے غزوات و سرایا وقوع پذیر ہوئے ہیں ان کو بڑے مبسوط انداز میں بیان کرتے ہوئے ان سے فقہی مسائل کا استنباط اور تاریخ کا استخراج بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔

اس کے بعد کتاب الاموال کو موضوع بحث بناتے ہوئے اموال کی تقسیم وتحصیل زکوۃ، غنائم، فیئے، جزیہ، خراج اور عشر و ہدایا کی اقسام کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد نامہائے مبارک اور وفود کا تذکرہ کیا ہے، آخر میں آپؐ کی وفات کے بیان اور اس سلسلے کی تمام جزئیات کو نہایت تحقیقی انداز میں پیش کرتے ہوئے کتاب کو ختم کیا ہے۔

مولانا نے جہاں احتیاط اور حاضر دماغی کی تلقین کی ہے وہیں اپنی کاوشوں پر اظہار اطمینان بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

''جو ترتیب مغازی کی میں نے اس کتاب میں لکھی ہے غالباً وہ اصح ترین ترتیب ہے اور اہم مواضع اختلاف کے موقع پر میں نے اس کے وجوہ دلائل کی طرف اشارات بھی کر دیے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے اکثر تفصیلی مباحث سے احتراز کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اہل علم اس کتاب میں کتاب المغازی کو جامع مکمل اور بہترین ترتیب پر پائیں گے۔''

اس کتاب کے اندر سنین کی ترتیب کے بجائے مباحث کے تسلسل کو مدنظر رکھا گیا ہے، تاکہ موضوع مالہ وما علیہ کے ساتھ قاری کے سامنے آجائے، مثلاً اگر مغازی کو لیا ہے تو مغازی و سرایا کو بہ تمام وکمال بیان کیا ہے، کتاب الاموال شروع کو کیا ہے تو اس کی جملہ جزئیات کو یکجا کر دیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ہر بحث کے ضمن میں فقہی مسائل کا استنباط و استخراج ہر ممکن طریقے سے ہو جائے۔

غرض یہ کہ یہ کتاب مباحث اور فصول کی ترتیب اور تسلسل کی وجہ سے علماء اور طلبا کے لیے یکساں مفید اور معلومات کا ایک بہترین ذخیرہ ہے۔

---

(۱) اصح السیر ص ۱۱۲۔

④ رسول رحمت ﷺ

یہ کتاب مولانا آزاد کے افادات اور مقالات پر مشتمل ایک بیش بہا ذخیرہ ہے جسے مولانا غلام رسول مہر نے ترتیب و اضافہ مطالب وحواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

مولانا آزاد فضائل و مکارم اور علم وفہم کا ایک عجیب پیکر تھے: ۲۲رفروری ۱۹۵۸ء مولانا کی وفات بڑا ہی الم انگیز حادثہ تھی اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ ان کے بے شمار علمی اور دینی افادات بکھرے پڑے تھے جن کی فراہمی اور ترتیب جنگ آزادی کی گوں ناگوں مصروفیات اور ملی و سیاسی مشغولیات کی وجہ سے نہ ہوسکی، بلکہ اس تگاپوئے دمادم میں ان کے بیشتر علمی ذخیرے تلف ہو گئے۔

''الھلال'' اور''البلاغ'' میں سیرت طیبہ کے مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں بہت سے مقالے شائع ہوئے تھے، مولانا آزاد ربیع الاول کے موقع پر ضرور ایک یا دو مقالے سیرت کے موضوع پر تحریر فرماتے تھے، اس کے علاوہ لوگوں کے استفسارات اور سوالات کے جواب میں تشفی بخش طریقے سے مضامین سپرد قلم کیا کرتے تھے، آپ نے انبیاء کرام کی سیرتوں کے متعلق بہت کچھ سپرد قلم کیا تھا۔

سیرت طیبہ کے موضوع پر مولانا کے افادات جب ترتیب وار رکھے گئے تو ان کے ذریعے ایک وقیع ذخیرہ وقوع پذیر ہوا جو اپنی مثال آپ تھا، مولانا غلام رسول مہر نے ان مقالات پر حواشی لکھے، تمہیدی عبارتیں تحریر کیں، جہاں جہاں بظاہر خلا محسوس ہوا مختصر تحریر کے ذریعے انھیں پر کیا اور آٹھ سو (۸۰۰) صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس پر ریویو لکھنا یا تنقیدی نظر ڈالنا کم از کم مجھ ناچیز کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، کیونکہ نقد وتبصرہ اور وہ بھی مولانا آزاد کی نگارشات پر، اس کی جسارت وہی کرسکتا ہے، جس کو اس موضوع پر درک حاصل ہو، نقد وتبصرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کتاب کے مضامین اور موضوعات کا ایک مختصر ترین تعارف پیش خدمت ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمے اور تقریباً بیس (۲۰) دیگر عناوین پر مشتمل ہے جس کے تحت ایک سو پانچ (۱۰۵) ابواب مختلف موضوعات سے متعلق شامل کیے گئے ہیں۔

مقدمے کے تحت سب سے پہلے سیرت نبویؐ کا مقام واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ علم و بصیرت کا سرچشمہ ہی سیرت نبویؐ ہے، آگے چل کر سیرت نبویؐ کی اہمیت اور اس کے مقام کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبویؐ معناً ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اس کی تشریح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل۔''

مقدمے کے بعد ظہور قدسی کے عنوان سے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے اور اس کے تحت آنحضور ﷺ کی تاریخ پیدائش کا ذکر کیا ہے اور ''رحمۃ للعالمین'' اور ''سیرۃ النبی'' کی تحقیقات کو سامنے رکھا ہے، تاریخ ولادت اور اس موقع پر عوام الناس اور اس دور کے علما کے درمیان جو موضوع روایات عام طور پر مشہور ہوگئی تھیں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس دور میں مجالس میلاد النبی ﷺ منعقد ہوتی تھیں اور اس ضمن میں جو بے سروپا اور موضوع روایات کثرت سے ذکر کی جاتی تھیں ان کے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں:

''مولود کی مجالس کا عجب حال ہے، مقصد مجالس کے لحاظ سے دیکھیے تو فقیر کے اعتقاد میں اس سے زیادہ اہم اور عظیم المنفعت اور قوم کے لیے ذریعۂ ارشاد و ہدایت اور کوئی اجتماع نہیں ہے، لیکن طریق انعقاد پر نظر ڈالیں تو اجتماعی اور مجلسی قوتوں کے ضائع کرنے کی بھی اس سے زیادہ اور کوئی افسوس ناک مثال نہیں ملے گی۔''(۱)

دعوت اسلام کے باب میں مولانا نے آنحضور ﷺ کی وسعت و ہمہ گیری کو متعدد نکات اور نواحی سے واضح کیا ہے اور اس سلسلے میں ''لا اکراہ فی الدین'' اور اوامر و نواہی، انسانی مساوات اور تمام انبیاء کرام کی وحدت دعوت کو بیان کیا ہے اور اس دعوت کی کامرانی کے اصول اور اس سلسلے میں درماندگی اور اس کا علاج قرآن کی روشنی میں پیش کیا ہے، نیز دعوت دین کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی شان رأفت و رحمت اور آپؐ کی صفات نذیر و بشیر کو بھی بیان کیا ہے۔

مدنی زندگی کا آغاز آنحضور ﷺ نے مسجد نبویؐ کی بنیاد اور تعمیر سے کیا تھا، چنانچہ مؤلف نے بھی اس باب کی ابتداء مسجد نبویؐ کے تعارف اور ازواج مطہراتؓ کے حجرات، صفہ اور اصحاب صفہ کے تذکرے کے ساتھ کی ہے، اس کے بعد نماز کی رکعات میں اضافہ اور تحویل کعبہ، فرضیت روزۂ رمضان کا تذکرہ کیا ہے۔

غزوات کے بیان کے سلسلے میں سب سے پہلے اذن قتال کے اسباب بیان کیے ہیں۔

غزوۂ بدر کے واقع ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف نے اسی موقف کو اپنایا ہے جو ان سے قبل مولانا عبدالرؤف داناپوری نے اپنایا ہے، یعنی قریش کے تجارتی قافلے پر حملے کو بجا اور حق بجانب قرار دیا ہے۔

(۱) مقدمہ، رسول رحمت ص ۲۳

جنگ احد کے جملہ عواقب اور نتائج بیان کرتے ہوئے اس کے چند افادی پہلوؤں کی طرف بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ یہ حادثہ بظاہر شکست پر منتج ہوا لیکن بباطن اپنے اندر چند در چند مصلحتیں اور حکمتیں رکھتا ہے، مثلاً اس حادثے نے کھرے اور کھوٹوں کو الگ کر دیا اور لوگوں کو جنگ کے نازک اور فیصلہ کن حالات کا ذاتی تجربہ ہو گیا جس کے بعد اہل ایمان کے قدم مزید محتاط ہو گئے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس ٹھوکر کے لگنے سے ان کا عزم و ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

غزوۂ خندق کے تفصیلی بیان کے ضمن میں یہود مدینہ کی تاریخ بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دی ہے۔

صلح حدیبیہ اور اس کے بعد مسلمانوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد آنحضور ﷺ کے عالمی دعوت اور تبلیغی پروگرام کو بالتفصیل بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک کے بیانات کے سلسلے میں اسلامی شریعت کے رموز و نکات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

آنحضور ﷺ کی وفات کے سلسلے میں ایام علالت اور اس دوران ان تمام احوال و کوائف کا مفصل بیان حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جو آپ ﷺ پر گزرتے رہے۔

اسوۂ محمدیؐ کے نام سے جو باب باندھا ہے اس میں آپ ﷺ کا حلیہ، لباس، غذا، گفتگو، معمولات شبانہ روز، عبادات اور دینی معمولات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، فضائل اخلاق کے سلسلے میں قرآن کی شہادت، خود آنحضور ﷺ کے ارشادات اور ان صحابہ وصحابیات اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بیانات کو بھی قلم بند کیا ہے جن کے بیانات کی روشنی میں ہم آنحضور ﷺ کے اخلاق وعادات کا ایک مرقع اپنے سامنے پاتے ہیں۔

آخر میں رحمۃ للعالمین کے عنوان سے کتاب کی اختتامی فصل تحریر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ نوع انسانی کے لیے خصوصاً اور سارے عالم کے لیے عموماً کیوں کر رحمت ہی رحمت ثابت ہوئے۔

آگے چل کر عہد نبویؐ کی جنگوں اور مہموں کی نوعیت، ان میں فریقین کے جانی نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نقشہ بھی مرتب کیا ہے اور بتایا ہے کہ کسی بھی زمانے میں کسی قوم میں جنگ کی صورت میں اتنے قلیل جانی نقصانات اور اتنے کثیر خیر و برکت کی مثال تو کیا اس کے عشر عشیر کا بھی تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

سب سے آخر میں قرآن کریم کے چند انقلاب انگیز اصول بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ

عالمی اصلاح و امن کی وہ محکم بنیادیں جو قرآن نے ڈال دی ہیں اگر ان پر صحیح معنوں میں انسانیت عمل پیرا ہو جائے تو آج بھی دنیا گہوارۂ جنت بن سکتی ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين!

سرسیّد کی سیرت نگاری

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، أما بعد!

رسول اکرم ﷺ کی سیرت وسوانح پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، یقیناً یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آپؐ پر جس قدر لکھا گیا ہے وہ دنیا کی کسی اور شخصیت کے حصے میں نہیں آیا، مسلمانوں نے اس ضمن میں جس قدر کاوش کی وہ اتنی تعجب خیز نہیں، کیونکہ ان کے ایمان و یقین اور عقیدت و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں جس قدر بھی کوشش کریں کم ہی ہے، آپ ﷺ کی خصوصیت تو یہ ہے کہ غیر مسلموں اور مستشرقین نے بھی آپؐ کی سیرت وسوانح پر اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے، حد یہ کہ پروفیسر مارگولیتھ جیسا متعصب مصنف بھی اپنی کتاب کے مقدمے میں اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے:

''پیغمبر محمد کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں شریک ہونا قابل فخر ہے۔''(۱)

پروفیسر موصوف نے ۱۹۰۵ء میں ہیروز آف دی نیشن کے سلسلے کی کتاب ''محمد'' تصنیف کی تھی، اس کتاب میں انھوں نے ہر واقعے کے متعلق سند بہم پہنچا کر اور اس کو بگاڑ کر دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہ کتاب سیرت کے موضوع پر چند انتہائی زہریلی کتابوں میں سے ایک ہے۔

(1) Mohammad: Prof.Margoliouth, (Introduction) "Heroes of the Nation Series" 1905 (London).

رسول عربی ﷺ اور دنیا کے دوسرے بانیان مذاہب اور رہبران ملت کے سوانح میں ایک بین فرق یہ ہے کہ آپؐ کے حالات زندگی از مہد تا لحد بڑی تفصیل سے اور تمام جزئیات کے ساتھ موجود ہیں، آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا کوئی اور واقعہ اور حادثہ تاریخ عالم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے، آپؐ نے تمام زندگی ایک ایسے بشر کی حیثیت سے گزاری ہے جس میں رنج وراحت، شادی وغم، سفرو حضر اور فتح وشکست سب کچھ جاری وساری رہا ہے اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ نے آپ کی جملہ حرکات وسکنات کو بجنسہ محفوظ رکھا ہے، یہاں تک کہ راویوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں بات کہتے وقت آپؐ کس قسم کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے، آپؐ کے چہرۂ مبارک کے تاثرات کیا تھے اور آپؐ نے دست مبارک سے کس طرح اشارہ فرمایا تھا۔

اسی لیے جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن'' مصنفہ ۱۸۷۰ء کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے وقائع عمری محمد ﷺ کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں۔''(۱)

آپؐ کی سیرت مبارکہ کا یہی وہ روشن پہلو ہے جس نے ہر سیرت نگار کو اپنی طرف متوجہ کیا، اسی لیے غیر مسلم مصنفین اور مستشرقین نے اپنے تمام تر تعصب اور مخالفت کے باوجود آپؐ کے سیرت نگاروں میں شامل ہونا باعث فخر سمجھا، چاہے انھوں نے اپنا مقصد اور مطمح نظر بڑی حد تک عیب جوئی اور نکتہ چینی ہی رکھا ہو۔

یہود ونصاریٰ نے اسلام کی بیخ کنی میں کبھی بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، میدان کارزار میں نبرد آزمائی کے ساتھ انھوں نے علمی وادبی میدانوں میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف لایعنی اعتراضات کرنے اور سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے مسلمانوں کی بعض معتبر اور بیشتر نامعتبر کتابوں کی عبارتوں کا انتخاب کرکے رسول اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ کو ہدف تنقید بنانا اپنا شعار بنالیا تھا۔

مسلم ممالک اور خصوصاً برصغیر میں آنے والے انگریز اور دیگر یورپی اقوام تاجر اور فاتح وکشورکشا ہی نہیں، عیسائیت کی پرجوش مبلغ بھی تھیں، اس کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرز کے چیرمین مسٹر مینگلس کی اس تقریر سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے ۱۸۵۷ء میں دارالعوام میں کی تھی:

''خدا نے انگلستان کو ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت اسی لیے سونپی ہے کہ ہندوستان کے

(۱) Appology for Mohammad and Quran, London, 1870.

ایک سرے سے دوسرے سرے تک حضرت عیسیٰ مسیح کی فتح کا علم لہرانے لگے، ہم میں سے ہر ایک کو اپنی پوری قوت اس کام میں لگا دینی چاہیے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام میں کسی وجہ سے ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پائے۔"(۱)

برصغیر میں عیسائیت کی تبلیغ یوں تو سولہویں صدی عیسوی ہی سے شروع ہو گئی تھی اور پادری مسیح کا پیغام لے کر اکبر کے دربار میں پہنچ گئے تھے لیکن مغلیہ حکومت کے عہد زوال میں جیسے جیسے انگریز کے قدم جمتے گئے اور ان کی حکومت و اقتدار کو استحکام ہوتا گیا، عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں بھی سرگرمی اور وسعت آتی گئی، شفاخانوں، بازاروں اور جیل خانوں غرض کہ ہر جگہ پادری تبلیغ عیسائیت میں مشغول تھے، عیسائی مشنریز نے انتہائی جارحانہ انداز اختیار کر لیا تھا، اسلام اور رسول عربی ﷺ کی ذات گرامی ان کے اعتراضات کا خصوصی ہدف ہوتے تھے، متعدد کتابیں، رسالے اور اشتہارات شائع کیے جاتے تھے جن میں انتہائی عامیانہ زبان استعمال کی جاتی تھی اور حقائق کو مسخ کر کے اعتراضات کی بوچھاڑ کی جاتی تھی، پادری شارع عام پر یا کسی بڑی مسجد کے پاس کھڑے ہو کر اسلام پر اعتراضات کرتے تھے، اس وجہ سے ہر طرف مناظروں اور بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہو گیا تھا۔

پادری اور مذہبی مبلغوں کے علاوہ حکومت کے عہدے دار بھی اس میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، ایسی ہی ایک بڑی کوشش اس وقت کے یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر ولیم میور نے چار ضخیم جلدوں میں "حیات محمد" لکھ کر کی، سیرت کے موضوع پر یہ بہت ہی مخالفانہ اور متعصبانہ کتاب ہے جس نے اس زمانے میں بڑی شہرت پائی اور یورپ میں یہ سمجھا گیا کہ ولیم میور نے یہ کتاب لکھ کر اسلام کے استیصال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسی لیے یہ کتاب نہ صرف اسلام سے یورپ کی مزید برگشتگی و غلط فہمی کا باعث بن رہی تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں بھی شکوک وشبہات پیدا کر رہی تھی۔

اس قسم کے تحریری وتقریری حملوں کا مسکت جواب دینے کے لیے علما کی ایک جماعت سینہ سپر ہوئی، سرسید ان میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں جنھوں نے اس کوچے میں بھی اپنے لیے الگ راہ بنائی۔

سرسید کی شخصیت کی طرح ان کے ذوق وشوق بھی عظیم اور ہمہ گیر تھے، وہ بیک وقت مورخ، ادیب، صحافی، سماجی مصلح، سیاسی رہنما، تعلیم وتربیت کے علمبردار اور ان کی ترویج و اشاعت کے داعی مذہبی مفکر و مصلح تھے، انھوں نے ان سبھی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

سرسید کی پرورش اور تعلیم وتربیت علمی و مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی، اسی لیے مذہبیت اور حب نبویؐ

(۱) 1857-First War of Independence" V.D. Savarkar, P.56

ان کی سرشت میں داخل ہوگئی تھی، وہ شروع سے ہی اس خیال کے علمبردار تھے کہ آپؐ کے ذکر جمیل کو تمام آلائشوں سے پاک اور صحیح روایات پر مبنی ہونا چاہیے، اسی مقصد کے لیے انھوں نے صرف چھبیس (۲۶) سال کی عمر میں یعنی ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں "جلاء القلوب بذکر المحبوب ﷺ" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں رسول عربی ﷺ کی ولادت باسعادت، معجزات و دیگر حالات اور وفات وغیرہ سے متعلق روایات معتبر ذرائع سے اخذ کر کے بیان کیں، اس کا بیشتر مواد شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی تصنیف "سرور المحزون" اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی "مدراج النبوۃ" سے ماخوذ ہے، اس رسالہ کی تصنیف کا مقصد روایات صحیحہ کی اشاعت قرار دیا گیا تھا، کم عمری میں اس قسم کی تصنیف ان کے عشق نبی اور عصمت نبی ﷺ کی حفاظت کے جذبے کی آئینہ دار ہے۔

سرسید ولیم میور کی مذکورہ کتاب سے قبل ہی ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کرتے تھے، جو اسلام کے متعلق عیسائیوں کے شکوک و شبہات دور کر سکے اور یورپین مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا خاتمہ کر سکے، ولیم میور کی اس کتاب کے بعد انھوں نے سیرت پر ایک جامع کتاب لکھنے کا عزم مصمم کر لیا، ان کے سفر انگلستان کی مختلف اغراض میں سے ایک غرض ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا اور اس کے دلائل وادعا کا رد کرنا بھی تھا۔

سرسید، ولیم میور کی کتاب کی اشاعت کے بعد بڑے مضطرب و بے چین تھے اور جلد سے جلد اس کا جواب لکھنا چاہتے تھے حالانکہ ان کے دوست احباب اور مخلصین انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ولیم میور اس وقت یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس جواب سے سرسید کو نقصان پہنچ سکتا ہے، سرسید اپنے مذہبی جوش اور حق پژوہی کے آگے بھلا اس خطرے کو کب خاطر میں لانے والے تھے، انھوں نے انگلستان سے جو خطوط محسن الملک کے نام ارسال کیے ہیں ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ولیم میور کی کتاب کے مندرجات سے کس حد تک بیزار تھے اور ان کا جواب دینے کو کس قدر ضروری اور اہم خیال کرتے تھے، وہ اپنے خط مورخہ ۲۰/ اگست ۱۸۶۹ء میں رقمطراز ہیں:

"ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے، ولیم میور صاحب نے کتاب آنحضرت ﷺ کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین

احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔"

مارا ہمیں تحفہ شہنشاہی بس است (۱)

سرسید کو اس کتاب کی اشاعت کے لیے زبردست مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کے اخراجات کا ذکر کرتے ہوئے وہ محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں۔" (۲)

روپیہ کی فراہمی کے لیے وہ محسن الملک سے کہتے ہیں:

"کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا، ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔" (۳)

اس موقع پر ان کے احباب نے بھی بھرپور مدد کی اور انھوں نے اپنے بے تکلف احباب سے مانگنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا، مددگار مخلصین کو اظہار تشکر کے طور پر لکھتے ہیں:

"اگر آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مر جانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔" (۴)

ادھر تو کتاب کی اشاعت کے اخراجات سرسید کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے اور یہاں ان کی اکلوتی صاحبزادی نے داغ مفارقت دیا، ان مصائب سے نبرد آزما ہونے پر انھوں نے محسن الملک کو لکھا تھا:

"کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی صدمہ میں صدمۂ غم انتقال ہمشیرہ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا، واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔" (۵)

حقیقت میں سرسید نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، مالی پریشانیاں اٹھائیں، صدمے سہے، اسباب البیت بیچا، بے تکلف دوستوں سے مدد مانگی یہاں تک کہ سود پر روپیہ قرض لینے سے بھی دریغ نہیں کیا، غرض کہ اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے نام کو سربلند کرنے کے لیے ہر طرح کی سعی اور جدوجہد کی کیونکہ بقول مولانا حالی:

---

(۱) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص۴۹، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء۔
(۲) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص۴۹، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء۔
(۳) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص۴۹، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء۔
(۴) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص۴۹، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء۔
(۵) خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص۴۹، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء۔

''سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے۔''(۱)

اس کی تائید خود سرسید کے ایک خط بنام محسن الملک سے بھی ہوتی ہے:

''اگر میری کتاب تیار ہوگئی، جس میں دس (۱۰) باب ہیں: تو میں لندن آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا، خدا قبول کرے۔''(۲)

اس کتاب کی تیاری میں سرسید نے کس قدر محنت شاقہ برداشت کی، اس کا حال بھی ان کے مختلف خطوط سے معلوم ہوتا ہے، وہ محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں:

''مواعظ احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔''(۳)

ایک دوسرے خط میں اپنی مصروفیت و محنت کا حال اس طرح پیش کیا ہے:

''میں روز تحریر کتاب سیر مصطفوی ''خطبات احمدیہ'' میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔''(۴)

ایک اور خط میں تحریر کرتے ہیں:

''اس کتاب کے پیچھے خواب وخور حرام ہوگیا ہے، خدا مدد کرے۔''(۵)

ایک خط میں اپنی پریشانی کا حال اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتہ سا ہوگیا ہے دن رات کی تکلیف سے، جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔''(۶)

لندن میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزم کی لائبریری میں اہم کتابوں کا انتخاب کرکے ان سے بھرپور استفادہ کیا اور مصر، فرانس اور جرمنی سے سیرت کے موضوع پر نادر و نایاب اور قیمتی کتب منگوائیں اور شب و روز کی محنت سے بارہ خطبے تیار کیے، ان کا انگریزی ترجمہ ایک لائق انگریز سے کراکے شائع کیا، ان خطبات کے ذریعے سرسید نے ولیم میور کے اعتراضات کا بدلائل

(۱) حیات جاوید، مولانا حالی، ص:۲۱۹، شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۹ء۔
(۲) خطوط سرسید، ص
(۳) خطوط سرسید، ص۵۹۔
(۴) خطوط سرسید، ص۵۴
(۵) خطوط سرسید، ص۵۴۔
(۶) خطوط سرسید، ص۵۴

جواب دینے اور اس کے دعووں کو باطل قرار دینے کی بھرپور کوشش کی ہے، یہ خطبات کافی طویل اور دقیق ہیں، خصوصاً ان کا اردو ایڈیشن زیادہ طویل اور وسیع ہے، ان خطبات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

پہلا خطبہ سب سے طویل ہے اور بقول مولانا حالی بجائے خود ایک کتاب ہے [۱] اس خطبے میں سرسید نے عرب کا مفصل تاریخی جغرافیہ پیش کیا ہے اور اسلام کے ان دیار و آثار کو توریت، انجیل اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے جن کا ولیم میور نے انکار کیا تھا۔

دوسرے خطبے میں انھوں نے ماقبل اسلام عربوں کی حالت، ان کے رسم و رواج، خیالات و عقائد اور معاشی و معاشرتی حالات کا نقشہ پیش کیا ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اسلام نے ان کی زندگی میں کیسا انقلاب برپا کیا۔

تیسرے خطبے میں قبل اسلام کے ان ادیان و مذاہب کا تذکرہ ہے جو عرب اور اس کے قرب و جوار میں رائج تھے، اس کے بعد ایک موازنہ پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام عرب کے دیگر الہامی مذاہب سے کس حد تک مماثلت رکھتا ہے اور کن امور میں اس نے اصلاحات کی ہیں۔

اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ اکثر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض ہے کہ اسلام کے اپنے اصول و نظریات کچھ بھی نہیں ہیں، یہ سابقہ مذاہب کے اصول و عقائد کی محض ترتیب جدید ہے، یہ اعتراض اس لیے بھی لایعنی ہے کہ خود اسلام نیا مذہب ہونے کا مدعی نہیں ہے، وہ خود کو دین فطرت قرار دیتا ہے جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے کی ہے، البتہ خاتم النبیین ﷺ کے ذریعے یہ کامل و اکمل صورت میں ظاہر ہوا ہے اور الہامی مذاہب کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

چوتھے خطبے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بنی نوع انسان کو اسلام سے کیا فوائد حاصل ہوئے اور خود یہودیت و عیسائیت نے اسلام سے کیا سیکھا، سرسید نے ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، ٹامس کارلائل اور خود ولیم میور کی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ عیسائیت نے اسلام سے بہت کچھ سیکھا ہے، انھوں نے اسلام کے فوائد و ثمرات کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور مختلف مثالوں سے اس کے فوائد و برکات پر روشنی ڈالی ہے۔

پانچویں خطبے میں کتب احادیث، سیر، تفاسیر اور فقہ کی تصانیف کا منشاء و مقصد اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

چھٹے خطبے میں اسلام کی روایت کے اسباب اور احادیث موضوع کے اختراع کی وجہ بیان کی گئی ہے۔

---

(۱) حیات جاوید، ص ۲۲۰

بقول مولانا حالی:

''یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اس نے آنکھیں بند نہ کرلی ہوں، ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔''(۱)

ساتویں خطبے میں قرآن کریم، اس کے نزول، اس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، مختلف قرأتوں اور آیات ناسخ ومنسوخ کی بحثیں ہیں اور ان غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جنھیں سمجھنے میں عیسائی مصنفوں اور مورخوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

ولیم میور نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آل اسماعیل کا حجاز اور خانہ کعبہ سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے آٹھویں خطبے میں خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخ وجغرافیائی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور یورپین وعیسائی مؤرخوں، محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ابراہیم واسماعیل علیہما السلام اور ان کی اولاد حجاز آئی، مکہ اور اس کے قرب وجوار میں بسی اور یہاں کے تمام آثار انھیں سے متعلق ہیں۔

نویں خطبے میں آنحضرت ﷺ کے حسب ونسب کی تحقیق ہے اور دلائل وبراہین سے آپ ﷺ کو آل اسماعیل ثابت کیا گیا ہے، کیونکہ ولیم میور آپ ﷺ کے آل اسماعیل ہونے کا منکر تھا۔

دسویں خطبے میں ان بشارتوں اور پیش گوئیوں کا بیان ہے جو توریت وانجیل میں آپؐ کے رسول برحق ہونے کے بارے میں مذکور ہیں۔

گیارھویں خطبے میں معراج اور شق صدر سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ سرسید نے اس سلسلے کی روایات واحادیث کا تضاد وتناقض دکھا کر معراج کو ایک خواب اور اس خواب میں شق صدر وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ظاہر ہے، یہاں سرسید جمہور سے بالکل مختلف راہ پر چلے ہیں۔

بارھویں اور آخری خطبے میں آنحضرت ﷺ کی ولادت مبارک سے بارہ برس تک کی عمر شریف کے حالات معتبر اور صحیح روایات کی بنیاد پر بیان کرنے اور اس سلسلے کے بیشار رطب ویابس سے پرہیز کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے، خصوصاً ان واقعات میں سے اکثر سے انکار کیا گیا ہے جن کو بنیاد بنا کر ولیم میور نے اعتراضات کیے ہیں۔

خطبات کا یہ خلاصہ بقول مولانا حالی کسی بڑے تالاب کے چلو، دو چلو پانی کے برابر ہے(۲)، ان

---

(۱) حیات جاوید، ص ۲۴۸۔

(۲) حیات جاوید، ص ۲۶۴۔

خطبات کے طویل علمی مباحث ونکات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور مصنف کی زبردست محنت، وسیع مطالعہ اور نکتہ سنجی کے آئینہ دار ہیں، اسی لیے مختلف علماء نے ''خطبات احمدیہ'' کی امتیازی شان اور اس کی اہمیت وافادیت پر اظہار خیال کیا ہے اور اسے بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

''سرسید کی تمام تصانیف میں سے ''خطبات احمدیہ'' کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کی تصنیف کی تحریک کا سرچشمہ ان کی عقیدت رسولؐ اور بے پناہ جذبہ محبت ہے، اس کتاب سے سرسید کی کوئی ذاتی یا سیاسی غرض وابستہ نہیں کی جاسکتی۔''(۱)

پروفیسر خلیق احمد نظامی کہتے ہیں:

''الخطبات الاحمدیہ'' سرولیم میور کے الزامات کی صرف تنقید یا جواب نہیں ہے، بلکہ یہ سید احمد کی ایک ایسی کوشش ہے، جس کے ذریعے انھوں نے انیسویں صدی کے میلانات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر عقلی دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کی ہے۔''(۲)

بقول حامد حسن قادری:

''سرسید کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین خدمت یہ تصنیف ہے۔''(۳)

پروفیسر نورالحسن نقوی کے خیال میں:

''خطبات احمدیہ سرسید کا نہایت وقیع اور قابل قدر کارنامہ ہے، ہر اعتراض کا مدلل جواب ہے اور متانت کے ساتھ''(۴)

منصف مزاج انگریزوں نے بھی ان کی اس کتاب کی تعریف کی اور ان کے دلائل کو تسلیم کیا، سرسید کی واپسی انگلستان کے دو سال بعد ایک انگریز نے اخبار Inquirer کی اشاعت مورخہ ۱۱ رمئی ۱۸۷۲ء میں اس کتاب پر مفصل اور سیر حاصل تبصرہ کیا، اس نے سرسید کے طریق استدلال کو سراہا اور ان کے دلائل کو خوشدلی سے قبول کیا۔ (۵)

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ ایسی مثالیں تو بہت ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے ملک میں اور اپنی زبان میں عیسائیوں کی کتابوں کے رد اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھیں، لیکن مجھے کوئی ایسی مثال

---

(۱) سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۴۱، چمن بکڈپو، دہلی۔

(۲) سید احمد خاں، پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۲۷، جدید ہندوستان کے معمار (سیریز) حکومت ہند، ۱۹۷۱ء۔

(۳) داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری۔

(۴) سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ پروفیسر نورالحسن نقوی ص ۹۶

(۵) بحوالہ، حیات جاوید، ص ۴۶۴

معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جاکر، یورپ ہی کی زبان میں اس موضوع پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔(۱)

کرنل گریہم کے خیال میں اس کتاب سے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصولوں کا احترام ظاہر ہوتا ہے۔(۲) کرنل موصوف کی رائے میں ''بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرین بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔''(۳)

یوں تو مسلمان علما ہمیشہ ہی عیسائیوں کے اعتراضات کا مسکت جواب دیتے رہے ہیں لیکن سرسید کی اس کاوش کو کئی حیثیتوں سے امتیاز حاصل ہے۔ مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' میں بعض ترجیحات کی نشان دہی کی ہے۔

سرسید کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے یورپ جا کر اور یورپ ہی کی زبان میں عیسائی اعتراضات کا جواب دیا۔

انھوں نے مروجہ مناظرانہ طریق کار سے یکسر پرہیز کیا ہے جو جارحانہ اور الزامی اعتراضات پر مشتمل تھا، مناظروں میں اکثر لطائف اور دل پسند واقعات کا سہارا لے کر عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی تھی، منطقی استدلال اور حقائق کا اس کوچے میں کم ہی گزر تھا، سرسید نے عوامی رجحان کے برعکس انھیں کو اپنا ہتھیار بنایا، انھوں نے علمی وتحقیقی انداز اختیار کیا۔

چونکہ سرسید نے مروجہ اسلوب اور عام انداز کے خلاف علمی، تحقیقی اور معروضی انداز اختیار کیا ہے جس میں کہیں کہیں اعتذار پسندی بھی جھلکتی ہے اس لیے اس وقت بھی اور آج بھی طبقہ علما نے اسے پسند نہیں کیا، ان کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا سید محمد میاں رکھتے ہیں:

> ''سرسید کسی اعتراض کا جواب قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں نہیں دیتے بلکہ جواب کا ڈھانچہ اپنی عقل سے تراشتے ہیں اور پھر توڑ مروڑ کر احادیث اور آیات کو اس اختراعی تخیل پر منطبق کرتے ہیں...... سرسید کے ماننے والے حضرات ان جوابات سے بے شک خوش ہوئے، مگر علما ملت کے نزدیک وہ جوابات سراسر اعتراضات تھے۔''

مولانا موصوف آگے رقمطراز ہیں:

> ''اس سے انکار نہیں کہ ردعیسائیت میں سرسید نے کچھ تحریریں شائع کیں جن پر سرسید کے

---

(۱) بحوالہ حیات جاوید، ص ۴۲۰

(۲) بحوالہ حیات جاوید، ص ۴۲۱

(۳) بحوالہ حیات جاوید، ص ۴۲۲

پیروکار آج تک فخر کرتے ہیں، مگر انصاف پسند حضرات ہمارے اس خیال کی تائید کریں گے کہ سرسید کے طرز جواب نے مسلمانوں کے دلوں سے حدیث، قرآن، مذہب اور علماء کے احترام کو کافور کردیا،......سرسید نے اپنی عقل کو اپنا رہبر بنا کر تحقیق و تدقیق سے بے خبر ہو کر الٹے سیدھے جوابات سے کتابوں کو پر کردیا ہے،......علما ملت کے نزدیک وہ جوابات سراسر اعتراضات تھے......سرسید نے ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر کھلے طور پر لامذہبی اور بے دینی کی تعلیم دی ہے یعنی مذہب کے نام پر لامذہبی کی تعلیم۔''(۱)

ظاہر ہے مولانا موصوف کا یہ تند و تیز تبصرہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے، اسے پوری طرح قبول نہیں کیا جاسکتا لیکن اس حقیقت سے انکار بہرحال مشکل ہے کہ سرسید کے اکثر جوابات میں یا تو نفسِ واقعہ سے ہی انکار پایا جاتا ہے یا پھر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے، اور یہ طریق کار یقیناً اس وقت کے مناظرانہ طریق کار سے یکسر مختلف تھا جبکہ کسی گروہ یا مناظر کی کامیابی اسی وقت ہی ممکن سمجھی جاتی تھی جب اعتراض پر جوابی اعتراض کیا جائے اور اعتراض کے دندان شکن جواب سے حریف کو خاموش کردیا جائے، مثلاً تعدد ازدواج کے جواب میں توریت کے حوالے سے یہ کہا جاتا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تو نوے اور حضرت سلمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں تھیں، پھر تعدد ازدواج پر اعتراض کیا معنی؟

غرض اسی قسم کے جوابی الزام و اعتراض سے حریف اور معترض کو خاموش کرنے میں کامیابی مضمر سمجھی جاتی تھی اور عوام الناس کو گمراہ و تشکیک ہونے سے بچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ سرسید نے چونکہ اس سے بالکل مختلف بلکہ برعکس طریق کار اختیار کیا تھا اس لیے ان کی تحریروں کا اعتذاری انداز اور بھی کھٹکتا ہے۔

بہرحال بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''خطبات کی تالیف میں خدمت علم کا مقصد کم ہے، ضمیر اور عقیدت کی اطاعت زیادہ ہے، ایسی صمیمیت اور خلوص کے سبب ہم اس کتاب کو ان کی سب تصانیف میں بلند ترین درجہ دینے پر مجبور ہیں۔''(۲)

❁......❁......❁

(۱) علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، مولانا سید محمد میاں ص ۴۴۔۴۶ الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی۔
(۲) سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، ص: ۴۴۔

طٰہٰ حسین کی سیرت نگاری.....علی ھامش السیرۃ کی روشنی میں

محمد صلاح الدین عمری، شعبہ عربی علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

”کیا حرج ہے اگر ہم مسلمانوں سے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کریں جوان کو یہ خبر دیں کہ پرندوں اور جانوروں کی اقوام نبی ﷺ کی پیدائش کے وقت اس مسئلے پر جھگڑ رہی تھیں کہ آپ ﷺ کی کفالت کون کرے، لیکن سب کی کوششوں پر پانی پھر گیا کیونکہ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ رضاعت نبی ﷺ حلیمہ سعدیہ کے حصے میں آئے گی؟ یا مسلمانوں کو اس خبر کو سننے میں کیا حرج ہے کہ جن وانس و حیوان ونجوم نے پیدائش نبی ﷺ پر ایک دوسرے کو بشارت دی؟، درخت سرسبز ہو گئے اور آسمان زمین سے اتنا قریب آ گیا کہ زمین نے اس کے جسم کریم کو مس کیا...... ان میں سے اگر چہ کوئی بھی بات صحیح نہیں ہے لیکن لوگ یہی سب سننا پسند کرتے ہیں، ان سب باتوں کے بارے میں گفتگو کرنا اوران کو سننا نبی ﷺ کی تمجید سمجھتے ہیں، لہٰذا ایسی باتوں کو ان کے سامنے پیش کرنے میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں“۔(۱)

(۱) ملاحظہ ہو: طٰہٰ حسین کا ردعمل، کسی مصری وزیر کی اس خواہش پر کہ سیرت رسول ﷺ کو خرافات واساطیر سے پاک کرکے مسلم امت کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے جس کے لیے اس نے اس اہم موضوع پر کام کرنے کے لیے انعام کا اعلان کیا تھا، طٰہٰ حسین کو وزیر کا یہ اقدام پسند نہ آیا اور انھوں نے اپنی مندرجہ بالا رائے پیش کی، جو جریدہ ”الوادی“ یکم اگست ۱۹۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی، دیکھیے. محمود مہدی، طٰہٰ حسین فی میزان العلماء والادباء ص۲۳۶، حاشیہ از مرتب بر مقالہ ”غازی التوبہ“۔

یہ ہے طہ حسین کا موقف سیرت رسول ﷺ جیسے اہم اور سنجیدہ موضوع کے سلسلے میں اور تقریباً اسی موقف کے پیش نظر، چھوٹی تقطیع کے ۲۱۷ صفحات پر مشتمل تین حصوں میں ان کی کتاب ''علی ھامش السیرۃ'' ۱۹۳۳ء میں منظر عام پر آئی، جس کے مقدمے میں انھوں نے اپنے اس نظریے کو پیش کیا ہے جس کو وہ کئی سال قبل جریدہ ''الوادی'' کے صفحات میں پیش کر چکے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ''فی الادب الجاھلی ۱۹۲۷ء'' اور ''مستقبل الثقافۃ فی مصر ۳۹۔۱۹۳۸ء'' جیسی کتب میں انھوں نے جس موضوعیت اور علمیت کو اتنی شدت سے اپنایا تھا کہ نہ صرف جاہلی شاعری بلکہ قرآن، نبوت، دینی امور اور تاریخی حقائق بھی محفوظ نہ رہ سکے تھے، اس موضوعیت اور علمیت کا مقام اس کتاب میں جذباتیت اور افسانویت نے لے لیا ہے، چنانچہ مقصد تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ سیرت رسولؐ کے واقعات کو اس طرح لذت و سرور حاصل کرنے اور بعد کے ادباء و شعراء کو اپنی ادبی و قصصی انتاجات پیش کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں جس طرح یونانی ادب کے اساطیر۔ وہ یونانی ادب کے اساطیر کے آغاز و ارتقا اور اس کے اسباب پر گفتگو کرنے کے بعد عربی ادب میں بھی اسی قسم کے اساطیری ادب کو اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، ان کے نزدیک جاہلی دور کے اخبار و احادیث کو اس طرح الہامی حیثیت حاصل ہے جس طرح یونانی اساطیر کو، جن کو قُصّاص نے قصہ نگاری کے مختلف رنگوں میں پیش کیا اور سیرت کے سلسلے میں بھی یہی بات کہی جانی چاہیے، جس نے اسلامی ادوار اور اسلامی ممالک کے ادبا و شعرا کو الہام کیا ہے اور انھوں نے سیرت کے واقعات کی مختلف رنگ و آہنگ میں تصویر کشی کی ہے، جس میں قوت و ضعف اور فنی جمال کی خوبیاں مختلف انداز میں سامنے آتی ہیں۔ (۱)

طہ حسین کے نزدیک سیرت کے چند پہلو عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، لہٰذا اس موضوع پر لکھتے وقت اپنے ان ہمنواؤں سے معذرت خواہ ہیں جو عقل کو مقدم رکھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

''بعض پہلو عقل سے متناقض ہیں اور عقل پر پورے نہیں اترتے، اس لیے وہ لوگ یقیناً انقباض محسوس کریں گے جو عقل کو ہر شئے پر فوقیت دیتے ہیں، عقل پر ہی اعتماد کرتے ہیں اور عقل کے علاوہ کسی شئے سے مطمئن نہیں ہوتے۔'' (۲)

لیکن طہ حسین ان کو یہ نکتہ سمجھا کر مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ:

''اگر چہ ان اخبار و واقعات اور احادیث سے عقل مطمئن نہیں ہوتی اور علمی اسالیب ان اخبار

(۱) طه حسين: مقدمه على هامش السيرة ص(ح) الطبعة الثلاثين

(۲) طه حسين: مقدمه على هامش السيرة ص(ى) الطبعة الثلاثين

کے خلاف فیصلہ صادر کرتے ہیں، یہ منطقی اسلوب پر بھی پورے نہیں اترتے، لیکن عوام اپنے شعور وعواطف، احساسات ومیلانات، سادگی پسند طبائع اور جہد حیات سے تھک کر آرام و تسکین کے تقاضوں کے تحت اس قسم کے اخبار کو پڑھنا پسند کرتے ہیں اور مشقات حیات سے بوجھل ہونے کے بعد ان کو جسمانی آرام و ذہنی سکون کی تلاش ہوتی ہے جو اس قسم کے ادب میں ہی مل سکتا ہے۔''(۱)

وہ اپنی صفائی بھی دیتے چلتے ہیں کہ:

''میں ان اخبار کو اس دعوے کے ساتھ نہیں لکھ رہا ہوں کہ یہ عقلی وعلمی معیار اور مناہج بحث کے مطابق ہیں، میرا اتخاطب تو قلب وشعور سے ہے کہ اس قسم کے اخبار سے عواطف خیر ابھرتے اور بواعث شر دبتے ہیں، یہ وقت گزاری کا ذریعہ اور اثقال حیات وتکالیف عیش کے احساس کو ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔''(۲)

آگے وہ اس کتاب میں اپنے منہج تالیف کو بھی واضح کر دیتے ہیں:

''اس کتاب کی تالیف کے وقت جہاں تک قصہ نگاری کا سوال ہے، میں نے خوب وسعت سے کام لیا ہے اور جہاں میں نے کوئی حرج محسوس نہیں کیا، وہاں اختراع حدیث اور روایت اخبار میں اپنے نفس کو پوری آزادی دے دی، الا یہ کہ جہاں احادیث واخبار نبی ﷺ کی شخصیت یا دین کے کسی پہلو سے متعلق ہیں وہاں میں نے نفس کو کسی حریت ووسعت کی اجازت نہیں دی بلکہ متقدمین سیرت نگاروں، رجال روایت اور علمائے دین کی روش اختیار کی ہے۔''(۳)

اس کے مصادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس قدیم الاصل جدید الصورۃ کتاب کے مصادر سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری سے متجاوز نہیں، اس کی کوئی فصل، کوئی خبر اور کوئی حدیث ایسی نہیں جو ان مذکورہ کتب میں موجود کسی خبر کے ارد گرد نہ گھومتی ہو، اگر کوئی خبر شخصیت نبی ﷺ سے متعلق ہے تو میں نے اس کے ماخذ کا ذکر کر دیا ہے'' (۱) چنانچہ پوری کتاب میں مذکورہ حوالوں کی کل تعداد اُنیس (۱۹) ہے (۲)۔

---

(۱) طه حسين: مقدمه على هامش السيرة ص(ى و ك)

(۲) طه حسين: مقدمه على هامش السيرة ص(ك)

(۳) طه حسين: مقدمه هامش السيرة ص(ك)

(٤) طه حسين: مقدمه على هامش السيرة ص(ك)

(۵) طبقات ابن سعد کے (۱۴)، سیرت ابن ہشام (۱) تفسیر طبری (۱)، تاریخ طبری (۱)، الاصابۃ (۱) اور الکشاف (۱)

دیگر مقامات پر اگرچہ ماخذ کے ذکر کا التزام نہیں کیا گیا لیکن بیشتر اخبار و احادیث انھی مذکورہ کتب سے ماخوذ ہیں مثلاً: پیدائش رسول کی تفصیلات، اسلام حمزہ، شعب ابی طالب میں محصوری، طبقات اور سیرت ابن ہشام کے ماخوذ ہیں، بنائے کعبہ میں باخوم مصری کے حصہ لینے کے واقعہ کو سیرت ابن ہشام سے اخذ کیا ہے۔ اسی طرح رسول ﷺ کو قتل کیے جانے کی سازش اور ابوجہل کی سربراہی میں کفار کے محاصرہ اور ناکامی کے واقعہ کو نیز ابوجہل کی محمد رسول اللہ ﷺ سے مرعوبیت کے واقعات بھی سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہیں، شق صدر کے واقعہ کو تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔

«علی هامش السیرۃ» کی ترتیب و تنسیق میں اگرچہ تاریخی ذمہ داری کو پوری طرح نبھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افسانوی طرز پر مذکورہ تالیف میں قوت خیال کی بھرپور کارفرمائی ہے جس کی وجہ سے اس کا اسلوب نگارش اس دور کے نقوش اجاگر کرتا ہوا ضرور نظر آتا ہے لیکن اکثر مقامات پر اصل موضوع عبارت آرائی اور تطویل کے الجھاؤ میں الجھ کر رہ جاتا ہے، مولف نے رسول کریم ﷺ کو تمام انسانی خصوصیات اور اعلیٰ اقدار سے متصف انسان کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کوشش میں چونکہ کما حقہ احترام نبی ﷺ کو ملحوظ نہ رکھ کر عنان خیال کو دراز کیا ہے، لہٰذا شخصیت نبیؐ نکھر کر سامنے نہیں آسکی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیرت نگار کی ترکیز سیرت نبویؐ پر نہیں بلکہ اخبار و واقعات کو اپنے قصص فنی اسلوب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش پر ہے۔

چنانچہ پیدائش رسول ﷺ کے وقت کی منظر کشی کرتے ہوئے انھوں نے مناظر و حوادث میں جو رنگ آمیزی کی ہے اور اپنے تخیلات کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے جس دلکش اور حسین اسلوب کو اپنا کر عبدالمطلب اور آمنہ کے احساسات کی تجسیم کی ہے اور واقعات کی منظر کشی کی ہے وہ افسانوی ادب میں تو یقیناً ایک اچھوتی کوشش ہوسکتی ہے لیکن تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے اسے کوئی معتبر سند حاصل نہیں، مثلاً: آسمان کے تاروں کا زمین سے قریب آنا اور اتنا قریب آنا کہ دیکھنے والی کو اپنے اوپر گر پڑنے یا جسم سے چھو جانے کا خوف ہونے لگے، اسی طرح آسمان کا زمین سے قریب آنا، حضرت آمنہ کی آنکھوں سے سارے حجاب اٹھ جانا اور ان کا بیداری میں اپنے اندر سے نور نکلتے ہوئے دیکھنا وغیرہ (۱)

(۱) محمد الغزالی نے اپنی کتاب ''فقه السیرۃ'' میں لکھا ہے کہ محمد ﷺ کی پیدائش عام انداز کی تھی، اس وقت کوئی بھی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو نظروں کی توجہ اور حیرت کا سبب ہوتا، انھوں نے مزید لکھا کہ جو لوگ ان غیر طبعی امور کے واقع ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں وہ دراصل صحیح فکر کی غلط تعبیر کے مرتکب ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو: فقه السیرۃ ص ۴۵-۴۶ طبع ۱۹۵۳ء۔

یا عقیقہ کے وقت عبدالمطلب کا اونٹ ذبح کر کے نہ صرف مکہ والوں کی دعوت کرنا بلکہ پہاڑوں پر گوشت رکھوانا تاکہ جانور بھی دعوت میں شریک ہو سکیں اور پھر مولف کا اس پر یہ تبصرہ کہ عبدالمطلب اپنے اس عمل سے انسانوں کے لیے نعمت اور اونٹوں کے لیے مصیبت ثابت ہوئے۔ (۱)

اسی طرح نفسیاتی احساسات، ذہنی رجحانات اور افکار و جذبات کی احساساتی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ اپنے اسلوب میں موسیقیت، ترنم اور روانی کا سہارا لے کر جس آہستہ روی سے تکرار اور مرادفات کا استعمال کرتے ہیں وہ اگرچہ ایک فن کار اور ادیب کی حیثیت سے ان کی اہم خوبی ہے لیکن اس خوبی کو جب وہ مثال کے طور پر اپنی کتاب کی ایک فصل ''راعی الغنم'' میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے رشتے کے بیان میں اپناتے ہیں تو تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ کے ایک طالب علم کو اس میں علاوہ غیر ضروری تکرار اور اکتا دینے والی تطویل کے کچھ نظر نہیں آتا، اس فصل کو انھوں نے اکیاون (۵۱) صفحات پر پھیلایا ہے۔

اور آخر میں طبقات ابن سعد کی صرف ایک روایت کا حوالہ دے کر گویا خود کو پورے قصصی اور ڈرامائی بیان کی ذمہ داری سے بری قرار دے دیا ہے، اس پوری فصل میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ابتدا ہی سے محمد ﷺ کی شخصیت کے تئیں بے خود، آپ ؐ کی عادات و اطوار پر فریفتہ اور انھی کے الفاظ میں محمد ﷺ کی شخصیت کی گرویدہ اور محبت میں گرفتار بتایا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس واقعہ کو لکھتے وقت انھوں نے اپنے تخیلات کی بنیاد پر بنائی ہوئی تصویر کو اپنے قصصی اسلوب کا ایسا زرتار جامہ پہنایا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اصل تصویر پس منظر میں چلی گئی ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنے افسانوی پلاٹ میں ایسے کردار کی صورت میں پیش کیا ہے اور ان کے قلب میں انھوں نے وہ احساسات پڑھ لیے ہیں کہ کسی عام صحت مند فکر رکھنے والے کی حقیقی زندگی میں بھی ایسے احساسات نہ پنپتے ہوں گے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قلبی احساسات و عواطف منظر کشی کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ اسی محبت و میلان کا نتیجہ تھا انھوں نے آپ ﷺ کو اپنے تجارتی سامان کے ساتھ دوگنی اجرت پر بھیجنے کی پیشکش کی، لیکن بھیجنے کے بعد دن کا عیش اور راتوں کی نیند کھو بیٹھیں جس کی وجہ وہی جذب و شوق کا تعلق اور اپنی آرزوؤں کے مرکز محمد ﷺ کے تئیں سفر کی صعوبتوں اور خطرات کا اندیشہ تھی۔

وہاں سے واپسی کے بعد وہ لمحہ آ ہی گیا جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے اندر چھپے ہوئے جذبے کو چھپانے پر قادر نہ رہ سکیں اور اپنے قریب موجود خواتین سے شیفتگی، بیخودی اور عقیدت سے سرشار ہو کر نرم آواز میں بول اٹھیں کہ اس سے قبل تم سب نے مجھے اس (نوجوان) سے بے رغبتی دلائی تھی اور

(۱) علی هامش السیرة ۱/۱۴۷۔۱۵۸۔

مجھے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن اب تم اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکو گی۔ (۱)

یہی افسانوی اسلوب طہ حسین نے حضرت زینب بنت جحش سے رسول مقبول ﷺ کے نکاح پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنایا ہے، لیکن جب ان کو معتبر روایات اور کتب حدیث وتفسیر میں اپنی تعبیر کی کوئی تصدیق نظر نہ آئی تو حُبِّ رسول ﷺ کا جواز اللہ کے فیصلے سے پیش کردیا کہ نظامِ تبنی کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے ہی رسول ﷺ، زید رضی اللہ عنہ اور مومنین صالحین سب کو امتحان میں مبتلا کردیا تھا، وہ اس طرح کہ قلب نبیؐ میں زیدؓ کی بیوی زینبؓ سے محبت کا جذبہ پیدا کردیا اور زیدؓ کے قلب میں زینبؓ سے نفرت پیدا کردی۔ (۲)

محمد ﷺ اس صورت حال سے سخت پریشان تھے، چنانچہ خود کو پوری طرح روکنے اور زینب سے محبت کے ان احساسات کو جھٹلانے اور بھلانے کی کوشش کرتے اور زیدؓ کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اللہ نے وہ سب عیاں کردیا جو آپ کا قلب چھپائے ہوئے تھا اور زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی ہدایت پر رسولؐ کی تنبیہ کی اور فرمایا:

﴿وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ﴾ (الاحزاب:۳۳/۳۷)

چنانچہ زیدؓ زینبؓ کو طلاق دے دیتے ہیں، نبی ﷺ زینبؓ سے شادی کر لیتے ہیں، منافقین اور جن کے دلوں میں کھوٹ تھا وہ اس سلسلے میں چہ میگوئیاں کرنے لگ جاتے ہیں، لیکن زیدؓ اور محمد ﷺ کے درمیان حب خالص، اس سخت آزمائش سے کامیاب وسرخرو ہوکر نکل آتی ہے، مومنین صادقین نے بھی اس آزمائش کا مقابلہ اسی طرح اخلاص ورضا کی کیفیت میں کیا، جس طرح اس سے قبل اللہ کے امر کو قبول کرتے آئے تھے اور ان کے قلوب مطمئن ہوگئے۔

حالانکہ جمہور مفسرین نے مذکورہ آیت کی اس قسم کی تفسیر کو رد کردیا ہے اور ان روایات کے بے اصل ہونے کی بات کہی ہے جو یہ تفسیر کرتی ہیں، ابن کثیر نے تو اس فضول تفسیر کو ذکر کرنا تک پسند نہیں کیا ہے، صاحب تدبر نے تو تردید کے لیے بھی ان روایات کو نقل کرنا معصیت شمار کیا ہے۔ (۳)

---

(۱) علی هامش السیرة ۲/۱۷۰

(۲) علی هامش السیرة ۳/۲۲۷۔۲۲۸۔

(۳) امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن ج۶، تفسیر سورہ احزاب، یہ موصوف کا حد درجہ غلو اور زائد عن اللازم احتیاط پر مبنی نقطۂ نظر ہے، ورنہ ابطال کے لیے جملہ علماء سلف نے موضوع ومن گھڑت روایات کے ذکر کو جائز قرار دیا ہے، موصوف تو غایت درجہ صحت سے متصف روایات کو بھی نظر انداز کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور نو جلدوں پر مشتمل پوری تفسیر تدبر قرآن میں ۱۰۰ سے بھی کم احادیث سے استدلال کرکے صحیح احادیث سے اپنی بے اعتنائی کے رویے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ جب احادیث رسولؐ تفسیر قرآن کا اولین اور بنیادی ماخذ ہیں تو ہزاروں صفحات کی تفسیر میں اتنی کم احادیث کا لانا آخر ان کے کس رویے کا غماز ہے۔

مولف کو چونکہ سیرت کے واقعات عقل کی کسوٹی پر پورے اترے نظر نہیں آتے اور وہ صرف تفریح طبع کے لیے ان واقعات کو اساطیری اسلوب میں لکھنے کے حق میں ہیں، لہٰذا شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کتاب میں وہ علمیت کا دامن چھوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہر ایسے موقع پر جہاں اختلاف روایات ہے یا کوئی ایسا تسلسل ہے کہ بغیر تمام اہم اور ثقہ روایات کو سامنے رکھے کسی نتیجہ پر پہنچنا علمی ضعف ہے، وہ صرف اسی روایت کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے ان کی نظر میں کسی حد تک عقلیت سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

چنانچہ وحی کی ابتداء کے سلسلے میں انھوں نے جو ایک روایت بیان کی ہے وہ سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہے (۱) (جس کا حوالہ بھی مؤلف نے دیا ہے) اور اس کے مطابق پہلی وحی خواب کی حالت میں آئی، مؤلف نے اول تو اس روایت کو ورقہ بن نوفل کی زبانی بیان کیا ہے، جو مولف کے مطابق، ورقہ بن نوفل نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سن کر اپنے گھر میں رات کے وقت شراب کی محفل میں نطاس رومی سے بیان کی، دوسرے انھوں نے دیگر ان روایات سے صرف نظر کیا ہے جو پہلی وحی کا بیداری کی حالت میں آنا ثابت کرتی ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو تفصیلی حدیث مروی ہے، اس کے مطابق آپ ﷺ پر پہلی وحی بیداری کی حالت میں آئی (۲)، ابن کثیر اس پہلی روایت کو لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ (خواب میں جبرئیل علیہ السلام کا آ کر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہوئی تحریر رسول ﷺ کو دکھانا جس میں سورہ (علق) کی ابتدائی آیات لکھی ہوئی تھیں' اور رسول سے پڑھنے کے لیے کہنا...... الخ'') گویا تمہید تھی اس معاملے کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا، جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث میں آیا ہے۔ (۳)

اسی طرح نبوت ملنے سے قبل، رسول اللہ ﷺ کے احساسات کی تصویر کشی کرنے میں بھی مؤلف نے خاصی رنگ آمیزی کی ہے اور اس احساساتی تصویر میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے افکار و جذبات بھی پڑھ لیے ہیں، چنانچہ ورقہ بن نوفل کی زبانی لکھتے ہیں کہ: محمد ﷺ پر اچانک فرشتہ نہیں آنے لگا اور نہ اچانک ان پر وحی نازل ہونے لگی، بلکہ اس کے لیے ان کو آہستہ آہستہ تیار کیا گیا، اس حد تک کہ محمد ﷺ کو خود سے سوء ظن ہونے لگا، ابتدا میں جب وہ اپنے رب کی نشانیاں دیکھتے تو سمجھتے کہ مجھے کوئی بیماری ہو گئی ہے، شروع میں ان کو سچے خواب دکھائے گئے...... پھر آپؐ خلوت پسند

(۱) ملاحظہ ہو: سیرت ابن ھشام ۲٥٤/۱، دار الفکر

(۲) صحیح بخاری، باب بدء الوحی

(۳) ابو الاعلیٰ مودودی: سیرت سرور عالم ۱۳۳/۲

ہو گئے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس خلوت سے اکتا گئے اور ان کے قلب میں شکوک وشبہات نے سر ابھارنا شروع کیا، خلوت کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی، رات اور دن کا فرق ختم ہو گیا، اب ان کو ہر طرف سے نور گھیرے رہتا، خواہ چمکتے ہوئے سورج کی روشنی ہو یا رات کی تاریکی، آخرکار وہ سکون و خاموشی کو کھو بیٹھے، جب بھی چلتے، ہر طرف سے دلکش سرگوشیاں سنائی دیتیں، درختوں، پتھروں، میدانوں، ہواؤں الغرض ہر شئے سے ان کو سرگوشی سنائی دیتی، حتیٰ کہ آپؐ خاصے پریشان ہو گئے اور ایک روز حیران و پریشان ہو کر خدیجہؓ کے پاس آئے اور بولے: خدیجہؓ تم جانتی ہو میں ان بتوں کو کتنا ناپسند کرتا ہوں جن کی یہ عرب پرستش کرتے ہیں اور اس کہانت کو کتنا برا سمجھتا ہوں جس سے عرب اتنا مانوس ہیں، اس کے باوجود میں کچھ ناپسندیدہ باتیں محسوس کرتا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ مجھے کوئی مرض لاحق ہو جائے گا یا میں کاہن ہو جاؤں گا، اس حالت میں خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو سنبھالا اور تسلی دی کہ آپ ﷺ اپنے رب کے معزز اور قابل ترجیح بندے ہیں، اللہ آپؐ سے ایسا کوئی سلوک نہیں کرے گا، آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ دن آ گیا جس روز آپ ﷺ کو نبوت ملی۔ (۱)

مولف کے اس پورے بیان کا مرکزی خیال طبقات ابن سعد میں مروی وہ چار (۴) روایات ہیں جو بالترتیب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابن عباس، حضرت عروہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں (۲)، یہ اور بات ہے کہ ورقہ بن نوفل کی زبان سے مولف نے اس کو قصصی رنگ میں پیش کیا ہے۔

اس طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آئے اور ان کو عبداللہ بن جدعان کی باندی نے ابوجہل کی رسول اللہ ﷺ سے بدسلوکی کی خبر دی تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کو جا کر مسجد میں دھر پکڑا اور اس کے سر پر سخت ضرب لگائی، اس پوری تفصیل کے راوی ءقصہ (جس کا نام مؤلف نے نہیں دیا ہے بلکہ صرف شیخ لکھا ہے) شیخ کی رائے میں مذکورہ باندی عشقیہ معاملات میں ملوث رہتی تھی اور ابوجہل نے اس سے قابل اعتراض حالت میں لطف اندوز ہونے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے ابوجہل کو سختی سے روک کر شرمندہ کر دیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے گزرتے ہوئے ابوجہل کی یہ حرکت دیکھ لی جو بہرحال اشراف قریش کے شایان شان نہ تھی، چنانچہ شرمندگی کی جھنجھلاہٹ میں اس نے رسول (ﷺ) سے بدکلامی کرنی

(۱) علی هامش السیرة ۵۲/۳

(۲) ملاحظہ ہو: طبقات ابن سعد ۱۹۴/۱-۱۹۵، بیروت ۱۹۶۰ء۔

شروع کردی، لیکن چونکہ رسولؐ کو اللہ نے اعراض کا حکم دے رکھا تھا، لہٰذا آپ ﷺ ابوجہل کی اذیت ناک باتوں کو سنتے ہوئے خاموشی سے گزر گئے، باندی پر آپ ﷺ کے اس موقف کا شدید اثر ہوا اور اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے سب کچھ کہہ سنایا، ابوجہل اس وقت شرمندگی اور ذلت کے احساس تلے دبا قریش کی محفل میں جا پہنچا تھا، حضرت حمزہؓ نے جب اس کو دھر پکڑا تو بنومخزوم ابوجہل کی طرف سے دفاع کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے، لیکن ابوجہل نے ان سبھوں کو یہ کہہ کر روک دیا کہ ابوعمارہ کو چھوڑ دو، میں نے ہی اس کے بھتیجے کو سخت سست کہہ دیا تھا۔

درحقیقت اسنے اس معاملے کو اس لیے رفع دفع کرنے کی کوشش کی تھی کہ مبادا بات بڑھنے کی صورت میں اس کی اس شرمناک حرکت کا علم کسی کو نہ ہو جائے، اگرچہ بنی مخزوم اس کے اس موقف کو اس کے ایثار اور انصاف نفس پر محمول کرتے رہے۔ (۱)

معجزات کے بارے میں طہ حسین اپنا متوازن نظریہ حنظلہ بن عمیر الخزاعی کے اس بیان کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ:

"وہ (رسول) ایک ایسے شخص تھے جن سے ان کے مخالفین اور دشمن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ معجزات سے اپنی برأت کا اظہار کرتے اور اعلان کرتے کہ وہ انھی جیسے بشر ہیں، آپ ﷺ کو اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ آپ عظیم واقعات کے ذریعے عقلوں کو حیران کر دیں، آپؐ کو تو اس لیے مبعوث کیا گیا تھا کہ لوگوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کریں، ان عقلوں کو ہدایت سے بھر دیں اور ان کے قلوب کو رحمت و خیر کا شعور عطا کریں، لیکن آپؐ کا معاملہ حیرت افزاء اور مسحور کن معجزات سے بھی خالی نہیں، بغیر اس کے کہ طبیعت اشیاء میں فی نفسہ کوئی حادثہ رونما ہو، یا مالوف طریقے سے تجاوز کرے، آپؐ کے معجزات ایسے ممتاز معجزات ہیں جن کو لوگ مالوف اور عام نظر سے دیکھتے ہیں اور مفکرین ان کو نادر و ماہر شکل میں مخالفین کو خاموش و عاجز کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، محمد ﷺ ایک ایسے شخص تھے جو دیگر اشخاص کی مانند نہیں تھے، وہ بشر تھے لیکن اپنی ان عادات و خصائل کی بنا پر لوگوں میں ممتاز تھے جن کو میرا قلب محسوس کرتا اور عقل تصدیق کرتی ہے، لیکن میں ان کی تصویر کشی نہیں کر سکتا"۔ (۲)

سیرت نبوی ﷺ کو طہ حسین نے اساطیری ادب کا مواد قرار دے کر مؤلفین و ادباء سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بھی سیرت کے واقعات سے اسی طرح محظوظ ہوں جس طرح یورپ کے ادباء یونانی اساطیر

---

(۱) علی ھامش السیرۃ ۳/۱۱۸-۱۱۹

(۲) علی ھامش السیرۃ ۳/۲۳۸

سے محظوظ ہوئے (۱) اس طرح گویا انھوں نے ان سارے علماء سلف کی کوششوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے سیرت رسول ﷺ کو اساطیر وخرافات اور اسرائیلی روایات سے پاک و صاف کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں، اگر ان علمائے اور سیرت نگاروں کی تالیفات میں ہم کو کہیں لفظی حسن اور اسلوب کی رعنائی نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کا مقصد ہی لفظی صنعت گری اور افسانہ نویسی تھا، ان کی کوششوں کا مرکز تو سیرت نبوی ﷺ کی حقیقی شکلوں کو زندہ اور متحرک رکھنا تھا۔

طہٰ حسین نے اپنے جس مخصوص افسانوی اسلوب میں سیرت نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے، اس کی توجیہہ یہ کی جاسکتی ہے کہ ہمارا وہ نوجوان طبقہ جو مغربی علوم وثقافت کا پروردہ ہے اور ہماری وہ نسل جو جدید سائنسی دنیا کی عطا کردہ مادی تہذیب کی دلدل میں پھنس کر ذہنی طور پر اس حد تک دیوالیہ ہو چکی ہے کہ علوم اسلامیہ کے سنجیدہ موضوعات اور دقیق مسائل پر غور وخوض اور عمیق مطالعے کے قابل نہیں رہی، اس کے لیے اس قسم کی افسانوی طرز کی تاریخی کتب کارآمد اور مفید ہوں گی، اس طرح کہ ہم کسی نہ کسی حد تک اسلامی وعربی تاریخ سے ان کے ذہنوں کو متعارف کرانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں (۲)، تاہم سیرت نگاروں کو تاریخی روایات کی صحت، اخبار و احادیث کی صداقت اور رسول ﷺ واصحاب رسول ﷺ کے تقدس کو بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ طہٰ حسین نے نقل واقعات اور روایت اخبار میں صداقت کو حتی الامکان ملحوظ رکھا ہے، لیکن کہیں کہیں افسانویت اور رومانویت کا غلبہ بہر حال کھٹکتا ہے، اسی طرح اخبار وواقعات کا استعمال اس انداز سے کیا ہے کہ ان کی صحت وحقیقت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔

---

(۱) مقدمه علی هامش السيرة ص (ح) و (ی)۔

(۲) یہ توجیہہ بڑی حد تک غیر معقول ہے کیونکہ اس قسم کی طرز تالیف سے متوقع فوائد برآمد ہونے کے بجائے منفی اثرات مرتب ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ (م)

بشریت رسولؐ اور مسئلہ علم غیب

مولانا قاری عبدالرشید خان، جہان پوری

الحمد للّٰہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ ، أما بعد:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

میں اس موقع پر دو اختلافی مسائل پر کچھ گفتگو کروں گا، جو سیرت سے متعلق ہیں۔

یہ دارالعلوم ہے، شب وروز لوگ یہاں تعلیم وتعلم میں مصروف ہیں اور علم کی فضیلت بہر حال مسلم ہے، اہل علم کے بڑے فضائل قرآن اور حدیث کے اندر موجود ہیں جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ علم دے کر بھی فضیلت دیتا ہے اور کبھی علم نہ دے کر فضیلت دیتا ہے، چونکہ عام طور پر ایک رخ سامنے ہے اور دوسرا رخ بہت کم لوگوں کی نظر میں ہے، لہٰذا دوسرا میں پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کبھی علم نہ دے کر فضیلت دیتا ہے۔

یہ واقعہ بارہا ہم قرآن میں پڑھ چکے ہیں اور سن، سنا چکے ہیں، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾(الصافات:۱۰۲/۳۷)

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام چلنے پھرنے کے لائق ہوئے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، تیرا کیا خیال ہے؟ چونکہ انبیاء کا خواب وحی کے

درجے میں ہوتا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ جو کچھ حکم ہوا ہے ابا جان آپ وہ کر گزریں، ان شاء اللہ مجھ کو صابروں میں سے پائیں گے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا چاہا:

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ﴾ (الصافات:۳۷/۱۰۳۔۱۰۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کی پوری تیاری کی اور یہی نہیں بلکہ چھری برابر گلے پر چلاتے رہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو علم غیب دے دیتا کہ آپ بیٹے کو جتنا جی چاہیں ذبح کریں ذبح نہیں ہوگا، اب بیٹے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ابا جان چاہے جتنی چھری چلائیں میں ذبح نہیں ہو سکتا، میرا گلا نہیں کٹ سکتا، تو کیا اس علم کے باوجود کوئی فضیلت باقی رہ جاتی ہے، علم نہ دے کر اللہ تعالیٰ نے ان کو مرتبہ دیا، ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھتے رہے کہ میں ذبح کر ڈالوں گا اور اسماعیل علیہ السلام یہ سمجھتے رہے کہ میں ذبح ہو جاؤں گا، اگر پہلے سے علم ہو جاتا کہ ذبح کرنے سے ذبح نہ ہوں گے تو کوئی فضیلت باقی نہ رہتی۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر انبیاء کرام کو علم نہ دے کر ان کو فضیلت بخشی ہے، لہٰذا ایک تصور یہ ہے کہ اگر علم غیب کا انکار کیا جائے یا اس کے کسی جزء کا تو انبیاء کی توہین ہوتی ہے، یہ عقیدہ سراسر غلط ہے، چونکہ یہ علمی بحث ہے میں تو ایک عامی آدمی ہوں، علمی بحث تو ہمارے ذی علم حضرات پیش کریں گے، میں تو موٹی بات پیش کرتا ہوں کہ اگر ایک سوال کیا جائے کسی سے کہ یہ بتایئے کہ اللہ کا علم زیادہ ہے یا رسول اکرم ﷺ کا علم زیادہ ہے؟ کہنا پڑے گا اللہ تعالیٰ کا علم زیادہ ہے تو جتنا زیادہ ہے اسی کو غیب تصور کر لیجئے اور یہ کہنا پڑے گا کہ ماکان وما یکون کا علم انبیاء کو نہیں تھا، غیب کا علم ضرور دیا گیا جتنے کا تذکرہ آپ ﷺ نے کر دیا کہ ہمیں معلوم ہے تو ہمیں عقیدہ رکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ کو معلوم، جس کے بارے میں آپ ﷺ نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم تو ہم کو یہ خیال کرنا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے غلط نہیں بتایا، جن چیزوں کے بارے میں کہا کہ مجھے نہیں معلوم یقیناً وہ نہیں معلوم ہے، جن چیزوں کے بارے میں آپ ﷺ خاموش رہے اس میں ہم کو بھی خاموش رہنا چاہیے، جس کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ نہیں بتایا کہ معلوم ہے یا نہیں، ہم کو بھی اس بارے میں خاموش رہنا چاہیے۔

دوسری بحث: چونکہ بشری اور نوری مخلوق کی آ گئی تھی اس سے پہلے بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ

اگر رسول اکرم ﷺ کو بشر کہا جائے تو یہ ان کی توہین ہے، اگر نور کہا جائے یا نوری مخلوق کہا جائے تو یہ ان کی عزت افزائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (فصلت:٤١/٦)

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ میں بشر ہوں، لیکن اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ آپ کہیے بشر، میں نہیں کہتا، آپ کہتے ہیں کہ بشر ہوں میں نہیں کہتا تو اگر اس طرح کا ترجمہ کیا جائے کہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ (الاخلاص:١١٢/١)، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے اور اس کا مطلب یہ نکالا جائے کہ آپ کہیے کہ اللہ ایک ہے میں نہیں کہتا، یہ کیسی حماقت کی باتیں ہیں، ایک سوال آتا ہے کہ اشرف المخلوق کون ہیں؟ کہنا پڑے گا کہ انسان اشرف المخلوق ہیں، اس سے اشرف کوئی مخلوق نہیں اور کیوں، اس کا سبب اس وقت میں نہیں بتا سکتا کیونکہ وقت بہت کم ہے، جب انسان اشرف المخلوق ہے تو اسے اگر انسانیت کے دائرے سے نکال کر کسی اور دائرے میں لے جایا جائے گا تو اشرف المخلوق کے درجے سے نکال کر کسی اور دائرے میں لے جایا جائے گا تو اشرف المخلوق کے درجے سے نکال کر گویا اس سے کمتر درجے کی مخلوق بنانا ہے، اللہ تعالیٰ بھی نور ہیں نور کی دو قسمیں ہیں: نور خالق اور نور مخلوق، اللہ تعالیٰ خود بھی نور ہے اور باقی جتنی مخلوقات ہیں خواہ وہ فرشتے ہی کیوں نہ ہوں پوری مخلوقات جتنی بھی ہیں وہ نور مخلوق ہیں اور نور مخلوق نور خالق کے برابر یا اس کا جزء نہیں ہو سکتی، بعض لوگوں نے اس حدیث سے سہارا لیا ہے کہ "اول ما خلق الله نوری" "سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا، حضور ﷺ کے بارے میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے حالانکہ یہ موضوع حدیث ہے، اسے تو ملا علی قاری وغیرہ نے بالکل موضوعات میں ذکر کیا ہے، اب ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر رسول اللہ، اللہ کا نور ہیں یا اس کا جزء ہیں تو یہ آیت کہاں جائے گی۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص:١١٢/٤) "اس ذات کا تو کوئی ہم سر ہے ہی نہیں۔"

اگر حضور ﷺ کو اللہ کے نور کا جزء مانا جائے تو گویا کچھ نہ کچھ برابری ثابت ہوتی ہے، لہٰذا یہ عقیدہ تو بالکل غلط ہوگا، اب دیکھنا یہ ہے کہ نور آپ ﷺ کو کچھ دیا گیا تھا، یا نہیں دیا گیا تھا، رسول اکرم ﷺ کے خاکی مخلوق ہوتے ہوئے آپ ﷺ کو کیا مرتبہ دیا گیا؟ ساری کائنات میں اشرف المخلوق انسان، انسانوں میں بھی ایمان والے، ایمان والوں کے چار درجے قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں:

﴿مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:٤/٦٩)

چار درجے ہیں جن میں انبیاء کا مرتبہ سب سے بڑا، پھر اس سے نیچے صدیقین ہیں، پھر شہداء، پھر صالحین ہیں، یعنی صالحین سے مرتبہ بلند شہداء کا، اس سے بلند مرتبہ صدیقین کا، اس سے بلند مرتبہ نبیین کا اور نبیوں میں سب سے بڑا مرتبہ رسول اکرم سید المرسلین ﷺ کا ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپؐ کو نور دیا گیا لیکن کیا دیا گیا؟ آپؐ کی ذات خاکی ہے لیکن آپؐ کے ذات کو جو نور دیا گیا ہے وہ نور ہدایت ہے، نور نبوت ہے نور علم ہے، اس طرح سے بہت سے نور، چنانچہ ذات اول ہے نہ کہ یہ صفات، جو خادم ہے اگر اس کو مخدوم بنا دیا جائے تو یہ اس کی توہین ہے اسی طرح اگر اسے نوری مخلوق ثابت کر دیا جائے تو یہ اس کی توہین ہے۔

لہٰذا اس عقیدے کے رکھنے والے پھر غور کریں کہ کیا وہ حضور ﷺ کی عزت افزائی کر رہے ہیں یا ان کا مرتبہ گھٹا رہے ہیں؟

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

طبقاتی کشمکش کا حل سیرت طیبہ کی روشنی میں

مولانا عبدالمتین صاحب میمن، جوناگڑھ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم ، أما بعد:

قال اللّٰہ تعالیٰ:﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾(الحجرات:۴۹/۱۳)

عرب میں قبائلی اور نسلی تفوق کا بڑا چرچا تھا، عرب کے مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کا قبیلہ بنی تغلب بھی ان قبائل میں سے ایک مشہور قبیلہ تھا اور عمرو بن کلثوم کے زمانے میں ایک بادشاہ تھا، عرب میں ایک ذیلی بادشاہت قائم تھی تو اس بادشاہ نے کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی محترم ہے کہ میری ماں کی خدمت کو اس کی ماں برا جانے، شرم و عار سمجھے، ناک کٹنے کے برابر سمجھے، کوئی اتنا اعلیٰ ارفع آدمی ہے، کوئی ایسا قبیلہ ہے اور اس بادشاہ کو اس زمانہ میں قیام رکوع سجدہ سب کچھ کیا جاتا تھا وہ اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھتا تھا، تو مصاحبین نے ذرا سوچ کر بتایا کہ بنی تغلب کا ایک شاعر عمرو بن کلثوم ہے۔ اس کی ماں بادشاہ سلامت کی ماں کی بھی خدمت کرنے کو عار سمجھے گی۔

چنانچہ بادشاہ نے اپنا غرور دکھانے کے لیے عمرو بن کلثوم شاعر کی دعوت کردی، اس کی ماں کی بھی دعوت کردی، اب وہ آیا اس کا شایان شان استقبال کیا گیا، بادشاہ کے پاس پہنچ کے عمرو بن کلثوم نے اپنی ماں کو زنان خانے میں بھیج دیا، اور خود بادشاہ کے پاس بیٹھ گیا، باتیں ہوتی رہیں، جو کچھ طے ہو چکا تھا اس کے مطابق بادشاہ کی ماں نے اس شاعر کی ماں کی بہت زیادہ پذیرائی کی، استقبال کیا اور

اچھی طرح سے بٹھایا، پھر کھانے سے پہلے اول خاطر تواضع کرنے کے لیے ایک تربوز منگوایا اور چھری سے اس کے ٹکڑے کیے لیکن تھالی اور رکابی ذرا دور رکھی تو بادشاہ کی ماں عمرو بن کلثوم کی ماں سے کہتی ہے کہ بہن ذرا یہ رکابی تھالی اٹھا کر دے دو، بس اتنی خدمت لینی تھی کہ وہ رکابی اٹھا کر دے دے، تا کہ بادشاہ کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ میری ماں کی خدمت اس نے بھی کی، جو اپنے آپ کو سب سے اونچا بتاتا تھا۔

چنانچہ بادشاہ کی ماں نے جب یہ کہا کہ بہن رکابی اٹھا دو تو اسی وقت عمرو بن کلثوم شاعر کی ماں کا رنگ بدل گیا اور پھر غم اور غصے میں اس کی چیخ نکل گئی اور یہ الفاظ نکلے کہ وابني تغلباه، ہائے بنی تغلب کی عزت یہاں پر ویران ہو رہی ہے، وا بني تغلباه کے الفاظ سن کر عمرو بن کلثوم کھڑا ہو گیا، اس کا غیظ وغضب بڑھ گیا اور اس بادشاہ سے کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں آپ کے دربار میں زنان خانے میں میری ماں کے ساتھ ہمارے شایان شان سلوک نہیں ہوا، بلکہ نازیبا سلوک کیا گیا ہے، یہ کہہ کر اس نے کہا کہ اس کا خمیازہ بادشاہ کو بھگتنا پڑے گا، تلوار میان سے نکالی اور بادشاہ کی گردن اُڑا دی، قتل کر دیا اور پھر اس شاعر نے اپنا وہ مشہور شعر جو اس کے قصیدے کے آخر میں ہے، اس کی لاش کے اوپر کھڑا ہو کر کہا کہ:

إذا بلغ الفطام لنا صبي تخر له الجبابر ساجدينا

جب ہمارا بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے، تو پھر اس کے سامنے بڑے بڑے ظالم سرکش بادشاہ بھی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، ہم وہ ہیں جنھیں تو نے سمجھا نہیں، اس کی لاش کے اوپر یہ شعر کہہ کر چلا آیا، دربار میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا راستہ روکتا، کیونکہ بنی تغلب اتنا خونخوار اور درندہ صفت قبیلہ تھا کہ سبھی ڈرتے تھے، تو میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ عار شرم دیکھیے کہ انھوں نے اپنے اونچائی کے درجے مقرر کر لیے تھے کہ کوئی ہم سے خدمت کے لیے نہ کہے، جو خدمت کرنا انسانی شرف ہے اس کو انھوں نے عار سمجھ لیا تھا تو جب انسانوں کے طبقے بن جاتے ہیں، خانوں میں انسان بٹ جاتے ہیں، اونچی نیچی قومیں بن جاتی ہیں، اونچے نیچے خاندان بن جاتے ہیں، تو اس وقت امانت اور دیانت، عدل وانصاف کا پہلے خون ہوتا ہے اور یہ بھی آپ یاد رکھیے کہ جب طبقات بنتے ہیں، انسان خانوں میں بٹتے ہیں تو کبر وغرور اور نخوت کی وجہ سے اگر یہ کبر وغرور اور یہ نخوت اور عجب اور یہ احساس برتری نفس کے اندر آ گیا تو آدمی اپنے آپ کو اونچا سمجھ کر دوسروں کو نچلے خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

اور ایسی صورت میں انسانیت سسکتی ہے، ظلم ہر طرف پھیل جاتا ہے اور پھر اس کا مداوا مشکل ہوتا

ہے، ایسے حالات میں ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ کے کچھ آگے پیچھے عمرو بن کلثوم کا یہ واقعہ ہوا تھا کہ اس نے احساس برتری کے اوپر جب دیکھا کہ زک پڑ رہی ہے تو اس بادشاہ کی گردن اڑا دی، جب انسان مختلف طبقات میں بٹ جاتے ہیں تو آپ یہ مت سمجھئے کہ اعلیٰ طبقے والے خیریت سے رہتے ہیں، عزت کے ساتھ رہتے ہیں ان کے اندر بھی اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے جس طرح نیچے والوں کی زندگی بڑی مایوس کن زندگی ہوتی ہے اسی طرح اعلیٰ خانے میں بٹے ہوئے لوگوں کی زندگی بڑے اضطراب اور بے چینی کی ہو جاتی ہے ہر جانب فساد پھیل کر رہ جاتا ہے اوپر سے نیچے تک، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کی حالت بیان فرمائی:

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾(آل عمران۳:۱۰۳)

تم جہنم کے کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے جیتے جی جہنم تک پہنچ گئے تھے، ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو یہ حالت تھی کہ جدھر بھی نظر اٹھائی طبقے ہی طبقے ہیں، اگر کبر و غرور ان کی تجارت میں آیا تو تجارت میں طبقات بن گئے اگر معاشرے یا سماج میں آیا تو سماجی طور پر وہ بٹ کر رہ گئے، کبر و نخوت اور غرور جب مذہب کے اندر آیا تو مذہب کے اندر بھی خانے بن کر رہ گئے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہی ہو رہا تھا کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ اصلی رنگ اور اصلی خون والے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں اور اللہ ہمارا ہی ہے اور کسی کا نہیں ہے۔

اور جب عیسائی لوگوں کا ظہور ہوا، عیسیٰ علیہ السلام آئے تو غرور و نخوت مذہبی طور سے بھی ان کو ملی تھی مذہب میں سرایت کر گئی تھی نبی اور اللہ والوں کو دیکھ کر یہ لوگ خوش نہیں ہوئے بلکہ ان کے دلوں میں تکبر سما گیا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ﴾(البقرۃ ۲:۱۱۳)۔

یہودیوں نے کہا کہ یہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں، ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے نہ ہدایت پر ہیں تو اب نصاریٰ آگے بڑھے اور انھوں نے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہا:

﴿وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾(البقرۃ:۲/۱۱۳)

نصاریٰ نے کہا کہ یہود لوگ بالکل نکمے ہیں، بیکار ہیں کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے، ہدایت بھی نہیں، شرافت بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾(البقرۃ ۲:۱۱۳)

دونوں کتاب پڑھتے تھے، یہودی بھی اور نصرانی بھی اور کتاب کی اصل غرض و غایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور اللہ کی عبادت کرنے والے خواہ وہ کوئی بھی کتاب والے ہوں

کسی بھی رنگ والے ہوں وہ سب کے سب بھائی ہیں، تو ان لوگوں نے یہ طبقے پیدا کر رکھے تھے لیکن اس سے خود بھی محفوظ نہیں تھے، وہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور اشرف قوم کہلانے والے تھے، ان کے اندر بھی طبقات پیدا ہو گئے تھے۔

حدیث شریف میں موجود ہے کہ: جب ان کے اندر کوئی امیر آدمی، اونچا آدمی بدکاری کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کو ذرا فضیحت اور رسوا کر کے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی غریب آدمی زنا کا مرتکب ہوتا تو اس کو رجم کر دیا کرتے تھے، دیکھیے کہ یہ لوگ اونچی قوم کہلاتے تھے، لیکن اپنے اندر بھی خانے بنا رکھے تھے تو جب تکبر و غرور آ جائے تو پھر خانہ در خانہ انسان بٹتے ہی رہتے ہیں اور نیچے ہی جاتے رہتے ہیں۔

ہمارے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا خاندان بہت اونچا خاندان مانا جاتا تھا، خاندان بنو ہاشم، لیکن جب آپ ﷺ کے اوپر کتاب نازل ہوئی تو انھیں میں سے باتیں بنانے والے باتیں بناتے ہیں:

﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾(الزخرف:۴۳/۳۱)

کہ یہ قرآن مجید مکہ اور طائف کی بستیوں کے کسی عظیم آدمی کے اوپر کسی اونچے آدمی کے اوپر بڑی حیثیت، اونچی پوزیشن والے کے اوپر کیوں نازل نہیں ہوا دیکھیے کہ انھوں نے سب سے اونچے خاندان کے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ صادق القول جن کو وہ صادق اور امین کا لقب دیا کرتے تھے ان کو بھی عظمت سے ہٹا کر ان کی بے عزتی کر ڈالی محض اس وجہ سے کہ آپ ﷺ یتیم اور نادار تھے، اس وجہ سے انھوں نے آپؐ کو نچلے خانے میں رکھ دیا، حالانکہ خاندان سب سے اونچا، اونچے خانے والا اور بڑے اونچے طبقے کا مانا جاتا تھا لیکن اس میں بھی تقسیم کر دی گئی تو یہ لعنت بڑھتی ہی رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کو بھیجا اور آپ ﷺ کو یہ آواز لگانے کے لیے کہا گیا جو سورہ (اعراف) میں ہے اور سورہ (اعراف) ویسے بھی مکی سورہ ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے پہلی دعوت کا مضمون بتایا ہے:

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاࣙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾(الاعراف:۷/۱۵۸)۔

آپؐ فرما دیجیے اعلان کر دیجیے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچے

پیغام، سچے فتوے، سچے مسئلے لے کر آیا ہوں، تم ان کو مانو ان کو قبول کرو، پھر آگے فرمایا: اس اللہ کی طرف سے آیا ہوں ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ جس کے لیے زمین و آسمان کی حکومت ہے، پھر آگے فرمایا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں ہے دلیل یہ ہے ﴿هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ وہ زندگی دیتا ہے اور مارتا ہے، اس کے حاکم و بادشاہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حیات اور موت اس کے ہاتھ میں ہے، وہ حیات اور موت کا مالک ہے، جس کے ہاتھ میں حیات اور موت ہو اس سے بڑا قاہر، اس سے بڑا قوی، اس سے بڑا مضبوط کوئی نہیں ہو سکتا تو اس کی حکومت زمین و آسمان پر ہے، پھر فرمایا کہ: ایسے نبی امیؐ کے اوپر ایمان لاؤ جو خود اللہ کے اوپر ایمان رکھتے ہیں، اس کے کلمات پر یقین رکھتے ہیں اور تم ان کی اتباع کرو تا کہ تمھیں ہدایت نصیب ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طبقاتی کشمکش کے جال کو توڑ کر کے پھینک دیا ہے، اس آیت کے ذریعے وہ طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے حالات سے عدل و انصاف، امانت و دیانت کا جو خون ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو روک دیا اور پھر اس کے بعد جو ظلم و ستم دنیا میں ہوتے ہیں اور انسانیت کراہتی رہتی ہے سسکتی رہتی ہے، اس کے بجائے ایسی چیز عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مایوسیوں کو دور کر کے امید کی لہر قرار دے کر اس خزاں کو مٹا کر بہار کا موسم لے آئے، اللہ رب العالمین تباہ ہونے والوں کو آباد کر دے اور بھوکوں کو خوشحال بنا دے، وہ چیز اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اب جب یہ چیز ہوگی تو طبقات ختم ہوں گے، مثال کے طور پر پہلا جملہ ہے کہ ﴿اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ میں تم تمام کی طرف سچے پیغامات لے کر آیا ہوں، باطل کا شبہ اس کے اندر نہیں ہے، مکارم اخلاق کو لے کر آیا ہوں، اب اس کو تم حاصل کر لو اس کو پورا پورا لے لو تو جس معاشرے نے رسالت محمدیؐ کو قبول کر لیا ویسے ہی اس معاشرے کے طبقے مٹ گئے اور پتہ نہیں چلے گا کہ کون اس میں اونچا ہے کون نیچا ہے کون آقا ہے کون نوکر ہے کون اونچی حیثیت کا ہے اور کون چھوٹی حیثیت کا ہے۔

لہٰذا پورے پورے احترام کے ساتھ اس شریعت کو قبول کیجئے پھر دیکھئے وہاں پر نہ سید رہے گا نہ مغل رہے گا نہ پٹھان رہے گا اور نہ وہاں پر کسی کو اونچا سمجھا جائے گا نہ کسی کو نیچا سمجھا جائے گا، سب امت محمدیؐ میں ہوں گے اور سب رسالت کے خوشہ چیں ہوں گے تو رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کرنا یا آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کرنا یا آپؐ کے اسوے اور نمونے کو لینا۔ یاد رکھئے یہ طبقات کو مٹا دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے، آخر اسی شریعت کے ماننے والے سلمان فارسی تھے، عجم کے مجوسی تھے، لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو یہ سب کے بھائی بن گئے، سب ان کے بھائی بن گئے۔

وہاں سے آئے، اسلام قبول کیا، مسلمانوں میں مل گئے، یہ بڑے گورے چٹے تھے، لیکن کالوں

کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کالوں کے اندر وہ ابوالاسود بھی ہے، طبقات کے اندر موجود ہے کہ اس ابوالاسود کو کوئی بھی اپنے پاس بیٹھنے نہیں دیتا تھا، اپنے پاس کھلانا تو درکنار دروازے کے اوپر کھڑا نہیں رہنے دیتا تھا کیونکہ وہ کالا آدمی تھا، بہت ہی بدوضع آدمی تھا، ٹانگیں اس کی سوکھی ہوئی تھیں، آنکھوں سے پانی بہتا رہتا تھا تو ایسے آدمی کو کوئی اپنے پاس نہیں بٹھاتا تھا لیکن گورے چٹے صہیب رومیؓ وہاں پر بیٹھے ہوئے تھے، وہیں وہ ابوالاسود بیٹھا ہوا ہے جو اول اول ڈرتے ہوئے آیا تھا، اس نے سن رکھا تھا کہ مدینے میں یثرب میں ایک نبی آئے گا جو ان کا کلمہ پڑھ لے اور جو ان کے دین کو قبول کرلے وہ ان کا بھائی ہو جاتا ہے، سب ان کے بھائی بن جاتے ہیں، ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک برتن میں کھا لیتے ہیں، ایک ہی برتن میں پی لیتے ہیں اور ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں تو وہ ایسی اخوت، ایسا بھائی چارہ لے کر آئے ہیں کہ اس میں کوئی اونچا کوئی نیچا کوئی شریف اور کوئی رذیل نہیں مانا جاتا، بلکہ سب ایک ہو جاتے ہیں، محبت میں ایک ہی ڈورے میں، ایک ہی دھاگے میں تمام پروئے ہوئے موتی معلوم ہوتے ہیں، تو وہ آیا اور بیچارہ ڈرتے ڈرتے مسجد کے پاس کھڑا ہو گیا، آخر اس کو بلایا رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کس لیے آئے ہو تو وہ دردر سے ہٹایا ہوا اور بھگایا گیا ابوالاسود بولتا ہے کہ کیا مجھے آپ کا دین قبول کرنے کی اجازت ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ: تم جیسوں کا رحمت خداوندی انتظار کر رہی ہے، اسلام قبول کرلو، چنانچہ ابوالاسود اسلام قبول کر کے بیٹھ گیا، یہاں کوئی اونچا نہیں رہا کوئی نیچا نہیں رہا، کیونکہ یہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے ماننے والے ہیں۔

ہمارے نبی ﷺ کے پاس زاھر بن حرام آیا کرتا تھا اور گاؤں سے چیزیں لے آتا، کچھ بھنی ہوئی چیزیں ہیں، کچھ گنے کی شکل کی، جو دیہات والے لے آتے ہیں، ایسے ہی وہ اپنے دیہات میں ہونے والی چیزیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ: «إن هذا باديتنا ونحن حاضروه».

یہ ہمارا دیہاتی آدمی ہے اور ہم اس کے لیے شہری ہیں، یہ اگر دیہات سے کوئی چیز لے کر آئے تو تم اس کو شہر کی چیزیں تحفے میں دیا کرو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کرام ان کو ہدیہ وتحفہ دیتے تو بڑے خوش خوش چلے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ان کی بستی میں تشریف لے گئے، دیکھا کہ گاؤں کے لگنے والے بازار میں یہ کھڑے ہوئے کچھ چیزیں بیچ رہے ہیں، یہ زاھر بھی ابوالاسود کی طرح تھے کہ (في قموشة ساقه وفي قموشة عينه)، اپنے پاؤں کی پنڈلیوں کے سوکھے پن پر اور آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے سب ان کو خراب اور بیوقوف سمجھتے تھے، جب بھی کوئی چیز بیچنے کھڑے ہوتے تو لوگ مذاق کرتے،

دھکے دیتے، کچھ اٹھا لے جاتے تو یہ بیچارے رو پڑتے تھے تو رسول اللہ ﷺ جب زاھر بن حرام کی بستی میں تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے پیچھے سے جا کر ان کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ کہتے ہیں: کون ہو کیوں ستاتے ہو، میں غریب آدمی ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی ہنسی نکل گئی، آپؐ کی آواز سے اس نے پہچان لیا کہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو وہ برابر پیچھے ہٹتے رہے یہاں تک کہ ''أَلْصَقَ ظَهْرَهُ بِصَدْرِ النَّبِيِّ ﷺ'' اپنی پیٹھ کو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے سینہ سے ملا دیا اور کہا کہ یہ وقت کب آئے گا مجھے کب ایسا وقت ملے گا تو رسولؐ اللہ نے ویسا کا ویسے ہی اٹھا لیا چھوٹا سا تو تھا ہی وہ بیچارہ پتلا دبلا چھوٹے قد کا تو ایسے ہی اٹھا لیا آپؐ نے ہاتھوں میں اور فرمایا: ''مَنْ يَشْتَرِيْ هٰذَا الْغُلَامُ'' کون اس لڑکے کو خریدتا ہے تو ان کے دل میں یہ آیا کہ میں واقعی بالکل بیکار ہوں، سب لوگ ستاتے ہیں، دھکے دیتے ہیں رسول اللہ ﷺ بھی بولی لگا رہے ہیں، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں میرا کوئی وزن نہیں ہوگا تو پوچھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہیں کہ پھر تو میں بالکل بیکار ہوں'' إِذًا وَاللّٰهِ وَجَدْتَنِي كَاسِلًا'' آپؐ نے مجھ کو بالکل بیکار سمجھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اتار دیا اور فرمایا: ''وَلٰكِنْ لَسْتَ عِنْدَ اللّٰهِ بِكَاسِلٍ'' اللہ تعالیٰ کے یہاں تُو بیکار نہیں ہے، اللہ رب العالمین کے یہاں تیرا مقام و مرتبہ وہی ہے جو کسی بھی ایک مومن کا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اس کے محبوب کا مرتبہ ہے وہی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو دے رکھا، دیکھا آپؐ نے اس شخص کو کہ جسے اونچے طبقے کے لوگ ہاتھ لگانا بھی توہین سمجھتے تھے، ہمارے رسول اللہ ﷺ کا ایسوں کے ساتھ کیا سلوک تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص اپنے نسب پر فخر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل کر دے گا جو اپنی ناک سے میل اور بول و براز کو لڑھکا کر آگے لے جاتا ہے اس سے بھی زیادہ ذلیل کر دے گا اللہ تعالیٰ اس شخص کو جو اپنی خاندانی شرافت دکھائے گا اور خاندانی شرافت پر فخر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اس کیڑے سے زیادہ ذلیل کر دے گا۔

صحیح بخاری شریف میں آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه'' جس کے عمل نے اس کو پیچھے رکھ دیا اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکے گا۔

اللہ رب العالمین نے شریعت کی باتوں سے نفرت کرنے والے منافقوں کو فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ﴾ (التوبة:۹/۵۶)

یہ تو فرقہ الگ بناتے ہیں، یہ الگ طبقہ بنا رہے ہیں اور یہ منافق لوگ اگر اپنی جگہ دیکھیں ابھی تو ان کو غنیمت کا مال ملتا ہے اور اس کی آس ہے اس کی طمع ہے ان کو اس لیے بظاہر وہ نمازوں میں اللہ و

رسولؐ کا نام لے رہے ہیں یہ اللہ و رسولؐ کا نام لینا اور عبادت کرنا اور ذکر و اذکار کرنا اور اس کے لیے دوڑنا پھرنا یہ بالکل الگ بات ہے اور شریعت کی ہر بات کو دل میں اتار لینا اور ہر شریعت کے فتوے کو اور ہر مسئلے کو دل کے اندر اتار لینا یہ بالکل الگ ہی بات ہے، یوں تو عبادت و ریاضت کرنے والے غلط مسلکوں کے اندر بھی آپ کو مل جائیں گے، شیعوں اور قادیانیوں کو آپ نے خارج اسلام کہہ دیا ہے، دیکھیے راتوں کو ذکر و فکر میں کس قدر منہمک رہتے ہیں اور دن میں کس طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کے حوالے دے کر وہ مسائل بتاتے ہیں اس کے باوجود وہ مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ بن گئے۔

پہلا طبقہ تھا صوفیوں کا، ان سے جب کہا جاتا تھا کہ تم لوگ عبادت کیوں نہیں کرتے؟ تو کہتے تھے کہ ہمارے دل اللہ کی محبت سے بھرے ہوتے ہیں اور محبت کا ثبوت یہ تھا کہ جو ان کی خانقاہ تھی وہاں یہ صوفی جمع ہوتے اور قرآن مجید کی تلاوت ہوتی، تو کوئی کھڑے کھڑے دھم سے گرتا اور کوئی بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو جاتا، اس کے اوپر عرق گلاب چھڑکا جاتا اور بڑی تعریف ہوتی کہ کتنا اللہ والا ہے، کیسا اللہ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے کہ قرآن مجید پڑھا گیا اور شہیدوں کی طرح بیہوش ہو کر گرا، کتنا اس کے اوپر اثر ہوتا ہے قرآن کا، تو اس کے اوپر کوئی ناریل چڑھا رہا ہے، کوئی کچھ چڑھا رہا ہے، جب یہ خانقاہ بنی ہے اور لوگوں کے اندر اس کی باتیں پھیلیں کہ بڑے اللہ والے لوگ ہیں۔

شدہ شدہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک یہ بات پہنچی کہ بعض لوگ قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ لوگ قرآن کے پڑھنے والے ڈھونگی ہیں، بہروپیے ہیں، ان کے اوپر اثر کچھ نہیں ہوا، یہ ڈھونگ رچاتے ہیں اور یہ ریاکار، مکار لوگ ہیں، ان صوفیوں کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس وقت بتا دیا جب آپ نابینا ہو گئے تھے کہ یہ لوگ ڈھونگی ہیں، سوانگ رچا رہے ہیں، لوگوں نے آپ سے کہا کہ کہا نہیں حضرت ان پر قرآن پڑھنے کا اثر ہوتا ہے تو آپ نے کہا نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ (الزمر:۳۹/۲۳)

قرآن مجید پڑھنے پر ایمان والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے بتایا، یہ نہیں بتایا کہ دھم سے گرتے ہیں، بیہوش ہو جاتے ہیں، تو پھر کیا کریں گے، یہ جو لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں، ان پڑھنے والوں کے گھر کے مکان کے ایک منزلہ دو منزلہ گھر کی منڈیر کے اوپر بٹھا دو،

پاؤں ان کے ادھر کردو پھر ایک اچھا پڑھنے والا خوش الحان قاری قرآن مجید کی تلاوت کرتا جائے، پھر دیکھنا ہے کہ منڈیر پر بٹھائے ہوئے ان صوفیوں میں سے ایک بھی نہیں گرے گا اور اگر کوئی گرے گا بھی تو چھت کے اوپر گرے گا، باہر کوئی بھی نہیں گرے گا، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو اسی وقت مکار بتادیا۔

اور پھر نماز جس میں کاندھے سے کاندھا ملا کر سب کھڑے ہوتے ہیں اس کے اندر ایک ایسا جملہ ہے کہ: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

''اے اللہ ایسے لوگوں کا راستہ عطا فرما جن کے اوپر تو نے انعام کیا ہے۔''

اگر ایک شہنشاہ ہے تو اس کو بھی یہ دعا مانگنی پڑے گی، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا پرستار، شریعت پر چلنے والا ہے تو اس کو بھی یہ دعا مانگنی پڑے گی کہ اے اللہ جن بندوں کے اوپر تیرا انعام ہوا ہے، اس شہنشاہ کو بھی ان کی راہ پر چلا، چاہے وہ ابوالاسود جیسا کالا ہو یا بلال حبشی جیسا نادار ہو کیسا بھی ہو، اس کے اوپر اگر انعام کیا ہے تو وہ بادشاہ دعا مانگ رہا ہے کہ اے اللہ ہم کو ایسے لوگوں کی راہ عطا فرما اور ایک نادار ہے غریب ہے، وہ اگر دعا کر رہا ہے اور دیکھا کہ وہاں پر ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی تھے انعام پانے والوں میں تو دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ جن کے اوپر تیرا انعام نازل ہوا ان کی راہ ہم کو عطا فرما، اب ان بے حیثیت بے وقعت لوگوں کو خلفاء راشدین جیسی راہ ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ دیتا ہے، کہاں رہی طبقہ واریت، کہاں رہی اونچ نیچ اور کہاں رہے اونچے نیچے خاندان۔

اور پھر اس کے بعد میں التحیات میں بیٹھ رہے ہیں، بیٹھ کر کہہ رہے ہیں کہ: ''السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین'' ایک نادار آدمی بھی، ایک فقیر آدمی بھی اور ایک بادشاہ بھی یہی کہہ رہا ہے کہ ایسے لوگوں کی راہ عطا فرما، ایسے لوگوں پر سلام نازل فرما جو تیرے بزرگ ہیں اور تیرے پیارے بندے ہیں ان کے اوپر ہماری طرف سے سلام نازل فرما، اب یہ سلام ان کو بھی پہنچے گا جو کالے کلوٹے تھے۔

اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ اگر تم نے ایمان لانے کے بعد ہمارے رسول ﷺ سے نیک عملوں کو سیکھ لیا اس کے اوپر عمل کر لیے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ تم کو زمین میں خلیفہ بنادے گا، تمھی تم ہو گے سارے غائب ہو جائیں گے اور تمہارا وہ دین جس سے اللہ راضی ہے اس کو برقرار کردے گا زمین میں، ﴿دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ (النور:٢٤/٥٥) اس دین کو برقرار کردے گا، پھر کسی ایک مسئلے کے لیے بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی جو ہمارے لیڈروں نے ہم کو سکھلا دیا، پھر فرمایا اللہ تعالیٰ

نے:

﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا﴾(النور:٢٤/٥٥)

اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا اگر یہ ضمانت ہے، تو صرف اور صرف اس میں کہ جو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا: "لا إله إلا الله" کے لیے اور اپنی اتباع کے لیے اسی کے اندر یہ انعام مل سکتا ہے، باقی روئے زمین کے اوپر یہاں سے لے کر وہاں تک، مشرق سے مغرب تک کوئی کسی کو بھی ڈھونڈ لیجئے کوئی ایک ایسا نہیں ملے گا، جس کی اتباع اور بات ماننے میں اللہ نے وہ انعام رکھا ہو جو نبیٔ ہاشمی مطلبی قریشی آمنہ کے لال عبداللہ کے بیٹے عبدالمطلب کے پوتے کی تابعداری میں اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے، وہ انعام کہیں نہیں مل سکتا، اللہ تعالیٰ اسی کا ہم کو مستحق بنا دے اور پروردگار ہماری گوتوں کو اور ہماری پھوٹ کو، فرقہ واریت کو، طبقہ داری اور اونچ نیچ کو اپنی رحمت وفضل سے دور فرما دے، آمین!

وصلى الله على النبى الكريم!

دعوت دین ہمارا انفرادی اور اجتماعی فریضہ

مولانا مختار احمد ندوی صاحب، امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث، ہند

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (سبا:٣٤/٤٦)

رب العالمین کی حمد وثنا کے بعد میں اپنے محبوب نبیؐ، اس دنیا کے سب سے سچے انسان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ ہم یہ سارا ذکر مسلمانوں میں کرتے ہیں اگر آج یہاں بنارس کے غیر مسلم ہوتے تو ہم ان کو بتاتے کہ ہم مسلمان کن کا ذکر کر رہے ہیں اور وہ کون تھے اور آج ہم نے کن کو بھلا دیا ہے، اگر ہم ان کو یاد کریں، ان کی صحیح سیرت سامنے لے کر آئیں تو ہمارا یہ ملک جنت نشان بن جائے گا، انھوں نے گڈریوں کے ہاتھ میں حکومت کی لگام دے دی تھی اور زندہ درگور ہونے والی بیٹیوں کو انھوں نے دنیا میں امہات المؤمنینؓ بنا دیا تھا، آج اس نبیؐ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، میرے بھائیو! ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم ہندوستان میں اپنی وہ پاک آواز، وہ مقدس کلام وہ عظیم پیغام جس سے دنیا کی تاریخ بدلی سب سے زیادہ پھیلائیں۔

اللہ رب العالمین اس آیت کریمہ میں (جسے میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیا ہے اور یہ آیت ہم سب مسلمانوں کے غور کے قابل ہے) فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (سبا:٣٤/٤٦)

اے نبیؐ! کہو آج میں تم کو صرف ایک بات کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں أن تقوموا للّٰه، تم سب اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اس کا پیغام لے کر اس کی مرضی پوری کرنے کے لیے اپنی زندگی میں کھڑے ہو جاؤ، مستعد ہو جاؤ، زندگی کا سب سے بڑا پروگرام رب العالمین کے کلام کو اس کے دین کو اس کی مخلوق تک پہنچانے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ، ہماری زندگی کا سب سے بڑا کام، سب سے بڑا پروگرام یہ ہو کہ ہم اللہ کا کلام اللہ کے بندوں تک پہنچائیں، اس ملک میں ہم زندہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے امتی کی حیثیت سے، اس امتی کا فرض ہے کہ اس ملک کو جو ابھی بھی محمد ﷺ سے غافل ہے، محمدیؐ پیغام سنائیں، ابھی بھی ہندوستان میں بسنے والے ہمارے بہت سارے ایسے بھائی موجود ہیں جو بنارس کے بہت سارے مندروں میں نہیں جا سکتے، میرے بھائیو! بہت سارے ہمارے ایسے مسلمان بدنصیب ہیں جو بہت ساری مسجدوں میں داخلے سے محروم ہیں، یہ جو اونچ نیچ ہے یہ میرے بھائیو! اس لیے ہے کہ ہم محمد ﷺ کا پیغام نہ سمجھے نہ سمجھا سکے، اگر ہم سمجھتے اور سمجھاتے تو یہ ماحول نہ ہوتا، نہ آج کوئی دلت ہوتا نہ کوئی اپنی برہمنیت پر فخر کرتا نہ کوئی سید کہہ کر فخر کرتا نہ کوئی اپنے کو قریشی کہہ کے شرماتا، میرے بھائیو! یہ سارا بھید بھاؤ ختم ہو جاتا، اس لیے کہ اللہ کے دین کی رحمت عام ہوتی ہے، سب کے لیے برابر برابر، اس رسولؐ نے یہی کہا تھا، افسوس کہ ہم اپنے رسولؐ کو بھول چکے ہیں۔

اللہ فرماتے ہیں: ''قل إنما أعظكم بواحدة أن تقوموا للّٰه'' کہو میں تم کو ایک بات کی نصیحت کر رہا ہوں کہ تم اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اکیلے ہو تو اکیلے کھڑے ہو جاؤ، اگر تم اکیلے ہی اس پیغام کو سمجھ سکے ہو تو مت دیکھو کہ تمھارا کوئی ہمنوا تمھاری آواز میں آواز ملانے والا تمھارا کوئی ساتھی یا تمھاری بات سننے والا کوئی تمھارا موافق موجود ہے یا نہیں، اکیلے ہی ابراہیم علیہ السلام کی طرح کھڑے ہو جاؤ ''إن ابراهيم كان أمة'' ابراہیمؑ اپنے پیغام میں جامعیت رکھتے تھے اور اسی جامعیت کے اعتبار سے اپنے پیغام کو اپنے وقت میں اکیلے کھڑے ہو کر لوگوں تک پہنچایا اور ایک امت کا کام کر گئے، میرے بھائیو! اس امت کی طرح کھڑے ہو جاؤ، ''مثنی وفرادی'' دو ہو تو دو اور ایک ہو تو ایک ہی کھڑے ہو جاؤ، ''ثم تتفكروا ما بصاحبكم من جنة'' پھر سوچو کہ تمھارے اس ساتھی کو یعنی تمھارے اس رسول کو جو اللہ کے لیے کھڑے ہیں بیقرار ہیں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر موقع پر جن کا ایک ہی عمل ہے اور جن کی زندگی کا ایک ہی کام ہے اور جن کو ایک ہی دھن ہے کہ:

حلقے پس دیوانہ و دیوانہ بہ کارے

دنیا پتھر مار رہی ہے اور اللہ والا پتھر کھا کر اس دنیا میں پھول برسا رہا ہے، میرے بھائیو! یہ بے چینی، یہ کسک، یہ بیداری، یہ بیقراری، یہ اضطراب امت کے لیے تمھارے اندر بھی ہونا چاہیے،

یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی خصوصیت تھی، رب العالمین نے اپنے نبیؐ کے ذریعے ہم تمام مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہے کہ نبیؐ کی سنت پر اگر عمل کرنا چاہتے ہو تو نبیؐ کی سیرت پڑھو، نبیؐ کی سیرت اختیار کرو، تمھاری زندگی میں جب تک اس چیز کو پہنچانے کی بیقراری اور بے چینی پیدا نہیں ہوگی تم نبی کا نام لینے کے حقدار نہیں ہو، فرمایا (إن هو إلا نذير لكم بين يدي عذاب شديد) وہ تمھیں ایک بہت بڑے سخت عذاب سے ڈرا رہا ہے، اس نے دیکھا کہ پس دیوار ایک بہت بڑا طوفان برپا ہے، اس نے دیکھا کہ اس پہاڑی کے نیچے ایک بہت بڑا لشکر ہے جو حملہ کرنے والا ہے، اس نے دیکھا کہ اللہ کی مخلوق اگر سوتی رہ گئی تو دب کر مر جائے گی، بچاؤ، ان کو آپؐ فرماتے ہیں: ''میں تمھاری کمر پکڑ کے جہنم سے کھینچ رہا ہوں تم مجھ کو جہنم کی طرف کھینچ رہے ہو۔''

اللہ کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا اور آپ کی سیرت پاک کا سب سے اہم ترین عنوان یہی تھا کہ آپؐ اس امت کے لیے انتہائی بیقرار آدمی تھے، آپؐ میں جو بے چینی اور آپؐ میں جو کسک اور آپؐ میں اس امت کی ہدایت کے لیے جو اضطراب موجود تھا تولا نہیں جاسکتا، کسی وزن سے مثال پیش نہیں کی جاسکتی اس کی، لہٰذا امت رسولؐ کو آج سب سے بڑا سبق اپنے پیغمبر کا یہ مل رہا ہے کہ جس ملک میں ہم ہیں اس ملک میں محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک گھر گھر پہنچائیں، کہیں زبان سے کہہ کر کہیں، پریس کے ذریعے، کہیں عمل کر کے، ہمارا عمل ہمارا پڑوسی دیکھے گا، ہمارے ساتھ ہمارا غیر مسلم پارٹنر اور غیر مسلم کام کرنے والے وہ سارے افراد دیکھیں گے جن کا ہم سے واسطہ پڑے گا، وہ ہمیں دیکھ کر محسوس کر لے کہ یہ محمدیؐ ہے کہ جب بھی ملتا ہے اچھائی کے لیے بے چین رہتا ہے، اس کے اندر یہ اضطراب کہاں سے آیا، یہ اس کے رسولؐ کا دیا ہوا ہے، یہ اس کے رسولؐ کی سیرت ہے۔

میرے بزرگو اور بھائیو! کیا میں اللہ کے یہاں پکڑا نہیں جاؤں گا اور کیا ہندوستان کا مسلمان اللہ کے یہاں جواب دہ نہیں ہے کہ اب بھی اس ہندوستان کے اندر لڑکیاں زندہ درگور ہو رہی ہیں اور اپنے شوہروں کی چتا پر اب بھی جلائی جا رہی ہیں اور ہم بیٹھ کر میلاد پڑھ رہے ہیں، قوالی، عرس اور مشاعرے کر رہے ہیں، بارہویں اور گیارہویں کر رہے ہیں اور ہمارے درمیان علماء کی کمی نہیں، ہم قادری ہیں اور ہم چشتی ہیں اور پتہ نہیں کتنے ہم جنوری فروری میں پڑے ہوئے ہیں یہاں پر، مگر کہاں گیا ہمارا وہ پیغام؟ لہٰذا محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک کا بیان نہ کر کے اس ملک پر ہم ظلم کر رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ میں ہی مجرم ہوں اور میں اپنے آپ کو مجرم قرار دیتا ہوں اس بات کے لیے

کہ اس ملک میں جو فضا مجھ کو تیار کرنی تھی وہ فضا میں نے تیار نہیں کی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جہالت باقی ہے، یہ نفرت باقی ہے، یہ عداوت باقی ہے، آج ہم اپنا مقصد حیات بھول چکے ہیں اس لیے میں آپ سے کہوں گا سیرت نبیؐ کا عنوان سننے والے مسلمانو! اس سیرت کے ذریعے کان کو صرف لذت نہیں دینی چاہیے، عمل کی دعوت دینی چاہیے، یہ ذمہ داری ہے، رسولؐ کا ذکر، آپؐ کے اعمال کا ذکر ہے، آپؐ کی حیات طیبہ کا ذکر ہے، ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جو ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے، اگر ہم ایمان رکھتے ہیں، ہمارے اندر اس بات کا احساس ہے تو میرے بھائیو اس بات کو یاد رکھو، جناب محمد رسول اللہ ﷺ غیب جانتے تھے یا نہیں، آپؐ کا سایہ تھا یا نہیں تھا، آپؐ کے استنجاء و پیشاب و پاخانہ میں بوتھی یا نہیں تھی یا آپؐ نور کے تھے یا اور کسی چیز کے، ان بحثوں میں تم کیوں پڑے ہوئے ہو، تم کو کیا ملے گا ہندوستان میں، تم کسی غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دے سکتے ہو تو آؤ اور محمد رسول اللہ ﷺ کو پہچانو، محمدؐ کہاں ہیں اور کس سیرت میں ہیں؟ محمدؐ کہاں ہیں اور کس سیاست میں ہیں؟ اس سے پورا ملک ناآشنا ہے، لوگ اب بھی جنگلوں کے قانون میں آباد ہیں اور ہم ہیں کہ محمد ﷺ کے نام پر ہم اسٹیج سجا سجا کے اور نعت پڑھ پڑھ کے اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہیں۔

بزرگو اور بھائیو! پھر اس آیت کو یاد کرو"

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾(سبا:٣٤/٤٦)

کہہ دو میں آج تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، دو ہو تو دو اکیلے ہو تو اکیلے پھر سوچو تمھارے اس ساتھی کو جنون نہیں جو رات دن اس خلق خدا کی ہدایت کے کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ایک بہت بڑے مستقبل کے خطرے سے تم کو بیدار کر رہے ہیں، تو میرے بھائیو! سیرت نبوی ﷺ کا سب سے بڑا عنوان یہی ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے لیے بھی اور اس مخلوق خدا کی ہدایت کے لیے بے چینی پائیں، میرے بھائیو! میرے رسول ﷺ کو صحن کعبہ میں کھڑا کیا گیا، لوگ لائے پکڑ کے اور ابو طالب سے کہا آپ کے بھتیجے کیا کچھ کہہ رہے ہیں، ہماری ساری قبائلی تاریخ اور پورے عرب کی تاریخ کو یہ ملیا میٹ کر رہے ہیں اور ایک ایسے ان دیکھے خدا کا ذکر کر رہے ہیں جن کو ہم نے اپنے باپ دادا سے سنا نہیں، کب تک برداشت کریں گے، آپ کی لاج ہے آپ بزرگ ہیں، آپ راستے سے ہٹئے پھر ہم دکھا دیتے ہیں، ابو طالب نے جب سنا کہ معاملہ بہت آگے جا چکا ہے اور اب تاریخ اس موڑ پر آچکی ہے کہ یا تو میں اپنے بھتیجے کے کندھے پر ہاتھ رکھوں یا

ہٹالوں، بہرحال انھوں نے قوم پرستی سے کام لیا اور اس وقت سارے مجمع کے سامنے یہ اعلان کیا ''لا تحملنی ما لا أطیق'' محمدؐ! اب میرے کندھے پر وہ بوجھ نہ رکھو جس کو میں اٹھا نہیں سکتا، آج سے میں تمھاری کفالت سے بری ہوتا ہوں، آج ابو طالب نے محمد ﷺ کو اپنی قوم کے حوالے کر دیا کہ جو چاہیں کریں، لیکن میرے رسول کا اس وقت کون سا جذبہ تھا، کیا جواب دیا، کس عزم کا اظہار کیا، ان حالات کا تو آپ اندازہ کیجیے، کیا ہندی مسلمان کو کبھی عدالت میں اس طرح کھڑا کیا گیا، یکہ وتنہا؟ نہیں میرے بھائیو!

حضور ﷺ نے فرمایا: ''یا عم! إن وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی شمالی علی ان أترك هذا الأمر ، والله ما ترکته حتی یأتی الله بأمره أو أهلك فیه''

عم محترم! اگر ناممکن کو یہ لوگ ممکن بنادیں یعنی سورج کو توڑ لائیں اور میرے داہنے ہاتھ میں دے دیں اور چاند کو توڑ لائیں اور میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تاکہ میں دین کی تبلیغ سے علیحدہ ہو جاؤں ،خدا کی قسم اگر یہ ناممکن ممکن بھی ہو جائے تو یہ ممکن نہیں کہ میں اللہ کے دین کی تبلیغ سے، بندگان خدا کی ہدایت سے رک جاؤں، تب لوگوں نے سوچا کہ یہ ایک ایسی اونچی چٹان پر کھڑے ہیں، اعتماد، یقین عزم کامل کی اس چٹان پر کھڑے ہیں جس کی صلابت اور سختی کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

میرے بزرگو اور بھائیو! آپؐ طائف تشریف لے گئے ،لوگ منتظر تھے ایک دکان پر آپؐ گئے اور کہا: ﴿إنی رسول الله إلیکم جمیعًا﴾ (الاعراف ۷: ۱۵۸) میں ہی وہ محمدؐ ہوں جس کو اللہ نے تم سب لوگوں کی جانب رسول بنا کر بھیجا ہے، اچھا آپؐ ہی ہیں؟ آپؐ ہی کا بہت دنوں سے مکہ والے ذکر کر رہے ہیں؟ اچھا آپؐ تشریف لائیے، پھر اس ساہوکار نے اپنے دکان کے ملازم کو حکم دیا کہ ہٹاؤ ان کو، ہاتھ پکڑ کر بھگاؤ یہاں سے، جب تک دوسرے دوکاندار کو خبر ہوئی اور تیسرے کو ہوئی چوتھے کو ہوئی شہر پورا کا پورا جمع ہو گیا، گالیاں، طمانچے اور تھوک، مار کس طرح وہ جلوس نکلا اللہ اکبر کیسا جلوس؟ حضرت زیدؓ بن حارثہ ساتھ تھے، وہ فرماتے ہیں: کہ جب میں قرن الثعالب کے موڑ پر پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ غش کھا کر گر پڑے ہیں اور بیہوشی کے عالم میں ہیں، ذرا ہوش آیا تو آپ ﷺ فرما رہے تھے ''اللّٰهم أشکو إلیك ضعف قوتی وقلة حیلتی وهوانی علی الناس'' اے رب العالمین! تیری بارگاہ میں آج اپنا شکوہ پیش کر رہا ہوں، مولیٰ تیری مخلوق کے درمیان آج بہت رسوا کیا گیا ہوں، اے رب العالمین اگر یہ تیرا عذاب ہے تو میں اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں، یہ تاریخ کا وہ سچا واقعہ ہے جسے ہر مسلمان طالب علم بلکہ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔

میرے بھائیو! حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہا (قد سمع الله ما

قالوا لك) ابھی طائف والوں نے جو کچھ کہا ہے اللہ نے سن لیا ہے اور ''هذا ملك الجبال'' یہ پہاڑوں کا فرشتہ ساتھ میں ہے، مجھے اللہ نے پہاڑوں کے فرشتے کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے، پہاڑوں کا فرشتہ سامنے آتا ہے اور کہتا ہے یا محمد! ''ذلك لك'' اے محمدؐ! آپؐ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ جنھوں نے ابھی پتھروں سے مارا ہے، آپؐ انھیں پہاڑوں سے جواب دے سکتے ہیں ''لئن أمرتني أطبقت عليهم الأخبشين'' اگر آپؐ مجھے حکم دیں (تو جو حضرات طائف گئے ہوں گے ان کو طائف کا جغرافیہ معلوم ہوگا کہ طائف پہاڑیوں کا ملک ہے) تو طائف کی ان دو پہاڑیوں کو چکی کے دو پاٹوں کی طرح ملا کے آپؐ کو گالی گلوچ دینے والے سارے شہر کو پیس کر رکھ دوں، لیکن میرے بھائیو! یہ اضطراب تھا، بے چینی تھی، حرص تھی اور لالچ تھا کس چیز کا، اس چیز کا یہ کہ امت سدھر جائے، یہاں میرا پیغام سننے والے زندہ رہ جائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا یہ خود ایک سیرت کا عنوان ہے اور بہت بڑا عنوان، کہ ساری زندگی آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا جو کچھ لڑائیاں ہوئیں وہ حکم الٰہی اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ہوئی ہیں، آپؐ نے فرمایا: ''بل أرجو أن يبعث الله من أصلابهم من يعبدوا الله ولا يشركوا به شيئا'' نہیں میں تم کو اجازت نہیں دے سکتا کہ تم پہاڑوں کو ایک کردو، مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ طائف کے اس شہر سے وہ قوم پیدا ہوگی جو اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرے گی، موحدین کا یہ شہر بہت جلد بسنے والا ہے، حضورؐ کی زندگی میں ہی طائف فتح کیا گیا، محمدی جھنڈا ''لا إله إلا الله'' وہاں لہرایا گیا اور آج تک لہرا رہا ہے، پھر اس کے بعد طائف کبھی غیر مسلم نہیں بنا ''لا إله إلا الله محمد رسول الله'' کا وہ جھنڈا آج بھی لہرا رہا ہے جہاں حضور ﷺ کی لاہوتی آواز گونجی تھی ''بل أرجو أن يبعث الله من أصلابهم من يعبدوا الله ولا يشركوا به شيئا'' میرے بھائیو! ہم کو اس ملک میں اس بات کو پیش کرنا چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ صرف قصہ کہانی نہیں تھے، وہ اٹھک بیٹھک کی مجلسوں میں آنے جانے والے نہیں تھے، جلوس نکال کر جذباتی نعرہ لگانے والے رسولؐ نہیں تھے، بلکہ وہ اس دنیا میں انقلاب لانے والے ہادیٔ برحق تھے، انھی کی وجہ سے یہ شمع روشن ہوئی، اگر آپؐ نہ آتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔

میرے بھائی اگر موحد انسان ہے اور اسلام جیسا دین رحمت اس کے پاس ہے تو کہیں خوف نہیں، ہم نے ہندوستان میں دین چھوڑ رکھا ہے، ہم نے قبریں پکڑ رکھی ہیں، ہم نے رسوم و روایات کو پکڑ رکھا ہے، ہم شرک کی پرورش کر رہے ہیں، ساری بدعات کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، تعلیماتِ محمدی ﷺ کہاں ہیں، آپ کا دین کہاں ہے، آج جب ہم ڈھونڈتے ہیں قرآن مجید میں حضرت محمد ﷺ

کو تو اس کے اوراق پر آپ کی سیرت کے جلوے نظر آتے ہیں لیکن ہماری زندگی میں نظر نہیں آتے، جو محمدؐ ہمارے درمیان نظر آتے ان کو لوگ عرش الٰہی پر مستوی قرار دیتے ہیں، جو نظر آتے ہیں وہ عالم الغیب اور نعوذ باللہ لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے والے نظر آتے ہیں، قرآن مجید میں اس پیغمبر کا کہیں ذکر نہیں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن سے حضرت محمد ﷺ کی سیرت کے نقشے کو نکالا جائے، احادیث صحیحہ سے نکالا جائے اور دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دو ہو تو دو اکیلے ہو تو اکیلے ایک بھی کہا اور دو بھی کہا یعنی تعداد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اکیلے ابراہیم علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیوں جوڑا جاتا ہے آپ نے کبھی اس پر غور کیا، حضور اکرم ﷺ کا کم سے کم چار پانچ جگہ قرآن میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (النحل:۱۶/۱۲۳)

"اے محمدؐ! ہم نے آپ کی طرف یہ وحی کی کہ آپ ﷺ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کیجئے، وہ مشرک نہیں تھے۔"

معلوم ہوا کہ جس کے شرک نہیں ہے تو سب کچھ اس کے پاس ہے۔ رب العالمین فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (الانعام:۶/۱۶۱)

کہہ دو کہ میرے رب نے مجھے ہدایت دی ہے، صراط مستقیم کی طرف، کون سی صراط ﴿دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ ایک ایسے سیدھے دین کی جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا، جو اللہ کے سوا سب کی طرف سے منہ پھیر چکے تھے، وہ مشرک نہیں تھے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (البقرہ:۲/۱۳۵)

لوگ کہتے ہیں یہودی یا عیسائی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے، اللہ فرماتے ہیں نہیں ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، وہ ابراہیم جو مشرک نہیں تھے، معلوم یہ ہوا کہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا پروگرام شرک کو مٹانا اور توحید کو پھیلانا ہے، اس توحید کے اندر کوئی ملاوٹ اور کھوٹ نہ ہو، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الانعام:۶/۸۲)

کیا عجیب وغریب آیت یاد آ گئی میرے بھائیو! جو لوگ ایمان لے آئے اور اپنے ایمان میں شرک کو نہیں ملایا یعنی شرک کر کے ظلم کے مرتکب نہیں ہوئے۔ دنیا میں امن و عافیت انھی کو ملتی ہے، جو توحید میں شرک کی آمیزش نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾(لقمان:۳۱/۱۳)

"اے میرے بیٹے شرک نہیں کرنا شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔"

اب ہم اللہ تعالیٰ سے بھی مانگیں اور غیر اللہ سے بھی مانگیں، روزانہ ہم قبروں کا جا کر طواف کریں اور اللہ کا نام لیں، پھر کہاں سے امن ملے گا کہاں سے عافیت ملی گی، اس لیے میرے بھائیو! ابراہیم علیہ السلام کا نام خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، یہ سیرت پاک، ایک اہم عنوان ہے، ہماری زندگی میں ایک بیقراری پیدا ہونی چاہیے اس امت کی ہدایت کے لیے اگر اس امت کو ہم نے اس کے حال پر چھوڑ دیا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اعراض برتا اور فریضہ انجام نہ دیا بحثیت ایک پیغامبر کے تو ہم بہت بڑا قصور کریں گے، دنیا کو ہم جاہل چھوڑ کر جائیں گے، تا ہم ہندوستانی مسلمانو! ہم ذمہ دار ہیں ہندوستان کی ہدایت کے، ذمہ دار ہیں ہندوستان میں اسلام پھیلانے کے، لہٰذا ہمیں اس فریضے کی طرف آنا چاہیے، سیرت پاک کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حقیقی زندگی کو ہندوستانی سماج میں اپنایا جائے۔ اپنی زندگیوں کو حضورؐ کے سانچے میں ڈھال کر غیر مسلموں کے سامنے بطور شہادت پیش کیا جائے، اس طریقے سے ہم ہندوستان کی سوسائٹی میں، ہندی سماج میں کھپ جائیں گے، اس میں اپنے ایمان کے ساتھ اپنی ثقافت کے ساتھ، اپنے رسولؐ کی سنت کے ساتھ، ان کی شریعت اور ان کے آداب وقوانین کے ساتھ پھر آپ دیکھیں ملک کیسے نہیں بدلتا، یقیناً بدلے گا ہم تو (أنتم شهداء الله في الأرض) اس زمین پر ہم اللہ کے گواہ ہیں، کیا گواہی دے دی ہم نے، میرے بھائیو! کبھی کبھی مظاہرہ ہمیں کرنا چاہیے جلوس نکالنا چاہیے، اس بات کے لیے کہ اللہ کو یاد کرو، ظلم مت کرو، چوری مت کرو، بدمعاشی مت کرو مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے میدان، ہماری گلیاں، ہمارے مکان، ہمارے محلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خریطے اور اس نقشے کے خلاف ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا کے دیا تھا۔

میں ایک چھوٹی سی مثال دے رہا ہوں تا کہ ہم غیر مسلم دنیا کے سامنے ایک اچھی سی تعبیر پیش کر سکیں، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا اور فرمایا کہ "لا يشهد اليوم من آذى جاره"، "یعنی اسے فوج میں نہیں لیا جائے گا جس نے پڑوسی کو ستایا ہوگا۔" ایک مرتبہ فوج بھیجنے کے لیے نام لکھائے

جار ہے تھے تو آپؐ نے اسی میں اعلان کر دیا اس آدمی کا نام نہیں لکھا جائے گا جس نے اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی، ایک صحابی نے یہ سوچا کہ کہیں حضور ﷺ کا یہ جملہ میرے ہی اوپر تو نہیں چسپاں ہوتا، اس نے کہا ''یا رسول اللّٰه! إنی أنلت فی أصل حائط جاری» یارسول اللہؐ! میں نے اپنے پڑوسی کی کھڑکی کے نیچے دیوار کی سطح پر پیشاب کیا ہے تو کیا یہ بھی پڑوسی کو تکلیف دینا ہے، نام لکھا سکتا ہوں کہ نہیں یعنی محمدیؐ فوج میں میرا نام لکھا جاسکتا ہے کہ نہیں دیکھو محمدیؐ لشکر کے جانباز نے کیسا خدا ترسی پر مبنی جواب دیا، میرے بھائیو! ہمارے محمد ﷺ کی یہ تہذیب تھی، یہ اسلامی کلچر تھا ذرا اپنا کلچر آج کا یاد کرو، آپ ﷺ نے فرمایا: ''إنك آذيت الله ورسوله'' تم نے پڑوسی کو نہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: جب ہر روز صبح کو سورج طلوع ہوتا ہے تو تمھارے جسم کے ہر جوڑ کے بالعوض ایک صدقہ واجب ہوتا ہے، ایک صحابی نے کہا یا رسولؐ اللہ! ہم میں سے کون اتنا مالدار ہے کتنے جوڑ ہیں انسان کے جسم میں؟ کہا تین سو ساٹھ (۳۶۰) کہا تین سو ساٹھ صدقہ صبح سے شام تک دو، دن بھر میں ملا کر، ایک نے کہا ''أينا يطيق ذلك'' ہم میں سے کون اس کی سکت رکھتا ہے، تو آپ ﷺ نے ان صدقات کی تفصیل بتائی، سنو محمدیو! کاش کہ ہندوستان میں ہم اس پر عمل کیے ہوتے! آپؐ نے فرمایا: ''تبسمك فی وجه أخيك صدقة'' تمھارا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا صدقہ ہے، تمھارا اپنے بھائی کے ڈول میں اپنے ڈول سے پانی نکال کر دے دینا صدقہ ہے، فرمایا: کمزور کو سواری پر سوار کرا دینا صدقہ ہے، یہ مت سمجھنا یہاں اہل حدیث کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ صرف اہل حدیث کو سواری پر بٹھائیں، نہیں بھائی ہر انسان کے متعلق کہا جا رہا ہے، یہاں یہ بات انسانیت کی ہو رہی ہے اس لیے کہ دنیا میں دو برادریاں ہیں کوئی تیسری برادری نہیں ایک انسانی برادری ہے جو اللہ کی مخلوق ہے جو ایک خالق کی مخلوق ہو کر ہمارے بھائی ہیں، ساری دنیا کے انسان ''كلكم بنو آدم وآدم من تراب'' آدم علیہ السلام کی اولاد، سب ہمارے بھائی ہیں، اور ایک اسلامی برادری ہے، اسلامی برادری کا حق اس انسانی برادری پر ہے کہ وہ ان کو بھی اسلامی برادری بنائے، وہ تہذیب سکھائے کہ دونوں برادریاں ساتھ ساتھ آباد رہیں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تمھارے اوپر ہر جوڑ کے بدلے صدقہ ہے، سواری پر سوار کرانے میں مدد دینا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا اور فرمایا بھولے بھٹکوں کو راستہ بتا دینا اور چلنے والوں کو سلام کرنا وغیرہ میرے رسولؐ کی سنت ہے۔ میرے رسولؐ کی سنت کہاں نہیں ہے، ہر جگہ آپ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب:۲۱/۳۳)

میرے استاد مولانا ابو القاسم محدث سیف بنارسی رحمہ اللہ نے کہا اگر تمھارے اندر سنت کی اتباع محبت کے ساتھ اور بدعت کی غیرت نہیں تو ہم سنت سے محبت نہیں اور اگر تمھیں شرک کی غیرت نہیں تو توحید کے ساتھ تم کو محبت نہیں۔ یاد رکھنا! جن بزرگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں ان کی اولاد میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں میں کیا کہوں میرے بھائیو! ملت سے غداری ہے، یہ اپنی جماعت سے غداری ہے اور دین کی رسوائی، لہٰذا ہمیں اگر زندہ رہنا ہے عزت کے ساتھ تو میرے بزرگو یاد رکھو "إنا نحن قوم أعزنا اللّٰه بالإسلام ولا نطلب العزة في غيره" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا ہم وہ قوم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محض اسلام دے کر ہمیں عزت دی تھی، اسلام کے بغیر ہم کو عزت نہیں مل سکتی، اس ملک میں اگر ہم کو عزت حاصل کرنی ہے تو آیئے پھر ہم مسلمان بن جائیں۔ اللہ نے فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا﴾ (النساء:۱۳٦/٤)

اے ایمان والو! اپنے ایمان کی تجدید کرو، دوبارہ ایمان لاؤ، اس کے بغیر یہ ملک نہیں سدھرے گا، ہم کو ملک میں رہنا ہے، اس ملک کی سرحدوں کے ہم محافظ ہیں، یہ ملک ہمارا ہے اس لیے کہ اللہ کا ملک ہے، یہ گنگا اور جمنا یہ ہمالیہ پہاڑ یا ارض و سماوات اللہ کی کائنات ہیں، اللہ ہمارا ہے، ہم اللہ کی مخلوق ہیں، ایک مسلمان یہی عقیدہ رکھتا ہے۔

میرے بھائیو! میرے رسول کا یہ عقیدہ تھا مکہ سے نکل کر جا رہے تھے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے تھے کہ مکہ میرا وطن تھا، ان گلیوں میں سے میں بارہا گزرا ہوں، میں اسی جگہ پلا بڑھا ہوں، یہ سرزمین اللہ کی ہے، اس لیے اللہ کے بندوں کا حق ہے اور ہمارا یہ نظریہ ہے کہ ظلم کوئی کرے (خواہ) ایک ہندو کرے، ایک مسلمان کرے ہم ظلم مٹانے کے ذمہ دار ہیں، کوئی بھی ہو حق بات سب کو سنانے کے ذمہ دار ہیں، اس ملک میں امن پیدا کرنا، اس ملک کو رحمت کا نمونہ بنا دینا، اس ملک میں شانتی پیدا کرنا، اس ملک میں اچھی تعلیم دینا، اس ملک میں اچھی تہذیب کو رواج دینا ہم مسلمانوں کی ڈیوٹی ہے۔ میرے بھائیو! ہم مسلمانوں کا فرض ہے جتنا پکا سچا مخلص محب وطن ایک مسلمان ہو سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

ہماری امت کی اس بوڑھی ماں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اسماء رضی اللہ عنہا بنت ابی بکر نے کہا تھا کہ بیٹے عبداللہ "عش كريما، ومت كريما" جب تک زندہ رہنا خودداری اور شرافت کے ساتھ زندہ رہنا اور جب تم مرنا تو شرافت کی موت مرنا۔

میرے بھائیو! ہم تاریخ جانتے ہیں بھول نہیں گئے ہیں، اسی شرافت کے ساتھ زندہ رہیں گے

ان شاء اللہ، ہمیں یقین ہے کہ ہمارا ایک بال کوئی ادھر سے ادھر نہیں کر سکتا، ہم اس توحید کا اقرار کر کے کھڑے ہوئے ہیں ''هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ'' اللہ سے ڈر اور جہاں چاہے جا کے رہ، اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو، آنحضور ﷺ پر جب یہ آیت اتری:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (الطور:۵۲/۴۸)

اے میرے رسولؐ! آپؐ اپنے رب کے فیصلے پر جمے رہیے آپؐ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ حضرت عائشہ ؓ کھڑی ہوتی تھیں بیٹھتی تھیں مارے خوشی کے کہ کیا آیت اتری ہے (فإنك بأعيننا) ہم اپنے مولائے کریم کی آنکھوں کے سامنے ہیں، موسیٰ اور ہارون ؑ واللہ نے کہا کہ:

﴿اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ○ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾ (طٰہ:۲۰/۴۳،۴۴)

کہا اے موسیٰ اور ہارون ؑ فرعون کے پاس جاؤ بڑی ڈینگیں ہانکتا ہے ذرا نرم بات کہنا:

﴿لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ (طٰہ:۲۰/۴۶)

''اے موسیٰ اور ہارون ڈرنا نہیں میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔''

مولانا آزاد نے یہی کہا تھا کہ تم نے جمنا کے ساحل پر ابھی وضو کیا ہے، کہاں گئے تم، اپنے قافلوں کو یاد کرو، ہمیں رہنا ہے یہاں، ہمیں رہنا ہی نہیں دوسروں کو رکھانا ہے، یہاں اور بسنے والوں کو بسانا اور ہمیں امن و چین دلانا ہے، ہمیں بڑا کام کرنا ہے، یہ کام کسی کے پاس نہیں، صرف ہمارے پاس ہے کیونکہ محمد ﷺ صرف ہمارے پاس ہیں میرے بھائیو! یہ عطیہ دوسروں تک پہنچانا ہے، یہ ہمارا فرض ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾ (سبا:۳۴/۴۶)

کہہ دو میں تم کو آج صرف ایک وعظ کہہ کر جا رہا ہوں کہ تم کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے دو ہو تو دو، ایک ہو تو ایک، پھر تم سوچو اپنے ساتھی کے بارے میں، اپنے رسولؐ کے بارے میں، یہ جو بے چینی ہدایت اور تبلیغ کے لیے ان کے دل میں تھی وہ کوئی جنون نہیں تھا وہ بہت بڑا عذاب دیکھ کر تم کو اس عذاب سے ڈرانے کے لیے رات دن اتنی محنت کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں آپؐ کے اسوۂ مبارکہ پر ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

❊......❊......❊

اولین سلفی سیرت نگار......اوران کی کتب سیرت

ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اگر چہ محدثین کرام کی تمام کتب حدیث میں سیرت نبوی کا بنیادی اور صحیح ترین مواد رکھتی ہیں تاہم ان کو تکنیکی اور فنی لحاظ سے علم سیرت کی تصانیف میں نہیں شمار کیا جاتا، مواد کے علاوہ فن سیرت اپنے آغاز وارتقاء کے لیے بھی فن حدیث کا مرہون منت ہے کہ اسی منبع اصلی سے سیرت نبوی کا سوتا پھوٹا اور ترقی پاکر ناپیدا کنار بنا، یہ حقیقت اب کسی سے مستور نہیں کہ ابتدائی مولفین سیرت اصلاً راویان حدیث اور جامعین سنن تھے۔ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کی احادیث وسنن کو جب فقہ واحکام کے اعتبار سے جمع ومدون کیا تو وہ ذخیرۂ حدیث بنا اور جب اسی کے ایک جزو کو "مغازی" کے عنوان سے علیحدہ کردیا تو وہ فن سیرت کہلایا۔

صحابہء کرام رضی اللہ عنہم اور اولین تابعین عظام کے دور مبارک میں فن حدیث وفن سیرت کا یہی چلن رہا تا آنکہ اصاغر صحابہ وتابعین کے زمانے میں جب اختصاص فن کا دور آیا تو پہلے "مغازی" اور پھر "سیرت" کے عنوان سے فن سیرت استقلال واستحکام پذیر ہوا۔ محدثین سلف نے جس فن شریف کی بنیاد فرخ نہاد کلام نبوت جیسی مبارک بنا پر رکھی تھی لازمی طور سے اس کے ارتقاء کی ضمانت اسی سے فراہم ہوگئی تھی۔ چنانچہ عہد صحابہؓ کرام سے تابہ امروز یہ سلسلۂ زریں جاری ہے اور تا قیام قیامت اس کے جاری رہنے کا یقین واثق ہے۔

اسی طرح از اول تا آخر سلفی علماء کرام اور مولفین نے سیرت نبویؐ کے علم وفن کو مالا مال کرنے میں

مقدور بھر حصہ لیا ہے، اس مختصر مضمون میں انھیں سلفی سیرت نگاروں اور ان کی تصانیف سیرت کا صرف عربی کی حد تک ایک سرسری جائزہ لینا مقصود ہے کہ مفصل بحث کے لیے کئی دفتر درکار ہیں، جن کی یہاں گنجائش نہیں۔

ابتدائی مؤلفین سیرت کو بلا شبہ سلفی سیرت نگاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف فقہی مکاتب فکر اور مسلکی مدارس نظر کے قیام وعروج سے پہلے کے مؤلفین ومصنفین تھے بلکہ وہ صحیح سنت نبویؐ اور طریقۂ سلف صالحین کے پیرو تھے، عام طور سے فن سیرت کا آغاز دور تابعین سے کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اب جدید تحقیقات سے اس امر کی شہادت بھی ملنے لگی ہے کہ اس فن شریف کا باقاعدہ آغاز اور اس میں کتابوں اور رسالوں رصحیفوں کی تدوین دراصل صحابۂ کرام کے عہد میمنت لزوم ہی سے شروع ہوئی تھی، خاص کر متأخرین صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے، انھوں نے مغازی کے نام سے اولین کتب سیرت لکھیں اور بعد میں ان پر خالص سیرت کا اطلاق ہونے لگا، یہ شاید ہمیشہ عقدۂ لاینحل ہی رہے گا کہ صحابۂ کرام میں اولین سیرت نگار کون تھے؟ اور ان کی اولین کتاب سیرت کون سی تھی؟ تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں (ساتویں صدی عیسوی میں) اس موضوع پر کتابیں تالیف کرنے کا اہتمام کیا جانے لگا تھا، صحابی جلیل حضرت سعد بن عبادۃ خزرجی کے بارے میں بعض روایات بتاتی ہیں کہ انھوں نے سیرت نبویؐ پر کچھ تحریری مواد چھوڑا تھا جس کی تہذیب وترتیب کا کام ان کے ایک گمنام فرزند سعید بن سعد نے کیا تھا، وہ سیرت نبویؐ کے ابتدائی مؤلفین میں تھے اور ان کی کتاب سیرت اپنی اصلی شکل میں ان کے پوتے سعید بن عمرو کے پاس عہد عباسی میں موجود تھی، مسند احمد بن حنبل (۲۲۲/۵) اور مسند ابی عوانۃ (بإصابہ ۲/۱۲۲۳) میں اس کتاب کے اقتباسات ملتے ہیں، طبری وغیرہ (۱۲/۱-۱۱۱) نے بھی ان کے تحریری اقتباسات کا ذکر کیا ہے۔

دوسرے نوجوان صحابی حضرت سہل بن ابی حثمہ المدنی الانصاری (۳ھ-۶۲۴ھ) تھے جو ان نوجوان صحابہ کرام میں شمار کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے سیرت نبویؐ پر خاص کر مغازی کی کتاب تالیف کی تھی۔ ان کی وفات خلافت معاویہ میں کسی وقت ہوئی تھی، ان کے پوتے یا پڑپوتے محمد بن یحییٰ بن سہل کے پاس ان کا تالیف کردہ نسخۂ سیرت تھا، مؤخر الذکر واقدی کے ایک بڑے راوی تھے اور ان کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی ان سے روایت کی تھی جن میں بشیر بن یسار انصاری بھی تھے جو محمد بن اسحاق کے اہم راوی ہیں، ان کے فرزند سے نافع بن جبیر بن مطعم اور عروہ نے بھی روایت لی تھی، جبکہ امام زہری کی ان سے تمام روایات مرسل ہیں۔

متأخرین صحابۂ کرام کی تالیفات سیرت کا باب ابھی تشنۂ تحقیق ہے تاہم ابتدائی تابعین کرام کے

بارے میں کافی معلومات جمع ہو چکی ہیں، عام طور سے تابعی مولفین سیرت میں اولیت کا شرف حضرت ابان بن عثمان کو دیا جاتا ہے اور شاید جوزف ہورووٹز (Joseph Horovitz) کے شاندار تحقیقی مضمون کی اتباع میں، لیکن مزید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے پہلے بھی بعض اہم اکابر تابعین نے سیرت نبوی پر کتابیں اور رسالے مدون کئے تھے، ان میں حضرت سعید بن المسیب بن حزن المخزومی (۹۴-۱۳ھ، ۱۳-۷۱۳ء-۶۳۴ء)، حضرت ابوفضالہ عبیداللہ بن کعب بن مالک انصاری (م ۹۸-۹۷ھ، ۷۱۵ء) اور امام شعبی (ابوعمرو عامر بن شراحیل (۱۰۳-۱۹ھ: ۷۲۱-۶۴۰ء) سرفہرست ہیں، معروف ومشہور تابعی سیرت نگاروں میں حضرت ابان بن عثمان بن عفان (۹۶-۲۰ھ-۶۴۰ء)، حضرت عروہ بن الزبیر بن العوام (۹۴-۲۳ھ، ۶۴۳ء)، شرحبیل بن سعید بن سعد بن عبادہ (م ۱۲۳ھ)، عاصم بن عمر بن قتادۃ انصاری (م ۱۲۰ھ، ۷۳۷ء)، امام زہری (ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم مدنی انصاری (۱۳۰-۶۰/۵۶ھ، ۷۴۷-۶۷۹ء)، موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش الاسدی (م ۱۴۱ھ، ۷۵۸ء)، محمد بن اسحاق بن یسار (۱۵۰-۸۵ھ، ۷۶۷-۷۰۴ء)، معمر بن راشد بن عمرو الأزدی (۱۵۴-۹۷ھ، ۷۷۰-۷۱۴ھ)، ابومعشر السندی (نجیح بن عبدالرحمٰن م ۱۷۰ھ، ۷۸۶ء)، یحییٰ بن سعید الاموی (۹۴-۱۱۴ھ، ۸۰۹-۷۲۳ء)، محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷-۱۳۰ھ، ۸۲۳-۷۴۷ء)، محمد ابن سعد الزہری (۲۳۰-۱۶۸ھ، ۸۴۸-۷۸۴ء)، اور عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری (م ۲۱۸ھ، ۸۳۴ء) جیسے نادرۂ روزگار مصنفین شامل ہیں جنھوں نے مغازی کے عنوان سے اپنی سیرتیں لکھیں، ان میں ابن اسحاق کی تالیف سیرت رسول اللہ ﷺ کے عنوان جمیل سے تھی اور جس کی تہذیب وتشریح کا فریضہ ابن ہشام نے اس طرح انجام دیا کہ وہ ہر صدی اور ہر زمانے میں مقبول عام رہی۔

ان مشہور ومعروف سیرت نگاروں کے علاوہ متعدد اور سوانح نگاران رسول اکرم ﷺ تھے، جنھوں نے فن سیرت میں قابل قدر خدمات انجام دیں مگر ان کے نام وکام کو وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے، ان میں قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق (۱۰۷-۳۷ھ، ۷۲۵-۶۵۷ء) ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی الہمدانی (۱۲۷-۳۲ھ، ۷۴۵-۶۵۳ھ)، یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ الثقفی المدنی (م ۱۲۸ھ، ۷۴۵ء)، یزید بن رومان الاسدی المدنی (م ۱۳۰ھ، ۷۴۷ء)، ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل الاسود الاسدی (م ۱۳۱ھ، ۷۴۸ء)، ابوسلیمان داؤد بن الحسین الاموی (م ۱۳۵ھ، ۷۵۲ء)، ابوالمعتمر سلیمان بن طرفان التیمی (۱۴۳-۴۶ھ، ۷۶۰-۶۶۶ء)، ابومحمد عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عثمان الحنیفی (۱۶۲-۹۰ھ، ۷۸-۷۰۸ء)، ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن الحارث الفزاری

(م۱۸۸ھ، ۸۰۴ء)، ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ الازدی البصری (م دوسری صدی ہجری کے ربع اخیر میں)، ابو العباس الولید بن مسلم الاموی الدمشقی (۹۵۔۱۱۹ھ، ۸۱۰۔۷۳۷ء)، عبداللہ بن وہب الفہری (م۱۹۷ھ، ۸۱۳ء)، ابو حذیفہ اسحاق بن بشر بن محمد البخاری (م۲۰۶ھ، ۸۲۱ء)، ابن عائذ (ابو عبداللہ محمد بن عائذ بن احمد القرشی الدمشقی ۲۳۳۔۱۵۰ھ، ۸۴۷۔۷۶۷ء)، حماد بن اسحاق بن اسماعیل الازدی (۲۶۷۔۱۹۹ھ، ۸۶۱۔۸۱۵ء)، ابو زُرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو بن عبداللہ الدمشقی (م۲۸۰ھ، ۸۹۳ء)، ابن شعیب الانصاری (ابو علی محمد بن ہارون ابن شعیب ۳۵۳۔۲۶۶ھ، ۹۶۴۔۸۸۰ء) اوران جیسے بعض دوسرے ذرا کم معروف سیرت نگار شامل ہیں۔

ان ابتدائی مؤلفین سیرت نے بیشتر کتابیں المغازی کے عنوان سے لکھیں لیکن ان میں سے بعض نے سیرت نبوی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اپنی خاص تحریریں چھوڑیں، مثلاً الحنفی کی کتاب ''السیرۃ'' واقدی کی کتاب کے مصادر اساسی میں شمار کی جاتی ہے، الفزاری کی کتاب ''السیر فی الاخبار'' ان کے بعض جانشینوں کا ماخذ رہی ہے، الازدی نے اپنی ''مختصر فتوح الشام'' میں سیرت پر اہم مواد پیش کیا ہے، ابو العباس الاموی نے ''کتاب المغازی'' کے علاوہ ''کتاب السنن'' بھی لکھی، ابو حذیفہ البخاری کی ''کتاب المبتداء'' کے چوتھے اور پانچویں اجزاء سیرت نبویؐ کے لیے مخصوص ہیں، اور ''کتاب الفتوح'' غزوات نبویؐ پر روشنی ڈالتی ہے، ابن عائذ کی ''کتاب المغازی'' ابن سید الناس کی ''عیون الاثر'' کے بنیادی مآخذ میں شمار کی جاتی ہے، حماد بن اسحاق ازدی نے ''ترکۃ النبی'' کے موضوع پر اسی عنوان سے اپنی کتاب لکھی، ابن شعیب انصاری نے ''صفۃ النبیؐ'' کے عنوان سے اور ابو زرعہ الدمشقی نے اپنی تاریخ میں سیرت نبویؐ پر بڑا قیمتی مواد جمع کیا ہے۔

مغازی، مشاہد اور فتوح کے عنوان سے متعدد قدماء نے کتابیں لکھی ہیں جو ابتدائی صدیوں کے مؤلفین سیرت کے معاصر اور جانشین تھے اور جن کی کتابیں اولین کتابوں کی تکمیل و تکملہ کرتی ہیں، ان میں سے مغازی میں اسی عنوان سے جن قدیم مصنفین نے کتابیں لکھی ہیں ان میں عبدالرزاق ابن ہمام الصنعانی (م۲۱۱ھ)، علی بن محمد مدائنی (م۲۱۵)، ابو جعفر الحرانی (م۲۳۴ھ) کے علاوہ احمد بن الحارث الخراز (م۲۵۸ھ) کی کتاب ''مغازی النبی وسرایاہ وازواجہ'' کے دل چسپ عنوان اور نام سے ہے۔

المغازی کے عنوان سے جن دوسرے قدیم مؤلفین نے کتابیں لکھیں ان میں عبدالملک بن محمد الرقاشی (م۲۷۶ھ)، ابراہیم بن اسماعیل الطّوسی (م۲۸۰ھ) وغیرہ کے علاوہ حافظ ابن عبدالبر القرطبی (م۴۶۳ھ) کی بھی ایک کتاب ہے جو ان کی مکمل سیرت کا اختصار ہے، حاجی خلیفہ نے امام واحدی ابو الحسن علی بن احمد (م۴۶۸ھ) کی مغازی پر ایک کتاب کا حوالہ اپنی ''کشف الظنون'' میں

دیا ہے جبکہ سخاوی نے اپنی ''الاعلان'' میں امام زہری (محمد بن مسلم بن شہاب م۱۲۴ھ) کی جانب ''مشاھد النبی ﷺ'' نامی کتاب منسوب کی ہے، فتوحات نبویؐ کے موضوع پر اب تک معلوم اولین کتاب حافظ المدائنی (م۲۲۵ھ) نے ''فتوح النبی'' کے عنوان سے لکھی تھی جبکہ بلاذری (احمد بن جابر، م۲۷۹ھ) کی مشہور کتاب ''فتوح البلدان، کے اولین حصے نبویؐ فتوحات کی اہم اور دستیاب دستاویز ہیں، ایک اندلسی عالم ابن حبیش (عبدالرحمٰن بن محمد م۵۸۴ھ کی کتاب ''الغزوات والفتوح'' کے نام سے ابھی تک مخطوطہ ہی ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اگر تجزیہ کیا جائے تو عربی زبان میں متعدد قدیم و جدید سلفی علماء نے سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ہر موضوع کے بارے میں بطور نمونہ بعض کتابوں کی مثالیں دی جاتی ہیں، سیرت نبویؐ کا ایک اہم اور مقبول موضوع میلاد یا مولد نبیؐ ہے حافظ ابن الجوزی کی ''مولد النبی ﷺ'' اور حافظ ابن کثیر کی ''مولد رسول ﷺ'' اس موضوع پر نمائندہ کتابیں ہیں، رسول اکرم ﷺ کے اسماء مبارکہ پر محمد بن احمد قرطبی (م۶۷۱ھ) کی ''ارجوزۃ فی اسماء النبی ﷺ'' ابن دحیہ کلبی (م۶۳۳ھ) کی ''اسماء النبی ﷺ''، عثمان الفتوحی الحنبلی کی ''بشری الکریم الامجد بعدم تعذیب من یسمی بأحمد و محمد''، علی بن احمد الحرانی المراکشی (م۶۳۷ھ) کی ''شرح السنۃ العلیۃ فی الأسماء النبویۃ'' وغیرہ کو گنایا جاسکتا ہے۔

نسب رسول اکرم ﷺ کے موضوع پر جن ممتاز سلفی علماء کا کام ہے ان میں محمد بن حبیب بغدادی کی «الأرحام التی بین رسول اللہ ﷺ و بین اصحابہ سوی العصبیۃ» علی بن محمد بن فرحون القرطبی کی «تواریخ الأخبار والتعریف بنسب النبی المختار» جیسی کتابیں کئی شامل ہیں۔

امہات الرسول میں علی بن محمد المدائنی کی ''امہات النبی ﷺ'' اس موضوع کی نمائندہ کتاب ہے، ان کی ایک کتاب ''اعمام النبیؐ'' کے ضمن میں «اخبار ابی طالب وولدہ» کے عنوان سے بیان کی گئی ہے، اگرچہ وہ آج کل دستیاب نہیں ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب «الأیناس بمناقب العباس» کا ذکر حاجی خلیفہ نے اپنی «کشف الظنون» میں کیا ہے۔

دلائل نبوت سیرت نگاروں، محدثوں اور دوسرے طبقات علماء میں بہت مقبول موضوع رہا ہے اور ابتداء سے اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں، علی بن محمد المدائنی (م۲۱۵ھ) کی ''آیات النبیؐ'' داؤد بن علی اصفہانی (م۲۷۰ھ) کی ''اعلام النبوۃ'' اور اسی نام کی امام ابوداؤد سجستانی (م۲۷۵ھ) اور ابوحاتم محمد بن ادریس الرازی (م۲۷۷ھ) کی کتابیں کئی مآخذ میں مذکور ہوئی ہیں۔ ''دلائل النبوۃ'' کے عنوان سے بہت سے سلفی علماء نے کتابیں لکھیں جن میں ابوزرعہ رازی (م۲۶۴ھ)، ابن قتیبہ (م۲۷۶ھ)،

ابن ابی الدنیا (م ۲۸۱ھ)، ابراہیم بن اسحاق الحربی (م ۲۸۵ھ)، ابوبکر الفریابی (م ۳۰۱ھ)، سلیمان بن احمد طبرانی (م ۴۳۰ھ)، حافظ ابن مندہ (م ۳۹۵ھ)، ابوبکر بیہقی (م ۴۵۸ھ) وغیرہ کی کتابیں بہت اہم سمجھی جاتی ہیں، جبکہ حافظ ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی کتاب غالباً اس بنا پر سب سے زیادہ مشہور و متداول ہے کہ اس موضوع کی واحد کتاب ہے جو مطبوعہ ہونے کے سبب دستیاب ہے جبکہ بقیہ کتب میں سے اکثر مفقود ہیں اور بعض مخطوطات کی صورت میں کتب خانوں میں مدفون ہیں۔

وحی محمدی کو باقاعدہ منفرد و مستقل موضوع بنا کر کتابیں لکھنے والوں میں امام عمر بن علی دارقطنی (م ۴۵۹ھ) کی کتاب «المعتمد المنقول فيما أوحى إلى الرسول» کا مخطوطہ اسکندریہ کے کتب خانے میں حدیث کے ذخیرے میں موجود ہے، قدماء میں اس موضوع پر مستقل تصانیف کا سراغ تقریباً نہیں کے برابر ہے، جبکہ قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر ان کی کتابوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن ان کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

معجزات محمدیؐ پر باقاعدہ کتابوں کی تعداد اگرچہ کافی ہے لیکن علماء سلف میں کم کسی نے کام کیا ہے، ابن دحیہ کلبی (م ۶۳۳ھ) کی «الآيات البينات» اور ابن غصن الاشبیلی (م ۷۲۳ھ) کی «معجزات خير البرية» کا ذکر یہاں کیا جاسکتا ہے۔

اسراء و معراج اور ان سے متعلق بعض اہم امور پر قدیم و جدید علماء اور سیرت نگاروں کی بہت سی تصانیف ملتی ہیں، ان میں امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کے ایک رسالے «رسالة في روية النبي الله تعالیٰ هل كانت بعيني رأسه؟» کا ذکر بطور نمونے کے کیا جاسکتا ہے جس کا مخطوطہ اوقاف بغداد کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔

اثبات نبوت محمدیؐ میں اسی طرح بطور مثال بشر بن المعتمر (م ۲۱۰ھ) کے رسالہ "الحجة في اثبات نبوة النبي علیہ السلام" اور ابن ابن طبری (م ۲۴۷ھ) کی کتاب "الدين والدولة في اثبات نبوة النبي محمد ﷺ" کا حوالہ دیا جاتا ہے، "اول الذکر" کا حوالہ ابن ندیم نے دیا ہے جبکہ "مؤخر الذکر" بیروت سے (۱۹۷۳ء) میں تیسری بار شائع ہوئی تھی، منافقین و بنو اسرائیل کے بارے میں علی بن محمد المدائنی وغیرہ کی کئی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں، مگر وہ اب دستیاب نہیں ہوتیں۔

ہجرت نبویؐ پر مستقل تصانیف کا قدماء کے ہاں پتہ نہیں چلتا البتہ مدینہ منورہ کے بارے میں بہت سی کتابوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں سے "اخبار المدينة" کے عنوان سے عمر بن شبہ (م ۲۶۲ھ)، الزبیر بن بکار (م ۲۵۶ھ)، شاگرد امام مالک ابن زبالہ (محمد بن الحسن) کی کتاب (مؤلفہ ۱۹۹ھ) کے علاوہ کئی کتابیں ابتدائی صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں اور اب دستیاب نہیں، اسی طرح رزین سرقطی

(م۵۳۵ھ) کی حرمین پر کتاب اور حافظ ابن عساکر (م۶۰۰ھ) کی کتاب کا صرف حوالہ ملتا ہے، ان کے علاوہ متعدد دوسرے قدماء کے حوالے سے ابن ندیم، حاجی خلیفہ اور دوسرے حوالے مآخذ میں صرف ضمناً ملتے ہیں، ان میں علی بن عبداللہ سمہودی کی دو کتابیں "وفاء الوفا باخبار دارالمصطفی" اور "خلاصۃ الوفاء باخبار دارالمصطفی" چھپ چکی ہیں جبکہ ان کی بعض اور کتابیں جیسے "ذروۃ الوفا" وغیرہ ابھی تک مخطوطے کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں، سخاوی (م۹۰۲ھ) کی "التحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ" بھی قاہرہ سے (۱۹۵۷ء) میں بعض شائقین علم کی توجہ سے چھپ چکی ہے۔

مسجد نبویؐ اور روضۂ نبویؐ کی تاریخ وتفصیل اور ان کے احترام وتقدس کے بارے میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے دو عالموں فخر الدین ابوبکر بن علی (م۸۸۹ھ) کی کتاب «بلوغ السول فی أحکام بسط الرسول» اور حرم نبویؐ کے خطیب محمد بن زین الدین کی کتاب "تحفہ المحب لمحبوب فی تنزیہ مسجد الرسول عن کل خصی ومحبوب" کے دل چسپ موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا حوالہ حاجی خلیفہ نے دیا ہے جبکہ ابن عماد حنبلی نے اپنی «شذرات الذھب» میں ابن ناصر الدین دمشقی (م۸۴۲ھ) کی کتاب «عرف العنبر فی وصف المنبر» کا حوالہ دیا ہے، جو مسجد نبویؐ کے ذکر سے زیادہ منبر نبویؐ سے متعلق ہے، اس موضوع پر اور کئی کتابوں کے علاوہ سمہودی (نور الدین علی بن محمد م۹۱۱ھ) کی «الوفا بما یجب لحضرۃ المصطفیٰ» کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ زائرین کو مسجد نبویؐ اور روضۂ اطہر کے تقدس واحترام کے ضروری آداب بتاتی ہے۔ یہ کتاب ریاض سے (۱۳۹۲ھ) میں چھپ چکی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے حلیۂ شریف اور جسمانی صفات ایک اور محبوب ومقبول موضوع رہا ہے، قدیم علماء، محدثین کرام، مؤلفین سیرت اور متعدد دوسرے طبقات مصنفین نے اس موضوع پر جہت سی کتابیں لکھی ہیں اور ان میں سلفی علماء کا حصہ بھی ہے "صفۃ النبی ﷺ" کے عنوان سے جن قدیم مؤلفین ومحدثین نے لکھا ہے، ان میں ابوالبختری وہب بن وہب (م۲۰۰ھ)، المدائنی (م۲۲۵ھ، ابن ابی الدنیا (م۲۸۱ھ)، اسماعیل بن اسحاق القاضی (م۲۸۲ھ) شامل ہیں جبکہ ابوعلی محمد بن ہارون الانصاری (م۳۵۳ھ) نے «صفۃ اخلاق» کا بھی اضافہ کیا ہے، دوسرے سلفی علماء کے علاوہ ہمارے معاصر زمانے میں علامہ ناصر الدین البانی نے "تلخیص صفۃ النبی ﷺ" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو بیروت سے (۱۹۷۲ء) میں چھپی تھی، بعض قدیم وجدید علماء ومؤرخین نے قاضی عیاض کی "الشفاء" وغیرہ سے بھی حلیۂ نبوی تلخیص کیا ہے۔

اخلاق نبوی کے موضوع پر لکھنے والے مولفین میں حافظ ابن حبان کی کتاب ''اخلاق رسول اللہ'' کافی اہم ہے مگر وہ اب دستیاب نہیں، ابن خیر کی فہرست میں اس کا حوالہ ملتا ہے، اس کا ایک اختصار امام محمد بن الولید الفہری الطرطوسی (م ۵۲۰ھ) نے کیا تھا دوسری کتابوں میں محمد بن عبداللہ الوراق (م ۲۴۹ھ) کی «اخلاق النبی»، ابن حبان بستی (م ۳۵۴ھ) کی «اخلاق النبی وآدابہ»، ابو الشیخ اصبہانی (م ۳۶۹ھ) کی «اخلاق النبی» اور داؤد بن علی اصبہانی (م ۲۷۰ھ) کی «صفة اخلاق النبی ﷺ» کا ذکر کیا جاسکتا ہے، ان میں سے بستی کی کتاب قاہرہ سے (۱۹۷۲ء) سے شائع ہو چکی ہے۔

خصائص وخصوصیات نبویؐ کے موضوع پر امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی ''الخصائص الکبریٰ'' بہت مشہور ہے۔ وہ کئی بار چھپ چکی ہے اور اس کی کئی شروح ومختصرات ہیں وہ بھی بار بار طبع ہو چکے ہیں اس موضوع پر ایک اہم کتاب امام عبدالرحمٰن بن علی الجوزی (م ۵۹۷ھ) کی کتاب ''الدر الثمین فی خصائص النبی الأمین'' ہے، ابن دحیہ کلبی کی ''نہایة السول فی خصائص الرسول'' کا مخطوطہ دارالکتب مصریہ میں محفوظ ہے جبکہ امام بلقینی (عبدالرحمٰن بن عمر م ۸۲۴ھ) کی ''خصائص النبی''، ابن حجر عسقلانی کی ''الانوار بخصائص المختار'' کے علاوہ سیوطی، تاج الدین سبکی وغیرہ متعدد دوسرے علماء کی کتابوں کا حوالہ مآخذ کتب میں ملتا ہے۔

مناقب نبویؐ میں کتابیں کم لکھی گئی ہیں، ان میں ابن الزملکانی (م ۷۲۷ھ) کی «عجالة الراکب فی ذکر أشرف المناقب» اور کمال الدین محمد ابن طلحہ قرشی (م ۶۵۲ھ) کا صرف حوالہ ملتا ہے، ان کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں البتہ محفوظ ہیں، مگر شمائل وخصائل نبوی پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے کئی مطبوعہ صورت میں دستیاب ومتداول بھی ہیں، ان میں سب سے مشہور امام ترمذی (محمد بن عیسیٰ م ۲۷۹ھ) کی «الشمائل النبویة والخصائل المصطفویة» ہے، اس کی متعدد شروح اور مختصرات ہیں جن کے مولفین میں متعدد مسالک وفقہی مکاتب کے علماء اور شارحین شامل ہیں، اس موضوع پر ایک اہم ترین کتاب حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی ''شمائل الرسول ودلائل نبوتہ وفضائلہ'' ہے اگرچہ حافظ موصوف نے «شمائل ترمذی» پر بنیادی طور پر انحصار کیا ہے، تاہم انھوں نے دوسری کتب صحاح اور مسانید سے اس پر بہت اضافہ کیا ہے، یہ اہم کتاب مصطفیٰ عبدالواحد کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، اس ضمن میں ابن المقری القرناطی (م ۵۵۲ھ) کی «الشمائل بالنور الساطع الکامل» ابن الرضی مالکی، ابن عتیق ازدی غرناطی (م ۶۴۶ھ)، محمد بن عبدالحی الفاسی اور الٰہی بخش وغیرہ کی کتابوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے، امام

بغوی (الحسین بن مسعود م ۵۱۶ھ) کی کتاب «الأنوار فی فضائل (أو شمائل) النبی المختار» اور ابن المنیر (م ۶۸۳ھ) کی «الاقتفا فی فضائل المصطفیٰ» کا حوالہ حاجی خلیفہ نے دیا ہے، یہ شمائل کے علاوہ فضائل نبوی سے بھی بحث کرتی ہیں، ان کے علاوہ حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی (م ۶۰۰ھ) کی کتاب «الآثار المرضیة فی فضائل خیر البریة» اور یوسف بن اسماعیل النبہانی (م ۱۳۵۰ھ) وغیرہ کی متعدد کتابوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

حقوق نبوی پر قاضی عیاض بن موسیٰ الیحبی (م ۵۴۴ھ) کی «الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ» بہت مشہور اور اپنے موضوع کی نمائندہ کتاب ہے، وہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور اس کی متعدد شروح اور مختصرات ہر زمانے میں مختلف مسالک کے مؤلفین نے تیار کیے ہیں، ان میں الخفاجی (م ۱۰۶۹ھ) کی شرح «نسیم الریاض» بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ قریباً دو درجن شروح کا پتہ چلتا ہے۔

بعض بڑے دل چسپ موضوعات پر بھی سلفی سیرت نگاروں نے قلم فرسائی کی ہے، حافظ ابن قیم کی «الفروسیة المحمدیة» ایسی ہی دلچسپ اور دلآ ویز کتاب ہے جو قاہرہ سے (۱۳۶۱ھ میں) عزت العطار کی توجہ سے چھپی، ابن ندیم نے زبیر بن بکار کی کتاب «مزاح النبی» کا حوالہ دیا ہے جبکہ بدر الدین محمد الغزی الدمشقی (م ۹۸۴ھ) کی ''المراح فی المزاح'' میں رسول اکرم ﷺ کے مزاح پر ایک بڑی فصل ہے، یہ کتاب دمشق سے (۱۳۴۹ھ) میں شائع ہو چکی ہے، ابوالیمن زید بن حسن کندی (م ۶۱۳ھ) نے آپ (ﷺ) کی سخن سنجی کے بارے میں ایک کتاب ''انشاد النابغة امام النبی ﷺ'' کے عنوان سے لکھی تھی جس کا مخطوطہ ظاہریہ کے کتب خانہ میں موجود طباعت کا ابھی تک منتظر ہے، اسی طرح متعدد کتابیں رسول اکرم ﷺ کے لباس، جوتوں، آلات و اسلحہ، گھوڑوں، مویشیوں، اونٹوں اور ترکہ میں چھوڑی گئی چیزوں کے بارے میں لکھی گئی ہیں جن کا ذکر اختصار کی خاطر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے بعض فرض معمولات کے بارے میں کئی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، صلاۃ نبویؐ پر دو اہم کتابیں سلفی علماء کی ہیں، ان میں سے ایک علامہ ناصر الدین البانی کی «صفة صلاة النبی ﷺ من التکبیر إلی التسلیم» بیروت (۱۳۸۹ھ) اور شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی «کیفیة صلاة النبی ﷺ» (مطبوعہ ریاض ۱۴۰۰ھ) ہے۔

حج نبویؐ پر متعدد تصانیف مرتب کی گئی ہیں، ان میں سے ابن جابر کی روایت کردہ کتاب ''حجة النبی ﷺ''، علامہ البانی کی توجہ سے بیروت سے (۱۳۸۴ھ) میں شائع ہوئی، جبکہ امام ابن حزم (م ۴۵۶ھ) کی کتاب ''حجة الوداع'' بیروت سے (۱۹۶۶ء) میں چھپی تھی۔ ان کے علاوہ امام

بقاعی (ابراہیم بن عمر دمشقی م۸۸۵ھ)، علامہ مقریزی (م۸۴۵ھ) اور محب طبری (م۶۹۴ھ) اور بعض دوسرے سیرت نگاروں کی اس موضوع پر کئی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں۔

سیرت نبویؐ کی جامع اور مفصل تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے اور اسی مناسبت سے علماء سلف کی تالیفات بھی کافی ہیں، ان کو آسانی کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اول وہ تالیفات جو سیرت کی مستقل کتابیں ہیں، اور دوم وہ کتب سیرت ہیں جو تاریخ اسلام کے ابتدائی ابواب ہیں یا ان کو بعد کے مرتبین نے مستقل کتب سیرت بنا دیا ہے، ابن اسحاق و ابن ہشام کی ''سیرت رسول اللہ'' کی تلخیص واختصار بہت اہم موضوع رہا ہے اور متعدد سلفی علماء نے بھی ایسی تالیفات تیار کی تھیں، فہرست ابن خیر نے جن مختصرات کا ذکر کیا ہے ان میں احمد بن محمد اشبیلی (م۶۳۷ھ) اور ابو عیسیٰ یحییٰ بن عبداللہ لیثی کی کتابوں کے علاوہ ابن عربی اور سخاوی کے مختصرات کا ذکر کیا ہے، جبکہ سہیلی (عبدالرحمٰن بن عبداللہ م۵۸۱ھ، ۱۱۸۵ء)، ابو ذر خشنی (م۶۰۴ھ، ۱۰۲۷ء)، فتح بن موسیٰ مغربی (م۶۶۳ھ، ۱۲۶۵ء)، وغیرہ کی منثور و منظوم شروح کے علاوہ احمد بن ابراہیم الواسطی (م۷۱۱ھ، ۱۳۱۱ء)، یحییٰ بن حمزہ بن علی (م۷۴۷ھ، ۱۳۴۶ء)، ابن جماعہ (محمد بن ابی بکر م۸۱۹ھ، ۱۴۱۶ء) وغیرہ کے مختصرات کا حال مشہور ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد شروح اور مختصرات سیرت ہیں، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ، ۱۷۰۳-۹۲ء) کی «مختصر سیرة الرسول ﷺ» اصلاً سیرت ابن اسحاق و ابن ہشام ہی کی تلخیص ہے، ابن ہشام کی سیرت کے علاوہ متعدد دوسری تلخیصات بھی لکھی گئیں جو دوسری کتب سیرت کا عطر کشید کر کے پیش کرتی ہیں، ان میں محمد صالح بن احمد الخطیب الحنبلی کی «تلخیص السيرة النبوية» بھی شامل ہے جو دمشق سے (۱۳۴۸ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ علامہ ابن الجوزی (م۵۹۷ھ) کی «تلقیح فهوم الأثر في التاريخ والسير» (مطبوعہ بمبئی) میں اور چیزوں کے علاوہ سیرت کا قیمتی مواد ہے، ایسی کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے۔

تیسری صدی ہجری رنویں صدی عیسوی سے جو اہم کتب سیرت مستقلاً لکھی گئیں ان میں علماء سلف کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے، ان میں امام ابن حزم علی بن احمد (م۴۵۶ھ) کی «جوامع السيرة» اور «المرتبة الرابعة في نسب رسول الله و سيره ومغازيه» حافظ ابن عبدالبر (م۴۶۳ھ) کی «الدرر في اختصار المغازي والسير»، عبدالرحمٰن الخثعمی الاشبیلی کی «الدرر في اختصار السير»، خلیل بن شاہین (م۸۷۳ھ) کی «الدرة المضية في السيرة المرضية» فتح بن موسیٰ مغربی (م۶۶۳ھ) کی منظوم و منثور سیرت «السول في نظم سيرة الرسول» اور «غاية السول في سيرة الرسول»، احمد بن یوسف الرعینی (م۷۷۹ھ) کی «السيرة والمولد النبوي»، امام ابن

الجوزی (م ۵۹۷ھ) کی «عیون الحکایات فی سیرۃ سید البریات»، «الوفا فی سیرۃ المصطفیٰ» اور «خلاصۃ الوفا فی سیرۃ المصطفیٰ» جو مطبوعہ ہیں اور کئی بار چھپ چکی ہیں۔ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی «السیرۃ النبویۃ» اور «الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول» (بار بار چھپ چکی ہیں)، عبدالعزیز بن محمد بن جماعہ (م ۷۶۷ھ) کی «مختصر سیرۃ النبی» اور المختصر فی سیرۃ سیدنا محمد ﷺ، ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ) کی «عیون الأثر فی فنون المغازی والسیر» اور اس کے مصنف کے قلم سے مختصر، امام ابن تیمیہ (م ۶۵۲ھ) کی «المنتقی من اخبار المصطفیٰ» وغیرہ اہم کتابیں ہیں، اس سلسلے کے آخر میں جامعہ سلفیہ کے استاد شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کی «الرحیق المختوم» کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

عالمی تاریخ اسلام سے متعلق کتابوں میں سیرت نبویؐ پر مستقل ابواب ہیں جو دراصل سیرت نبویؐ کی کتابیں ہیں، ان میں بلاذری اور طبری کی «أنساب الأشراف» اور «تاریخ الرسل والملوك» اور حافظ ابن کثیر کی ''البدایۃ والنہایۃ'' وغیرہ سے سیرت کے ابواب علیحدہ کتابی شکل میں چھاپے جاچکے ہیں، ان میں سے بعض کے صرف حوالے ملتے ہیں، جیسے حسین بن علی المغربی (م ۴۱۸ھ)، ہشام ابن احمد الوقشی الطلیطلی (م ۴۸۹ھ)، محب طبری (م ۶۹۴ھ)، ابن النقاش (م ۷۶۳ھ)، ابن جابر اندلسی (م ۷۸۰ھ) وغیرہ کی کتب تاریخ وسیرت ہیں، مؤخر الذکر کا ایک مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے، مگر متعدد دستیاب کتابوں میں بھی سیرت نبویؐ کا پورا مواد موجود ہے، ان میں حافظ ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) کی «تاریخ دمشق» عبدالغنی المقدسی (م ۶۰۰ھ) کی «الدرۃ المضیئۃ»، حافظ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کی «المنتظم فی تاریخ الملوك والأمم»، ابن الاثیر (م ۶۳۰ھ) کی «الکامل فی التاریخ»، امام نووی (محی الدین بن شرف م ۶۷۶ھ) کی «تہذیب الأسماء واللغات»، حافظ ذہبی (محمد بن احمد الدمشقی م ۷۴۸ھ) کی «تاریخ الأسلام»، ابن شاکر کتبی (م ۷۶۴ھ) کی «عیون التاریخ» وغیرہ متعدد کتابیں بہت اہم ہیں، ان کے علاوہ بعض اور کتابیں بھی اس ضمن میں شامل کی جاسکتی ہیں لیکن ان کو اختصار کے خیال سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے فیصلوں، فتووں، معاہدوں اور جوامع الکلم وغیرہ پر بعض اسلاف اور علماء نے کتابیں لکھی ہیں، ان میں علی بن محمد المدائنی کی «صلح النبی اور عہود النبی» ابن تیمیہ کی «جوامع الکلم الطیب» نواب صدیق حسن قنوجی کی «الحرز المکنون من لفظ المعصوم»، ابن فرج مالکی (ابن الطلاع م ۴۹۷ھ) کی «أقضیۃ النبی ﷺ» اور ابن قیم کی «بلوغ السول من أقضیۃ للرسول»، حسین بن مبارک الموصلی (م ۷۴۲ھ) کی «الفتاویٰ النبویۃ» اور ابن ابی الدنیا

(م۲۸۱ھ) کی «فقه النبی ﷺ» عبدالرحمٰن الحنبلی (م۶۳۴ھ) کی «أقیسة النبی ﷺ»، ابواحمد عسکری (م۳۸۲ھ) کی «الحِکم والأمثال» اور ابن العربی (م۵۴۳ھ) کی «حِکم النبی ﷺ» اہم تصانیف ہیں، ان میں سے بعض کے صرف حوالے ملتے ہیں، لیکن اکثر چھپ چکی ہیں اور بار بار چھپی ہیں۔

ذکر رسول ﷺ کے موضوع پر امام نووی کی «الأذکار المنتخبة من کلام سید الأبرار ﷺ»، ابن حجر عسقلانی کی «تخریج الأذکار الواردة عن رسول الله ﷺ» اہم کتابوں میں شامل کی جاتی ہیں، جبکہ قرءات نبویؐ پر ابوعمر الدوری (م۲۴۰ھ) کی ''قرءات النبی ﷺ'' اور ابن عیسیٰ اندلسی (م۴۰۰ھ) کی ''وقوف النبی ﷺ فی القرآن'' کا حوالہ ملتا ہے، محمد بن احمد غرناطی (م۴۰۷ھ) نے «تفسیر النبی» پر ایک کتاب لکھی تھی۔

خطبات نبویؐ پر مدائنی وغیرہ متعدد علماء کی کتابیں «خطب النبی ﷺ» کے نام سے ہیں۔

طب نبویؐ بھی سیرت نگاروں کا ایک محبوب موضوع رہا ہے، اس میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن حزم کا «رسالة فی الطب النبوی»، سخاوی کی کتاب «السیر القوی فی الطب النبوی»، یوسف بن محمد الحنبلی (م۷۷۶ھ) کی «شفاء الإنام فی طب أهل الإسلام» کے علاوہ «الطب النبوی» کے نام سے متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں عبدالملک بن حبیب (م۲۳۸ھ)، ابونعیم اصفہانی، ابن الاکفانی (م۷۴۹ھ)، ضیاء مقدسی (م۶۴۳ھ)، حافظ ذہبی (م۷۴۸ھ)، حافظ ابن قیم، ابوالقاسم محدث نیشاپوری (م۴۰۶ھ) اور حافظ سیوطی کی کتابیں معروف ہیں اور اکثر مطبوعہ اور متداول بھی۔

رسول اکرم ﷺ سے وابستہ افراد واشخاص جیسے ازواج واولاد، عمال وسفراء، کتاب وخدام اور صحابہ وغیرہ میں سے ہر ایک موضوع پر سیرت نگاروں نے کتابیں لکھی ہیں۔ صحابہ کرام پر مجموعی طور سے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سیرت نبویؐ کا اہم مواد شامل ہے اس لیے وہ تکملہ اور تتمہ سیرت کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سلفی علماء کی خدمات قابل ذکر اور قابل قدر ہیں، حافظ ابن عبدالبر کی «الاستیعاب فی معرفة الأصحاب»، حافظ ابن اثیر کی «أسد الغابه فی معرفة الصحابة» اور حافظ ابن حجر کی «الإصابة فی تمییز الصحابة» تو بہت مشہور ومتداول کتابیں ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں ان علماء کرام نے تالیف کی تھیں، سب کا ذکر تو بہت مشکل ہے صرف چند کا ذکر کیا جا رہا ہے، ابن خلف ابن فتحون (م۵۲۰ھ) نے «الاستیعاب» پر استلحاق لکھا تھا، امام بخاری کی «اسماء الصحابة» کا ذکر حاجی خلیفہ نے کیا ہے، حافظ ابن حزم اور حافظ ابن الجوزی کی کتابوں

«اسماء رواۃ الصحابۃ» کے مخطوطے استانبول، مصر میں موجود ہیں، جبکہ امام بقی بن مخلد (م۲۷۶ھ) کی «اسماء الصحابۃ وعدد ما رووا من أحادیث» کا مخطوطہ معہد المخطوطات میں محفوظ و مامون ہے، حافظ ذہبی کی «تجرید أسماء الصحابۃ» چھپ چکی ہے، ابن سید الناس کی «تحصیل الإصابۃ فی تفصیل الصحابۃ» کا ذکر صفدی نے کیا ہے، حافظ ابن مندہ (م۳۹۵ھ) کی کتاب «معرفۃ الصحابۃ» بڑی اہم کتاب ہے، اس عنوان سے متعدد دوسرے اسلاف نے کتابیں لکھی ہیں، اسی طرح امام نسائی، ابن عساکر، ابن حمیدہ، قاضی عیاض، امام احمد بن حنبل، ابونعیم اصفہانی، حاکم نیشاپوری وغیرہ متعدد علماء کی کتابیں ہیں، متعدد سلفی علماء نے خاص صحابہ کرام کے گروہ یا افراد کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان میں فضائل ومناقب شیخین پر حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ذہبی کی کتابیں «رسالۃ فی تفصیل ابی بکر وعمر» اور «فضائل صحابہ» یا ابن سعید الطبری (م۲۴۶ھ) کی «فضائل الشیخین» نمائندہ کتابیں ہیں، اولین خلفاء اربعہ کے بارے میں بالخصوص اور دوسرے صحابہ کرام جیسے عشرہ مبشرہ حضرات ابوعبیدہ بن جراح، عبداللہ بن مسعود، خالد بن الولید، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم وغیرہ کے بارے میں خثیمہ بن سلیمان طرابلسی (م۳۴۳ھ)، حاکم نیشاپوری، محب طبری، الفزاری، ابن ابی الدنیا، عبدالغنی المقدسی، ابن عساکر، رضی الدین محمد حنبلی (م۹۷۱ھ)، ابن حجر ہیثمی، محمد بن یحییٰ المالقی (م۷۴۱ھ)، ابن ابی الخصال الغافقی (م۵۴۰ھ) عبداللہ بن احمد بن حنبل، ابن حزم اندلسی وغیرہ متعدد علماء نے لکھا ہے، علامہ ابن الجوزی کی ''مناقب عمر بن الخطاب'' تو کافی مشہور ومتداول کتاب ہے۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں بھی سلفی علماء کرام نے کئی کتابیں لکھی ہیں، علی بن محمد المدائنی، ابوعبیدہ اور واقدی جیسے قدیم مولفین کے علاوہ حافظ ابن عساکر نے بھی امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے «الاربعون فی مناقب امہات المؤمنین» مناقب پر محب طبری، عبداللہ بن احمد السقطی اور عائشہ بنت الشاطی نے اپنی خاص کتابیں تالیف کی ہیں جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر حافظ ذہبی کی کتاب «أخبار أم المؤمنین عائشۃ» دمشق سے (۱۹۴۵ء) میں چھپ چکی ہے، ان سے متعلق واقعہ افک پر کئی علماء نے ''حدیث الافک'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جن میں قاضی ابوبکر ابن العربی کی کتاب شامل ہے، اس کے علاوہ مدائنی کی کتاب بھی ہے، امام داؤد بن علی ظاہری (م۲۷۰ھ) نے ''الرد علی اهل الافک'' کے نام سے ایک کتاب تالیف اور مرتب کی تھی، جبکہ اولاد نبویؐ میں زیادہ تر کتابیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل پر لکھی گئی ہیں، ان میں ابن شاہین (م۳۸۵ھ)، حاکم نیشاپوری وغیرہ کی کتابیں ہیں جبکہ جدید عہد

میں بنت الشاطی نے ''بنات النبی'' کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے جو مصر سے (۱۹۵۶ء) میں پہلی بار چھپی تھی۔

آپ ﷺ کے خدام اور موالی پر سخاوی کی کتاب کا مخطوطہ اوقاف بغداد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

آپ ﷺ کے ارداف (ردیف کی جمع) پر حافظ ابن مندہ کی کتاب ہے، نبویؐ فرستادوں اور سفیروں پر متعدد کتابیں ہیں جن میں مدائنی کے تین رسالوں کے علاوہ کلاعی کی کتاب اہم ہے، اسی طرح عمال نبوی پر مدائنی کی ایک کتاب تھی۔ سیرت نگاروں کے ایک خاص طبقے میں رسول اکرم ﷺ پر درود وسلام اور آپ ﷺ کی مدح ونعت کے بارے میں لکھنے کا بہت شوق رہا ہے، ان میں بطور نمونہ چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن قیم کی «جلاء الافہام» (کویت (۱۹۷۷ء) اور «ربیع الأبرار في الصلاة على النبي المختار» وغیرہ، حافظ ابن ابی الدنیا کی «الصلاة على النبي»، ابن سید الناس، ابن جابر (م ۷۸۰ھ) وغیرہ کی نعتیں اور قصیدہ بردہ وغیرہ کی شروح اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

اسی طرح خواب میں رویت نبوی، توسل بالرسول، اقتداء نبویؐ، زیارت نبویؐ اور ہدایت نبویؐ وغیرہ کے مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، اقتداء نبویؐ پر امام احمد بن حنبل کا رسالہ اور قبر نبویؐ کی زیارت اور اس کے احکام پر شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا رسالہ جاننے کی چیز ہیں، اگرچہ وہ مخطوطے ہیں۔

سبِّ رسول اور مخالفین نبوت کے اعتراضات کے جواب میں امام ابن تیمیہ کی کتاب «الصارم المسلول على شاتم الرسول» بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اور ہدایات نبویؐ پر ان کے شاگرد «زاد المعاد في هدي سيد العباد» بہت اہم اور مقبول کتاب ہے، مؤخر الذکر کے ایک رسالے «الرسالة الحلبية في الطريقة المحمدية» کا حوالہ صفدی نے دیا ہے، مختصر یہ کہ قدیم وجدید سلفی علماء نے سیرت نبویؐ کے ہر پہلو پر دقیق تحریریں چھوڑی ہیں اور ان کا مفصل جائزہ ایک تحقیقی مقالے کا تقاضا کرتا ہے۔

نوٹ: یہ مضمون تحقیق و بیان کے اعتبار سے معیاری و معتبر ہے لیکن شاید مصنف نے سلفیت کی تحدید وتعیین میں اصول ومبادی کے بجائے مدت زمانی کا اعتبار کیا ہے، اسی لیے ان کی فہرست میں بعض ایسے علماء کے نام آگئے ہیں جن کا منہج سلف صالحین کے منہج سے واضح طور پر مختلف ہے۔ (ادارہ)

علامہ مقریزی کی إمتاع الأسماع ......ایک تحقیقی جائزہ

پروفیسر عبدالباری، صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علامہ تقی الدین مقریزی (۷۶۶ـ۸۴۵ھ) کی کتاب «امتاع الأسماع بما للرسول من الأبنا والأخوال والحفدة والمتاع» ادب اور خصوصیت سے سیرت رسول ﷺ کے فن میں ایک گراں بہا اضافہ ہے، عجیب اتفاق کہ اس نادر الوجود کتاب کی صرف پہلی جلد جو بڑی تقطیع کے ساڑھے پانچ سو (۵۵۰) صفحات پر مشتمل رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے مکمل احوال کا مرقع پیش کرتی ہے، پہلی مرتبہ قاہرہ سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوسکی۔ خوش قسمتی سے اس کتاب کا تحقیقی ایڈیشن عہد حاضر کے مشہور محقق اور تحقیق نصوص کے ماہر محمود محمد شاکر کے ہاتھوں منظر عام پر آیا۔ پیش لفظ میں احمد امین نے اسے «خير الكتب في سيرة الرسول» کہا ہے۔

مصنف «النجوم الظاهرة» نے بھی اسے فن کی نفیس کتابوں میں شمار کیا ہے۔ کتاب کی دیگر پانچ جلدوں کا بھی پتہ چلتا ہے جو رسول پاکؐ سے متعلق الگ الگ موضوعات مثلاً اسماء وغیرہ کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

جہاں تک مصنف کا تعلق ہے، شواہد یہی بتاتے ہیں کہ وہ مصری تاریخ کے سب سے بڑے مؤرخ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، چنانچہ ابن تغری بردی علامہ مقریزی کو عالم کامل، عمدۃ المورخین اور رئیس المحدثین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مقریزی تاریخ کے فن اور اس کے متعلقات میں ہم عصر علماء میں سب سے بڑے تھے۔ علامہ سخاوی نے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دوسو

(۲۰۰) سے زائد کتابوں کو بچشم خود دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، انھیں تاریخ کے فن میں علامہ ابن خلدون سے کسب فیض کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔

مقریزی امور سلطنت میں بھی دخیل رہے تھے، عہد مملوک میں مصر کے اندر انھیں بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا گیا، یہ ''دیوان الانشاء'' میں سیکرٹری ہوئے اور محکمہ مالیات اور بحریہ کے نگران مقرر کئے گئے، شام میں اوقاف کی نگرانی بھی سپرد کی گئی اور دمشق کے اہم مدرسے میں حدیث کے استاد کی حیثیت سے بھی آپ نے فرائض انجام دیئے، خاص بات یہ ضرور ہے کہ ان ساری مختلف النوع مشغولیتوں کے باوجود آپ کا علمی کام بھی جاری و ساری رہا، اسلامی علوم پر غیر معمولی دستگاہ کے ساتھ ساتھ اللہ نے آپ کو ایک اعلیٰ وارفع ادبی ذوق سے بھی نوازا تھا۔ آپ کی علمی کاوشیں وقت کی بہترین انشاء پردازی کا نمونہ پیش کرتی ہیں، شاعری کے میدان میں بھی آپ کے پاکیزہ کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ دور حاضر کے ایک ناقد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کوئی ادیب و مؤرخ مقریزی سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔

ہمیں کتاب اور صاحب کتاب کی قدر و قیمت سے یک گونہ آشنائی ہو چکی۔ آیئے اب خاص سیرت رسول ﷺ کے فن کا جائزہ لیں۔

سیرت نگاری بلاشبہ ایک مستقل فن ہے، اس کے ڈانڈے ادب اور تاریخ دونوں ہی فنون سے جا ملتے ہیں، یوں تو عربی لغت میں لفظ ''السیرۃ'' کے معنی رہن سہن اور طریقے کے ہیں، بعضوں نے اسے شخصی زندگی کی عہد بعہد تاریخ اور زندگی کا تذکرہ بتایا ہے، انسانی کارکردگی بھی اسی دائرے میں آجاتی ہے۔

CASSEL اپنی انسائیکلوپیڈیا میں یوں رقمطراز ہے: ''سیرت نگاری تاریخ کی ایک شاخ ہے، اس کی غرض و غایت انسانی زندگی کو بقدر امکان صحیح طریقے پر پیش کرنا ہے۔ اسی طریقے سے آکسفرڈ ڈکشنری میں تذکرہ کو اشخاص کے احوال زندگی کی تاریخ و ادب کی ایک شاخ بتایا گیا ہے۔

سیرت نگاری یا تذکرہ نگاری کے لیے فنی موشگافیوں کا لحاظ از بس ضروری سا ہو جاتا ہے، تذکرہ نگار کسی حد تک اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس راکھ میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا کرسکے جسے ایک چلتی پھرتی ہستی اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے، کیونکہ بہت ساری گفتگو، حادثات اور یادداشتیں جن کا تعلق کسی شخص سے ہوتا ہے، تاریخی اسباب کے نتیجے میں جمود کا شکار رہتی ہیں، مگر تذکرہ نگار انھیں اپنے ادبی پیرایۂ بیان سے اصلی رنگ وروپ کی طرف لے آتا ہے اور اس سے ایک خوبصورت پیکر تراشی کا نمونہ پیش کرتا ہے، یقیناً پیکر تراشی کے اس فن میں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ایک اہم رول

ادا کرتا ہے۔

اگر سیرت کو بھی ہم ایک فن مان کر چلیں تو بہت حد تک ہمیں یہ بھی مان لینا ہوگا کہ جس طرح طبری سے ابن خلدون تک عربی تاریخ نویسی کے فن نے ارتقائی منازل طے کر کے تکمیلی شکلوں تک رسائی حاصل کی ہے، ٹھیک اسی طرح سیرت رسول ﷺ کا فن بھی حضرت عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کی «کتاب المغازی»، ابن اسحاق کی «السیرة النبویة» اور پھر ابن اسحاق سے مرحلہ بہ مرحلہ اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتا ہوا مقریزی کی «امتاع الأسماع» تک تکمیل کی شکلوں سے ہمکنار ہوتا نظر آتا ہے۔

مغازی کی ابتداء روایات واحادیث کی جمع وترتیب سے شروع ہوتی ہے، ابن اسحاق نے رسول اکرم ﷺ کے احوال زندگی کے مختلف گوشوں کا زیادہ سے زیادہ احاطہ کرنے اور مربوط شکلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی، روایات کی تکثیر کے اس عمل میں عہد عباسی کی سیاسی وسماجی کشمکش نے تنقیح و تمحیص کی ضرورت کو بڑھادیا، چنانچہ ابن ہشام نے بہت ساری روایتوں اور اشعار کو حذف کر کے اس کتاب کی نوک پلک درست کی، اور آج ہم ابن اسحاق کی اس کتاب کو سیرت ابن ہشام کے نام سے جانتے ہیں، سیرت نگاری کا فن ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ ابن الجوزی نے اسے مزید تابناک بنایا، اسانید کی طویل تفصیل اور روایات کی زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کرنے کا رجحان کم ہوا، اس کی جگہ زندگی کے خاکے کو مربوط شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ موضوع کا حق ادا ہو سکے، مگر یہاں بھی اللہ کے رسول ﷺ کی عظیم شخصیت کو احوال زندگی کے چار مخصوص خانوں میں الگ الگ دیکھنے کی کوشش کی گئی یعنی:

① سیرة الرسول ﷺ ② شمائل الرسول ﷺ

③ خصائص الرسول ﷺ ④ دلائل النبوة

خصائص کے باب کو ہی لے لیجئے، انبیاء پر آپ ﷺ کی فضیلت کا بیان صرف متعدد احادیث کا یکے بعد دیگرے ذکر ہے اور بس، شخصیت کی عظمت کا ادراک اس کی زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کے ساتھ ایک تسلسل کو اجاگر کرنے میں قلوب واذہان کو کما حقہ متاثر نہیں کرتا، مسئلہ کسی عام انسان کی زندگی کے احوال کو صرف مستند حوالوں کے ساتھ بیان کر دینے کا نہیں ہے، بلکہ ایک مرد کامل اور خالق کون و مکان کے محبوب رسول کی داستان حیات کی بھرپور عکاسی کا ہے، معاملہ خیر البشر ﷺ کی سیرت نگاری کا ہے، وہ ذات جسے ساری انسانیت کے لیے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا، ایک طرف وہ اللہ کا رسول ہے اور اسے پیغامبری کی امانت کا حق زندگی کی آخری سانس تک ادا کرنا ہے۔ دوسری طرف

وہی انسان مقام عبدیت کا اعلیٰ ترین مظہر بھی ہے، زندگی کے اس کٹھن اور صبر آزما راہ سے ایک انسان گوشت و پوست کا پیکر کس طرح گزرا ہے، جسم و جان کی گداختگی اور قلب و ذہن کی وارفتگی میں اس پر کیا کچھ بیتی ہے، اس کا مرقع پیش کرنا کچھ اس فکر کے ساتھ کہ «إن الرسول لنور يستضاء به» اور (لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة) یقیناً فن کی باریکیوں اور ندرتوں کے بغیر بھلا کس طرح ممکن ہوسکتا ہے، مقریزی کی «امتاع الأسماع» بہت حد تک فن کی ان باریکیوں اور ندرتوں کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے۔

مقریزی کی کتاب کا عنوان «امتاع الأسماع» بذات خود معنی خیز اور فکر انگیز ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح مسکویہ کی تاریخ کا نام ''تجارب الأمم'' اور ابن خلدون کی تاریخ کا نام ''کتاب العبر'' اپنے اندر ایک خاص معنویت رکھتا ہے، کتاب کے مقدمے کی خوب صورت اور جاندار تحریر مقریزی کے ذھن رسا اور اس کی فنی موشگافیوں کے نقوش و خطوط کو بہت حد تک واضح کر دیتی ہے، صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے سیرت رسول اکرم ﷺ کو پیش کرنے میں صرف واقعات و حادثات کو یکجا کرنے کا ایک علمی اور تحقیقی فریضہ انجام نہیں دیا، بلکہ اپنے خون جگر کی آمیزش سے ایک ایسی عظیم ہستی کا جاندار پیکر تیار کرنے کی کوشش کی ہے جو سارے جہاں کے خالق کی طرف سے ساری دنیا کے لیے رسول رحمتؐ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تحریر سے عظمت و کردار کا نقش قلوب و اذہان پر مرتسم ہو جاتا ہے اور آپؐ کی ذات کا علم ''اسوۂ حسنہ'' کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا نظر آتا ہے، مقریزی نے سیرت رسولؐ کو مکی زندگی اور مدنی زندگی کے علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر دکھانے اور شمائل و دلائل کے الگ الگ ابواب میں بند کر کے پیش کرنے سے گریز کیا ہے، ان کے نزدیک زندگی کا ایک تسلسل ہے۔ «امتاع الأسماع» رسول اکرم ﷺ کی کتاب زندگی تو ضرور ہے لیکن ایسی کتاب جہاں شخصیت ایک حد تک زندہ پیکر کا روپ دھار لیتی ہے اور ماضی کا رشتہ حال سے جڑتا نظر آتا ہے، ہمارے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کو اختیار کرنے کے لیے ایک ماڈل جیسے زندگی کی اصلی تابناکیوں کے ساتھ سامنے آجاتا ہے، سیرت نگاری کے فن میں اپنی جملہ ندرتوں کے ساتھ یہ تذکیری رخ «امتاع الأسماع» کو مقریزی سے پہلے لکھی جانے والی کل کتابوں پر فائق بنا دیتا ہے، ہم سیرت کے فن میں اسے ایک گراں قدر اضافہ سمجھنے پر مجبور ہیں، اس طرح اس کتاب کی حیثیت سیرت رسول ﷺ کے فن میں ایک ''راہ نما'' کی سی ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو «امتاع الأسماع» کے بعد سے آج تک اسی تذکیری رخ کو زیادہ سے زیادہ سامنے رکھ کر سیرت کی کتابیں لکھنے کی کوششیں جاری ہیں۔

شخصیت رسول ﷺ کا بھرپور تعارف مقصود ہو تو آپ کی زندگی کے تین خاص محور نظر آتے ہیں یعنی:

① آپؐ کی ذات بحیثیت رسول خدا

② بحیثیت محبوب بندۂ خدا

③ اور بحیثیت معلم اخلاق

مقریزی کی «امتاع الأسماع» میں بھی رسول اکرم ﷺ کی زندگی کے نقوش و خطوط بہت حد تک انھی مذکورہ اساسات پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس خاکے کو زیادہ جاندار اور حقیقت پسندانہ بنانے میں ایک مخصوص ٹیکنیک کو استعمال کیا گیا ہے، اس ٹیکنیک میں ہم پاتے ہیں کہ واقعات زندگی کا سنین کے اعتبار سے ترتیب وار تسلسل برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جلی سرخیوں کے اندر واقعات کو بیان نہ کرکے کتاب کے بائیں طرف حاشیے میں چھوٹی چھوٹی سرخیاں لگا دی گئی ہیں، مگر اس طرح کہ متن کتاب میں حیات سے ممات تک احوال زندگی کا بیان ایک ایسے تسلسل کے ساتھ ہے جس میں ذہنی ترتیب بھی باقی ہے اور واقعات کی کڑیاں بھی ایک دوسرے سے پیوستہ رہتی ہیں، چنانچہ کتاب کی ابتداء ان الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے، «وھو سید ولد آدم ...... اور پھر زمانی ترتیب کے اعتبار سے واقعات کی روشنی میں شخصیت کی کامل تصویر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

احوال کے بیان میں تحقیق واقعہ کا لحاظ بدرجہء اتم پایا جاتا ہے، مثلاً ولادت نبی ﷺ کے سلسلے میں کثیر اختلافی روایات کو دیکھتے ہوئے مقریزی اہم ترین سبھی روایات کی نشاندہی کے بعد تحقیق کی بنیادوں پر اپنی ترجیحی شکل بیان کر دیتے ہیں۔

دوسری اہم بات اس ٹیکنیک کی یہ ہے کہ مقریزی قرآنی آیات اور مستند احادیث کے برمحل استعمال کے ساتھ ساتھ حسب حال خطبات رسولؐ اور ان کی مخصوص دعاؤں کو بھی حقیقی ماحول آفرینی کے لیے تحریر کا جزو بنا لیتے ہیں اور پھر قرآن و حدیث کے معجزاتی کلمات کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے ایک نہایت ہی شگفتہ و شستہ تحریر سے زبان و بیان کی سحر طرازی کا کام لیتے ہیں، سیرت رسول ﷺ کے لیے زبان و بیان کی یہ مناسبتیں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق موضوع کے اختصار، احوال زندگی سے جڑے اہم واقعات کا محققانہ انتخاب، فن کی جملہ ندرتیں اور ان سب پر مستزاد خود مقریزی کا حب رسول ﷺ میں گداختہ دل، سیرت کے باب میں «امتاع الأسماع» کو غیر معمولی عظمت و امتیاز سے ہمکنار کرتا ہے۔

جنگ احزاب میں مسلمانوں کو جن مشکلات و مصائب کا سامنا تھا، اور صبر و ثبات کی جن منزلوں سے مومنوں کو اور خود رسول اکرم ﷺ کو گزرنا پڑا تھا، ہم سب اس سے واقف ہیں، خندق کی کھدائی

جاری ہے، خطرات واضطراب کے لمحات ہیں، ایسے میں امت مسلمہ کے درمیان اور اعداء اسلام کے سامنے آپ کی ذات اقدس کا خاکہ دیکھیے کیسا جیتا جاگتا اور زندگی کے حقائق سے مملوء ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، جنگ کا منظر، کیمپوں کے احوال، چلت پھرت کے نقشے، دلوں کے کوائف، بے باکانہ گفتگو اور وہ سب کچھ سامنے آجاتا ہے جس میں آپ ﷺ بیک وقت ایک برحق رسول، عبد شکور اور محبوب بندۂ خدا اور معلم اخلاق نظر آتے ہیں۔

مقریزی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''مسلمانوں کی جماعت اس کام کی طرف دوڑ پڑی، انھوں نے بنو قریظہ سے کدال، پھاوڑے، مٹی کے ڈھونے کے تھیلے اچھی خاصی تعداد میں جمع کر لیے تاکہ خندق کھودی جاسکے، رسول اللہ ﷺ نے خندق کے ہر جانب لوگوں کو مقرر فرمادیا جو اس کی کھدائی میں لگ گئے، نوجوانوں کی ٹولی مٹی ڈھورہی تھی، مہاجرین وانصار دونوں ہی مٹی ڈھونے کے لیے اس شان سے نکل کھڑے ہوئے تھے کہ مٹی کے تھیلے ان کے سروں پر تھے، اور جب وہ مٹی ڈال کر لوٹتے تو واپسی میں وہ تھیلوں کو سلع پہاڑ کے پتھروں سے بھر لیتے تھے، کیونکہ یہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا، جس سے وہ اپنے دشمنوں کو نشانہ بناتے۔''

ادھر رسول اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ بھی مٹی تھیلے میں ڈال کر ڈھورہے تھے اور اصحاب (جوش جہاد میں) رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے، آپ ﷺ بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے (اس معرکے میں) حضرت سلمان فارسیؓ (کی قدر افزائی) کا یہ حال تھا کہ لوگ ان کی طرف ٹوٹے پڑ رہے تھے، چنانچہ مہاجرین بولے سلمانؓ تو ہم میں سے ہیں، پھر انصار بول پڑے: ارے وہ تو ہماری طرف رہیں گے، کیونکہ سب سے بعد کی میزبانی تو ان کے لیے ہماری ہی ہے، تب آپ ﷺ بھی لب کشا ہوئے: بھئی سلمانؓ تو ہمارے گھر کے فرد ہیں۔

خود حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ بارہ آدمیوں کے کام تنہا انجام دے رہے تھے، یہ کام جاری تھا اور آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے «اللّٰھم لا عیش إلا عیش الآخرۃ» اور آپ خندق بھی کھود رہے تھے، پیٹھ پر مٹی بھی ڈھورہے تھے، سچ بات تو یہ ہے کہ ایک بھی مسلمان ایسا نہ تھا، جو خندق کھودنے کے اس کام میں پیچھے رہا ہو۔

خود ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا حال یہ تھا کہ جلدی کی وجہ سے اپنے اپنے کپڑوں میں مٹی ڈھورہے تھے، انھیں جلدی میں کوئی تھیلا بھی نہیں مل سکا تھا، کام میں ان کے ساجھے کا بھی عجب حال تھا کہ مٹی ڈھونے میں، چلنے میں اور منزل پر پہنچنے میں وہ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے تھے۔

خود آپ ﷺ کی کام کی تندہی کا یہ عالم تھا کہ کبھی پھاوڑے چلاتے اور کبھی کدال سے مٹی بھر بھر کر نکالتے، اور کبھی مٹی کو تھیلے میں بھر کر ڈھوتے، ایک دن آپ ﷺ تھکن سے چور چور ہو کر ذرا دیر کو بیٹھ گئے اور ایک پتھر سے ٹیک لگائی تو غنودگی طاری ہو گئی، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ کے سرہانے آ کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو اس طرف سے گزرنے میں روکنے لگے کہ کہیں آپ ﷺ کو جگا نہ دیں، پھر اچانک آپ ﷺ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: بھئی دیکھو! تم دونوں نے تو مجھے پریشانی میں ڈال دیا''، پھر آپ ﷺ نے فی الفور نوکیلی کدال سے ضرب لگانی شروع کی اور آپ ﷺ کی زبان سے یہ کلمات جاری تھے:

اللّٰهم إن العيش عيش الآخرة فاغفر الأنصار والمهاجرة

آپ نے دیکھا! شخصیت رسول ﷺ کی کیسی حقیقت پسندانہ اور دلوں کو تڑپا دینے اور گرما دینے والی پیکر تراشی کا حق ادا کیا گیا ہے۔

سیرت رسول اللہ ﷺ کے فن میں مقریزی کی ''امتاع الاسماع'' یقیناً اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور آج بھی سیرت کے فن کو نکھارنے اور مزید تابناک بنانے میں اس کتاب سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

گلِ نخستیں

فضا ابن فیضی

بزم نئی ہے، ساز نئے، انداز نیا، آہنگ نیا
پیکر پیکر وضع انوکھی، منظر منظر رنگ نیا
قدر نئی، معیار اچھوتا، نقش نیا، اثر رنگ نیا
دیکھ! یہ خلد جلوۂ ونکہت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ، اللہ، مجلس مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

کس نے صنم آباد میں ڈالی، آخر یہ بنیادِ حرم
تا بہ سوادِ کاشی پہنچا، سلسلۂ ایجادِ حرم
قافلۂ اربابِ عجم! ہو تم کو مبارک زادِ حرم
ہو سب کا مقسوم یہ نعمت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ، اللہ، مجلس مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

محفل محفل بکھرے ہیں، خورشید رسالت کے جلوے
حسن و بصیرت کے نظارے، دین و شریعت کے جلوے
زلف یقیں کی سحر طرازی، رُوئے حقیقت کے جلوے
کتنی زر افشاں ہے یہ روایت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ، اللہ، مجلس مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

آ ئے ادب کے ساتھ زباں پر، نام رسول عربی کا
''قرآں'' بھی ہے اصل میں اک پیغام رسول عربی کا
کون ومکاں میں عام کرو پیغام رسول عربی کا
یہ بزم ارشاد و ہدایت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ اللہ، مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

تہذیب اخلاق و تمدن، تعمیر کردار و عمل
تشکیل اسرار ومعارف، تکریم ادیان و ملل
''اسوۂ حسنہ'' کا ہر پہلو، تعلیم قرآں کا بدل
عین یہی منشا، یہی دعوت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ اللہ، مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

مینائے توحید کی صہبا، اہل نظر کے جام میں ہے
جنت کے میوے کی حلاوت، خوشۂ صبح وشام میں ہے
دونوں جہاں کا خیر، ہمارے آفاقی پیغام میں ہے
خاک ہے بوسہ گاہِ عقیدت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ اللہ، مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

خوشبو کے ہاتھوں نے مجھے محراب صبا پر لکھا ہے
دیکھو تو یہ ماجرا کیسا؟ لوح نوا پر لکھا ہے
میں نے اس نغمے کو فضا، قرطاس حرا پر لکھا ہے
تم بھی ذرا سن لو یہ حکایت جامعہ السّلفیہ کی
اللہ اللہ، مجلس سیرت جامعہ السّلفیہ کی

میزباں شیخ عرب کا ہے یہ شہر برہمن

ذاکر ندوی، بسکوہر

مظہر تحمید ہے یہ نظم استقبالیہ
میں نے استقبالیہ میں نعت کا تحفہ دیا
ذوق دنیاوی ہے استقبال ہارون الرشید
سرخی تاریخ ہے اقبال ہارون الرشید
موج خامہ جب کبھی ہارون کی جاری ہوئی
قیصر روما کے تن پر کپکپی طاری ہوئی
ہمنشیں اس دور جمہوری میں سلطانی کہاں؟
دجلۂ اسلام میں شاہوں کی طغیانی کہاں؟
زندہ قوموں کو مشیت کا مگر ہے فیصلہ
نوع دیگر سے ملا قربانیوں کا پھر صلہ
چھن گیا جب دست دیں سے تخت و شمشیر وعلم
مل گئی تب قوت تقریر و تحریر و قلم
گونج اٹھی دانش کدوں سے ضرب ابن تیمیہ
مل گیا سارا عرب، افریقہ یورپ ایشیا

ابن قیم اور شوکانی سے آیا انقلاب
گم ہوا جب مہر دنیا، دیں کا چمکا آفتاب
علم کے سلطاں انھیں کے جانشیں ہیں سامنے
خرمن ماضی کے فاضل خوشہ چیں ہیں سامنے
ان ملوک فن کا استقبال اب مقصود ہے
مدح خواں خوش بخت ہے، ممدوح بھی مسعود ہے
صد خوشی موقع ہے یہ شہر بنارس کے لیے
چن گیا سیرت کی اس بزمِ مقدس کے لیے
میں ہوں حیراں آج میں کاشی میں یا طیبہ میں ہوں
ساغر زمزم بدست اب ساحل گنگا میں ہوں
ہند کیا میر عربؐ کو دے سکے ٹھنڈی ہوا
ہے خراماں اس میں خود طیبہ کی عطر آگیں صبا
شان رب ذی الکرم ہے فضل رب ذی المنن
میزباں شیخ عرب کا ہے یہ شہر برہمن
سلفیہ کے بخت کا تارا ہے پورے اوج پر
ناز ہے اس کو محمدیوں کی علمی فوج پر
فوج کچھ بحر عرب سے ہے یہاں آئی ہوئی
چھاؤنی اس کی ہے بحر ہند میں چھائی ہوئی
یہ ہے علمی فوج بھارت! اس سے گھبرانا نہیں
جو سپاہی دین کا ہے دنیا کا دیوانہ نہیں
علم کے ان جرنلوں سے ظلم ہو سکتا نہیں
غازیٔ فن تخم شر و جنگ ہو سکتا نہیں
رحمۃ للعالمین کی فوج رحمت اس کا نام
عدل امن انصاف اور جمہوریت سب اس کے کام
جو پناہ گہ آخری پائے گی یہ دنیا کبھی
وہ محکم اور قطعی دامن دین نبی

یاد آیا پھر وہ زریں گفتہ برناڈشا
کون دے گا امن دنیا کو محمدؐ کے سوا؟
امن کی کوشش کبھی یو این کی جب ہو جائے فیل
تو محمدیوں ہی کے ہاتھوں میں دو اس کی نکیل
ساحری ٹوٹے گی جب لندن کی اور نیو یارک کی
جب جنیوا چپ ہو اور گم ہوں صدائیں سارک کی
موت کی جب آخری ہچکی میں پہنچے ماسکو
ریزہ ریزہ جب بھی ہو پیکنگ کا جام وسبو
دامن دین محمدؐ میں ملے گی تب پناہ
یہ ہے بس اس بزم سیرت کی نوید وانتباہ
ہند کے باہر کے یہ دانشوروں کی فوج ہے
اور ہندستان قابل رہبروں کی فوج ہے
ہیں اشارے نظم میں تفصیل یہ بتلائیں گے
بزم میں ہر رنگ و بو کے پھول یہ برسائیں گے
گر ہو مہلت کچھ وضاحت مجھ سے بھی سن لیجیے
میرے شبال سخن سے اور گل چن لیجیے
ان کا قرآں ماہ رحمت ان کا پرچم ہے ہلال
سید فاروق اعظم اس کا اک حبشی بلال
عفو ان کی بانیء شر و وغا سے پوچھیے
روح بوسفیان جان عکرمہ سے پوچھیے
وہ یتیموں اور غریبوں پر تھے کتنے مہرباں
اس کی وادی میں خدیجہ ہم مسلمانوں کی ماں
ہمنشیں! ان کا کرم ہر ظالم مکہ سے پوچھ
پوچھ کر ہندہ سے وحشی قاتلِ حمزہ سے پوچھ
عورتوں پر چاند کی ٹھنڈک تھا وہ شمس عشاءِ
اس کو واضح کر سکے گی بس زبان عائشہؓ

وقف ہوں ہم آج سے تبلیغ رحمت کے لیے
کامیابی کی دعا ہے بزم سیرت کے لیے
مرکزی جمعیۃ جمعیۃ اور یہ مرکزی دارالعلوم
اک ہیں دلی اور کاشی، کیا ہے فرق ارض وبوم
داغِ دل ہے ارتحال حضرت عبدالوحید
کاش پھر لاؤ مثال حضرت عبدالوحید
مرحبا اے ازہری اور شکریہ شاہد جنید
آگیا ذاکر بھی پا کر بزم سیرت کی نوید

❁......❁......❁

ورفعنا لک ذکرک

شوق اعظمی

پیغام کردگار پیام محمد است
پنہاں کلام حق بہ کلام محمد است
نام خدا بہ ہمرۂ نام محمد است
در کلمہ ی نگرچہ مقام محمد است
موسیٰ کلیم وعیسیٰ مسیح زماں، ولے
آوازۂ رفعنا، بنام محمد است
محبوب را بہ لفظ رفعنا، خطاب کرد
در کائنات شہرۂ عام محمد است
ہرگز نہ گفتے تا نہ شنفتے ز جبرئیل
از وحی مستنیر کلام محمد است
اے مدعی چوں دیدۂ ادراک واکنی
بینی بہ دہر نقش دوام محمد است
از صبح تا بہ شام بہ ہر خطۂ جہاں
بانگ اذاں بلند بنام محمد است
ادیان سابقہ را فسردہ چراغہا
تابندہ آفتاب نظام محمد است

بوجہل نامراد کہ نام و نشاں نداشت
اما ہنوز ذکر دوام محمد است
دارد فضیلتے بہ جہاں ہر نبی، ولے
طغرائے امتیاز بنام محمد است
ممنون فیض او چہ حکیم و چہ فلسفی
ہر فرد خوشہ چین کلام محمد است
تاریخ شاہد است کہ از حسن خلق او
دشمن اسیر حلقۂ دام محمد است
رفتہ بہ عزم قتل ولے چوں نگاہ کرد
آخر عمر چہ دید کہ رام محمد است
کافی برائے تیرگیٔ قلب جرعۂ
از بادۂ صفا کہ بجام محمد است
ہر کس بہ زعم خویش بنازد بہ دلبرے
شوق حزیں بدانکہ غلام محمد است

حرفِ صدا

وفا صدیقی (بھوپال)

یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے
سیرت طیب پر جو لکھوں اس تحریر میں قدرت دے
گلشن گلشن رنگ وصباحت قریہ قریہ خوشبو ہو
حب نبی میں جو نغمہ ہو اس کی شہرت ہر سُو ہو
لہجہ لہجہ گہرائی دے، حرف صدا کو قامت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے
رحمت عالم امن کا جس نے دنیا کو پیغام دیا
درس حرا سے جو پایا تھا فاراں سے وہ عام کیا
جو آواز صفا سے اٹھی اس آواز کو رفعت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے
منزل منزل روشن کی، توحید کا پرچم لہرایا
راہ روانِ تیرہ شبی کو روشن رستہ دکھلایا
سنت اور قرآن کے اس رستے کی طاعت وحرمت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

دریا پربت جنگل گونجے کلمۂ حق کے نعروں سے
نور ہدایت چمکا بکھرا کوچوں سے بازاروں سے
کلمۂ حق کی، نور ہدیٰ کی، اک اک لفظ شہادت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

رنگ ونسل کا بھید مٹایا تقویٰ کو معیار کیا
نہ کوئی برتر نہ کوئی کمتر یہ جذبہ بیدار کیا
ایسا تقویٰ ایسی عقیدت ایسا جذبۂ اخوت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

حجر مقدس کی تنصیب کی حکمت سے دانائی سے
سرداران قوم کو روکا اک خوں ریز لڑائی سے
ایسی حکمت ایسا تدبر ایسا فہم وفراست دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

صلح وہ جو کہ فتح مبیں کی بنیاد و تمہید بنی
اہل صفا کی اہل رضا کی اہل وفا کی عید بنی
صبر و رضا میں پوشیدہ ہو ایسی فتح ونصرت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

معبودان باطل ٹوٹے پاک ہوا اللہ کا گھر
حق کی چوکھٹ پر سب آئے ظالم، جابر اور خودسر
دشمن کو بھی جس میں اماں ہو ایسی شفقت ورحمت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

قیصر وکسریٰ روم وایراں کانپے جس کی ہیبت سے
پورب، پچھم، اتر، دکھن جاگے دین کی دعوت سے
ایسی دعوت، ایسی عظمت، ایسا جوشِ شجاعت دے
یارب میرے شعر وسخن کو ایسا حسن بلاغت دے

جو امت تھی خیر امت آج بٹی ہے فرقوں میں
دین مجلّا کو محصور کیا ہے جھوٹی رسموں میں
حق کے آگے استادہ ہیں جہل وکفر کی دیواریں
صدق و وفا پر ہر جانب ہیں ظلم وستم کی یلغاریں
اس امت خیر کو جہد وعمل کی طاقت دے
دورِ ہوس میں سچائی کو یارب امن وحفاظت دے

ہماری دیگر کتابیں

تاریخ تدوین سنت	ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب
حیات سرور کائناتؐ	ملا واحدی
سیرت خاتم النبیینؐ	ڈاکٹر ماجد علی خاں
سیرت رحمت عالمؐ	ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری
عہد نبویؐ کا تمدن	پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
مقالات شاغف	ابوالاشبال شاغف بہاری
احکام سُترہ	غلام مصطفیٰ فاروق
مرقع سیرت	پروفیسر عبدالجبار شاکر
اسوۂ کامل (صدارتی ایوارڈ یافتہ)	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
سیرت پیغمبرِ اسلام (فقہ السیرۃ)	علامہ محمد غزالیؒ
علوم الحدیث فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
قادیانیت نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت	حکیم محمود احمد ظفر
خطبات و مقالات سیرت	پروفیسر عبدالجبار شاکر
عظمت اسلام فی القرآن و بائبل	نازش شہزاد
عہد رسالت میں اسلام اور نصرانیت کے تعلقات	ڈاکٹر فاروق حمادہ

کتاب سرائے

پبلشرز' ڈسٹری بیوٹرز' مشیران کتب خانہ جات

الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ پاکستان

فون:042-37320318' فیکس: 042-37239884

kitabsaray@hotmail.com

ملنے کا پتہ

فضلی بک سپر مارکیٹ

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 021-32212991, 32633887